سالہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات ★ تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

حیاتِ مصلح الامّت

یعنی مصلح الامّت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ
وصی اللہ صاحب قدس سرہ کی سوانح عمری

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را ★ گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

تالیف!

مولانا اعجاز احمد اعظمی

سالہا در کعبہ وبتخانہ می نالد حیات ☆ تا بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

حیاتِ مصلح الامت

یعنی مصلح الامت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کی سوانح عمری

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را ☆ گاہ گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

تالیف

مولانا اعجاز احمد اعظمی

ناشر

مولانا لیاقت علی قاسمی

امام وخطیب مسجد بی۔ آئی۔ ٹی بلاک، بھنڈی، بازار ممبئی MOB:9869540674

تفصیلات

نام کتاب .... حیات مصلح الامت (حصہ اوّل، دوم)

تالیف .... مولانا اعجاز احمد اعظمی

ناشر .... مولانا لیاقت علی قاسمی، بھنڈی بازار، ممبئی

باہتمام .... الحاج محمد ناصر خان

صفحات 528

طبع اوّل ۱۹۸۴ء

طبع دوم ۲۰۰۷ء

قیمت ....

سنہ طباعت .... اگست ۲۰۰۷ء

فہرست مضامین

حصہ اوّل

کلماتِ طیبات	حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب	۸
پیش لفظ	حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی صاحبؒ	۱۰
تصدیق وتوثیق	حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامی	۱۷
تقریب	مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی	۲۳
دیباچہ طبع دوم	مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی	۲۶

☆☆☆☆☆☆

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
۱	**ماحول وخاندان**	۲۸
۲	**نمودِ صبح**	۳۶
۳	حافظ محمد یعقوب صاحب کی اولاد	۳۷
۴	بچپن	۳۸
۵	ابتدائی تعلیم	۳۸
۶	ابتدائی عربی تعلیم	۴۰
۷	**قیامِ دیوبند**	۴۴
۸	دعوتوں سے اجتناب	۴۹
۹	وقت کی قدردانی اور جفاکشی	۵۱
۱۰	اکابر سے لگاؤ اور ان کی نظر	۵۳
۱۱	بے نظیر ایثار	۵۷
۱۲	**قیامِ تھانہ بھون**	۶۰
۱۳	یکسوئی اور انہماک	۷۱
۱۴	مرشد کی نگاہِ کرم	۷۳

۱۵	حضرت کی زندگی کا ایک اور رُخ	۸۱
۱۶	کمالِ دانائی	۸۲
۱۷	حکمت عملی	۸۳
۱۸	سبق آموزی	۸۵
۱۹	علمی معاملات میں مرشد کا اعتماد	۸۶
۲۰	مرشد کی قدر افزائی	۹۰
۲۱	**تدریس**	۹۴
۲۲	تلاوت قرآن سے تاثر	۹۹
۲۳	کانپور کا قیام	۱۰۰
۲۴	**نکاح**	۱۰۳
۲۵	**قیامِ وطن (۱)**	۱۰۸
۲۶	خانقاہ کی ابتدائی شکل	۱۱۱
۲۷	جدید خانقاہ	۱۱۳
۲۸	مسجد کی جدید تعمیر	۱۱۵
۲۹	مدرسہ وصیۃ العلوم	۱۱۸
۳۰	**قیامِ وطن (۲)**	۱۲۰
۳۱	دعوت حق کی راہ میں دشواریاں	۱۲۴
۳۲	**خانقاہ کے شب وروز**	۱۳۲
۳۳	ہدایات	۱۳۳
۳۴	نظام الاوقات برائے طالبین وحاضرین خانقاہ	۱۳۵
۳۵	ہدایات	۱۳۶
۳۶	مجلس	۱۳۷
۳۷	مجلس کی ایک عجیب خصوصیت	۱۴۱
۳۸	**حضرت مصلح الامۃ اور کوپاگنج**	۱۴۴
۳۹	جس جگہ بیٹھ کے پی لے وہی میخانہ بنے	۱۵۱

۴۰	**مخالفت اور اس کی اصلاح**	۱۵۶
۴۱	**هجرت**	۱۶۴
۴۲	**قیامِ گورکھپور والہ آباد**	۱۷۰
۴۳	غیرت دینی کا ایک نمونہ	۱۷۱
۴۴	مولوی ثناء اللہ صاحب کے مکان سے منتقلی	۱۷۲
۴۵	مسجد کی تعمیر	۱۷۶
۴۶	**اَسفار (۱)**	۱۸۶
۴۷	سفر حج	۱۸۷
۴۸	لکھنؤ کا پہلا سفر	۱۸۹
۴۹	سفر مانی کلاں	۱۹۰
۵۰	فتح پور تال نرجا کا سفر	۱۹۰
۵۱	ڈھاکہ کا سفر	۲۰۴
۵۲	**اَسفار (۲)**	۲۰۸
۵۳	سفر علی گڈھ	۲۰۸
۵۴	نواب چھتاری خدمت والا میں	۲۱۱
۵۵	دعاء کا منظر	۲۱۲
۵۶	سفر لکھنؤ	۲۱۳
۵۷	بمبئی کے اسفار	۲۱۶
۵۸	سفر جون پور	۲۲۴
۵۹	مئو کے پروگرام	۲۲۶
۶۰	موضع اتراؤں اور بمرولی	۲۲۶
۶۱	**سفر حج اور وصال**	۲۵۰
۶۲	آخری مجلس	۲۵۲
۶۳	روانگی	۲۵۷
۶۴	آخری بیعت	۲۶۱
۶۵	وفات	۲۶۲

۞	**حصہ دوم**	**۲۸۵**
۱	**ذوق ، مزاج اور خصوصیات**	۲۸۷
۲	خلوت گزینی اور ذوقِ عبادت	۲۸۸
۳	ذاتِ نبوی کے ساتھ شیفتگی	۲۹۳
۴	قرآن سے عشق و تعلق	۳۰۱
۵	زُہد و تقویٰ	۳۰۴
۶	صدق و توکل	۳۱۴
۷	محبت و شفقت	۳۱۹
۸	اصلاحِ امت کی دُھن	۳۲۳
۹	رُعب و جلال	۳۲۸
۱۰	حزم و تدبر	۳۳۲
۱۱	غیر معمولی تاثیر	۳۳۵
۱۲	ایک مشاہد مگر نامعلوم کیفیت	۳۳۷
۱۳	مقبولیت عامہ	۳۳۹
۱۴	ذوقِ علم	۳۴۱
۱۵	**استاد شاگرد کے حلقۂ ارادت میں**	۳۴۵
۱۶	**علماء، عصر سے روابط**	۳۵۵
۱۷	شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ	۳۵۵
۱۸	شیخِ وقت حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوریؒ	۳۵۹
۱۹	حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ	۳۶۲
۲۰	حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ	۳۶۷
۲۱	حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ	۳۶۹
۲۲	جناب ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفیؒ	۳۷۱
۲۳	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ	۳۷۳

۲۴	**کرامات وقبولیتِ دعاء**	۳۸۱
۲۵	**طریقۂ تربیت واصلاح**	۴۰۰
۲۶	بیعت کا سلسلہ	۴۰۳
۲۷	اتباعِ سنت کی وصیت	۴۰۴
۲۸	میرا شجرہ	۴۰۴
۲۹	دستور العمل	۴۰۵
۳۰	بیعت کا حاصل	۴۰۵
۳۱	بیعت کی ضرورت	۴۰۶
۳۲	اصلاح کی ابتداء	۴۰۶
۳۳	مقصود باطن کی درستگی ہے	۴۰۸
۳۴	ہر شخص کے حالات کے لحاظ سے اَورادووظائف	۴۰۹
۳۵	طریقہ بارہ تسبیح	۴۰۹
۳۶	مطالعہ کتب کی ضرورت	۴۱۰
۳۷	مشائخ کی کتابیں	۴۱۰
۳۸	اصلاح اخلاق	۴۱۱
۳۹	ادب واحترام	۴۱۱
۴۰	اہل وعیال کی اصلاح	۴۱۲
۴۱	تجدید ایمان	۴۱۴
۴۲	صلحاء کی صحبت	۴۱۵
۴۳	**اولاد واَحفاد**	۴۲۷
۴۴	**تالیفات**	۴۳۳
۴۵	**چار ھفتہ ایک کھف میں**	۴۴۶
۴۶	**ایک تاریخی وعظ**	۴۶۴
۴۷	**مجلس الہ آباد**	۴۸۰
۴۸	**حضرت والا کا ایک درس**	۵۰۴
۴۹	**حضرت کی مکاتبت حضرت تھانویؒ سے**	۵۲۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کلماتِ طیبات

(حضرت اقدس مولانا قاری شاہ محمد مبین صاحب مدظلہٗ جانشین حضرت مصلح الامۃ قدس سرہٗ)

الحمدللّٰہ و کفیٰ و سلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

سیّدی وسندی مرشدی ومولائی حضرت مصلح الامۃ قدس سرہٗ کے زمانۂ حیات ہی میں بندہ کا نیز اور بھی بعض احباب کا قلبی تقاضا تھا کہ حضرتؒ کی سوانح حیات قلمبند ہوجاتی تو بہت بہتر ہوتا کہ خود اپنے لئے بھی موجب تسلی بنتی اور بعد والوں کے لئے بھی حضرت کے کوائف اور حالات کے جاننے کا ایک ذریعہ ہوجاتی، لیکن چونکہ حضرتؒ ہمارے درمیان موجود تھے، اس لئے گویا حضرت کی ساری حیات ہی نگاہوں کے سامنے تھی، پھر یہ کہ جولوگ حضرت والاؒ کے اندازِ تربیت سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ حضرت نے اپنے تمام متوسلین کو ایک مرکز فکر کے ساتھ مربوط فرمارکھا تھا، اور وہ تھا ''فکر آخرت'' اور ''اصلاحِ نفس'' ان میں انہماک کسی دوسری چیز کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت ہی نہ دیتا تھا۔ پھر ایک دن وہ بھی آیا کہ سفر حج کے دوران یک بیک آپ کا جلوۂ ظاہری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا، اب نہ اصلاح وتربیت کے وہ روح پرور مناظر رہے اور نہ مواخذۂ وداروگیر کے ایمان افروز نظارے۔ دل اب بھی انھیں مناظر کا طالب تھا، مگر حیف کہ ع

روئے گل سیر ندیدیم وبہار آخر شد

اب پھر خیال ہوا کہ حضرت اقدس کی زندگی کا جونقشہ ابتک دیکھنے والوں کی نگاہوں میں ہے اس امانت کو سینے سے سفینے میں منتقل کردینا ضروری ہے تاکہ اپنے لئے بھی وہ تسکین ورہنمائی کا ذریعہ بنے، اور نہ جاننے والوں کیلئے بھی محرومی نہ رہے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامؔی کو، اور انھیں صحت وقوت بخشے کہ انھوں نے پوری کاوش کر کے حضرتؒ کے حالات جمع کئے، اور سابقاً اس کو رسالہ ''معرفت حق'' اور حالاً رسالہ ''وصیۃ العرفان'' میں شائع کئے، چنانچہ اس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، لیکن چونکہ یہ حالات ان رسالوں میں قسط وار طبع ہو رہے تھے اس لئے ان سے طبیعت کو سیری نہ ہوتی تھی، اس لئے خیال ہوا کہ انھیں ازسرنو ترتیب دے کر یکجا کتابی صورت دیدی جائے، تاکہ مطالعہ کرنے والوں کو ایک ہی جگہ حضرت اقدس کی زندگی کے مقدس نقوش مل جائیں۔ فکر تھی کہ یہ کام آخر کس سے لیا جائے؟ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہیں، حسن اتفاق کہ مولانا اعجاز احمد صاحب سلّمہٗ مدرس مدرسہ دینیہ غازی پور، جب الہ آباد میں عارضی قیام کے لئے تشریف لائے اور ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو اندازہ ہوا کہ مولانا موصوف اس کام کے لئے نہایت موزوں ہیں، ماشاء اللہ تحریری سلیقہ، حضرت اقدس سے والہانہ عقیدت، تعلیماتِ تصوف سے مناسبت، یہ تمام امور بیک وقت آپ کے اندر موجود پائے، اور یہ کہ گو حضرت والاؒ کی زیارت آپ نے دیدۂ ظاہر سے نہیں کی تھی مگر اس کی تلافی بطریق احسن ان کے جذبۂ عشق ومحبت نے کردی۔

ان امور کو دیکھتے ہوئے ترتیب سوانح کی انھیں سے فرمائش کی گئی، اور انھوں نے بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ حالات سلیقہ سے جمع کر دیئے، چنانچہ پیش نظر تالیف انھیں کی محنت کا ثمرہ ہے جو کہ ناظرین کیلئے حضرت والاؒ کے احوال وواقعات، تعلیمات اور اندازِ اصلاح وتربیت نیز ہم سب کے لئے اطمینان وتسلی کا پورا چمنستان ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے حسن قبول سے نوازے اور ہم سب کو حضرت اقدسؒ کے نقش قدم پر قائم رکھ کر علم وعمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

کمترین محمد مبین عفی عنہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

(از: حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ)

الحمدللہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ۔ أمابعد!

اپنے وقت کے عظیم مصلح اور مربی، داعی الی اللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات مسمیٰ بہ ''حیات مصلح الامت'' تالیف مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی پر یہ چند تعارفی وتمہیدی سطور تحریر کرنا میرے لئے بڑی سعادت اور فخر کی بات ہے، کہ خریدارانِ یوسف کی صف میں ایک بضاعتِ مزجاۃ لیکر راقم السطور بھی شامل ہوگیا، ع

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

قبل اس کے کہ میں حضرت کی شخصیت ودعوت اور پیش نظر سوانح کے متعلق کچھ لکھوں، میں اپنی ناچیز تالیف ''تاریخ دعوت وعزیمت'' حصہ اوّل کا ایک اقتباس نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں، جو میں نے دوسری صدی ہجری کے سب سے بڑے داعی و مصلح اور تاریخ اسلام کی ایک مقبول ترین شخصیت حضرت حسن بصریؒ کے متعلق لکھا تھا، کہ تفاوتِ زمانی ومکانی اور تفاوتِ مراتب جس کا تعلق عہد نبوت سے قرب، صحابۂ کرام سے براہ راست استفادہ اور قبولیت عند اللہ سے ہے، کے باوجود ان دونوں داعیوں اور اپنے اپنے زمانہ میں اصلاح وتربیت کا کام کرنے والوں کے طرز اصلاح، نقطۂ مرکزی، ہدف اور مزاج میں بڑی مماثلت نظر آتی ہے۔ امام حسن بصریؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

’’حضرت حسن بصریؒ کی دعوت واصلاح کی طاقت وتاثیر میں اس بات کو بڑا دخل ہے کہ انھوں نے زندگی کا ایک سرا پکڑ لیا اور معاشرہ کی اصل بیماری کی طرف توجہ کی، ان کے زمانہ میں بہت سے واعظ اور داعی تھے، لیکن اس زمانہ کے معاشرہ نے کسی کے وجود اور کسی کی دعوت کو اس طرح محسوس نہیں کیا جس طرح حضرت حسن بصریؒ کے وجود اور ان کی دعوت کو محسوس کیا، اس لئے کہ ان کی تقریروں اور ان کے درسوں سے بگڑے ہوئے معاشرہ پر زَد پڑتی تھی، وہ نفاق کی حقیقت بیان کرتے تھے، اور نفاق ایک مرض تھا جو اس معاشرہ میں پھیل رہا تھا، وہ منافقین کے اخلاق واوصاف بیان کرتے تھے اور یہ اخلاق واوصاف بہت سے لوگوں میں پائے جاتے تھے جو حکومت، فوج اور تجارت میں پیش پیش تھے اور زندگی میں نمایاں تھے، وہ آخرت فراموشی اور دنیا طلبی کے بحران کی مذمت کرتے تھے اور بکثرت لوگ اس وبا کا شکار تھے، وہ موت اور آخرت کی تصویر کھینچتے تھے اور ان حقیقتوں کو مستحضر کراتے تھے، اور مترفین اور غافلین کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا تھا جس کی زندگی ان چیزوں کے بھلائے رکھنے میں تھی۔

غرض ان کی دعوت، ان کے مواعظ اور ان کے اصلاحی درس اس زمانہ کے خواہشات واغراض سے اس طرح متصادم تھے کہ اس زمانہ کی سوسائٹی کے لئے ان سے غیر متعلق رہنا مشکل ہوگیا تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ بکثرت لوگ ان کی تقریروں اور مجلسوں سے چوٹ کھا کر اپنی پچھلی زندگی سے تائب ہوتے تھے اور نئی زندگی اختیار کرتے۔ وہ اپنی تقریروں اور مجلسوں سے دین وایمان کی دعوت بھی دیتے تھے اور اپنی صحبت وعمل سے نفوس کی تربیت اور تزکیہ بھی کرتے تھے، ساٹھ سال کی طویل مدت انھوں نے اس دعوت واصلاح میں گزاری، کوئی اندازہ نہیں کرسکتا کہ کتنے نفوس کو ان کی وجہ سے حلاوتِ ایمان اور حقیقتِ اسلام نصیب ہوئی۔ عوام بن حوشب کہتے ہیں کہ حضرت حسن نے ساٹھ برس تک اپنی قوم میں وہ کام کیا جو انبیائے کرام (ختم نبوت سے پہلے) اپنی امتوں میں کرتے تھے۔‘‘ (تاریخ دعوت وعزیمت: حصہ اوّل، ص:٦٦)

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کے کام اور ان کی دعوت واصلاح کے نقطۂ مرکزی کو بیان کیا جائے، جس کے گردان کی پوری دعوتی واصلاحی جدوجہد گردش کرتی رہی تو ہمارے نزدیک اس کا عنوان ہوگا ''ازالۂ نفاق واصلاحِ اخلاق''

میرے نزدیک مسلمانوں کا اس وقت کا مرض نہ کفر ہے نہ جہل ہے، اور نہ عمومی وعالمگیر فسق، ان کا مرض ظاہر و باطن کا اختلاف، عقیدہ وعمل کی عدم مطابقت، دعوے اور عمل کا تضاد عبادات اور اخلاق میں نہ صرف عدم مناسبت بلکہ بونِ بعید، دنیا کو آخرت پر ترجیح، اپنے حقیر منافع اور موہوم مفاد کے لئے دوسروں کے حقوق کی پامالی اور حق تلفی شریعت کو زندگی کے تمام شعبوں میں جاری وساری نہ کرنے کی عادت، رسوم ومظاہر کو حقائق وجواہر پر مقدم رکھنا اور ان کی احکامِ الٰہی کی طرح تعمیل کرنا، یہ سب وہ جزئیات ہیں جن سے کوئی کلّیہ قرار دیا جائے تو وہ قرآن وحدیث کی زبان کا بلیغ ووسیع، عمیق وپُر از معانی لفظ ''نفاق'' ہے، اس کے متعلق محققین تابعین جن کے سرخیل وپیشوا سیّد التابعین حضرت حسن بصریؒ تھے کی تحقیق ہے کہ یہ مرض عہد رسالت کے ساتھ ختم نہیں ہوگیا، یہ فطرتِ انسانی کی وہ کمزوری ہے جو انسانی نسل کے ساتھ دنیا وآخرت، تعلیمات آسمانی اور جذباتِ نفسانی، اُخروی فوائد اور دنیوی مفادات کے تعارض کی موجودگی میں ہر دور اور ہر جگہ پایا جاسکتا ہے، اور اس کے لئے ضروری نہیں کہ اسلام اور کفر کی دو طاقتیں میدان میں موجود ہوں اور ان میں کشمکش جاری ہو۔ اس لئے حضرت حسن بصریؒ کا خیال تھا کہ نفاق کا مرض اس دورِ خیر وبرکت میں زندہ ہے جو اسلامی فتوحات، اسلامی برکات، علمائے ربانیین اور زاہدین واوّابین سے خالی نہیں۔ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ بھی اسی کے قائل تھے کہ نفاق ہر زمانہ میں موجود اور زندہ ہے، اور منافقین کا وجود کسی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں، ان

کے نزدیک نفاق کی دو قسمیں ہیں ، نفاقِ اعتقادی اور نفاقِ عمل و اخلاق۔ نفاق اعتقادی کا قطعی علم زمانۂ رسالت کے بعد انقطاعِ وحی کی وجہ سے دشوار ہے، لیکن نفاقِ عمل اور نفاقِ اخلاق کثیر الوقوع ہے (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ''الفوز الکبیر، ص:۱۲، مطبع محمدی)

حضرت مولانا نے بھی اسی نفاقِ عمل اور نفاقِ اخلاق کو اپنی اصلاح و دعوت کا ہدف اور مسلمانوں کے اکثر طبقات کا مرض تجویز فرمایا تھا، اور اسی کو اس وقت مسلم معاشرہ کی بیماری اور عمومی کمزوری سمجھا تھا جو اس وقت کے اکثر امراض کی جڑ تھی اور وہ اسی پر اپنی مجالس اور درس و مواعظ میں ضرب لگاتے تھے، اگر آپ کی مجالس اور مواعظ کا جائزہ لیا جائے اور مکان و زمان کے تنوع اجمال و تفصیل کے اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کا قدر مشترک تلاش کیا جائے تو بے اختیار زبان سے نکلے گا کہ، ع

آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمان

اس کے بعد دوسرے نمبر پر جس چیز کو حضرت مولانا کی اصلاحات و دعوت و تربیت کا جامع عنوان قرار دیا جاسکتا ہے وہ **اصلاحِ اخلاق** ہے، اور یہ پہلو ان کے شیخ و مربی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کا مجددانہ کارنامہ اور امتیازی وصف ہے۔ اصلاح معاملات و اخلاق اور اصلاح معاشرت و اصلاحِ رسوم وہ عنوان ہے جس کے اس دور میں امام و مجدّد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ تھے، اور میری ناقص معلومات میں ان کے نقش قدم پر ان کے خلفاء میں (جو سب کے سب قابل احترام ہیں) سب طرف سے آنکھیں بند کر کے چلنے والے حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوریؒ نظر آتے ہیں، اس کی تفصیل اور اس کے دلائل اسی زیر تبصرہ کتاب ''حیات مصلح الامت'' میں عنوانات ذیل کے تحت دیکھی جاسکتی ہے ...... ''طریقۂ تربیت و اصلاح'' ''مقصود

باطن کی درستگی ہے'' ''اصلاح اخلاق'' ''اہل وعیال کی اصلاح'' نیز حضرت کے مواعظ، ملفوظات اور خود آپ کے حالات اور سیرت کے اوصافِ خاص حسن خلق وحسن سلوک، تقویٰ ومعاملات کی صفائی تھی۔ حضرت حدیث پاک میں جن علاماتِ نفاق کا ذکر آیا ہے اکثر سنایا کرتے اور کبھی اسی پر وعظ فرماتے تھے، فرماتے تھے کہ:

''چونکہ اس مرض میں ابتلائے عام ہے اس لئے اسی حدیث پر اکثر بیان کرتا ہوں، اس لئے کہ اس زمانے میں صرف احوالِ رفیعہ اور مقامات عالیہ کے بیان سے نفع نہ ہوگا بلکہ جن رذائل میں عوام وخواص مبتلا ہیں ان کی نشاندہی پھر ان کے علاج کی طرف رہبری سے نفع ہوگا۔''

آپ نفاقِ اعتقادی اور نفاقِ عملی کی قسموں کا بھی تذکرہ فرماتے تھے اور پھر نفاقِ عملی کی علامات وخصائل کو مسلمانوں کی زندگی میں دکھاتے تھے، تفصیل کے لئے حضرت کا رسالہ ''تحذیر العلماء'' کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

حضرت کی زندگی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اپنے شیخ کی طرح تصوف کے رسوم ومظاہر اور سلسلہ کی توسیع واشاعت سے مستغنی ہوکر اور ان سے صرفِ نظر کرکے اصلاح وتربیت کے کام میں سرگرمی کے ساتھ مشغول تھے، اور ولا یخافون لومة لائم پر پورا عمل تھا، ظاہر کے بجائے باطن پر، قشر کے بجائے لُب پر اور جسم کے بجائے جوہر پر نظر تھی، مسلمانوں کی زندگی، امراضِ باطنی، معاشرہ کی خرابیوں اور شاہ ولی اللہ صاحب کی اصطلاح میں ''غوائل رسوم'' پر گہری نظر تھی، حاضرین کو آپ کی مجالس میں شریک ہوکر صرف حلاوتِ ایمانی، ذوقِ عبادت اور خیالِ آخرت ہی نہیں پیدا ہوتا تھا بلکہ اپنی کمزوریوں کا اور اپنی خصوصی بیماریوں کا بھی احساس ہوتا تھا، اور وہ آپ کی مجالس سے محض اطمینان لے کر نہیں اٹھتے تھے، اصلاح حال کا خیال، اپنی

خامیوں کا احساس اور اپنی پچھلی زندگی پر ندامت بھی لے کر واپس ہوتے تھے، جو اہل اللہ کی مجالس اور مصلحین امت کی خدمت میں حاضری اور مجلسوں میں شرکت کا اصل فائدہ اور ثمرہ ہے۔ راقم الحروف کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس سعادت سے محروم نہیں رکھا، اور جیسا کہ میری کتاب ''پرانے چراغ'' کے پہلے حصہ کے اس مضمون سے معلوم ہوگا جس میں میں نے حضرتؒ کے یہاں حاضری کے تاثرات و مشاہدات لکھے ہیں، اور اس کے متعدد اقتباسات زیر تبصرہ کتاب میں بھی آئے ہیں۔ حضرت کی شفقت خاص سے بھی محروم نہیں رہا، اس وقت بھی میرا یہی احساس تھا اور اب بھی یہی احساس ہے کہ یہ اصلاحی رنگ، اخلاقی و باطنی امراض کے معالجہ کی فکر و اہتمام حضرتؒ کے تمام اَذواق پر غالب اور مشائخ وقت میں حضرت کا امتیازِ خاص تھا کہ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

ضرورت تھی کہ زمانہ کی سلیس، شستہ و شگفتہ زبان میں طویل تمہیدات مبالغہ آمیز مداحانہ کلمات سے بچتے ہوئے جو عام طور پر بزرگوں کی سوانح و تذکروں کا خاصہ بن گیا ہے، کسی رنگ آمیزی کے بغیر حالات و واقعات، ملفوظات و ارشادات، اخلاق و شمائل معاصرین کے تعلقات اور اصلاح و تربیت کے اثرات و نتائج پیش کئے جائیں خدا کا شکر ہے کہ یہ مبارک سلسلہ شروع ہوگیا، ویسے تو پہلے ''معرفت حق'' اور ''وصیۃ العرفان'' کے ذریعہ حضرتؒ کے افادات و حالات کی اشاعت کا سلسلہ جاری تھا، لیکن اب مستقل سوانح عمری کی ترتیب کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ چند دن ہوئے محبّ محترم مولانا محمد قمر الزماں صاحب کے مرتب کئے ہوئے ''تذکرۂ مصلح الامت'' کا پہلا حصہ سامنے آیا، مجھے ابھی اس کے باقاعدہ مطالعہ کا موقع نہیں ملا تھا کہ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی کی تالیف کی ہوئی کتاب ''حیاتِ مصلح الامت'' کا کتابت شدہ

مسودہ طباعت کے لئے تیار ہے، اور جس کی اشاعت دائرۃ الاشاعت خانقاہ مصلح الامت کی طرف سے عنقریب ہونے والی ہے، سامنے آیا، میں نے جستہ جستہ اس پر نظر ڈالی اوراس کے بعض حصے سنے، کتاب جدید اسلوب اور مذاق کے مطابق لکھی گئی ہے، اوراس میں جہاں تک مجھے اندازہ ہوا وہ خصوصیات موجود ہیں جن کی طرف میں نے اشارہ کیا۔ میرا مصنف سے اس کتاب کے ذریعہ پہلی مرتبہ تعارف ہوا، وہ مدرسۂ دینیہ غازی پور کے مدرس ہیں، جن کا اصلاً اشتغال درس وتدریس سے ہوگا، لیکن ان میں تصنیفی سلیقہ، تحریر میں ایسی شگفتگی اور سلاست، کتاب میں ایسی حسن ترتیب اور مضامین کا حسن انتخاب ہے جو کہنہ مشق مصنفوں اور اہل قلم میں پایا جاتا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت وقت کی ایک اہم دینی واصلاحی خدمت اور بزرگوں کی سوانح عمریوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ میں مصنف اور ''دائرۃ الاشاعت خانقاہ مصلح الامت'' کو مبارکباد دیتا ہوں کہ ان کو ایک ایسی مفید کتاب کی اشاعت کی توفیق ہورہی ہے۔ حضرتؒ کے خلیفہ ومجاز اور جانشین مولانا قاری محمد مبین صاحب اور حضرت معتمد اور کاتب خاص مولانا عبدالرحمٰن جامیؔ صاحب قارئین اور مستفیدین کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان کے ایماء وحکم سے ایک ایسی مفید اور جامع کتاب میں وجود میں آئی۔ اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ نفع پہونچے اور پڑھنے والوں میں اس سے اپنے اصلاحِ حال کا جذبہ، اور دینی ترقی کا شوق پیدا ہو۔

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہ حسنی۔

۴؍رجب المرجب ۱۴۰۴ھ، ۷؍اپریل ۱۹۸۴ء

☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تصدیق وتوثیق

(از: جناب مولانا عبدالرحمٰن جامؔی صاحب علیہ الرحمہ، مدرس مدرسہ وصیۃ العلوم الہ آباد)

الحمد لأهله والصلوٰة لأهلها   أما بعد!

کسی کتاب پر تقریظ لکھنے کی نہ تو عادت ہی ہے، اس لئے کہ اپنی علمی کم مائیگی اس باب میں سدراہ ہوتی ہے، نہ ہی یہاں اس کی چنداں ضرورت ہے، اس لئے کہ پیش نظر کتابِ خود اپنے ہی شیخ ومرشد نور اللہ مرقدہٗ کی سیرت اور ان کے حالات پر مشتمل ایک تالیف ہے، جس کا اکثر وبیشتر حصہ بقول مصنف سلّمہٗ میرے ہی تحریر کردہ ''حالاتِ مصلح الامت'' سے ہی ماخوذ ہے، اس لئے اس پر کچھ لکھنا گویا اپنے ہی کسی مضمون پر تقریظ لکھنا ہوا۔ رہا اس تالیفِ نو کا اندازِ بیان اور طرزِ تحریر تو ماشاء اللہ بلا کسی تصنع کے عرض ہے کہ مؤلف سلّمہٗ کو اللہ تعالیٰ نے ایسا سلیقہ بخشا ہے کہ کم ازکم میں تو اپنے کو اس سے قاصر پاتا ہوں اور تقریظ کا منصب کسی کامل کو ہوا کرتا ہے نہ کہ قاصر کو۔

ہاں البتہ اس سلسلہ میں ایک بات یہ سمجھ میں آئی اور دراصل وہی سبب بنی ان چند سطور کے لکھنے کا، کہ تقریظ کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہوا کرتا ہے کہ مؤلف پر لوگ وثوق واعتماد کریں اور اس کی وجہ سے مؤلف بھی ان کی نظروں میں وقیع اور محبوب ہوجائے، تو جہاں تک اس سیرت کی مقبولیت کا تعلق ہے انشاء اللہ خود صاحب سیرت کی ذات والا صفات ہی اس کی ضامن ہے، باقی رہا یہ سوال کہ اس کا لکھنے والا کون

ہے؟ تو اس کی ضرورت سے **انظر إلیٰ ماقال ولاتنظر إلیٰ من قال** کا مقولہ اباء کرتا ہے، کوئی کہنے والا ہو، اس سے کیا غرض، تم تو یہ دیکھو کہ وہ کیا بیان کر رہا ہے۔ ؎

مرد باید کہ گیرد اندر گوش　　　　ورنبشت است پند بر دیوار

لیکن اب اس کو کیا کہئے کہ اس زمانہ میں رسم کچھ اسی طرح کی جاری ہوگئی ہے کہ لوگ پہلے "**من قال**" ہی کو دیکھتے اور اس کے بعد "**ماقال**" کی جانب توجہ کی جاتی ہے اور اس کی قدر ہوتی ہے۔ اور آج کے اس موجودہ دور میں جبکہ علم وفہم کی کمی اور علو وغلو کی بہتات مشاہد ہے، اسلئے شاید یہی طریق اسلم بھی ہو کہ پہلے "**من قال**" کو دیکھ لیا جائے۔

اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ مؤلف سلّمہٗ اللہ تعالیٰ کا قدرے تعارف کرا دیا جائے، باقی رہی تالیف اور مؤلف عنہ تو وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ع

بآب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبارا

ہمارے مخلص ومحترم مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی سلّمہٗ اللہ، دارالعلوم دیو بند کے پڑھے ہوئے ایک ذہین وفطین، ذی استعداد، نیک وصالح عالم دین ہیں، مدرسہ دینیہ غازی پور میں منصب تدریس پر فائز ہیں، وہیں بعض رسائل "معرفت حق" کے مطالعہ سے گذرے، اور وہی راقم سے تعارف کا ذریعہ بن گئے، چنانچہ ایک دفعہ مجھے لکھا کہ:

"ابھی چند روز ہوئے دسمبر ۱۹۷۳ء کا شمارہ ایک صاحب سے دیکھنے کو ملا، اس سے پہلے بھی بعض شمارے دیکھے تھے، مگر "**کل أمر مرھون بأوقاتہ**" کے تحت اس وقت کوئی خاص اہمیت نہ دی، اب جس وقت ہاتھ آیا اور اس کے مضامین پڑھے تو چونک اٹھا۔ بلاشبہ ایک عجیب چیز ہے، حضرت مصلح الامۃؒ

کے نفس گرم کی تاثیرسنی تو ضرور تھی، احساس اب ہوا، بے اختیار دل کھنچتا چلا گیا۔ لفظ لفظ پڑھا، عجیب وغریب کیف محسوس ہوا، اب تو صبر نہ ہوا، مدرسہ میں ڈھونڈھا تو تین رسالے اور مل گئے انھیں پڑھا، مزید شوق ہوا، مخدومی جناب مولانا بشیر الدین صاحب کے یہاں سے حاصل کر کے پڑھا اور اب نوبت یہانتک پہونچی کہ مستقل خریداری کے بغیر قرار نہیں، حقیقت یہ ہے کہ حضرت کے ملفوظات بیمار انسانیت کے لئے آبِ حیات ہیں، میں ان کو بار بار پڑھتا ہوں اور ہر مرتبہ ایک نیا لطف حاصل ہوتا ہے، بہت جلد حضرتؒ کی تصنیفات بھی خریدوں گا۔“

اس کے بعد دوسرا خط آیا:

”حکیم صاحب موصوف کے یہاں سے جس قدر رسائل مل سکے ان کا ایک ایک لفظ پڑھ چکا ہوں، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ وہ آبِ زُلال ہے کہ جس کے پینے کے بعد جہاں روحانی سیرابی حاصل ہوتی ہے وہیں شوق وانتظار کی تشنگی بدرجہا بڑھ جاتی ہے، اور اب تو یہ شوق دل میں سما رہا ہے کہ چل کر اس جلوہ گاہ کی زیارت کرنی چاہئے جس کی ضیا پاشیوں سے صدہا تاریک قلوب نے روشنی پائی۔ بہرکیف حضرت گو نہیں ہیں مگر آپ کے کلمات طیبات تو ہیں، میں سوچ رہا ہوں کہ اب شاید انتظار کی مدت بہت کم ہوگی، واللہ علیٰ کل شئ قدیر. والسلام

غرض مطالعۂ رسائل سے حضرت اقدس مصلح الامۃؒ سے تعلق ومحبت عشق کے درجہ میں ہوگیا، اور کہنا چاہئے کہ اسی وقت سے حضرتؒ کے نادیدہ عاشق ہی ہوگئے، اس کے بعد جب حضرت کے مضامین کی پیاس بڑھی تو اس راقم کے پاس اپنا یہ سارا ماجرا لکھ کر جملہ کتب ورسائل کے طالب ہوئے، چنانچہ میں نے جو جو مل سکیں فراہم کر کے بھیج دیں۔ مولانا نے ان سب کا عمیق مطالعہ عقیدت کی نگاہوں سے فرمایا اور

اس سلسلہ میں مجھے ایک دفعہ لکھا کہ:

''آپ نے حضرت مصلح الامۃ نور اللہ مرقدہٗ کی تمام کتابیں اور معرفت حق کی قدیم جلدیں ارسال فرما کر مجھ پر احسانِ عظیم فرمایا، جزاکم اللہ ۔ کیا عرض کروں حضرت اقدس کے لطیف مضامین اور اپنے شوقِ مطالعہ کا یہ عالم کہ کئی کئی شب اس طرح گذر گئیں کہ عشاء کے بعد ان کتب ورسائل کا مطالعہ شروع کیا اور فجر کی اذان ہوگئی، رات کے گذر جانے کا احساس تک نہ ہوا، سبحان اللہ حضرتؒ کے مضامین کا کیا کہنا، نہایت محققانہ اور عارفانہ کلام ہے۔''

اس کے بعد خدا کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ خود مولانا ہی کا تعلق حضرت قاری صاحب مدظلہٗ سے ہوگیا، اور پھر مولانا مدرسہ وصیۃ العلوم میں مدرس ہوکر تشریف لے آئے اور تقریباً ۴؍سال قیام فرمایا۔ اس اثناء میں مولانا موصوف کے ذوق وشوق، فہم واستعداد اور حضرت والا کے ساتھ ان کے اُنس ومحبت کو دیکھ کر مخدوم ومحترم جناب قاری محمد مبین صاحب مدظلہٗ نے (بلکہ ہم سب ہی حاضرین خانقاہ نے) ان سے یہ خواہش ظاہر کی کہ حضرتؒ کی سیرت اور حالات جو رسالہ معرفت حق اور وصیۃ العرفان میں پھیلے ہوئے ہیں اس میں سے انتخاب کر کے ایک مختصر مگر جامع سیرت مرتب ہوجاتی تو شاید لوگوں کو اس سے زیادہ نفع پہونچتا۔ مولانا نے اس کو منظور بھی فرمالیا۔ پھر ایک موقع پر الہ آباد ہی تشریف لا کر آپ نے اس کی ابتداء فرمائی اور غازی پور جا کر اس کی تکمیل فرمائی۔ حضرت قاری صاحب مدظلہٗ نے بھی جستہ جستہ مقامات سے اسے سنا، اور اس راقم نے تو از اوّل تا آخر اس کی سماعت کی، جناب قاری صاحب مدظلہٗ نے بھی پسند فرمایا اور بندہ تو بہت ہی محظوظ ہوا، اور جابجا تو مولانا نے واقعات کی عکاسی کچھ اس طرح کی کہ اصل حال کا منظر سامنے آ کر اس نے بہت ہی متاثر کیا، اور

کہیں کہیں لکھتے لکھتے جب خود حضرت اقدسؒ کے الفاظ ذکر کئے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خاتم میں نگینہ جڑ دیا ہو، اور بہت سی جگہوں پر تو واقعات کے ذکر کرنے سے پہلے یا بعد میں تمہیداً یا تفریعاً کچھ اس طرح سے اس کی وضاحت کردی ہے جس نے اصل مضمون میں چار چاند لگا دیئے ہیں، بالخصوص حضرت قاری محمد مبین صاحب مدظلہٗ کا خط جو انھوں نے مکہ مکرمہ سے حضرتؒ کے وصال کے بعد لکھا تھا اس کے اقتباسات جو حصہ اول کے اختتام پر نقل فرمائے ہیں، اس نے تو حسن خاتمہ ہی کی یاد تازہ کردی۔ سبحان اللہ! خط کے حرف حرف سے حضرت اقدسؒ کے ساتھ ان کی وابستگی، عقیدت، محبت وعظمت نمایاں ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اپنا دل ہی نکال کر رکھ دیا ہو، نیز ایسے عظیم اور ہوش رُبا سانحہ پڑنے کے وقت پر بھی اس طرح سے خود کو سنبھالے ہوئے رہنا اور دوسروں کو بھی سنبھالے ہوئے رکھنے نے تو سنت صدیقی کی یاد تازہ کردی، اور اس بات کی تصدیق کردی کہ بے شک ایسا ہی شخص حضرت مصلح الامۃؒ کے بعد ان کا نائب اور جانشین بننے کے قابل ہے۔

غرض کہ ماشاء اللہ مولانا نے اپنے اس انتخاب میں اختصار کے باوجود کسی گوشہ کو تشنہ نہیں چھوڑا، اور حضرت مصلح الامۃ علیہ الرحمہ کی سوانح کو بہمہ وجوہ مکمل ذکر کرکے اپنی اس تالیف کو رشک صد تالیف بنا دیا ہے، چنانچہ مولانا موصوف کی اس سعی وکوشش پر دل سے دعاء نکلی کہ اولاً تو یہ موضوع خود ہی محبوب تھا، پھر مولانا اعجاز احمد صاحب کے قلمِ اعجاز رقم نے اس میں سونے پر سہاگہ کا کام کردیا، اللہ تعالیٰ اسے مقبول بنائے اور اس کے نفع کو عام وتام فرمائے۔ ایک منتسب خانقاہ کی تالیف کردہ اور خانقاہِ وصی اللٰہی سے اس کی اشاعت ہونے کی وجہ سے یہ کتاب اور بھی مستند اور قابل مطالعہ ہوگئی ہے۔ **فالحمد للّٰہ علیٰ ذٰلک۔**

یہ چند سطور مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی کی تعریف میں نہیں بلکہ تعارف میں اس لئے بھی وقوع میں آئیں کہ مولانا موصوف اپنی ''خانقاہی برادری'' میں ذرا کم متعارف تھے، اور یہاں معاملہ ''من قال'' والا درپیش تھا، اور خود یہ راقم گو ظاہری و باطنی ہر کمال سے عاری ہے، تاہم حضرت مصلح الامۃؒ کے متوسلین تو تقریباً سب ہی اس سے عام طور سے واقف ہیں، اور اس کی وجہ محض حضرتؒ کے ساتھ وہ نسبت غلامی ہی ہے جو اسے حاصل ہے، بقول حضرت امیر خسروؔ ؎

داغِ غلامیت کرد پایۂ خسرو بلند

میر ولایت شود بندہ کہ سلطاں خرید

اور اس نسبت پر الحمد للہ اس عاجز کو فخر بھی ہے، اور اس پر وہ حق تعالیٰ کا جس قدر بھی شکر ادا کرے کم ہے۔

آخر میں یہ عاجز ناظرین سے اپنے لئے حسن علم، حسن عمل، حسن اخلاص اور حسن خاتمہ کی دعاء کی درخواست کرتا ہے، **وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔** والسلام

راقم ناکارہ عبدالرحمٰن جامیؔ

خادم مدرسہ وصیۃ العلوم، الہ آباد

۱۵؍صفر المظفر ۱۴۰۴ھ

☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریب

۱۸؍شعبان المعظم ۱۴۰۲ھ کو مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کی خانقاہ الہ آباد میں حاضری کی توفیق ہوئی۔ اتفاق سے حضرت کے خلیفہ وجانشین حضرت مولانا قاری شاہ محمد مبین صاحب مدظلہ العالی اس وقت کوپاگنج تشریف لے گئے تھے، آپ کے انتظار میں چندروز ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ دورانِ قیام ہمارے مخدوم بزرگ مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامیؔ اور برادر محترم مولانا عرفان احمد صاحب نے تحریک کی کہ تم نے کسی وقت حضرت مصلح الامتؒ کی سوانح حیات لکھنے کا وعدہ کیا تھا، وہ کب پورا ہوگا؟ مجھے یاد آیا کہ یہ وعدہ حضرت قاری صاحب مدظلہٗ سے بھی ہوچکا تھا۔ میں ایک طرح کی سوچ میں پڑ گیا، کسی بزرگ، خدارسیدہ عالم ربّانی کے حالاتِ زندگی کو لکھنا، اس کے ظاہری وباطنی حسن وجمال اور امتیازات وخصوصیات کا نقشہ موئے قلم سے کھینچنا یوں بھی ایک مشکل اور نازک کام ہے، پھر حضرت مصلح الامت قدس سرہٗ کی جلالت شان اور آپ کی بزرگانہ عظمت ورفعت کا تصور ہوتا تو فکر ونظر اور احساس ومشاہدہ کی ہمت جواب دے جاتی تھی۔ اس قصور ہمتی کے ساتھ اس آستانۂ بلند تک رسائی ہوبھی سکے گی؟ استطاعت تو کیا عزم وحوصلہ بھی گھبراتا تھا، تاہم ان اکابر کے اس سوال کے بعد سچی بات یہ ہے کہ معذرت کا ایسا کوئی کلمہ بھی نہ کہہ سکا جو قابل قبول ہوتا، اپنی کوتاہ ہمتی، ناتجربہ کاری اور تذکرہ نویسی کے کوچہ سے ناآشنائی کو سوچے بغیر یہ ذمہ داری قبول کرلی، لیکن جب کام شروع کردیا اور اس کی دشواریاں قدم قدم پر قلم کا راستہ روکنے لگیں تو بار بار یہی سوچتا رہا کہ اے کاش یہ ذمہ داری قبول

نہ کی ہوتی! لیکن جس نوع پر إنہ کان ظلوماً جھولاً کا فتویٰ خالق کائنات علیم وخبیر کی جانب سے صادر ہو چکا ہے اگر اسی نوع کے ایک فرد نے ظلومیت وجھولیت کا ایک اور تصدیقی سامان فراہم کردیا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

بہرکیف ۲۴؍شعبان سے کتاب کی تالیف کا آغاز کردیا گیا، ارادہ تھا کہ ڈھائی تین سو صفحات میں کتاب کی تکمیل ہوجائے گی، مگر ۲۴؍رمضان کو جب الہ آباد سے اپنے وطن اعظم گڈھ آنے کے لئے قلم کا یہ سفر عارضی طور پر روکنا پڑا تو تقریباً ساڑھے تین سو صفحات ہو چکے تھے، اور منزل باوجود قریب ہونے کے کسی قدر دور نظر آرہی تھی، باقی حصہ مدرسہ دینیہ غازی پور میں رہ کر مکمل کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے قبول فرمائیں۔

تذکرہ نگار نے گوکہ حضرت مصلح الامت کا زمانہ پایا ہے، لیکن وہ طالب علمی کی بے شعوری کا دور تھا، حضرت مولانا اس وقت الہ آباد میں تشریف فرما تھے، دید وزیارت کے شرف سے بھی محروم رہا، اس بنا پر حالات سے ذاتی واقفیت کا کوئی سوال ہی نہیں، میرے لئے حالات کے سلسلے میں سب سے معتبر اور مستند ذخیرہ ''حالات مصلح الامت'' کا وہ سلسلہ ہے، جسے مولانا عبد الرحمٰن صاحب جامی ایک عرصہ سے اپنے مخصوص انداز میں تحریر فرما رہے ہیں۔ حالات کا یہ سلسلہ پہلے معرفت حق میں بالاقساط شائع ہوتا رہا، اور اب اسی کے نقشِ ثانی ماہنامہ وصیۃ العرفان میں طبع ہو رہا ہے۔ بنیادی طور اس کتاب کا ماخذ مولانا موصوف کا یہی تذکرہ ہے، چنانچہ جابجا اس کے حوالجات کتاب میں ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے، کہیں کہیں بغیر حوالے کے بھی معلومات اخذ کی گئی ہیں۔ مولانا کو حضرت مصلح الامتؒ کی طویل رفاقت ومعیت اور اعتماد خصوصی حاصل رہا ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۷ء تک حضرت کی حیات کے آخری لمحہ تک آپ مولانا کے ہمراہ ہی رہے۔ حضرت کے احوال وکوائف اور ذوق ومزاج کے جاننے اور سمجھنے میں مولانا موصوف استناد کا درجہ رکھتے ہیں۔

تاہم مولانا نے ابھی تک گورکھپور کے قیام تک کے حالات تحریر فرمائے تھے، اس کے بعد کے حالات کے لئے مؤلف کو خود کاوش کرنی پڑی، اس سلسلے میں بھی مدد تمام تر مولانا جامی صاحب ہی سے ملی۔ حضرت کے زمانے کے تمام کاغذات مولانا کے پاس محفوظ ہیں، ان سے بہت سا ذخیرہ دستیاب ہوا، اور حالات سمجھنے میں مدد ملی۔ مولانا جامی صاحب حضرت کے پورے حلقے کے شکریئے کے مستحق ہیں۔

کتاب کا ایک معتد بہ حصہ حضرت مولانا قاری شاہ محمد مبین صاحب مدظلہ العالی جانشین حضرت مصلح الامتؒ کو سنا دیا تھا، حضرت نے اسے بنظر استحسان دیکھا، حضرت کا یہ استحسان میرے لئے سند قبول ہے، اللہ تعالیٰ اپنی قبولیت سے نوازے۔

کتاب کی تالیف کے سلسلے میں برادر محترم جناب مولانا عرفان احمد صاحب اور ان کے والد محترم جناب انیس احمد صاحب، نیز مولانا نورالہدیٰ صاحب اور انیس بھائی پور خاص، الہ آباد والے کا خاص طور سے ممنون کرم ہوں، ان حضرات کی حوصلہ افزائی، مؤلف کے آرام و راحت کی فکر اور اہتمام نیز دلجوئی و دلداری نے رہوارِ عزم و حوصلہ کو کہیں تھکنے نہیں دیا، ورنہ شدید گرمی کے رمضان میں شاید ہمت پست ہو جاتی اور کام کا سلسلہ رک جاتا۔

اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو خصوصی اجر عنایت فرمائے۔

کتاب ناظرین کے ہاتھوں میں پہونچ چکی ہے، نوآموز سوانح نگار کے قلم نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہوگی، اس کا احساس اسے کہاں ہوگا، اہل نظر ناقدانہ نہیں مشفقانہ طور پر تنبیہ فرمائیں۔ اگر اللہ نے توفیق دی تو طبع ثانی میں اصلاح کر دی جائے گی۔

اعجاز احمد اعظمی

مدرسہ دینیہ، غازی پور

۲۰/ذی الحجہ ۱۴۰۲ھ

☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچۂ طبع دوم

ماضی قریب کے عظیم صاحب نسبت بزرگ، سراپا احسان واخلاص، صاحب ورع وتقویٰ، حق تعالیٰ کے اخص الخواص بندے، جن کے فیض کو اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کی مصلحت کیلئے عام فرمایا تھا، یعنی مصلح الامت، عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری ثم الہ آبادی قدس سرہٗ کی حیاۃ طیبہ کے حالات اس خاکسار، گناہگار نے حضرت اقدس کے جانشین اور اخلاف صالحین کے حکم سے اپنی استعداد کے بقدر ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۹۸۴ء میں مرتب کئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس تحریر کو صاحب سوانح کی برکت سے بڑی قبولیت عطا فرمائی، حضرت کے حلقۂ متوسلین و متعلقین سے بڑی دعائیں ملیں، کتنے لوگوں نے اس کا حرف حرف بار بار پڑھا، بعض علماء واکابر نے اپنی مجالس میں اسے پڑھوایا۔ وہ جو اربابِ معنیٰ ہیں، انھوں نے حضرت اقدس کی روحانیت کی حلاوت پائی، اور وہ جو اصحاب ظاہر ہیں، انھوں نے الفاظ وعبارت کو بنظر استحسان دیکھا، یہ سب برکت ہے اس فنافی الرسول ہستی کی، جس نے اپنے شب وروز، اپنے اعمال واخلاق بلکہ اپنی حیات وممات کو ذات وحدہ لاشریک لہ کے لئے مٹا رکھا تھا۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

عرصہ سے اس کا ایڈیشن ختم تھا، حضرت اقدس سے محبت رکھنے والوں اور نسبت مع اللہ کی قدر کرنے والوں کی طرف سے اس کے تقاضے ہوتے رہے، مرتب کے پاس جو چند نسخے تھے، وہ سب تقسیم ہوگئے، اور وہ خود تہی دست ہو کر رہ گیا۔

حضرت کی خانقاہ سے مرتب نے اس کے دوبارہ شائع کرنے کی اجازت چاہی، ان حضرات نے اپنی کریم النفسی سے بخوشی اجازت عطا فرمادی۔ ارادہ ہوا کہ پرانی تحریر ہے، اس پر نظر ثانی کرلی جائے۔ ’’حیات مصلح الامت‘‘ کی طباعت واشاعت کے بعد حضرت اقدس کے حالات اور علوم ومعارف کے سب سے بڑے اور معتبر امین حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامؔی صاحب کے مرتب کردہ تفصیلی حالات وسوانح بنام ’’حالات مصلح الامت‘‘ تین ضخیم ضخیم جلدوں میں شائع

ہو چکے ہیں، پھر خود حضرت جامی صاحب کے سوانح حیات اس خاکسار کے قلم سے بعنوان ''ذکر جامی'' طبع ہو چکے ہیں، خیال ہوا کہ ان دونوں کی مدد سے مزید کچھ اضافہ کی گنجائش نکال لی جائے ،مگر میری مسلسل علالت اور ناکارگی کی وجہ سے یہ خیال، خیال ہی رہ گیا، جو کچھ لکھا جا چکا تھا، اس پر حضرت کے خاص اہل تعلق کے بارے میں چند مضامین جو میں نے لکھے تھے، ان کا اضافہ کیا گیا ہے۔ایک مضمون حضرت اقدس کی بڑی صاحبزادی مکرمہ ومحترمہ علیہا الرحمہ کی وفات پر لکھا تھا، وہ شامل کیا گیا ہے، اس کے علاوہ حضرت کے اخص الخواص حضرات میں دو بزرگ حضرت مولانا محمد فاروق صاحب اتراؤں علیہ الرحمہ، اور دوسرے حضرت مولانا قاری حبیب احمد صاحب الہ آبادی نور اللہ مرقدہٗ کی وفات کے موقع پر دو مضمون لکھے تھے، ان دونوں کو ان کے شیخ کے حالات کے ضمن میں ملحق کر دیا گیا ہے۔

یہ ساری کاوش ومحنت میری کج مج تحریروں کے قدردان اور اس کی حفاظت کرنے والے، بلکہ بہت کچھ مجھ سے لکھنے والے، میرے بہت ہی عزیز اور محبّ ومحبوب عزیزم مولانا حافظ ضیاء الحق خیر آبادی عرف حاجی بابو...... اللہ تعالیٰ انھیں ترقیات وتوفیقات حسن سے نوازیں...... نے کی ہیں، اگر ان کا حوصلہ نہ ہوتا، ان کی محبت نہ ہوتی، تو شاید میری تحریروں کا کوئی حرف نہ شائع ہوتا، بلکہ شاید کوئی چیز موجودہ حالات میں لکھی ہی نہ جاسکتی۔

اس کی کتابت اور ترتیب وتیاری کے بعد اس کی اشاعت کا مرحلہ تھا، اللہ تعالیٰ غیب سے سامان پیدا کرتے ہیں، میرے ایک اور عزیز جو ممبئی میرے میزبان اور بہت ہی مہربان ہیں، عزیزم مولانا لیاقت علی قاسمی سلّمہٗ، امام وخطیب مسجد بی۔آئی۔ٹی بلاک، بھنڈی بازار ممبئی نے از خود پیشکش کی، بلکہ اس کی طباعت کی فرمائش کی، ان کے تعاون سے فرید بکڈپو دہلی کے مالک اور ذمہ دار الحاج ناصر خاں کے انتظام میں یہ کتاب شائع ہو رہی ہے، اللہ تعالیٰ سب کو اس کا اجر عطا فرمائیں، اور اس کتاب کو امت کے لئے مفید بنائیں۔آمین

اعجاز احمد اعظمی

مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور، اعظم گڈھ

۲۹ / رجب ۱۴۲۸ھ

باب ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماحول وخاندان

اعظم گڈھ، مشرقی اتر پردیش کا ایک زرخیز ومردم خیز ضلع ہے، عہدِ انگریزی سے قبل یہ مستقل ضلع نہ تھا، بلکہ شیرازِ ہند جونپور کا ایک حصہ تھا، یہی وجہ ہے کہ علماء ومشائخ کی ایک خاصی تعداد باوجودیکہ ان کا مولد ومنشاء موجودہ ضلع اعظم گڈھ ہے لیکن ان کی نسبت جونپور کی جانب ہوتی ہے۔ شیخ عبدالقدوس شطاری، نظام آباد کے باشندے تھے، میر سیّد علی عاشقان سرائے میر کے، اور ملا محمود صاحب شمس بازغہ ولید پور(۱) کے رہنے والے تھے، یہ علاقے موجودہ ضلع اعظم گڈھ میں شامل ہیں، مگر تاریخ کے صفحات نے انھیں جونپور کی نسبت سے یاد رکھا ہے۔

جونپور کا یہ پورا خطہ عرصۂ قدیم سے علم وفضل کا گہوارہ چلا آرہا ہے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق نے اسے آباد کیا تھا، اسی دور میں علم وحکمت کے قافلے اس سرزمین پر اترنے لگے تھے۔ درس وتدریس کی بساط بچھنی شروع ہوگئی تھی اور ایمان وعمل کی پُرکیف ہوائیں چلنے لگی تھیں، شاہانِ شرقیہ کے دور میں علم ودانش کی یہ بہار سدا بہار بن چکی تھی۔ ان کے بعد بھی ہر چند کہ مختلف حکومتیں برسرِعروج آتی اور دستبردِ زمانہ سے مٹتی رہیں، مگر اربابِ فضل وکمال کی جو انجمن جم چکی تھی جمی رہی۔

اسی اعظم گڈھ کے مشرقی خطہ میں نرجا(۲) نامی ایک وسیع وعریض جھیل ......جس کو وہاں کے عرف میں تال کہتے ہیں...... کے ساحل پر ایک گاؤں فتح پور نامی واقع ہے، تال کی مناسبت سے یہ گاؤں فتح پور تال نرجا کے نام سے معروف ہے،

ہمارے حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا مولد ومنشاء یہی فتح پور ہے۔

حضرت کے اَجداد میں ایک صاحب فتح خاں تھے، یہ بستی انھیں کی آباد کی ہوئی ہے اور انھیں کے نام سے مشہور ہے۔ فتح پور کے آس پاس میلوں تک مسلمانوں کی آبادیاں پھیلی ہوئی ہیں، ان میں کچھ زمیندار، کچھ کاشتکار اور کچھ پیشہ ور دستکار مسلمان آباد ہیں۔ گھوسی، کوپا گنج، پورہ معروف، ندوہ سرائے، کوئریاپار، حمید پور، کاری ساتھ، اس علاقے کی معروف مسلم آبادیاں ہیں۔

حضرت کا تعلق ایک نومسلم راجپوت خاندان سے ہے، جس نے حلقۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد اپنی فطری شجاعت وبسالت کی مناسبت سے اپنے لئے ''خان'' کا لقب تجویز کیا تھا، یہ خاندان اس علاقہ کی اکثر آبادیوں میں پھیلا ہوا ہے۔

راجپوتوں کا یہ خانوادہ قدیم راجپوتانہ کا باشندہ تھا، راجپوتانہ میں جس وقت اسلامی فوجیں اپنے قدم جمارہی تھیں، اسی زمانہ میں یہ خاندان وہاں سے فرار ہو کر اس علاقہ میں پناہ گزین ہوا۔ کون جانتا تھا کہ جس دین ومذہب سے بھاگ کر وہ صعوبتیں جھیلتے ہوئے دیارِ پورب میں آرہے ہیں، یہاں اسی مذہب میں ان کی گرفتاری کا سامان ہورہا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس خاندان نے اعظم گڈھ کی یہ سرزمین پسند کی اور یہیں آباد ہوگیا۔ چند پشتوں کے بعد اسی خانوادہ کا ایک خوش قسمت فرزند کنور سنگھ طالع آزمائی کے لئے کھڑا ہوا، راج بھیروں سے مقابلہ تھا، مدد حاصل کرنے کیلئے کنور سنگھ ۸۲۴ھ میں ابراہیم شاہ شرقی فرمانروائے جونپور کے دربار میں پہونچا، وہاں جو اس نے اسلام کا صاف ستھرا رنگ دیکھا، علم وعلماء کی بارونق مجلسیں پائیں، مشائخ وصوفیاء کے ایمان

افروز حلقوں میں پہونچا، دینداری، سچائی اور اخلاص و دیانت کی ہر طرف گرم بازاری محسوس کی تو اس کے دل میں بھی ایمان کا چراغ کا جل اٹھا، یہی وہ خوش نصیب ہے جس نے اپنے خاندان میں سب سے پہلے اسلام کی برکات حاصل کرنے میں پیش قدمی کی۔ دربارِ شرقی میں اس کا نام ملک دیندار تجویز ہوا۔ ازلی سعادت نے قسمت میں یہ دولت بیدار لکھ دی تھی، ظاہری دشمن کے مقابلے میں کمک حاصل کرنے جونپور پہونچے تھے اور لوٹے تو ظاہر و باطن ہر دو دشمنوں پر فتح یاب و ظفر مند تھے۔ کنور سنگھ کے تین بھائی اور تھے جو اپنے مذہب پر قائم رہے، (۳) انھیں ملک دیندار کی پندرہویں پشت کا ظہور ہمارے حضرت مولانا کے وجود مسعود کی صورت میں ہوا

تاریخ نے ملک دیندار کے مسلمان ہونے کی گواہی دیکر خاموشی اختیار کرلی، صرف مسلمان ہوکر لوٹ گئے، یا اپنے خاندان میں دینی علوم کا بھی کچھ نظم وانتظام کیا؟ باقی اہل خاندان نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ دل یہ کہتا ہے کہ شاہانِ شرقی کا وہ عہد زرّیں تھا، ہر طرف علم و علماء کی محفلیں سجی اور جمی تھیں، گلشن علم و فضل اپنی بہار پر تھا، گاؤں گاؤں میں علم کے چراغ روشن تھے، اغلب یہ ہے کہ ملک دیندار نے اس نورانی فضا سے متاثر ہوکر اپنے اہل و عیال کے لئے بھی تحصیل علم کا کوئی نظم کیا ہوگا، تاہم ماضی قریب کی تاریخ میں عرصہ تک علم وآگہی کا کچھ سراغ نہیں ملتا۔

بقول حضرت مصلح الامت کے ''اس اطراف میں سب سے پہلے جو صاحب پڑھ کر آئے وہ مولوی خادم صاحب گھوسی کے تھے، اس زمانہ میں مولوی مختار صاحب اور حافظ ولی محمد صاحب حمید پوری بھی موجود تھے۔ (۴)

اس کے بعد مولوی محمد حنیف صاحب کانپور سے پڑھ کر آئے، یہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے شاگرد تھے، انھوں نے تجارت کا مشغلہ رکھا۔ (۵)

اسی دور میں مولوی علیم اللہ صاحب درویشی کا شہرہ لے کر آئے، مشہور ہوا کہ حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن صاحب کے مرید ہیں، آواز اچھی تھی، جلسوں اور میلادوں میں دھوم رہتی تھی۔

ان حضرات میں سب سے اہم شخصیت مولانا محمد عثمان صاحب کی تھی، مولانا محمد عثمان صاحب فتح پور میں ۱۲۹۹ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کر کے جونپور چلے گئے، وہاں حفظ قرآن کی دولت سے سرفراز ہوئے، پھر تعلیمی سلسلہ منقطع کر کے پیشہ سپہ گری اختیار کیا، لیکن ایک بزرگ کا اشارہ پا کر دوبارہ علم کی جانب متوجہ ہوئے، متوسطات تک کانپور میں تعلیم حاصل کی اور وہاں سے دیوبند چلے گئے، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی سے بخاری وترمذی پڑھ کر ۱۳۲۹ھ میں فراغت حاصل کی، فراغت کے بعد کانپور مدرسہ ضیاء العلوم میں مدرس ہو کر آئے، لیکن کچھ ہی دنوں میں وہاں سے علیٰحدگی اختیار کر کے ریاست گوالیار چلے گئے، لیکن وہاں بھی زیادہ عرصہ تک نہ ٹھہرے، دوبارہ کانپور تشریف لا کر ایک مدرسہ اشرف العلوم کے نام سے قائم کیا، یہ مدرسہ بہت بابرکت ثابت ہوا، سیکڑوں علماء وفضلاء یہاں تیار ہوئے، آج بھی مدرسہ کسی نہ کسی صورت میں باقی ہے۔ مولانا کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ انھوں نے تدریس پر کبھی معاوضہ قبول نہیں کیا، خالصاً لوجہ اللہ طلبہ کو درس دیتے رہے۔

مولانا محمد عثمان صاحب اعظم گڈھ کے زمرۂ علماء میں اس حیثیت سے امتیازی شان رکھتے ہیں کہ یہ بھی حضرت شیخ الہند کی تحریک ریشمی رومال کے ایک اہم رُکن تھے، اور دو مرتبہ حضرت شیخ الہند کا پیغام لے کر افغانستان تشریف لے گئے، مولانا محمد عثمان صاحب نے ۱۳۵۴ھ میں وفات پائی۔ (٦)

محض یہ چند حضرات تھے، جنھوں نے باقاعدہ دینی علوم حاصل کئے اور

اشاعت دین کا کام ان سے ہوا، ورنہ عموماً اس دیار میں ناخواندگی عام تھی، تعلیم کی جانب توجہ نہ تھی، بچے جب ذرا ہاتھ پاؤں سے مضبوط ہوتے تو کاشتکاری اور زمینداری کے مشاغل میں کھینچ لئے جاتے، جہالت اور بے علمی کا اثر یہ تھا کہ بدعات ورسومات کا غلبہ، فتنہ وفساد کا شیوع، معمولی باتوں پر حرب وضرب، قلوب میں سختی اور اس طرح کی دوسری خرابیاں عام تھیں۔

علماء ومشائخ کی آمد ورفت بھی کم تھی، کم علمی کی وجہ سے لوگوں میں احساس بھی نہ تھا۔ کبھی کبھی حضرت مولانا سیّد محمد امین صاحب نصیرآبادی (۷) تشریف لایا کرتے تھے، مولانا جب تشریف لاتے تو عرصہ تک اس اطراف میں ان کا قیام رہتا، مواضعات میں یکے بعد دیگرے سفر فرماتے۔ حق تعالیٰ نے مولانا کو شاہانہ دبدبۂ حق دیا تھا، ان کے سامنے بڑے بڑوں کا زہرہ آب ہوجاتا، سامنے سے اگر کوئی ٹخنوں سے نیچے پاجامہ لنگی کرکے گزر جاتا تو بلا کر زائد کپڑا قینچی سے کٹوا دیتے۔ کوئی مسلمان بڑی مونچھیں رکھے ہوئے ہوتا تو اسے بھی ترشوا دیتے، مجال نہ تھی کہ کوئی دم مارتا۔ بدعات ورسوم کے سخت مخالف تھے، ان سے بہت اصلاح ہوتی تھی، لیکن چونکہ کبھی کبھی تشریف لاتے تھے، اس لئے اصلاحی اثرات دیرپا نہ ہوتے تھے۔ (۸)

حضرت مصلح الامت ایک اور بزرگ کے بارے میں فرماتے تھے ان سے بھی ہمارے اطراف کے لوگوں کا تعلق تھا، اور وہ اسی علاقہ کے رہنے والے تھے، یہ بزرگ غالباً حضرت مولانا شاہ علی احمد صاحب بھیروی تھے (۹)

ان حضرات نے اس علاقہ میں اصلاح کی بڑی کوششیں کیں، اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کوششیں ناکام رہیں، آخر علم کا شہرہ ہوا، لوگوں میں بیداری پیدا ہوئی۔ ذکر الٰہی کی گرمی نے قلوب کو زندگی کی حرارت بخشی اور آہستہ آہستہ دین کی رَو پھیلتی

چلی گئی، پھر اس کا نقطۂ عروج فتح پور کی اس عظیم الشان خانقاہ کی صورت میں دنیا نے دیکھا، جس نے ایک عالم کو ایمان کا نور، یقین کی ٹھنڈک اور جذبۂ عمل کی حرارت بخشی۔

اور غالباً اسی بیداری کا اثر تھا کہ گاؤں کے کچھ نوعمر علماء نے بااثر لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک اصلاحی انجمن کی بھی بنا ڈالی تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں میں نماز، روزہ کی ترغیب کا کام انجام دیا جائے، عورتوں کو پردہ کی تاکید کی جائے، شادی بیاہ کے ناجائز رسوم کی اصلاح کی جائے، یہ انجمن علاقے میں بہت مقبول ہوئی، جگہ جگہ اس کے جلسے ہوئے، غلط رسوم کے قلع قمع کے لئے مختلف منصوبے بنے، ان پر عمل بھی کیا گیا، لیکن بعد میں خاص اسباب کی وجہ سے انجمن ٹوٹ گئی۔

ابتداء میں چونکہ جہالت عام تھی، اور یہی خرابی سب سے بڑھ کر تھی، اس لئے لوگ دیوبندیت اور بریلویت کے اختلاف سے ناواقف تھے۔ گاؤں میں جمعہ ہوتا تھا اور سب لوگ اس میں شریک ہوتے تھے۔ مولوی محمد حنیف صاحب اور مولانا محمد عثمان صاحب جب پڑھ پڑھا کر آئے تو فتنہ کے خوف سے وہ لوگ بھی شریک ہوتے رہے، بعد میں مولانا محمد عثمان صاحب کے ایک شاگرد نے گاؤں میں جمعہ کے عدم جواز کے فتویٰ کو مشتہر کیا، چونکہ اس باب میں حکمت عملی سے کام نہیں لیا، اس لئے کچھ شورش ہوئی۔ مولانا محمد عثمان صاحب سے لوگوں نے دریافت کیا، مولانا نے حنفی مسلک کے مطابق مسئلہ بتادیا اور پھر خود بھی جمعہ پڑھنا چھوڑ دیا۔ یہ بات لوگوں کے نفس کے خلاف پڑی، اپنی تائید کے لئے لوگ گھوسی مولوی امجد علی کے پاس جا پہونچے، مولوی امجد علی صاحب نے جمعہ کے مسئلہ میں عام لوگوں کی موافقت میں جواز کا فتویٰ دیا، لیکن ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا کہ جمعہ کا مسئلہ نہ اٹھاؤ، یہ لوگ وہابی ہیں، ان کے بزرگوں کو لو اور انھیں برا بھلا کہو، وہاں سے یہ نیا سبق جو سیکھ کر آئے، اسی وقت

سے گاؤں میں بریلویت کا زہریلا بیج پڑ گیا، اور اس کے بعد جتنے فتنے ہوئے، یہاں تک کہ حضرت مصلح الامت کو وطن سے ہجرت کرنی پڑی وہ سب اسی زہریلے درخت کے برگ وبار تھے۔

انھیں حالات میں حضرت مصلح الامت نے شعور کی آنکھیں کھولیں، اور اصلاحی کام کا آغاز فرمایا۔ اس پس منظر میں حضرت کے حالاتِ زندگی اور طریق کار کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

☆☆☆☆☆☆☆

(۱) اب تو اعظم گڈھ بھی تقسیم ہو گیا، اور زمین کا ایک خطہ ضلع مئو کے نام سے موسوم ہو چکا ہے۔ ولید پور ضلع مئو میں شامل ہے۔ (۲) اب ضلع مئو میں شامل ہے۔

(۳) یہ معلومات ''تذکرۂ علماء اعظم گڈھ'' سے اخذ کی گئی ہیں۔

(۴) حالات مصلح الامت (۵) حالات مصلح الامت

(۶) تذکرۂ علماء اعظم گڈھ، ص:۲۹۴

(۷) حضرت مولانا سید محمد امین صاحب نصیر آبادی علیہ الرحمۃ ان علماء ربانی اور مشائخ حقانی کے سلسلۃ الذھب کی ایک زریں کڑی تھے، جن سے سنت وشریعت کا نور پھیلا، اور شرک وبدعت کی تاریکیاں کافور ہوئیں۔ ۲۲/ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ کو آپ کی ولادت ہوئی، حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلیؒ کی خدمت میں درسیات کی تکمیل کی، حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوریؒ سے بھی علم حدیث کی سند حاصل کی، سلوک وطریقت کی منزلیں رائے بریلی میں حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ کے نانا حضرت مولانا سید ضیاء النبی صاحبؒ کی خدمت وصحبت میں طے کیں۔

جمعہ کے دن مولانا کا وعظ ہوا کرتا تھا، وعظ میں ایک خاص تاثیر ہوتی تھی، مولانا کے دل میں اتباعِ سنت وشریعت کا بہت قوی جذبہ اور داعیہ تھا، محبت الٰہی میں سرشار اور عشق نبوی میں دلفگار رہتے، اس کا اثر آپ کے وعظ وبیان سے پھوٹا پڑتا تھا۔ ان کے وعظ سے لوگوں کی زندگیاں بدل جاتی تھیں، مولانا کے تبلیغی اور عرفانی دورے پرتاپ گڈھ، سلطان پور اور اعظم گڈھ، جونپور میں ہوا کرتے تھے، جس

طرف نکل جاتے نور کی ایک جوئے رواں بہتی چلی جاتی، بدعات، رسوم جاہلی اور بت پرستی کے شعائر مٹتے چلے جاتے، سود، اکل حرام، تعزیہ اور محرم کی بدعات سے تنفر پیدا ہو جاتا۔

حضرت مولانا سید محمد امین صاحب نصیر آبادیؒ، منکرات کی نکیر میں بہت سخت تھے، مجال نہ تھی کہ کوئی شخص داڑھی منڈائے ہوئے یا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے پہنے، اور بڑی بڑی مونچھیں رکھے ان کے پاس سے گزرے، اور ان کی نکیر شدید سے بچ جائے۔ خلق خدا کو آپ کی ذات گرامی سے بہت نفع ہوا۔ ۱۳۴۹ھ میں انتقال ہوا۔ نزھۃ الخواطر ج:۸ ص:۸۶، ۸۷

(۸) حالات مصلح الامت، ص:۳۱

(۹) ضلع اعظم گڈھ میں فتح پور سے تقریباً دس میل مغرب میں ایک گاؤں بھیرہ نامی ہے، اس کی قریبی مشہور بستی ولید پور ہے، امتیاز کے لئے بھیرہ ولید پور ایک ساتھ بولتے ہیں۔ مولانا علی احمد صاحب اسی بھیرہ کے رہنے والے تھے۔ مولانا علم وفضل اور عزیمت وتقویٰ کے درخشندہ نمونہ تھے، قائم اللیل وصائم النہار بزرگ، یادِ مولیٰ میں ہر وقت منہمک، ان کی مجلس میں بجز ذکر وتسبیح اور علم وحکمت کے کسی چیز کا گزر نہ تھا۔ مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی کا بیان ہے کہ میں تقریباً تیس سال کے طویل عرصہ سے مولانا کے یہاں آمد ورفت رکھتا ہوں، لیکن آج تک کبھی بھی ایسی بات ان کی زبان سے نہیں سنی جو کسی کی مذمت یا اذیت کا سبب بنے، اور نہ کبھی ان کی مجلس کو ذکرِ الٰہی سے خالی پایا۔ ۱۳۱۷ھ میں آپ کی رِحلت ہوئی۔ (تذکرۂ علماءِ اعظم گڈھ، ص:۲۱۲)

ابھی کچھ عرصہ پہلے تک گاؤں میں وہ آنکھیں موجود تھیں جنھوں نے مولانا کی زیارت کی تھیں، مولانا کی کرامات کا چرچا اب بھی ہے۔ حضرت مصلح الامت دوبار ان کی مزار پر فاتحہ پڑھنے تشریف لے گئے ہیں۔ مؤلف کتاب کا آبائی وطن بھیرہ ہی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب ۲

نمودِ صبح

کون جانتا تھا کہ اعظم گڈھ کے ایک دیہات، فتح پور میں حافظ محمد یعقوب صاحب کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ، جو کائناتِ عالم میں زندگی کی پہلی صبح دیکھ رہا ہے، آگے چل کر وہ آسمانِ شریعت وطریقت کا آفتاب و ماہتاب بننے والا ہے۔ کاش کوئی جانتا ہوتا تو ہمارے لئے اس کی تاریخ ولادت اور سن پیدائش ضرور محفوظ رکھتا۔ لیکن قریات وقصبات میں نہ جانے کتنی عظیم شخصیتیں وجود میں آتی ہیں، مگر انجام سے بے خبری خاندان والوں کو آغاز سے بھی غافل کر دیتی ہے، یقین کے ساتھ تذکرہ نگار نہیں بتا سکتا کہ آگے چل کر جو بچہ عارف باللہ، ولی کامل، مصلح امت اور شیخ طریقت بننے والا ہے۔ اس نے کب اور کس ماہ وسن مین اس زمین پر قدم رکھا؟ قرائن بتاتے ہیں کہ وہ ۱۳۱۲ھ یا اسی کے آس پاس کا کوئی سال رہا ہوگا، بہر حال اسے ۱۳۱۰ھ سے ۱۳۱۵ھ تک کے درمیان کا کوئی خوش نصیب سال کہہ لیجئے جبکہ باغِ عالم ایک نئے شجر معرفت سے اپنی گود بھری پا رہا تھا۔

حضرت کے والد ماجد حافظ محمد یعقوب خاں ہیں، خوش قسمتی سے اس خانوادہ نے اپنا شجرۂ نسب اپنے جد امجد ملک دیندار تک محفوظ رکھا ہے، ملاحظہ فرمایئے!

(۱) مصلح الامت حضرت مولانا حافظ قاری الحاج شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ، (۲) ابن حافظ محمد یعقوب صاحب (۳) بن افضل علی خاں (۴) بن حسین علی خاں (۵) بن رحم دین خاں (۶) بن شہاب علی خاں (۷) بن فاضل خاں (۸)

بن مصاحب خاں (۹) بن پہاڑ خاں (۱۰) بن سیف خاں (۱۱) بن فیروز خاں (۱۲) بن جتن خاں (۱۳) بن ملک فتح خاں (۱۴) بن مبارک خاں (۱۵) بن ملک اودھرن خاں (۱۶) بن ملک دیندار سابق کنور سنگھ۔

حافظ محمد یعقوب صاحب کی اولاد:

حافظ محمد یعقوب صاحب کی دو بیویاں تھیں، پہلی اہلیہ سے ایک صاحبزادی آمنہ خاتون اور دو صاحبزادے عبدالحلیم خاں اور حافظ عبدالعلیم خاں تھے، عبدالحلیم خاں صاحب نے بھوپال میں سکونت اختیار کرلی تھی، بچپن میں حضرت ان کے پاس کچھ دنوں مقیم رہے ہیں۔

حافظ عبدالعلیم خاں صاحب پہلے بینا میں محکمۂ ریلوے میں ملازم تھے، بعد میں بمبئی تبادلہ ہوگیا اور کُرلا میں مستقل قیام کیا، ان کے صاحبزادے عبدالعظیم خاں کے نام پر عظیم دواخانہ قائم ہوا۔ کرلا میں فتح پور یا اطراف کے جو لوگ اس وقت موجود ہیں، ان کے بمبئی میں قیام کی داغ بیل ڈالنے والے حافظ صاحب ہی ہیں، قومی کاموں کا بہت شوق تھا، گاؤں میں بڑے حافظ صاحب کے نام سے مشہور تھے۔

دوسری اہلیہ سے بالترتیب حسب ذیل سات اولادیں تھیں۔

فصیح اللہ خاں، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب، سمیع اللہ خاں، اسلام اللہ خاں، رفیع اللہ خاں، انعام اللہ خاں اوّل، انعام اللہ خاں ثانی۔

ان بھائیوں میں اب صرف تین بھائی بقید حیات ہیں، اللہ ان کی عمر میں برکت دے۔، رفیع اللہ خاں وطن میں ہیں، اور اسلام اللہ خاں اور انعام اللہ خاں پاکستان میں۔

بچپن:

حضرت کے برادر خورد مکرم جناب رفیع اللہ صاحب کی زبانی حضرت کی ابتدائی سادہ مگر پُر کیف داستان سنئے، فرماتے ہیں:

”بھائی صاحب کے بارے میں والدہ صاحبہ فرماتی تھیں کہ جب یہ پیٹ میں تھے تو مجھے قے بہت زیادہ ہوئی، جس کی وجہ سے مجھے خیال ہوا کہ آخر یہ کیا بات ہے، مگر اس وقت تو خیر کچھ سمجھ نہ سکی، لیکن بعد میں جب ان کے اور سب طور طریقے بھی سب بچوں سے مختلف دیکھے، اور رُشد و صلاح اور اُنس و محبت کے آثار ان میں نمایاں ہوئے تو اسی وقت سے اتنا سمجھتی تھی کہ آگے چل کر ان کی کچھ شان ہونے والی ہے، بچپن ہی سے یہ سب بچوں سے الگ تھلگ رہتے تھے، اور اس عمر میں بچے عام طور سے جس قسم کے کھیل کود، تفریح و شکار وغیرہ میں مصروف رہتے ہیں، ان کو ان سب سے کوئی دلچسپی نہ تھی، اپنے ہم عمر لڑکوں سے خلط ملط نہ رکھتے، اور اپنے ساتھیوں میں سے کسی کی شکایت نہ گھر پر کسی سے اور نہ مدرسہ میں استاذ سے کی۔ (حالات مصلح الامت، ج:۱ص:۵۳)

انبیاء کی سنت کے مطابق حضرت نے ابتدائی عمر میں کچھ دنوں بکریاں بھی چرائی ہیں، آگے چل کر امت کی گلہ بانی کا کام جس سے لیا جانے والا تھا، اس سے ابتداء میں اگر بکریاں چرانے کا عمل کرایا گیا تو یہ فطرت کے عین مطابق ہے۔

ابتدائی تعلیم:

ابتداءً بکریاں چرانے کا کام جس بچہ سے لیا گیا جب وہ عمر کی اس منزل کو پہونچ گیا، جہاں سے کاروانِ زندگی کو تحصیل علم و کمال کی جانب موڑا جاسکتا ہے، تو

والدین نے آپ کو حافظ ولی محمد صاحب کے پاس بستی ہی میں قرآن حفظ کرنے کے لئے مکتب میں بیٹھادیا۔حافظ ولی محمد صاحب مئو کے پاس کسی بستی کے رہنے والے تھے، پھر کسی وجہ سے وہاں سے منتقل ہو کر حمید پور............فتح پور سے دو تین میل کے فاصلے پر ایک آبادی ہے............آ کر آباد ہو گئے، فتح پور آمد ورفت رہا کرتی تھی، ان کی نیکی اور تقویٰ دیکھ کر گاؤں والوں نے وہیں رہ کر بچوں کو تعلیم دینے کی درخواست کی، گاؤں والوں نے ان کی رہائش کیلئے ایک مکان بھی تعمیر کروادیا۔مکتب حضرت کے آبائی مکان کی بیٹھک میں قائم کیا گیا، حافظ عبدالعلیم صاحب برادر کلاں حضرت والا سب سے پہلے اس مکتب سے فارغ ہوئے۔

حافظ ولی محمد صاحب ایک صاحب نسبت اور صاحب کشف وکرامت بزرگ تھے (۱) پہلے حضرت مولانا شاہ علی احمد بھیروی سے ارادت کا تعلق رکھتے تھے، ان کے وصال کے بعد حضرت تھانویؒ سے بیعت ہو گئے تھے، جس ذاتِ گرامی کی جانشینی کا فخر حضرت کو بعد میں حاصل ہونے والا تھا، اس کی نسبت کے فیضان کا بندوبست شروع ہی میں کر دیا گیا۔

حضرت والا نہایت محنت وکاوش کے ساتھ قرآن حفظ کرنے میں مشغول ہو گئے، آپ کی فطری سعادت مندی، صلاحیت نیز آپ کے غیر معمولی احوال نے حافظ ولی محمد صاحب کی توجہ بہت جلد آپ پر مبذول کرادی، حضرت کا حافظہ آخر عمر تک بہت عمدہ رہا، اس کے آثار بچپن ہی میں ظاہر ہونے لگے تھے۔ناظرہ حضرت نے الگ سے نہیں پڑھا بلکہ حفظ ہی سے تعلیم قرآن کی ابتداء ہوئی۔چودھری عبدالوحید خاں کا بیان ہے کہ:

”ہم سب ساتھیوں میں حضرت کا حافظہ مشہور تھا، اللہ تعالیٰ نے کمال کی

یادداشت عطا فرمائی تھی ، چنانچہ آپ کے حفظ قرآن کی بھی عجیب کیفیت تھی ، سب طالب علم جانتے تھے کہ یہ سبق بہت جلد یاد کر لیتے ہیں ، بلکہ بغیر یاد کئے اور رٹے ہوئے صرف استاذ کے پاس ایک دفعہ پڑھنے ہی سے ان کو سبق یاد ہو جاتا ہے، چنانچہ مولانا جب مدرسہ کی چھٹی کے بعد گھر جانے لگتے تو کبھی کبھی ہم لوگ یہ کرتے کہ ان کا قرآن شریف چھین لیتے ،حضرت بڑی نرمی اور خوشامد کے ساتھ اپنا قرآن مانگتے ، ہم لوگ کہتے کہ جو سبق آج پڑھا ہے اس کو سنا دیجئے تب آپ کا قرآن دیں گے، اس پر فرماتے کہ اچھا ایک مرتبہ سبق دیکھ لینے دو، چنانچہ ہم لوگ کبھی تو دیدیتے اور حضرت والا ایک مرتبہ نظر ڈال کر ہم کو واپس فرما دیتے ، اور اپنا سبق سنا دیتے ، اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہم لوگ جواب میں کہتے کہ نہیں قرآن شریف نہیں ملے گا ، پہلے سبق سنا دیجئے ،تب آپ کا قرآن ملے گا، اس پر ذرا سا تامل فرما کر وہیں کھڑے کھڑے اپنا سبق فرفر سنا دیتے ، وعدہ کے مطابق ہم لوگ آپ کا قرآن واپس کر دیتے اور آپ گھر چلے جاتے ۔ (حالات مصلح الامت ، ج:ا ص:۵۸)

گھر جب آتے تو سیدھے والدہ کے پاس پہونچ کر سلام کرتے اور کہتے اماں! حافظ جی کو سبق یاد کر کے سنا دیا، پھر دادی مرحومہ کے پاس جاتے ، عام بچوں سے جداگانہ ،ضد ، اودھم ، رونا دھونا اور مچلنا ان سب سے بہت دور رہتے ، آپ کی والدہ مرحومہ فرماتی تھیں کہ یہ مادرزاد ولی ہیں، ان سے مجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہونچی۔

ابتدائی عربی تعلیم:

دس بارہ سال کی عمر میں آپ نے حفظ کی تکمیل کر لی تھی ، غالباً کچھ اردو نوشت وخواند بھی سیکھ لی تھی ، گاؤں میں چونکہ اس سے زیادہ تعلیم کا نظم نہ تھا اس لئے

حضرت کے بڑے بھائی حافظ عبد الحلیم صاحب اپنے ساتھ بینا لے گئے، اور وہاں سے آپ منشی عبد العلیم خاں صاحب کے پاس بھوپال پہونچا دیئے گئے۔ حضرت کے یہ دونوں بھائی عمر میں آپ سے بڑے تھے، اور انگریزی تعلیم حاصل کرکے تحصیل معاش میں مصروف تھے، اس لئے عام طور پر رُجحان یہی تھا کہ ان صاحبزادے کو بھی انگریزی تعلیم میں لگا دیا جائے، منشی عبد الحلیم صاحب کے ایک صاحبزادے انگریزی تعلیم حاصل بھی کررہے تھے، اس لئے ایک نمونہ موجود ہونے کی وجہ سے بات اور بھی یقینی تھی، لیکن حضرت کا رجحان بلکہ اصرار عربی کی طرف تھا، طبیعت کو انگریزی کے نام سے وحشت ہوتی تھی۔ لوگ طرح طرح سے آپ کو انگریزی تعلیم کے فوائد ومحاسن اور ضرورت سمجھاتے، مگر آپ خاموشی سے ٹال جاتے، جب دیکھا گیا کہ اس طرح کام نہیں نکلتا تو طعن وطنز کے دلخراش تیر چلنے لگے، کوئی کہتا مولوی بن کر بھیک مانگیں گے، کوئی کہتا عربی پڑھ کر قوم پر بار بنیں گے، غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ حضرت فرماتے تھے کہ اپنے ہی گھر میں اپنے لوگوں سے اس قسم کی باتیں سنتا تھا اور تنہائی میں جا کر روتا تھا، اور اللہ تعالیٰ سے رورو کر دعائیں کرتا تھا کہ یا اللہ یہ لوگ تیرے دین کی تعلیم حاصل کرنے میں مزاحم بننا چاہتے ہیں، میرے حال پر رحم فرما اور مجھے دنیا میں ان کا دست نگر نہ بنا، اور اے اللہ مجھے علم دین عطا فرما اور مجھے ایسی عزت سے نواز کہ ان لوگوں کو بھی معلوم ہوجائے کہ دین حاصل کرنے والا دنیا میں بھی ذلیل نہیں ہوتا، یا اللہ میری عزت بس تیرے ہاتھ میں ہے، اپنے دین کو ان دنیاداروں کے سامنے ذلیل ورُسوا ہونے سے بچالے۔ (حالات مصلح الامت، ص:۲۸)

جس زمانے میں میری یہ تعلیمی کشمکش جاری تھی اور کسی کو بھی اپنا چارہ ساز وہمدم نہ پاکر میں پریشان ہوتا تھا تو اللہ تعالیٰ ہی غیب سے نصرت فرما کر مجھے سنبھالتے

تھے، مثلاً کوئی خواب دیکھ لیا، اس سے تسلی ہو جاتی، چنانچہ جن دنوں میں بھائی صاحب کے پاس بھوپال میں تھا تو مجھے وہاں قیام سے بہت فائدہ پہونچا، باوجود اس گئی گزری حالت کے وہاں اس وقت بھی لوگوں میں دینداری کافی تھی، بات یہ ہے کہ والی اور حاکم جب مسلمان ہوتا ہے تو اس کا اثر رعایا پر بھی پڑتا ہے، چنانچہ وہاں حکومت کی طرف سے قاضی بھی مقرر رہتے تھے، اور جس محلے میں ہمارا مکان تھا قاضی صاحب کا مکان بھی اس کے بالکل قریب ہی تھا، ایک دفعہ میں نے خواب دیکھا اور اپنے کو پوشیدہ رکھنے کی غرض سے بھاوج صاحبہ کی جانب سے اس کو لکھ کر قاضی صاحب کے پاس تعبیر دریافت کرنے خود گیا، انھوں نے پرچہ لے کر خواب پڑھا اور پڑھ کر فرمایا، نا بھائی یہ خواب کسی عورت کا نہیں ہوسکتا، اس سے کوئی دوسرا شخص مراد ہے اور وہ اسی گھر میں رہتا ہے اور وہ خدا کا ولی ہے۔(حالات مصلح الامت)

غرض حضرت نے باوجود گھر والوں کے ضد اور اصرار کے انگریزی شروع نہ کی، اور غالباً وہاں سے لوٹ کر گھر تشریف لے آئے، اس وقت مولانا محمد عثمان صاحب کانپور میں زیر تعلیم تھے، جہاں تک خیال جاتا ہے حضرت نے اپنی عربی تعلیم کے شوق کا اظہار کیا ہوگا اور مولانا محمد عثمان صاحب اپنے ساتھ کانپور لیتے گئے ہوں گے، مولانا موصوف متوسطات کے طالب علم تھے اور حضرت مبتدی، غالباً فارسی کی کچھ کتابیں مولانا موصوف ہی سے پڑھی ہیں۔ کانپور آپ کا قیام تھوڑی مدت رہا، پھر مولانا محمد عثمان صاحب تکمیل کے لئے دیوبند جانے لگے تو قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بھی انھیں کے ہمراہ دیوبند تشریف لے گئے، کیونکہ مولانا موصوف نے شوال ۱۳۲۸ھ میں دورۂ حدیث میں داخلہ لیا ہے، اور حضرت نے غالباً فارسی کی کسی جماعت میں۔ گویا مولانا محمد عثمان صاحب کا آخری سال تھا اور حضرت کا ابتدائی، مولانا محمد عثمان

صاحب تو فارغ ہو کر کانپور تشریف لائے اور حضرت وہیں پورے انہماک ویکسوئی کے ساتھ تحصیل علم میں مشغول رہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

(۱) حافظ صاحب کے کشف کا ایک واقعہ بہت مشہور ہوا۔ بستی کے کسی آدمی کو ایک مرتبہ سرسام ہو گیا، کسی حکیم نے علاج کے لئے بکلی (چھوٹا بگلا) تجویز کیا، فوراً بکلی کہاں ملے، اس سلسلے میں پریشان تھے، حافظ صاحب کو علم ہوا، انھوں نے ایک لڑکے سے کہا تال میں جاؤ، دیکھو فلاں جگہ فلاں جھاڑی میں ایک بکلی پھنسی ہوئی ہے، اس کو پکڑ لاؤ، وہ لڑکا اس جگہ گیا تو دیکھا کہ واقعی ایک بکلی گھاس کے جال میں پھنسی ہوئی ہے، وہ اس کو پکڑ لایا، اس قسم کی باتیں تو بہت جلد پھیل جاتی ہیں، آناً فاناً اس واقعہ کا پورے گاؤں میں چرچا ہو گیا، اور لوگ حافظ صاحب کے بہت معتقد ہو گئے، ان کے شیخ مولانا علی احمد صاحب کو علم ہوا تو بہت خفا ہوئے اور کہا کہ بہت بکلی پھنساتے ہو، یاد رکھو سب سلب ہو جائے گا، اس پر حافظ صاحب بہت روئے اور معافی چاہی۔ (حالات مصلح الامت)

باب ۳

قیامِ دیوبند

شوال ۱۳۲۸ھ میں ۱۴/۱۵/ سال کا ایک نوعمر مگر نیک اور صالح، پاکباز اور پاک طینت طالب علم دیوبند کی سرزمین پر قدم رکھتا ہے، فارسی یا عربی کے ابتدائی درجہ میں داخلہ کا آرزومند ہے، گھر والوں سے سخت کشمکش کے بعد آیا ہے۔علوم نبوت کا یہ وارث وامین بچہ ایک سخت امتحان میں کامیاب ہوکر آیا تھا مگر جن کو ذمہ داری عظیم سونپی جانے والی ہوتی ہے ان کی آزمائش بھی سخت اور دشوار ہوتی ہے،اس آزمائش کو خود حضرت کی زبانی سنئے،فرماتے ہیں!

> ”میں جب دیوبند گیا تو میرے ہمراہ ایک اور صاحب تھے جو میرے عزیز ہوتے تھے، وہ کسی کی سفارش بھی لے گئے تھے اور میں یونہی گیا تھا، چنانچہ ان صاحب کا داخلہ مع الطعام ہوگیا، اور ہم سے کہا گیا کہ طعام کا انتظام مدرسہ سے نہ ہوسکے گا، خیر میں اسی طرح رہنے لگا۔(حالات مصلح الامت)

ایک طرف گھر والوں نے ہر طرح کی امداد واعانت سے ہاتھ کھینچ رکھا تھا، دوسری جانب مدرسے سے بھی امداد نہ ہوسکی، لیکن بھلا جو طالب علم پورے خاندان سے الگ ہوکر محض دینی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اتنی دور دراز کی مسافت طے کرکے دیوبند پہونچا ہو، محض اتنی سی بات سے بددل ہوجائے گا؟ یقین تھا کہ کارسازِ حقیقی، مسبب الاسباب غیب سے کوئی صورت پیدا کرے گا، چنانچہ یہی ہوا، یہ داستان بھی حضرت ہی سے سنئے!

’’میرے ایک مہربان مولوی علی اظہر صاحب بلیاوی مرحوم وہاں معین مدرس تھے، انھوں نے حضرت مہتمم صاحب سے نہ جانے کیا کہہ دیا کہ انھوں نے میرا کھانا مدرسہ سے کردیا اور وہ بھی اس طرح کہ اس کے لئے کوئی درخواست وغیرہ بھی نہیں دینی پڑی، حالانکہ مدرسہ کا قانون تھا کہ طعام جاری کرانے کے لئے طلبہ درخواست دیتے تھے اور مہتمم صاحب کے اس پر دستخط ہوتے تھے، لیکن مولوی صاحب خدا معلوم کس طرح مہتمم صاحب سے منظوری کرا کے ناظم مطبخ کے پاس لے گئے، اور انھوں نے میرا کھانا جاری کردیا، میں مولوی صاحب مرحوم کا بہت احسان مانتا تھا، مگر زمانۂ طالب علمی کے بعد پھر ان سے ملاقات ہی نہ ہوسکی۔ ایک بار ان کی اہلیہ میرے یہاں آئی تھیں، تو میں نے لڑکیوں سے کہہ دیا کہ ان کے سر پر تیل لگاؤ، ان کو کچھ تکلف ہوا، مگر لڑکیوں نے کہا کہ ابا نے کہا ہے، اس پر وہ خاموش ہوگئیں (حالات مصلح الامت، ج:۱ص:۶۵)

دار العلوم دیوبند کا وہ دور جس میں حضرت وہاں پہونچے ہیں، علم وعمل اور عرفان واحسان ہر اعتبار سے نہایت زریں اور بابرکت دور تھا، زمانہ کی آنکھوں نے آسمان علم وفضل پر ایسے درخشاں آفتاب وماہتاب اور نجوم وکواکب کم دیکھے ہوں گے، ہر طرف صلاح وتقویٰ، زہد وعبادت اور اخلاص وللٰہیت کے نمونے بکثرت تھے۔ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب فرزند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کا زمانۂ اہتمام تھا، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی جیسا مجاہد جلیل، پاک نفس وپاکباز، فضل وکمال کا جبل عظیم مسند صدارت پر رونق افروز تھا، اور ان کے تلامذۂ وخدام جو بجائے خود علم وآگہی کے روشن چراغ تھے، درس وتدریس کی محفلوں میں جگمگا رہے تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں حضرت والا ۱۳۲۸ھ سے ۱۳۳۶ھ تک کسب علوم فرماتے رہے، اس عرصے میں اساتذہ کی ایک طویل فہرست ہے جن کے سامنے آپ نے زانوئے ادب تہ کیا ہے، تاہم حضرت کے حالات کی جہاں اور بہت سی باتیں پردۂ خفا میں ہیں، یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ کس استاذ سے آپ نے کیا پڑھا ہے، لیکن اساتذۂ کرام کی ایک سرسری فہرست پر نظر ڈالتے چلئے، انھیں اکابر سے حضرت کا دامن تلمذ وابستہ ہے۔

(۱) امام العصر، محدث کبیر حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ
(۲) میاں صاحب حضرت مولانا اصغر حسین صاحب دیوبندیؒ
(۳) شیخ الاسلام حضرت علامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ
(۴) فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی، مہتمم دارالعلوم دیوبند
(۵) شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب امروہویؒ
(۶) حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب دیوبندیؒ
(۷) جامع المعقول والمنقول حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ
(۸) مناظر جلیل حضرت مولانا سیّد مرتضٰی حسن صاحب چاندپوریؒ
(۹) مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندیؒ
(۱۰) حضرت مولانا غلام رسول صاحب ہزارویؒ
(۱۱) حضرت مولانا حکیم محمد حسن صاحب دیوبندی برادر خورد حضرت شیخ الہندؒ
(۱۲) حضرت مولانا سراج احمد صاحب رشیدیؒ

ان میں کا ہر ہر فرد جہاں علم وفضل کے اعلیٰ مراتب پر رسوخ رکھتا تھا، وہیں زہد وتقویٰ، خلوص وللہیت، خداترسی ودیانت اور عشق الٰہی ومحبت نبوی کا بھی مکمل نمونہ

تھا، پھولوں سے بھرے ہوئے کسی چمن میں نکل جایئے، دل ودماغ کیسے تازہ ومعطر ہوجاتے ہیں، اس کی نشاط انگیز اور عطر بیز ہوائیں سرور ومستی کا کیسا پیغام دیتی ہیں، کوئی کتنا ہی بدذوق ہو وہاں کا کیف ونشاط اس میں ایک نئی حرکت واہتزاز پیدا کردیتا ہے۔ آپ خود سوچئے، علوم نبوت کا شاداب وروح پرور چمن لہلہا رہا ہے، گلشن کے مالیوں نے ہر ہر روش سنوار رکھی ہے، پورا گلستاں جوش بہار پر ہے، دن میں **قال اللہ وقال الرسول** کی صدائیں گونج رہی ہیں، تو رات کو **لاالٰہ إلا اللہ** اور **اللہ اللہ** کا نغمۂ سرمدی روح کو تازگی بخش رہا ہے، کہیں کلام الٰہی کی خوشبو پھوٹ رہی ہے، کہیں حدیث کا درس بہار پر ہے، کہیں فقہ کے موتی لٹائے جارہے ہیں، کہیں معقولات کی بادیہ پیمائی ہورہی ہے، غرض ایک بہار کا سماں تھا۔ نشاط ہی نشاط تھا، کوئی کیسا ہی غافل اور زنگ آلود قلب لے کر آتا چند دنوں میں اس کی کایا پلٹ ہوجاتی، پھر یہاں تو وہ سعید ازلی روح تھی جس کا شاید قدرت نے ابتداء ہی سے انتخاب کر رکھا تھا، آہن پارس کے پاس پہونچا اور کندن بن کر چمک گیا۔

حضرت کی دیوبند میں جو کیفیت تھی، اسے حضرت کے ہمدرس اور بعد کے پاکستان کے مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمہ کے قلم سے ملاحظہ فرمایئے، لکھتے ہیں!

”آج سے ۵۶/سال پہلے ۱۳۳۱ھ میں جب احقر نے دارالعلوم دیوبند میں کافیہ وقدوری وغیرہ کے اسباق میں داخلہ لیا تو ضلع اعظم گڈھ کے رہنے والے ایک ذہین وفطین مگر سیدھے سادے طالب علم سے ہم سبق ہونے کی حیثیت سے تعلق قائم ہوا، اور دارالعلوم کے بہت سے اسباق میں ان کے ساتھ شرکت رہی، مگر دورانِ تعلیم ہی میں ان کو اصلاح اعمال کی فکر اور ذوق عبادت حق تعالیٰ

نے عطا فرمایا تھا، طالب علمانہ شوخیاں ان کے پاس سے ہو کر نہیں گزریں، اجتماعات سے الگ تھلگ رہنے کے عادی تھے، خوش نصیبی سے دورانِ تعلیم ہی ان کو سیّدی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضری اور تربیت باطنی کا شرف حاصل ہو گیا۔

(ماہنامہ ''البلاغ'' کراچی، شوال ۱۳۸۷ھ)

جن لوگوں کو مدارس کے اجتماعی ماحول اور ان کی اقامت گاہوں کے مرکب معاشرہ سے سابقہ پڑا ہے وہ خوب واقف ہوں گے کہ مدارس کی اس فوجِ گراں کے ساتھ رہتے ہوئے ان سے اپنے کو علیٰحدہ رکھنا، اجتماعات سے الگ تھلگ رہنا طالب علمانہ شوخیوں کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دینا اور وہ بھی کسی کی نگرانی اور اندیشۂ بازپُرس کے بغیر کوئی ایسا سہل عمل نہیں کہ سوچا اور کر ڈالا، اور اس پر دوام تو اور زیادہ مشکل ہے، بلاشبہ یہ اختلاط و تعلق، آپس کی خوش طبعیاں اور چھلیں سیکڑوں مفاسد کا سرچشمہ بنتی ہیں، باہمی نزاعات، تعلیم سے بے توجہی، لیڈرانہ ذہن کی پرورش، اور اساتذہ کے مقابلہ میں دعویٰ ہمسری، یہ سب اسی شجرۂ خبیثہ کے زہریلے برگ و بار ہیں، حضرت نے دارالعلوم میں آٹھ سال اس طور پر گزارے کہ ان سب مفاسد سے اپنا دامن صاف بچا کر نکل گئے، کچھ تو وہ دور ہی بابرکت اور روح پرور تھا، ابھی مذکورہ بالا مفاسد کا وہاں شیوع و ظہور نہ تھا، دوسرے حضرت کی فطرت سعید ازلی تھی، کام بنتا ہی چلا گیا، گو کہ اس دور میں خال خال مثالیں دوسرے نوع کی بھی ملتی تھیں، مگر حضرت والا ان کے سایہ سے بھی دور تھے، فرماتے تھے کہ:

''آپ لوگوں سے کیا عرض کروں، قرآن وحدیث کے مضمون میں کبھی کبھی ترغیب وترہیب کا کوئی مضمون ایسا آجاتا تھا کہ جس سے قلب کچھ متاثر ہو جاتا

تھا تو اسی حالت میں خاموش کسی قدر غم کا اثر قلب پر لئے ہوئے درسگاہ سے اپنے کمرے میں آتا اور چپ چاپ ایک کنارے بیٹھ جاتا، تو بعض طالب علم ایسے بھی دیکھے جو ہمارے حال پر ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ ان کو دیکھو یہ صوفی ہیں اور سبق سے اثر لے کر آئے ہیں، إنا لله وإنا إليه راجعون

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

جو حال اور اثر قرآن وحدیث سے عام طور پر قلوب میں ہونا چاہئے وہ ان لوگوں کی نظروں میں عیب تھا، یہ رنگ دیکھ کر میں سب سے الگ تھلگ رہتا تھا، کسی سے لڑتا نہیں تھا، نہ کسی کو حقیر سمجھتا تھا، لیکن یہ ضرور سمجھتا تھا کہ بھیّا ان لوگوں کے ساتھ اختلاط میں اپنے دین کی خیر نہیں۔ (حالات مصلح الامت،)

اس آئینے میں حضرت کا مزاج صاف نمایاں ہے، یہی رنگ آپ کی پوری زندگی پر چھایا رہا، اپنے دین کی حفاظت کی خاطر لوگوں سے الگ تھلگ رہنا اور پھر کسی کو حقیر نہ سمجھنا یہ اتنا بڑا کمال ہے کہ ایک نوعمر بچہ تو خیر بڑوں سے اس کا نباہ مشکل ہے۔

حضرت مولانا جہاں طلبہ کے آپس کے اختلاط سے بچنے کی کوشش کرتے، وہیں عوام الناس سے بھی دور رہنے کو ضروری خیال فرماتے، اور یہ صحیح ہے کہ دور طالب علمی میں خواہ طلبہ کی باہمی مجلس بازیاں ہوں یا عوام کے ساتھ زائد تعلقات! دونوں سخت مضر ہیں۔

دعوتوں سے اجتناب:

دیوبند میں کبھی کبھی اہل قصبہ کی طرف سے طلبہ کی دعوتیں ہوتی تھیں، طلبہ ان دعوتوں میں بھیجے جاتے تھے، مگر حضرت ان میں شرکت سے عذر فرمادیتے، بعض اوقات سارے طلبہ مدعو ہوتے، مدرسہ کا مطبخ بند ہو جاتا، حضرت عذر کر دیتے اور وہ

دن فاقہ سے گزار دیتے۔ایک بار حضرت نے فرمایا کہ:

’’میں دیوبند میں دعوتوں وغیرہ میں نہیں جاتا تھا، ایک دفعہ تمام طلبہ کی دعوت ہوئی، ناظم مطبخ مولوی گل محمد صاحب نے میرا نام بھی لکھ دیا۔میں نے کہا کہ یہ تو قانون مدرسہ کا ہے نہیں کہ ہر شخص دعوت میں ضرور ہی جائے، البتہ چونکہ دعوت پورے مدرسہ کے طلبہ کی ہے اس لئے ظاہر ہے کہ ایک دو کے لئے مطبخ تھوڑا ہی کھلے گا، اور اس میں مدرسہ کا نقصان بھی ہے، لہٰذا ہم کھانا نہیں مانگتے، ہمارا کھانا بند کر دیا جائے، باقی دعوت میں تو ہم سے نہ جایا جائے گا۔انھوں نے کھانا بند کر دیا، ہمارے دوستوں میں سے ایک صاحب تھے جو مہتمم صاحب کے بھی بہت منہ لگے ہوئے تھے، انھوں نے حضرت مہتمم صاحب سے کہہ دیا (میرا نام لیکر) کہ وہ دعوت میں نہیں جایا کرتے، ان کا کھانا مولوی گل محمد صاحب نے بند کر دیا ہے، مہتمم صاحب مجھے بلایا اور لگے میری تعریفیں کرنے کہ آپ ایسے ہیں، آپ ویسے ہیں، ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آج آپ کا کھانا مطبخ سے بند کر دیا گیا ہے، لہٰذا آپ آج ہمارے ساتھ کھائیے گا، میں یہ سن کر مارے شرم کے زمین میں گڑا جا رہا تھا اور جی چاہتا تھا کہ سامنے سے بھاگ جاؤں تاکہ یہ کلمات مہتمم صاحب کی زبان سے خود نہ سنوں، لیکن وہ موقع نہ تو پائے رفتن نہ جائے ماندن کا مصداق تھا، اس لئے خواہی نخواہی کھڑا سنتا رہا۔(حالات مصلح الامت، ج:ا ص:٦٦)

خیال کیجئے جس نے اپنے دین کی حفاظت کی غرض سے لذائذ سے کنارہ کشی اختیار کرنی چاہی، آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس کو کس اعزاز واکرام سے نوازا جا رہا ہے، مولانا مفتی محمود حسن صاحب مدراسی مجاز حضرت والا تحریر فرماتے ہیں کہ:

''حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ میں عام دعوتوں میں زمانۂ قیام دیوبند میں نہیں جاتا تھا، چنانچہ یہ بات عام لوگوں تک میں مشہور ہوگئی تو قصبہ کے لوگ پھر یہ کرنے لگے کہ صرف میری ہی تنہا دعوت کرتے اور نہایت اصرار کے ساتھ خود آکر اپنے گھر لیجاتے اور کھانا کھلاتے تھے۔ (ایضاً، ج:۱ص:۶۸)

وقت کی قدر دانی اور جفاکشی:

حضرت کے نزدیک طلب علم کے اوقات کی اس درجہ قدر و قیمت تھی کہ دیگر مصروفیات جو تعلیم کے اوقات کی قربانی مانگتیں، خواہ وہ ضروری کے درجہ میں کیوں نہ ہوں، اپنے نفس پر مجاہدہ کر کے انھیں ترک فرما دیتے تھے، آج تو ان باتوں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، تاہم اس دور میں بھی اس کی مثالیں شاذ و نادر ہی تھیں۔ مولانا محمود حسن صاحب مدراسی لکھتے ہیں:

''حضرت نے فرمایا کہ اب تو دیوبند کے حالات ہی بدل گئے، جب میں وہاں تھا تو کسی سے ملتا ولتا نہ تھا، ایک گوشہ میں حجرہ مل گیا تھا بس اسی میں تنہا رہتا تھا، جب مطبخ کھانا لینے جاتا تو ناظم مطبخ صاحب باورچی سے کہتے کہ بھائی مولوی صاحب کو اچھی روٹی دیکھ کر دیدو، جلی ولی نہ ہو، یہ بیچارے صرف روٹی ہی تو لیتے ہیں سالن تو لیتے نہیں۔ احقر (یعنی مولانا محمود) نے عرض کیا کہ حضرت پھر روٹی کیسے تناول فرماتے تھے، فرمایا گڑ وغیرہ سے کھالیتا تھا (ایضاً)

آج مدارس میں دونوں وقت روٹی، سالن اور چاول پاکر بھی مطالبات پیش کرنے والوں کو حیرت ضرور ہوگی، مگر کیا کیا جائے واقعہ یہی ہے، اللہ کا ایک بندہ ایسا بھی ہوا ہے جس نے روٹی اور سالن کو محض ضرورت کی وجہ سے استعمال کیا ہے، لذتِ دنیا سے اس نے کچھ بھی نہیں چکھا، بعد کی زندگی میں جن لوگوں نے حضرت کے

دستر خوان پر کبھی الوان واقسام کے لذائذ وطیبات کا مشاہدہ کیا ہے انھیں غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ حضرت ان سب کو بحکم ضرورت استعمال فرماتے تھے، اللہ نے چاہا تو اس اجمال کی تفصیل کہیں کردی جائے گی، ابھی تو آپ دیوبند کی داستان سنتے چلئے۔ حضرت کے ایک عزیز خادم حافظ محمد زکریا صاحب کی زبانی مزید تفصیل ملاحظہ فرمائیے!

”مدرسہ سے حضرت کو کھانا ملتا تھا، لیکن تقسیم کے وقت مجمع کی کثرت کے سبب لائن لگانی پڑتی تھی، جس میں وقت زیادہ صرف ہوتا تھا، اس لئے حضرت والا طباخ سے پہلے ہی روٹی لے لیتے تھے، وہ بھی صرف ایک، ورنہ تو عام طور پر ہر طالب علم کو دو آبی تنوری روٹی ملا کرتی تھی، چنانچہ باورچی بھی یہ کرتا تھا کہ حضرت کو دور سے آتا دیکھتا تو ہاتھ کے اشارے سے بلاتا اور گرم گرم روٹی فوراً دیدیتا تھا، اس فی الجملہ امتیازی برتاؤ پر بعض طلبہ کو اعتراض ہوتا، وہ حضرت سے تو کچھ نہ کہتے، باورچی سے الجھتے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ان کو بھی سب طلبہ کی طرح کھانا نمبر پر ملنا چاہئے، طباخ نے کہا مولوی صاحب جانتے بھی ہو، یہ بے چارے صرف ایک روٹی لیکر چلے جاتے ہیں، اپنے وقت کی قدر کرتے ہیں ، اس لئے ہم بھی ان کی قدر کرتے ہیں۔ حضرت کو چونکہ مدرسہ سے اسٹیشن کی مسجد جانا ہوتا تھا، جس کا فاصلہ دو میل سے کسی طرح کم نہ تھا، اس لئے بھی چاہتے تھے کہ جلدی سے کھانا مل جائے تو چلے جائیں تا کہ نماز وغیرہ میں دقت نہ ہو، پھر جائے قیام پر آ کر کبھی گڑ سے، کبھی نمک سے وہ روٹی کھالیا کرتے تھے ، بہر حال چونکہ روزمرہ کا یہی معمول تھا، نمازیوں اور اہل محلّہ پر مخفی نہ رہ سکا، لوگوں نے دیکھا کہ ہمارے امام صاحب روکھی روٹی اس طرح کھاتے ہیں، عرض کیا (مولوی جی) سالن ہمارے گھر سے منگالیا کیجئے، مگر یہ بھلا حضرت کی

ذات سے کیونکر ممکن تھا، اس لئے کبھی کبھی وہی لوگ خود سالن یا ترکاری پہونچا دیا کرتے تھے، اس وقت حضرت انکار نہ فرماتے بلکہ قبول فرمالیتے۔

(حالات مصلح الامت، ج:۱، ص:۶۸)

اکابر سے لگاؤ اور ان کی نظر:

حضرت کے پاکیزہ قلب میں چونکہ ابتداء ہی سے عشق الٰہی اور محبت نبوی کا نور جگمگا رہا تھا، اس لئے جہاں اس نور کی تابش محسوس ہوتی بے اختیار ادھر کھنچ جاتے۔ اکابر دیوبند اس وقت تقریباً سب ہی شرابِ محبت کے جُرعہ نوش تھے، اس لئے حضرت کا تعلق خاطر ان سب حضرات سے تھا، تاہم جہاں یہ نشہ زیادہ تھا ادھر جھکاؤ کا زیادہ ہونا بھی فطری تھا، فرماتے ہیں:

"میں جب دیوبند گیا تو وہاں کے بزرگوں میں حضرت شیخ الہند کی مجلس پسند آئی، چنانچہ حضرت کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا، پھر وہاں یہ دیکھا کہ کبھی کبھی بیعت کا سلسلہ بھی ہوجاتا ہے، چنانچہ حاضرین میں سے بہت سے طلبہ بھی بیعت ہوجاتے۔ اسی طور سے ایک مرتبہ میں بھی بیعت ہوگیا، اس وقت عمر بھی میری کم تھی اور ابتدائی زمانہ تھا، مگر تھوڑے ہی عرصہ میں حضرت دیوبندی مالٹا چلے گئے، ادھر مدرسہ میں حضرت مولانا تھانوی بھی برابر تشریف لایا کرتے تھے، حضرت کے وعظ میں شریک ہوتا، مجلسوں میں بیٹھتا، چنانچہ حضرت اقدس تھانوی سے مناسبت اور تعلق بڑھتا گیا، یہاں تک کہ پھر حضرت ہی سے بیعت ہوگیا اور تھانہ بھون کی آمد و رفت بھی شروع ہوگئی۔ (ایضاً، ج:۱، ص:۶۹)

ہمارے یہ اکابر صاف باطن اور روشن ضمیر تھے، انھوں نے حضرت کے احوالِ باطن کو تاڑ لیا تھا، پھر ان کی نظر خصوصی اکثر حضرت والا پر رہنے لگی تھی، حضرت فرماتے

تھے کہ:

”جب میں دیوبند میں تھا تو وہاں ایک اور طالب علم تھے جو کسی امیر کے لڑکے تھے، حضرت تھانوی سے ان کا بھی تعلق تھا، ایک مرتبہ انھوں نے حضرت تھانوی سے میری بابت نہ جانے کیا کہہ دیا، میں نے دیکھا کہ حضرت اس کے بعد مجھ سے بہت محبت فرمانے لگے، چنانچہ ایک مرتبہ میں دیوبند سے تھانہ بھون حاضر ہوا تو حضرت نے خواجہ صاحب (۱) سے فرمایا کہ خواجہ صاحب دیکھئے یہی ہیں مولوی وصی اللہ، یہ سن کر خواجہ صاحب اٹھے اور بڑھ کر مجھ سے معانقہ کیا اور دیر تک سینے سے لگائے رکھا۔ (حالات مصلح الامت، ج:۱،ص:۷۰)

لگے ہاتھوں اس سلسلے کی کچھ اور کڑیاں بھی سنتے چلئے، ع

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

حضرت فرماتے تھے کہ:

”زمانۂ قیامِ دیوبند میں جب میرا تعلق حضرت تھانوی سے ہوا، اور حضرت کی جانب سے مجھ پر جو شفقت ہوئی، اس کا حال لوگوں کو معلوم ہوا، اور حضرت مولانا مدرسہ کے سرپرست بھی تھے، اس لئے اکثر مدرسہ کے کاغذات لے کر تھانہ بھون کوئی شخص جاتا تھا اور حضرت کی رائے لے کر یا دستخط کرا کے واپس ہوتا تھا، تو اس تعلق کے بعد حضرت مہتمم صاحب نے یہ خدمت میرے سپرد کردی، چنانچہ جب کوئی ضرورت پیش آتی تو مجھے بلا کر فرماتے کہ مولوی صاحب! تھانہ بھون جاؤ گے؟ یہاں اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں، آستانۂ شیخ کی حاضری ہو اور نہ صرف حکم بلکہ مصارف سفر بھی ملیں تو بھلا اس موقع کو میں کب چھوڑتا، عرض کرتا کہ حضرت ضرور جاؤں گا، پھر حضرت مہتمم صاحب

مدرسہ کے کاغذات مرحمت فرمادیتے، اوراس سلسلے میں کچھ ہدایات فرماتے، سب کو سمجھ کر حضرت مولانا سے عرض کرتا اور کام مکمل کر کے واپس آجاتا۔

ایک مرتبہ حافظ احمد صاحب مہتمم مدرسہ نے کاغذات دیکر فرمایا کہ مولوی صاحب اس دفعہ تو آپ ہی کو تھانہ بھون جانا ہے، چنانچہ کرایہ اور زادِ راہ کے لئے کچھ رقم مرحمت فرمادی، جب تھانہ بھون پہونچا اور حضرت سے ملا تو حضرت نے فرمایا کہ آپ کا کھانا میرے گھر سے آئے گا، میں نے عرض کیا حضرت! مہتمم صاحب نے مجھے پیسہ دیا ہے، خانقاہ سے کھالوں گا حضرت زحمت نہ فرمائیں، فرمایا کہ نہیں پیسے رکھئے، پھر کام آئیں گے، کھانا میرے ہی یہاں سے آئے گا، چنانچہ میں کام ختم کر کے دیوبند واپس آیا اور کاغذات کے ساتھ ساتھ پیسے بھی واپس کئے، فرمایا یہ کیسے؟ اس پر میں نے صورت حال بتائی کہ کھانے میں خرچ ہوا ہی نہیں۔ فرمایا اجی تم ہی ایسے شخص ہو کہ اس طرح سے آمد وخرچ کا حساب دیتے ہو، ورنہ تو کسی نے بھی اب تک ایسا نہیں کیا، اچھا خیر خرچ نہیں ہوا، نہ سہی، اب سے یہ رقم تم ہی رکھ لو، حضرت فرماتے قہر درویش برجانِ درویش الامر فوق الادب، اس وقت ادباً کچھ نہ کہہ سکا، پیسے رکھ لئے، فرماتے تھے کہ الحمد للہ حضرت مولانا تھانوی کو بھی مجھ سے تعلق تھا اور مجھ پر اعتماد واعتبار بھی تھا، چنانچہ حضرت مولانا بھی اپنی خصوصی تحریر اور مخصوص خطوط دیوبند میرے ہی ذریعہ سے بھیجتے تھے۔ (حالات مصلح الامت، ج:۱، ص:۷۲)

دیوبند میں کسی محلّہ والوں نے حضرت مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند سے اپنی مسجد کے لئے کسی امام کی درخواست کی، مہتمم صاحب نے حضرت کو وہاں نماز پڑھانے کے لئے متعین فرمادیا، کچھ دنوں کے بعد اس محلّہ کے ایک رئیس

حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں کسی ضرورت سے آئے، مہتمم صاحب نے ان سے پوچھا کہ کہئے شیخ صاحب! ہم نے آپ کو امام کیسا دیا، انھوں نے عرض کیا بہت ہی عمدہ امام ہیں، بہت پابند، نہایت مستعد اور بالکل بے زبان بالکل ولی انسان ہیں، فرمایا ہاں وہ ایسے ہی ہیں۔ (ایضاً ص:۶۹)

حضرت کی ذاتِ گرامی پر اعتماد واطمینان کی یہ کیفیت اساتذہ واکابر کے ساتھ مخصوص نہ تھی، آپ کے ہم درس رفقاء بھی جو اپنے ساتھیوں پر بالخصوص بہت دیر میں اعتماد کرتے ہیں، آپ کی نیکی وشرافت، ورع وتقویٰ بلکہ ولایت کے معترف ومداح تھے، قیامِ دیوبند کے عرصہ میں ایک واقعہ پیش آیا، وہ یہ کہ حضرت کے حجرے کے سامنے احاطۂ مولسری میں ایک کنواں تھا، جو آج بھی ہے۔ ایک مرتبہ جماعت کھڑی ہوچکی تھی، حضرت کو وضو کے لئے پانی کی ضرورت تھی، بعض لوگوں نے دیکھا کہ حضرت کنویں کے پاس تشریف لے گئے اور لوٹے کو ہاتھ سے کنویں میں ڈالا اور پانی بھر کر نکال لیا، حالانکہ کنواں گہرا ہے، عام طور سے رسی ڈول کے ذریعہ پانی نکالا جاتا ہے، اس واقعہ کی تصدیق آپ کے رفیق درس مولانا حکیم سیّد محفوظ علی صاحب برادر نسبتی علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے بے تکلفی کے ان الفاظ میں کی ہے کہ:

> ’’ہاں بھائی! مولوی وصی اللہ کا کیا کہنا، وہ تو مادرزاد ولی تھا، چنانچہ کبھی کبھی احاطۂ مولسری کے کنویں سے یونہی ہاتھ ڈال کر پانی نکال لیتا تھا، ہم لوگ اس کو جانتے تھے، انتہیٰ بلفظہ (حالات مصلح الامت، ج:۱،ص:۷۵)

انھیں حکیم سیّد محفوظ علی صاحب کا قول مولانا ابوالکلام صاحب مبلغ دارالعلوم دیوبند کی روایت سے ملاحظہ کیجئے، کہتے ہیں کہ:

> ’’حکیم موصوف میرے خسر ہوتے تھے، میں نے حضرت مصلح الامت کا ذکر

سب سے پہلے انھیں سے سنا، ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ میرے ساتھیوں میں اعظم گڈھ کی طرف کا ایک ساتھی تھا، وصی اللہ اس کا نام تھا، وہ صورۃً اور سیرۃً ولی معلوم ہوتا تھا، کسی وقت میں وہ بڑا شخص ہوگا۔ (ایضاً، ج:۱،ص:۸۱)

بے نظیر ایثار:

حضرت کے عہد تحصیل و تعلیم کی ایک ہلکی سی جھلک آپ نے دیکھ لی، لیکن یہ اتنی سی بھی ادھوری رہے گی اگر حضرت والا کے ایثار و قربانی کی وہ داستان نہ لکھی جائے جسے مؤلف ''تذکرۂ علماء اعظم گڈھ'' نے زینت کتاب بنایا ہے، مولانا کی روداد حیات تمام تر اس جیسی پُر کیف اور ایمان پرور داستانوں سے مزین ہے، لیکن سب کہاں معلوم ہوسکتی ہیں جو معلوم ہوگئیں انھیں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، مؤلف تذکرہ ہی کے قلم سے سنئے!

''مولانا بشیر احمد صاحب غالب پوری جب دیوبند تشریف لے گئے تو چونکہ شرح جامی کے معیار کی تعلیم نہیں ہوئی تھی، اس لئے مدرسہ میں داخلہ نہ ہوسکا، اتفاقاً گھر واپس ہونے کے لئے کرایہ بھی نہیں تھا، اس لئے بڑی الجھن میں پھنس گئے، اعظم گڈھ کے دوسرے طلبہ کی زبانی مولانا بشیر احمد صاحب کی پریشان حالی کی اطلاع ہوئی، تو انھیں اپنے حجرہ میں بلایا اور تسکین اور حوصلہ افزائی کے بعد فرمایا کہ کھانے کی طرف سے آپ بالکل بے فکر رہیں، میرا دوپہر کا پورا کھانا اور شام کا آدھا آپ کو مل جایا کرے گا، آپ ایک سال کے اندر اپنی علمی کمزوری کو دور کریں، چنانچہ حسب وعدہ مکمل ایک سال تک آپ نے ایک وقت کے نصف کھانے پر اکتفا کر کے دوسرے کی مدد کی، ایثار و قربانی کے اس سے اہم اور بڑے واقعات پیش کئے جاسکتے ہیں، لیکن جس دور

میں مولانا نے یہ قربانی پیش کی ہے شاید اس عہد کی قربانیوں میں اس کی مثال نہیں دی جا سکے گی۔ (ص: ۳۲۵)

صلاح وتقویٰ اور ایثار وقربانی کے یہ مبارک آثار حضرت کی پوری زندگی میں نمایاں طور پر ملتے ہیں، طالب علمی کا زمانہ عموماً شوخی، شرارت اور کھیل کود سے معمور ہوتا ہے، طلبہ کے باہمی روابط کی وجہ سے بہت سی اخلاقی بیماریاں بھی ان کے باطن میں سرایت کر جاتی ہیں، جنھیں بعد میں دور کرنا اور ان سے صحت مند ہونا ایک طویل مجاہدہ کا طالب ہوتا ہے، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں، اسی وقت سے حضرت کا قلب کتنا صاف ستھرا اور پاکیزہ تھا، زہد وتقویٰ اور ذوقِ عبادت کے ساتھ حق تعالیٰ نے آپ کو ذہانت وذکاوت اور قوت، حافظہ کی دولت سے بھی مالا مال فرمایا تھا، اس لئے جو کچھ پڑھا سمجھ کر پڑھا اور اسے محفوظ رکھا، اسی وجہ سے پوری زندگی ''بر کفے جامِ شریعت'' اور ''بر کفے سندانِ عشق'' کا نمونہ بن کر ہمیشہ ''جام وسندان باختن'' کا عمل دہراتے رہے۔

حضرت نے آٹھ برسوں میں حسب ذیل کتابوں کے درس میں شرکت کی، اور امتحان میں ہمیشہ اوّل نمبرات سے کامیاب ہوتے رہے، شوال ۱۳۲۸ھ میں آپ کا داخلہ ہوا تھا، شعبان ۱۳۲۹ھ میں پہلے امتحان میں شرکت کی۔

(۱) ۱۳۲۹ھ۔ نحو میر، دستور المبتدی، شرح مأۃ عامل، پنج گنج، صرفِ میر۔

(۲) ۱۳۳۰ھ۔ ہدایۃ النحو، شرح مأۃ عامل، فصول اکبری، مرقات، تہذیب۔

(۳) ۱۳۳۱ھ۔ مفید الطالبین، کافیہ، قدوری، شرح تہذیب، شرح جامی بحث فعل

(۴) ۱۳۳۲ھ۔ شرح جامی بحث اسم، شرح وقایہ، نور الانوار، میر قطبی، سلم العلوم۔

(۵) ۱۳۳۳ھ۔ ہدایہ اولین، شرح عقائد نسفی، تلخیص المفتاح، مختصر المعانی، مقامات حریری، دیوان متنبّی، میبذی، ملاحسن، میر زاہد۔

(۶) ۱۳۳۴ھ۔ قاضی مبارک، حمد اللہ، مشکوٰۃ، نخبۃ الفکر، جلالین شریف۔

(۷) ۱۳۳۵ھ۔ موطا امام محمد، موطا امام مالک، شمائل ترمذی، بیضاوی، طحاوی۔

صحاحِ ستّہ، دورۂ حدیث شوال ۱۳۳۵ھ سے شروع ہوکر شعبان ۱۳۳۶ھ میں مکمل ہوا، اس طرح آپ کا سن فراغت ۱۳۳۶ھ ہے۔ اس وقت امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری شیخ الحدیث تھے، بخاری شریف کے اسباق شاہ صاحب کے پاس ہوتے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆

(۱) خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوبؔ غوری، حضرت تھانویؒ کے عاشق زار خادم، ڈپٹی کلکٹر تھے، یہ عہدہ دینی اعتبار سے پسند نہ ہوا، تنزل قبول کر کے محکمۂ تعلیم میں انسپکٹر ہوئے، بہت پُرگو اور خوش گو شاعر تھے، عشق و معرفت کے اشعار خوب کہتے اور خوب سناتے تھے، حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی وفات کا ایسا صدمہ ہوا کہ جلد ہی اس دنیا سے رُخصت ہو گئے۔ بڑے صاحب نسبت اور والہانہ عشق و محبت کے حامل بزرگ تھے، ''کشکول مجذوب'' کے نام سے مجموعۂ کلام شائع ہوا ہے، ''اشرف السوانح'' بھی آپ ہی کی تالیف ہے۔

باب ۴

قیامِ تھانہ بھون

گذشتہ صفحات سے اس بات کا علم ہو چکا ہے کہ حضرت کا تعلق قیام دیوبند ہی کے عہد میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ سے ہو چکا تھا۔ اکابر کا یہ دستور معلوم ہے کہ زمانۂ تحصیل و تعلیم میں عموماً بیعت نہیں فرماتے تھے، طلب علم کا مقصد پوری یکسوئی اور انہماک چاہتا ہے، اور سلوک و معرفت کی راہ بھی تمام مشغولیات سے انقطاع کلی چاہتی ہے، دونوں کو جمع کرنا بغایت دشوار ہے، اسی لئے یہ دستور چلا آرہا ہے کہ جب تک عرفی طالب علمی ہے، ذکر و شغل، مجاہدہ وریاضت سے طالب علم کو دور رکھا جاتا ہے، اگر وہ اپنے ذوق وشوق سے ادھر متوجہ ہونا بھی چاہتا ہے تو اسے روک دیا جاتا ہے، اس کی ریاضت مطالعہ وتکرار، اور اس کی عبادت اسباق میں حاضری اور غور وتدبر کے ساتھ کتاب کا سمجھنا ہے۔ پہلے وہ علم میں رسوخ وکمال حاصل کرلے اور اس کو تکمیل کی ایک حد تک پہونچالے، پھر دوسرے مشغلہ میں لگے، اس دوران فرائض وسنن پر اکتفا کرنا ہی اس کے لئے مناسب ہے، احادیث میں بھی نوافل کے اوپر علم کے تقدم کے اشارات ملتے ہیں۔ حضرت مولانا تھانویؒ نے اپنے دورِ طالب علمی میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ سے درخواست بیعت کی تھی، مگر آپ نے انکار فرمادیا تھا۔

تاہم یہ قاعدہ کلیہ نہیں کہ اس کی پابندی ہر جگہ اور ہر شخص کے ساتھ ضروری ہو، بعض مواقع اس سے مستثنیٰ بھی ہیں، مشائخ اس باب میں مجتہد ہوتے ہیں، کسی کو

بہت جلد بیعت فرما لیتے ہیں اور کسی کے حالات دیکھ کر اس کا معاملہ موخر فرما دیتے ہیں، کام کرنے والوں کو اپنے کام پر بصیرت حاصل ہوتی ہے، اس کو حضرت مولانا ہی کی ایک بیان کردہ مثال سے سمجھئے، فرماتے ہیں:

''دیوبند میں میرے ایک دوست تھے، بہت نیک آدمی تھے، کسی اور شیخ سے بیعت تھے، ان کو لوگ صوفی جی کہا کرتے تھے، اور سب طالب علم ان کا ادب کرتے تھے اور ان کا کام وغیرہ بھی کر دیا کرتے تھے، اور وہ یہ کام کرتے تھے کہ کاغذ کی اکنی دونی چونی کاٹ کر غریب طلبہ کو دیدیتے تھے کہ اس کو بازار لے جاؤ، یہ سکہ ہو جائے گا اور اس سے اپنا کام نکالو، مگر خود استعمال نہیں کرتے تھے، ایک دفعہ انھوں نے مجھ سے کہا کہ ہمارے شیخ ظاہر شرع کے کچھ پابند نہیں ہیں، باطن میں تو خیر ہیں، اور حضرت مولانا تھانوی ظاہر و باطن دونوں کے جامع ہیں، یعنی باطن میں بھی اللہ تعالیٰ سے صحیح تعلق حاصل ہے اور ظاہر میں بھی متبع سنت ہیں، لہٰذا مجھے بھی حضرت ہی سے بیعت کرادو، میں نے کہا بہت اچھا۔ پھر ایک بار حضرت مظفر نگر تشریف لائے، میں بھی ان صوفی صاحب کو ہمراہ لیکر مظفر نگر حاضر ہوا اور حضرت سے انھیں ملایا، اور ان کے ارادے کی اطلاع کر دی، حضرت نے انھیں ایک نظر اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر بیعت فرما لیا۔ سمجھ لیا ہوگا کہ کام کا آدمی ہے، راستہ پر لگا ہوا ہے۔ خواجہ صاحب نے عرض کیا حضرت تو پہلی ملاقات میں بیعت نہیں فرماتے، فرمایا کیا سب کے ساتھ ایک ہی معاملہ ہوتا ہے۔ (حالات مصلح الامت، ج:۱ص:۴۷)

کچھ اسی طرح کا معاملہ حضرت کے ساتھ بھی ہوا، حضرت کے یکسوئی، انہماک، ذوق عبادت، تقویٰ و پرہیزگاری، یہ سب باتیں نمایاں تھیں، محسوس کیا گیا

کہ ان کے لئے بیعت ہونا تحصیل علم کے حق میں مضر تو کیا ہوتا، مفید ہی ثابت ہوگا، حضرت تھانوی کی فراست نے شہادت دی ہوگی اور بیعت فرمالیا ہوگا۔

دار العلوم دیوبند سے فارغ ہوکر حضرت والا سیدھے تھانہ بھون چلے گئے اور وہیں کے ہوکر رہ گئے، پھر اور کہیں نگاہ اٹھی ہی نہیں۔ مرشد بھی کامل اور مسترشد بھی اَخاذ وقابل! جذب ہوگئے اور پالیا جو کچھ پانا تھا، تھانہ بھون سے لگاؤ اور جذب کی بات آگئی تو لگے ہاتھوں اس باب میں حضرت کی وہ کیفیت بھی ملاحظہ کرتے چلئے جو حضرت کو پوری زندگی بطور حال بلکہ مقام کے حاصل تھی، اس سے اس عشق وتعلق کا بھی کچھ اندازہ ہوسکتا ہے جو حضرت کے قلب میں تھانہ بھون کے ساتھ موجزن تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنے ایک مکتوب میں حضرت کی تعلیم کے متعلق کچھ دریافت کیا تھا، اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ:

''میری تعلیم کے متعلق دریافت کیا ہے کہ کہاں پائی ہے، سو اس کے متعلق تو میری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ بس تھانہ بھون ہی کا نام لوں، اگرچہ حروف شناسی میں نے اور مدارس میں بھی کی ہے، یہ بالکل صحیح ہے، مگر اب جی نہیں چاہتا کہ علاوہ تھانہ بھون کے اور کسی جگہ کا نام لوں، اور بجز وہاں کے کسی اور جانب اپنے کو منسوب کروں، بلکہ اپنے کو دوسری جانب منسوب کرنے یا کئے جانے کو شرک فی الطریق سمجھتا ہوں، چونکہ یہ امر ظاہر ہے کہ کسی ذی شرف کی جانب نسبت ہونے سے ذی نسبت میں بھی شرف آجاتا ہے، جیسے **عبد السلطان حاضر** (بادشاہ کا غلام موجود ہے) اس لئے حاضری تھانہ بھون کے بعد نہ فتح پوری ہوں اور نہ اور کچھ ہوں، بلکہ تھانوی اور صرف تھانوی ہوں، اور اپنے مدعا کے اظہار میں اس شعر کو کافی سمجھتا ہوں۔ ؎

نیاوردم از خانہ چیزے نخست　　　　　تو دادی ہمہ چیز من چیز تست

(حالات مصلح الامت، ج:۱،ص:۱۸)

دیوبند سے حضرت ۱۳۳۶ھ میں فارغ التحصیل ہوئے اور اسی وقت تھانہ بھون چلے گئے، حضرت تھانوی کا وصال ۱۳۶۲ھ میں ہوا۔اس طرح بارگاہِ مرشد میں حضرت کو چھبیس سال حاضری کا موقع نصیب ہوا ہے، اس مدت میں گاہے گاہے آپ نے طویل طویل عرصہ تک تھانہ بھون میں قیام فرمایا ہے۔کبھی گھر بھی تشریف لائے ہیں، علاقے کے بعض مدارس میں تدریسی ذمہ داری بھی انجام دی ہے، کچھ روز کانپور بھی رہے ہے۔افسوس کہ اس طویل مدت کی تفصیلات نہ معلوم ہوسکیں کہ کب کب آپ لمبے عرصہ تک کے لئے تھانہ بھون میں رہے، کب سے مستقلاً وطن میں قیام کیا، خانقاہ کے مشاغل کیا تھے، بیعت کی اجازت کب عطا ہوئی، دوران سلوک کن کیفیات وواردات سے آپ دوچار رہے، یہ سب باتیں صیغۂ راز میں ہیں۔حضرت کو اپنے حال کے اخفاء کا بہت اہتمام تھا، اس لئے ان امور کے جمع وانضباط کی طرف کیوں التفات ہوتا، کچھ قدرت نے بھی یاوری کی، خانقاہی احوال کو روشنی میں لانے کا سب سے بڑا ذریعہ وہ مکاتیب ہوسکتے تھے، جو حضرت نے اپنے مرشد کی خدمت میں پیش کئے تھے اور مرشد نے انھیں خطوط پر جواب ارقام فرمائے تھے، حضرت کے پاس وہ ذخیرہ موجود تھا، حضرت کی حیات میں اسے ہاتھ لگانے کی کوئی جرأت بھی نہ کرسکتا تھا، وصال کے بعد تلاش ہوئی تو پورا ذخیرہ غائب! اللہ ہی جانتا ہے کہ کیا ہوا، ایک پرچہ بھی ایسا نہ مل سکا جس سے حالات پر کچھ روشنی پڑتی، یقیناً اسی میں وہ مکتوب بھی رہا ہوگا جس پر حضرت تھانوی نے بیعت کی اجازت دی ہوگی۔۲۶؍سال کے حالات کا مکمل ذخیرہ یکسر مفقود ہونا ایک عجیب سانحہ ہے، لیکن کیا عجب ہے کہ جس چیز کو حضرت نے

عمر بھر ظاہر نہیں ہونے دیا، اللہ تعالیٰ نے وصال کے بعد بھی مخفی ہی رکھا، والغیب عند اللہ

اب ہمارے پاس بجز اس کے اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ انھیں حالات پر اکتفا کریں جنھیں اپنی مجالس میں حضرت نے برسبیل تذکرہ کچھ بیان کردیا ہے، یا دوسرے معتبر حضرات سے اس باب میں جو کچھ سنا گیا ہے، اسے نقل کریں، شاید کچھ اندازہ ہوسکے۔

خانقاہ تھانہ بھون میں حضرت کی جو کیفیت رہتی تھی اس کا اندازہ کرنے کیلئے سب سے پہلے حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے ایک مجاز وخلیفہ حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب جلال آبادی دامت برکاتہم کی شہادت پیش کی جارہی ہے، مولانا جلال آبادی اہل علم کے حلقے میں محتاجِ تعارف نہیں ہیں، موجودہ دور میں مولانا کا شمار حضرت تھانویؒ کے اجل خلفاء میں ہے، جو حضرت تھانویؒ کے نقش قدم پر چل کر دین وعلم اور سلوک وتصوف کی خدمت میں خود کو فنا کئے ہوئے ہیں۔ مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

> حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ مجھ سے بہت محبت فرماتے تھے، چنانچہ میں جب دارالعلوم میں پڑھتا تھا تو حضرت شاہ صاحب اسی وقت مجاز ہوچکے تھے، میں کم عمر تھا اور شاہ صاحب ادھیڑ عمر کے تھے، اور شاہ صاحب پر جو کیفیت اپنے سر اور کان پر ہاتھ ملنے کی بعد میں سننے میں آئی وہ اس وقت بھی تھی، بلکہ اس وقت تو عام اوقات ہی میں ایک جذب ساطاری ہونا محسوس ہوتا تھا۔
>
> حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں حضرت شاہ صاحب میں سب سے زیادہ یکسوئی اور خلوت گزینی تھی، حضرت اپنے مزاج وحالات میں منفرد تھے، چنانچہ شاہ صاحب جیسا مزاج حضرت تھانوی کے خلفاء میں سے کسی نے نہیں پایا تھا،

شاہ صاحب کو تصوف میں خاص ملکہ اور درک حاصل تھا، نیز شاہ صاحب کا اندازِ اصلاح بھی بہت عجیب وغریب تھا۔ (حالات مصلح الامت، ج:۳،ص:۲۸۴)

مولانا جلال آبادی دوسرے ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:

مولانا شاہ وصی اللہ صاحب بھی عجیب طبیعت کے مالک تھے، خانقاہ میں سب سے الگ تھلگ رہتے تھے، حضرت اقدس تھانوی کی جہاں نشست ہوتی تھی، تو جس وقت حضرت مولانا وہاں تشریف فرما نہیں بھی ہوتے تھے تو بھی دیکھا جاتا تھا کہ مولانا شاہ وصی اللہ صاحب ستون سے اپنی کمر لگائے وہاں کھڑے ہوتے تھے، نیز یہ بھی دیکھا جاتا تھا کہ اور خلفاء تو باہم کچھ ہنس بول بھی لیتے تھے، لیکن ان کا عجیب رنگ تھا۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا راستہ طے کرنے والوں پر بہت سے حالات طاری ہوتے ہیں، اور ان کو بہت سے حالات سے گذرنا ہوتا ہے، ان میں ایک مقام، مقامِ حیرت بھی ہے کہ آدمی اپنے خیال کو ہر طرف سے ہٹا کر اپنے مطلوب اور محبوبِ حقیقی کی جانب توجہ کر کے اور اپنے خیال کو اس کی جانب جما کر اس طرح بیٹھے کہ پھر اس کو کسی آنے جانے والے کی بھی خبر نہ ہو، یہ حیرت ہے.........تو مولانا وصی اللہ صاحب بیچارے الگ تھلگ رہتے تھے، نماز بھی عجیب کیفیت سے پڑھتے تھے۔ (ایضاً، ج:۳،ص:۴۸۹)

مولانا جلال آبادی مدظلہ کے اس بیان سے .... جو لوگ سلوک ومعرفت کی راہ سے گذرے ہیں..........انھیں حضرت کے حال ومقام کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے، یہ مقام جسے مولانا مقامِ حیرت فرمارہے ہیں، عشق ومحبت کے لوازم میں سے ہے، عشق خواہ حقیقی ہو یا مجازی، جب اس کا تسلط قلب وجگر پر ہوتا ہے تو محبوب کے علاوہ سب کو پھونک کر رکھ دیتا ہے، اس کے علاوہ دل میں کسی کا گذر ممکن نہیں ہوتا،

اسی وجہ سے عاشق بے تاب اپنے لئے ایسی جگہیں ڈھونڈتا ہے جہاں خلوت ہو، یکسوئی ہو، محبوب کی جانب سے اس کی توجہ ہٹانے والا کوئی نہ ہو، جنگل، صحرا، ویرانہ اور اس قسم کی جگہیں جہاں سناٹا اور خاموشی ہو، عاشق کو پسند آتی ہیں، اس خاموش فضا میں ساری دنیا کو فراموش کر کے وہ یادِ محبوب میں سرمست و مدہوش رہنا چاہتا ہے، رات کا اندھیرا، بیابان کا سناٹا، اور دریا کا سکوت اسے بھاتا ہے، دل کی بے تابی اسے آبادی میں ٹھہرنے نہیں دیتی۔ قیس عامری عشق مجازی میں گرفتار تھا، مگر مجنون بن کر دیوانہ وار آبادیوں سے نکل کھڑا ہوا، اور صحرا صحرا کی خاک چھان کر عشق و شوریدگی کی دنیا میں اپنا نقش دوام چھوڑ گیا، عشق لیلیٰ میں جب یہ تاثیر ہے تو عشق مولیٰ میں جو کچھ بھی اثر ہو کم ہے۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود
گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

جی چاہتا ہے کہ حضرت کے اس مقام کی قدرے شرح حضرت ہی کے ایک بیان سے کر دی جائے، غالباً حضرت نے اپنی ہی کیفیت بیان فرمائی ہے، اقتباس کسی قدر طویل ہوگا، مگر سراسر مغز اور خلاصہ ہے۔ اس لئے مزید تلخیص کی جرأت نہیں ہوئی، رسالہ ''تلاشِ مرشد'' میں فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کی طلب اس دارِ دُنیا میں ایمان کے لوازم سے ہے، جس قدر ایمان ہوگا اسی قدر طلب ہوگی، اور جس طرح یہ طلب ایمان کے لوازم سے ہے اسی طرح حیرانی و سرگردانی بھی طلب کے لوازم میں سے ہے، اس حال کو صوفیہ بھی حیرت سے تعبیر کرتے ہیں، اور یہ حیرت محمود ہے، کیونکہ ان حضرات کے نزدیک حیرت کی دو قسمیں ہیں، محمود اور مذموم۔ مذموم یہ ہے کہ انسان کو محبوب کی طلب سے غفلت ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ راستہ ہی چھوڑ دیتا ہے اور

راستہ چھوڑ دینے کے لئے بھی حیرانی وسرگردانی لازم ہے، یہ حیرانی مذموم ہے اور تمام دنیاداروں کو حاصل ہوتی ہے، بلکہ ان کے لازم حال ہوتی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ اپنے مستقل مرکز یعنی اللہ تعالیٰ سے ہٹ جاتے ہیں، اور پھر ان کا کوئی مستقل مرکز نہیں رہ جاتا، یہی سبب بنتا ہے ان کی حیرانی اور پریشانی کا۔ کسی نے خوب کہا ہے۔ ؎

رہے نہ دل کے لئے کوئی مستقل مرکز
یہی ہے عقل دل تو اس سے دور ہی اچھا

اور ایک حیرانی اللہ تعالیٰ کی طلب میں ہوتی ہے، جو تمام انبیاء علیہم السلام اور مومنین صالحین کو حاصل ہوتی ہے، چنانچہ **ووجدک ضالاً فھدیٰ** میں **ضالاً** کی ایک تفسیر حیرانی وسرگردانی سے بھی فرمائی گئی ہے، یعنی ہم نے آپ کو طلب مولیٰ میں حیران وسرگرداں پایا پس وصال کی دولت سے آپ کو نواز دیا، اور یہ حیرانی اس لئے ہوتی ہے کہ ادھر کا راستہ اس قدر وسیع ہے کہ یہ حضرات اس میں حیران رہ جاتے ہیں، اور یہ حیرانی کیوں نہ ہو، یہ راہ بھی کس کی راہ ہے، محبوب حقیقی کی راہ ہے۔ اس راہ میں تو جب کسی کو ذرا سی بھی معرفت حاصل ہوتی ہے تو بس حیران رہ جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض بعض اس مرتبہ میں مجذوب تک ہو جاتے ہیں، بس اسی حیرانی میں کبھی ان حضرات سے بظاہر کچھ خلاف اور خطا کا صدور بھی ہو جاتا ہے، لیکن یہ مذموم نہیں ہے، چنانچہ امیر خسرو جو حضرت نظام الدین اولیاء کے خلفاء میں سے ہے ہیں، فرماتے ہیں:

حیراں شدہ ام در آرزویت   اے چشم جہانیاں بسوخت
ما ایم وتحیر وخموشی   آفاق ہمہ بگفتگویت

خسرو بکمند تو اسیر است　　　بے چارہ کجا رود زکویت

یعنی میں تو تیری طلب اور جستجو میں حیران اور سرگرداں ہو گیا ہوں، اے وہ ذات کہ دنیا کی نظریں تیری ہی جانب لگی ہوئی ہیں، ہم ہیں اور ہمارے لئے حیرانی وخموشی ہے، اور دنیا ہے کہ تیری گفتگو میں مشغول ہے، خسرو تو اب تیرے کمند کا قیدی ہو چکا ہے، اب وہ غریب بیچارہ تیری گلی چھوڑ کر کہاں جائے۔

اور مولانا روم فرماتے ہیں:

کاملاں کز سر تحقیق آگہ اند　　　بیخود وحیراں ومست و والہ اند

نے چنیں حیراں کہ پشتش سوئے اوست　　　بل چنیں حیراں کہ غرق ومست دوست

یعنی کاملین جو کہ رازِ حقیقت سے آگاہ ہیں، وہ تو ہر معاملۂ قدرت میں حکمت کو دیکھ دیکھ کر ہر وقت حیران ومست رہتے ہیں، لیکن ایسے شخص کی طرح حیران نہیں جس کی پشت دوست کی طرف ہے یعنی حق تعالیٰ سے غافل ومحجوب ہو، بلکہ وہ ایسے حیران ہیں کہ علوم الٰہیہ میں مستغرق اور مست ہیں۔

اب اس حیرانی کے اسباب کا بیان کچھ آسان نہیں ہے، یہ وہ حیرانی ہے جو محبوب حقیقی کی طرف سے پیش آتی ہے، اور ہر ایک کو اس کے مناسب حال پیش آتی ہے، بات یہ ہے کہ وہ غنی ہیں، طالب سے بھی اور طالبین کی طلب سے بھی، اس لئے وہ اپنے طالبین سے استغناء ظاہر کرتے ہین، اب جبکہ محبوب ہی استغناء ظاہر کرے تو ایک طالب ومحبّ بے چارہ کہاں جائے اور کیا کرے، بس وہ حیران وششدر رہ جاتا ہے اور بالکل اس شعر کا مصداق ہو جاتا ہے کہ:

دیدار می نمائی وپرہیز میکنی　　　بازار خویش وآتش ما تیز میکنی

یعنی اے محبوب تو اپنا دیدار بھی دکھاتا ہے اور مجھ سے اعراض واستغناء بھی برتتا

ہے، اس کے ذریعہ تو، تو اپنے حسن کے بازار کو اور میرے عشق کی آگ کو تیز سے تیز تر کر دیتا ہے، اور زبان حال سے یہ کہتا ہے۔

أشاهد من أهوىٰ بغير وسيلةٍ　　فيلحقني شان أضل طريقاً
يوجج ناراً ثم يطفي برشة　　لذاك تراني محرقاً وغريقاً

یعنی میں اپنے محبوب کا بغیر کسی وسیلہ کے براہ راست ہی مشاہدہ کرتا ہوں تو مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ میں راستہ ہی بھول جاتا ہوں، وہ محبوب میرے دل کی آگ کو اوّل بھڑکاتا ہے، پھر اس پر چھینٹے ڈال کر بجھا بھی دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جس کی بنا پر تم مجھ کو آگ میں پڑا ہوا اور پانی میں ڈوبا ہوا دیکھتے ہو۔ اور اسی حال میں وہ کہتا ہے۔

باغ میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

اور محبوب کے لئے تو یہ بے نیازی لازم ہے، جیسے عشاق کے لئے نیاز طلب لازم ہے، چنانچہ وہ اپنے عشاق کا اس میں امتحان لیتے ہیں، ۔

مزا آتا رہے ان کو چھیڑنے میں اپنے عاشق کو
کبھی مسرور کرتے ہیں، کبھی رنجور کرتے ہیں

اس پر کسی عاشق نے بھی کیا خوب کہا ہے کہ ۔

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے　　بے نیازی تیری عادت ہی سہی

(تلاش مرشد، ص:۳۰)

حضرت نے ایک بار اپنے اس حال کو ان الفاظ میں بیان کیا کہ:

”میں تو جنگل کا آدمی تھا، یہ تو حضرت مولانا تھانوی کی تربیت تھی کہ مجھے سنبھال لیا، کبھی فرماتے کہ تم لوگوں سے سابقہ مقدر تھا جو یہاں نظر آرہا

ہوں، ورنہ لوگوں کے درمیان سے ایسا غائب ہوتا کہ لوگ میری ہوا بھی نہ پاتے۔ (حالات، ص:۱۰۴)

حق تعالیٰ کو حضرت سے شریعت وطریقت کا کام لینا تھا، ورنہ عشق ومحبت کی اس شوریدگی وتپیدگی کے ساتھ مخلوق خدا کے درمیان رہنا بہت مشکل تھا۔ (۱)

حضرت کے دل میں عشق الٰہی کی آگ جل رہی تھی اور اس کا اثر کبھی کبھی ظاہر پر بھی نمودار ہوجاتا تھا، محبت ایک باطنی اور قلبی کیفیت ہے، مگر جب اس کا غلبہ شدت کے ساتھ ہوتا ہے تو اعضاء بدن بھی متاثر ہوجاتے ہیں، مولانا محمد عمر صاحب کٹھوروی (جو حضرت والا کو اولاً تھانہ بھون لے گئے تھے) راوی ہیں کہ:

''مولوی وصی اللہ نے تو ابتداء میں بہت ذکر کیا ہے، ان کا سینہ ہر وقت جلتا رہتا تھا، اور قلب کے پاس کا حصہ سیاہ پڑ گیا تھا، چنانچہ اس سوزش اور گرمی کا اثر ان کے کرتے پر بھی کبھی کبھی جھلکتا تھا، ایک مرتبہ میں نے ان کے سینے کے پاس کے کرتے کے حصہ کی جانب اشارہ کرکے کہا کہ یہ کیسے سیاہ ہوگیا ہے، تو فرمایا ارے بھائی! میری باطنی اور قلبی سیاہی کا اثر اور دھبہ ہے جو اندر سے نکل کر اوپر ظاہر ہوگیا ہے۔ (حالات، ج:۱ص:۱۰۴)

اس گرمی کا اور سوزش کا اثر یہ بھی ہوا کہ حضرت والا سخت بیمار ہوگئے، کھانا پینا بند ہوگیا اور جسم لاغر ہوتا چلا گیا، ہر وقت حرارت سی رہنے لگی، بعض اچھے اطباء نے تپ دق تجویز کردیا، حضرت تھانویؒ کو فکر لاحق ہوگئی، ان دنوں دق ایک لاعلاج مرض سمجھا جاتا تھا، عام طور سے یہ تصور تھا کہ یہ مرض جان لے کر ٹلتا ہے، اتفاقاً انھیں دنوں حضرت اقدس تھانویؒ کے محبوب شاگرد وخلیفہ اور حاذق طبیب جناب مولانا حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری تھانہ بھون تشریف لائے، انھوں نے بھی حضرت کو دیکھا،

حالات کچھ تو وہ پہلے ہی سے جانتے تھے، کچھ لوگوں کی زبانی سنا، انھوں نے حضرت سے عرض کیا کہ مولوی وصی اللہ کو میں اپنے ہمراہ میرٹھ (جہاں ان کا قیام تھا) لئے جاتا ہوں وہیں میرے یہاں رہیں گے اور میں ان کا علاج کروں گا، حضرت دعا فرمادیں۔ حضرت مولانا نے بخوشی اجازت دیدی، چنانچہ حکیم صاحب موصوف حضرت کو اپنے ساتھ لے گئے، انھوں نے علاجاً حضرت کا ذکر و شغل سب بند کرادیا، اور علاج کیا۔ حضرت والا صحت مند ہو گئے، دق وغیرہ کچھ نہ تھا۔ (حالات مصلح الامت، ج:۱، ص:۱۰۴)

درحقیقت یہ ذکر الٰہی کی گرمی اور حرارت تھی جو جگر میں سرایت کر گئی تھی، یہ بخار اور یہ لاغری اسی کا اثر تھا، حکیم مصطفیٰ صاحب طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ اس راہ کے بھی رمز شناس تھے، دوسرے اطباء صرف ایک رُخ دیکھ رہے تھے۔

یکسوئی اور انہماک:

دورانِ قیامِ دیوبند آپ دیکھ چکے ہیں کہ حضرت باوجود عہد جوانی کے سب سے الگ تھلگ، گوشہ نشین اور یکسو رہا کرتے تھے، تھانہ بھون میں بھی طبیعت کا یہ رنگ قائم رہا، مولانا مسیح اللہ صاحب کی شہادت اس باب میں گزر چکی ہے، کام کے لحاظ سے گو کہ حضرت حکیم الامت کے ساتھ بہت قرب تھا، چنانچہ حضرت تھانوی اپنے مسودات صاف کرنے کیلئے مولانا کو بھی دیا کرتے تھے، تاہم حضرت صرف اپنے کام سے کام رکھتے۔ کوئی ضرورت پیش آئی یا شیخ کی جانب سے طلبی ہوئی تو حاضر خدمت ہوئے اور جو کچھ کام ہوا کر کے اپنے ذکر وفکر میں محو ہو جاتے، فرماتے تھے کہ وہاں بھی جب مجھے ذرا فرصت ملتی تو خانقاہ سے دور جنگل چلا جاتا۔ حاصل یہ کہ لوگوں سے زیادہ تعلقات اور مجلس بازی سے حضرت کو کچھ بھی مناسبت نہ تھی، یہی وجہ ہوئی کہ مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے جب حضرت کے کام کی اطلاع پائی اور حضرت کا شہرہ

سنا تو اپنے بعض احباب سے دریافت کیا کہ حضرت مولانا وصی اللہ صاحب جو اپنے حضرت کے مجاز ہیں، ان کے بابرکت حالات سننے میں آرہے ہیں جس کی وجہ سے ملاقات کا بھی اشتیاق ہورہا ہے، لیکن یہ تو بتایئے کہ یہ کون بزرگ ہیں، تھانہ بھون میں میں نے انھیں ضرور دیکھا ہوگا لیکن شکل وصورت کچھ یاد نہیں آرہی ہے، اس نام کے کون صاحب وہاں تھے اور کس حجرے میں رہا کرتے تھے، حضرت نے جب یہ بات سنی تو ہنس کر فرمایا کہ بھائی میں تو مولانا عبدالباری صاحب کو خوب جانتا ہوں، تھانہ بھون میں میری ان سے ملاقات بھی ہوئی ہے، باقی یہ ضرور ہے کہ میں وہاں چونکہ سب سے الگ تھلگ رہا کرتا تھا اس لئے ہوسکتا ہے کہ مولانا کو میں یاد نہ ہوں، اور میں تو تھانہ بھون خود کو مٹانے کے لئے گیا تھا نہ کہ پہچنوانے کے لئے۔ خانقاہ میں میری دوستی خواجہ صاحب، مفتی محمد شفیع صاحب اور شاہ لطف رسول صاحب(۲) سے تھی، یہ حضرات مجھے بخوبی جانتے تھے، باقی وہاں آنے جانے والوں سے میں ملتا سب سے تھا، سب کا ادب واحترام کرتا تھا، لیکن ربط ضبط کسی کے ساتھ نہ رکھتا تھا، اور اس زمانہ میں تعارف کا بالعموم یہی سبب ہوا کرتا ہے اور میں اس سے طبعاً دور تھا۔ (ایضاً، ص:۱۰۹)

سیّدالطائفہ شیخ جنید بغدادیؒ کا ارشاد ہے کہ: **إتصالک بالحق بقدر إنفصالک عن الخلق**، جس قدر مخلوق سے دوری ہوگی اسی کے بقدر خالق سے قرب واتصال ہوگا۔ حضرت کی طبیعت اور ذوق ومزاج سب اسی سانچے میں ڈھلا ہوا تھا، حقوق ضروریہ جنھیں شریعت نے ضروری قرار دیا ہے، ان سے تو مفر اور گریز جائز نہیں، ان حقوق کی ادائیگی تو علیٰ وجہ الکمال فرماتے، پھر سب سے الگ یادِ الٰہی میں سرمست وسرشار!

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ، مجھے کام ہے اپنے کام سے
ترے ذکر سے، ترے فکر سے، تری یاد سے، ترے نام سے

مرشد کی نگاہِ کرم:

مذکورہ بالا خصوصیات کی وجہ سے حضرت نے مرشد گرامی کے قلب میں محبوبیت کا ایک خاص مقام حاصل کرلیا تھا، حضرت تھانویؒ سمجھ چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان سے دین کا کام بڑے پیمانے پر لینے والے ہیں، زمانۂ قیام تھانہ بھون مین حضرت نے ایک خواب دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف رکھتے ہین اور کسی جانب کچھ اشارہ فرمایا، حضرت نے یہ خواب شیخ کی خدمت میں عرض کیا، شیخ نے تعبیر یہ ارشاد فرمائی کہ متعین طور پر تو نہیں کہہ سکتا، ہاں اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے دین کا کام ہوگا اور رسول اللہ ﷺ کی مرضی کے مطابق ہوگا۔

تھانہ بھون میں حضرت کی تربیت باطن اسی انداز پر ہورہی تھی، جیسے کسی بڑے کام کے لئے تیار کیا جارہا ہو، کبھی کبھی ایسی باتوں پر بھی گرفت ومواخذہ ہوجاتا تھا جنھیں عام طور پر معمولی اور ناقابل التفات سمجھا جاتا ہے، اور خود حضرت تھانویؒ دوسروں کے لئے قابل مواخذہ نہیں سمجھتے تھے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی آئندہ ہونے والی حیثیت کے پیش نظر ان معمولی باتوں پر بھی گرفت فرمالیتے تھے، حضرت کے زمانۂ قیام تھانہ بھون کا یہ واقعہ بعض معتبر حضرات سے سننے میں آیا کہ ایک مرتبہ عید کے دن حضرت تھانویؒ نے حضرت سے فرمایا کہ آپ کہیں جایئے گا نہیں، گھر سے کچھ کھانا آپ کے لئے یہیں آجائے گا، حضرت نے عرض کیا بہت اچھا، لیکن نمازِ عید کے بعد جب احباب آپس میں ملے تو حضرت خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ہم لوگ فلاں ڈپٹی صاحب (جو حضرت تھانوی کے متوسلین میں سے تھے) کے یہاں جارہے ہیں، کچھ خورد ونوش کا سلسلہ رہے گا، آپ بھی چلئے، حضرت نے معذرت کی کہ حضرت مولانا کا حکم یہ ہے کہ کہیں جانا نہیں، کھانا حضرت کے یہاں سے آجائے گا، خواجہ

صاحب مصر ہوئے کہ حضرت کے یہاں سے آتے آتے ابھی کچھ دیر ہوگی اور ہم لوگ صرف پانچ منٹ میں واپس آجائیں گے۔ خواجہ صاحب کے اصرار پر حضرت ساتھ ہولئے، ادھر یہ حضرات خانقاہ سے باہر گئے اور ڈپٹی صاحب کے یہاں پہونچے ہوں گے کہ ادھر حکیم الامت حضرت تھانویؒ طباق میں کچھ لئے خود ہی بہ نفس نفیس خانقاہ میں وارد ہوئے، اور حضرت کو حجرہ میں نہیں پایا، مگر فوراً ہی حضرت بھی آگئے، حضرت مولانا نے دریافت فرمایا، کہاں گئے تھے؟ عرض کیا حضرت! خواجہ صاحب کے ہمراہ فلاں ڈپٹی صاحب کے یہاں چلا گیا تھا، حضرت مولانا نے ناگواری کے طور پر فرمایا کہ آپ کو کہیں جانے سے منع کردیا گیا تھا نا؟ پھر آپ کیوں گئے، اب حضرت والا کے پاس کیا جواب تھا بجز اقرارِ خطا کے، یہ فرما کر حضرت تھانوی تو گھر واپس ہوگئے اور حضرت والا کے لئے یہ کھانا زہر ہوگیا، اور وہ کھانا کِر کِرا، اپنے حجرے میں جاکر بڑی زور سے اپنی زبان کھینچی اور چیخ مار کر گر گئے اور بے ہوش ہوگئے، مطلب یہ تھا کہ اسی زبان کی بدولت آج یہ مواخذہ ہوا اور یہ دن دیکھنے کو ملا کہ شیخ ناراض ہوگئے، بہرحال بہت کچھ معافی تلافی کے بعد معاملہ صاف ہوا۔ (حالات مصلح الامت، ج:۱،ص:۱۰۹)

اس واقعہ کے ذیل میں مرتب حالات جناب مولانا جامیؔ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

”ملاحظہ فرمایا آپ نے! حکیم الامت کی تربیت کہ جس کو سمجھتے تھے اس کی کیسی نگرانی فرماتے تھے، خواجہ صاحب یا جناب ڈپٹی صاحب اچھے لوگ تھے، لیکن ان کا شمار بلاشبہ امراء ورؤسا کے زمرے میں ہوتا تھا، اور ریاست و مالداری کا ایک اثر ہوتا ہے جو دوسروں کے حق میں زہر ہوتا ہے۔ حضرت حکیم الامت اپنے اس مسترشد کو اسی سے بچانا چاہتے تھے، جانتے تھے اگر خدانخواستہ امراء

کی مصاحبت اور ان کی بود و باش نظروں میں سما گئی تو ان صاحب کا تو پڑا ہو جائے گا، آگے انھیں سے کام لینا ہے، اور ان کو ابھی بہت کچھ کام کرنا ہے اور ہر طبقہ میں کرنا ہے، لہٰذا امراء کے اختلاط سے حضرت مصلح الامت کو بچایا گیا۔

(حالات مصلح الامت، ج:۱،ص:۱۰۹)

خانقاہ تھانہ بھون میں بار بار آزمائش کی بھٹی میں حضرت تپائے گئے، بار بار امتحان لیا گیا اور ہر بار کامیاب ہو کر نکلے۔ قیامِ تھانہ بھون میں حضرت پر ایسا زمانہ بھی گذرا ہے کہ شاہ لطف رسول صاحب اور خواجہ صاحب دونوں یکے بعد دیگرے بہت معمولی معمولی باتوں پر حضرت کو روک ٹوک اور تنبیہ کرتے تھے، اور ٹوکنے کا انداز کچھ ایسا اختیار کرتے جیسے شیخ اپنے طالب کا مواخذہ کرتا ہو، غالباً یہ بات حضرت تھانوی کے ایماء سے تھی، یہ امتحان بہت سخت تھا، شیخ کی ڈانٹ ڈپٹ اور مواخذہ تو عقیدت ومحبت کی وجہ سے گوارا ہو جاتا ہے مگر اپنا پیر بھائی جو خود اپنی اصلاح کا طالب ہے اس سے ایک طرح کی ہمسری ہوتی ہے وہ مواخذہ کرے اور برداشت کرلیا جائے، بلکہ سعادت مندی کے ساتھ تعمیل حکم کی جائے، اعلیٰ درجہ کے حسن خلق، تواضع اور کسر نفسی کی دلیل ہے، حضرت والا اس امتحان میں پورے اترے، اس طرح کے نہ جانے کتنے امتحانات لئے گئے ہوں گے، اب بجز علام الغیوب کے کون جانتا ہے۔

غالباً آخری آزمائش جس کے بعد حضرت کو اجازت مرحمت فرمائی گئی، مولانا محمود حسن مدراسی کی روایت سے ملاحظہ فرمایئے، لکھتے ہیں کہ:

''حضرت مولانا محمد سعید صاحب کیرانوی مدراسی خلیفہ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے مجھ سے فرمایا کہ مولانا وصی اللہ صاحب حضرت کے بہت ہی عاشق تھے، ایک وقت حضرت تھانوی نے کسی اصلاحی بات پر غصہ ہو کر ان سے

فرمایا کہ یہاں سے چلے جاؤ، مولانا وصی اللہ صاحب خانقاہ سے کہیں چل دیئے ، پھر حضرت تھانویؒ رات بھر لالٹین ہاتھ میں لیکر تلاش فرماتے رہے، تھانہ بھون کے ہر ہر کنویں پر بھی جا کر دیکھتے، کیونکہ ان پر ایک حال طاری تھا، حضرت کو یہ اندیشہ ہوا کہ کسی کنویں میں جا کر نہ گر گئے ہوں، آخر تین دن کے بعد دہلی سے کسی حکیم صاحب کا سفارشی خط لے کر حضرت کے قدموں پر آ کر گر گئے اور بے ہوش ہو گئے، حضرت ان کے سر کو اپنی گود میں رکھ کر خود ہی پنکھا جھل رہے تھے، پھر ہوش آیا تو حضرت نے ان کو بیعت کی اجازت مرحمت فرمائی۔

میں نے جب یہ واقعہ مولانا محمد سعید صاحب سے سنا تو اس کی تصدیق کے لئے اس واقعہ کو حضرت والا کی خدمت میں لکھا، حضرت نے بس اتنا ہی اس پر تحریر فرمایا کہ میرا حال بہت خراب تھا اور اب بھی ہے، اب اپنی حالت اپنے قلم سے کیا لکھوں۔"

یہ واقعہ جہاں ہمیں حضرت کے عشق و تعلق کی داستان سنا رہا ہے، وہیں اس کی بھی صراحت کر رہا ہے کہ اُنس و محبت کا یہ تعلق یکطرفہ نہ تھا، حضرت تھانوی کا قلب بھی حضرت کے جوشش عشق سے پوری طرح متاثر ہے، ایک طرف یہ اضطراب کہ شیخ نے مواخذہ فرمایا ہے، عشاق ہی کچھ سمجھتے ہیں کہ محبوب کی نگاہیں پھر جانے کا شبہہ بھی عاشق کو گذر جاتا ہے تو پوری کائنات کی نگاہیں پھری معلوم ہونے لگتی ہیں، اس کا ذرا سا تغافل عاشق کا جگر شق کر دیتا ہے، پھر اس کیلئے زمین اپنی وسعت و پہنائی کے باوجود تنگ معلوم ہونے لگتی ہے، آغازِ نبوت میں کچھ دنوں کے لئے وحی کا سلسلہ رک گیا تھا، تو خود جناب رسالتمآب ﷺ کا حال کیا ہوا تھا، کبھی کبھی پہاڑ پر اس ارادے سے جاتے کہ خود کو گرا کر ہلاک کر ڈالیں، بات کیا تھی، صرف شبہہ کہ کہیں ربِ دو جہاں کی نگاہیں

تو مجھ سے پھر نہیں گئیں، بالآخر تسلی دی گئی، مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلیٰ ،آپ کے رب نے آپ کو نہ چھوڑا ہے، نہ کینہ اختیار کیا ہے۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مواخذہ وعتاب میں پڑنے کے بعد ان کا کیا حال ہوا، ایسا اضطراب، ایسی بے چارگی کہ اس نے رحمتِ خداوندی کو جنبش دیدی۔ حق تعالیٰ نے اس کو ان الفاظ میں ارشاد فرمایا: حَتّٰی إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَنْ لَّا مَلْجَأَ مِنَ اللهِ إِلَّا إِلَيْهِ ،یعنی زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی، اور انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب اللہ تعالیٰ سے بچ کر سوا اس کی جانب رجوع ہونے کے کوئی چارہ نہیں۔

حالت مواخذہ کی تنگی اور اضطراب کی یہ خبر سب سچوں سے بڑھ کر سچے نے دی ہے۔ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللهِ قِيلاً حق فرمایا، بلاشبہ یہی کیفیت ہوتی ہے، حضرت مولانا نے بھی اپنے محبوب شیخ ومرشد کی نگاہیں پھری ہوئی دیکھیں تو بے تاب ہوگئے، یا اللہ حضرت ناراض ہوگئے، اب کیا کروں، کہاں جاؤں؟ حکم ہے کہ یہاں سے چلے جاؤ، جس بات کا تصور کبھی نہیں کیا تھا، اسی کا حکم ہو رہا ہے، اب کیا ہوگا، بے چینی اور اضطراب میں نکل کھڑے ہوئے، مرتب حالات لکھتے ہیں کہ تھانہ بھون سے دہلی ریلوے لائن پکڑے ہوئے پیدل ہی چل دیئے، ایک حکیم صاحب کے یہاں پہونچے۔

> ”حکیم صاحب سے کچھ تعلق رہا ہوگا، وہاں سے سفارش حاصل کی، حکیم صاحب نے پہلا کام یہ کیا کہ کسی ذریعہ سے حضرت مولانا تھانوی کو فوراً اطلاع کردی کہ مولوی وصی اللہ یہاں میرے پاس دہلی میں ہیں، تا کہ حضرت کو اطمینان ہوجائے۔ (حالات، ج:۱ص:۹۵)

ایک طرف تو یہ کیفیت تھی ، ادھر شیخ ومرشد کا یہ حال کہ خود تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ، دوسروں سے جستجو کرائی ،نہیں پتہ چل سکا، اندیشہ ہوا کہ حال کی تنگی اور گھٹن نے کہیں بے اختیارانہ کچھ اور نہ کرادیا ہو، اندیشہ ہی اندیشہ تھا، مگر کیا کیجئے

ع عشق است و ہزار بدگمانی

نہ جانے کہاں ہوگے ، کس مصیبت میں گرفتار ہوں گے ، لالٹین لٹکا لٹکا کنوؤں میں تلاش ہورہی ہے ،قربان جایئے شیخ کی اس شان پر، جس وقت حضرت تھانوی قدس سرہٗ اپنے چہیتے مرید کی جستجو میں اس طرح سرگرداں رہے ہوں گے ، خانقاہ میں مقیم اس شمع ہدایت کے پروانوں پر کیا گذرتی رہی ہوگی ، ہر دل امید وبیم میں **یارب سلم سلم** کا نعرہ لگاتا رہا ہوگا، ہر زبان پر عافیت وسلامتی کی دعائیں رہی ہوں گی ، یہ رات کس اضطراب و بے تابی اوردعا ومناجات میں گذری ، اب کون بتائے ؟ وہ رات بھی گذر چکی اوراس کی ان عجیب وغریب کیفیات سے دوچار ہونے والے بھی جاچکے،اب کسی کے سینے میں اسی طرح کا دردمند دل ہوتو اندازہ لگائے۔

پھر اللہ ہی جانتا ہے کہ کب حکیم صاحب کا تار آیا اور کب حضرت کو اطمینان ہوا، ہاں اتنی بات راویوں نے محفوظ رکھی ہے کہ:

”آخر تین دن کے بعد دہلی سے کسی حکیم صاحب کا سفارشی خط لے کر حضرت کے قدموں پر آکر گر گئے اور بے ہوش ہوگئے ،اور پھر کیا ہوا“

رحمت خداوندی جوش میں آئی ،حضرت نے اپنی گود میں لٹالیا، عاشق مسکین کا سر اپنے زانو پر رکھ کر خود ہی پنکھا جھلنے لگے۔آہ

بیمارِ محبت کو جب ہوش میں لانا ہو زانو پہ لٹالینا، دامن سے ہوا کرنا

کام پورا ہوچکا تھا، آزمائش کی گھڑی ختم ہوگئی ،اب بشارتوں سے سرفراز کیا

جا رہا ہے، جہاں تک اندازہ ہوتا ہے یہ آخری مواخذہ ہوا، اس کے بعد دوسرا دور شروع ہوگیا، اس دوسرے دور کی ابتداء خود حضرت والا کی زبانِ فیض ترجمان سے سنئے، راوی مولانا عبدالقیوم صاحب فتح پوری ہیں:

''حضرت فرماتے تھے کہ میرا جب دوسرا دور شروع ہوا، تو حضرت مولانا تھانویؒ ہر نشست میں میری تعریف فرماتے تھے (لیکن سامنے نہیں، میری عدم موجودگی میں) چنانچہ بڑی پیرانی صاحبہ بھی بہت ماننے لگیں، اور کبھی کبھی مجھے کپڑا وغیرہ بھی عطا فرماتیں، جب ان حضرات کی ظاہری شفقت مجھ پر بڑھی تو وہاں کچھ لوگوں کو رشک ہونے لگا، چنانچہ ایک خادم نے ایک مرتبہ میری شکایت حضرت سے کردی کہ مولوی وصی اللہ عشا بعد زور زور سے قرآن شریف پڑھتے ہیں، وہاں خانقاہ کا قانون تھا کہ نمازِ عشاء سے فارغ ہوکر لوگ فوراً سوجائیں تاکہ آخر شب میں اٹھنے میں آسانی ہو، اور سنت طریقہ بھی یہی ہے، اس لئے عشا بعد زور زور سے باتیں کرنا یا کچھ پڑھنا پڑھانا وغیرہ جس سے سونے والوں کی نیند میں خلل پڑے اس کی ممانعت تھی، اس لئے اس نے یہ شکایت کی، حضرت نے مجھے بلایا اور فرمایا کہ آپ خلافِ قانون عشا کے بعد زور زور سے کیوں تلاوت کرتے ہیں، میں نے عرض کیا کہ حضرت اس وقت میرا معمول تلاوت کا نہیں ہے، ہاں نماز سے فارغ ہوکر اپنے بستر پر لیٹ کر صرف سورہ ملک پڑھ رہا تھا، حضرت نے فرمایا جایئے۔ (ایضاً، ج:۱، ص:۱۰۵)

دورِ امتحان گذر چکا تھا، اب تو نوازش واکرام ہی کا معاملہ تھا، قدم قدم پر حضرت تھانویؒ دلجوئی ودلداری فرماتے، آپ کی ضروریات کا بطور خود خیال رکھتے اور اس کا اہتمام فرماتے، یہ لذیذ حکایت بھی میرے بجائے حضرت سے ہی سنئے، فرمایا کہ:

’’میں خانقاہ میں مقیم رہتا تھا، حضرت کھانے کیلئے مجھے پیسے دیتے تھے، اور فرماتے کہ جب ختم ہو جائیں پھر لے لینا، میں ختم ہونے کے بعد بھی نہیں مانگتا تھا، حضرت ہی پھر از خود مجھے دیدیتے تھے، ایک مرتبہ حضرت کہیں طویل سفر کیلئے تشریف لے جارہے تھے، تو میں بھی ساتھ ہو گیا حالانکہ میرے جیب میں ایک پائی بھی نہیں تھی، حضرت ہر ایسے اسٹیشن پر پہونچ کر جہاں ٹکٹ لینا ہوتا مجھے پیسے دیدیتے تھے، ہمارے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے، ان کو بھی حضرت پیسے دیتے تھے، ایک بار ان کو ڈانٹا کہ پیسے خود کیوں نہیں مانگ لیتے، کیا ان کی ریس کرتے ہو، اس پر میں نے عرض کیا کہ حضرت اب میں بھی مانگ لیا کروں گا، تو فرمایا نہیں نہیں، تم نہیں لوگے میں جانتا ہوں۔

ان دونوں حضرات کے فرق کو حضرت تھانوی سمجھتے تھے، غالباً یہ خیال فرمایا ہوگا کہ ان کا سوال نہ کرنا تو بوجہ قناعت وتوکل ہے، اگر ان کو نہ بھی دیا جائے تو زبان تو خیر دور کی بات ہے، دل میں بھی ادنیٰ شائبۂ شکایت نہ آئے گا، اس کے برخلاف دوسرے صاحب محض ان کی ریس میں اور ہمسری کے خیال سے سوال نہیں کرتے، ان کا قلبی حال ایسا نہیں ہے، ان کو اگر نہ دیا جائے تو دل میں شکایت تو ہوگی ہی، عجب نہیں کہ زبان بھی ملوث ہو جائے۔

ایک بار حضرت نے فرمایا کہ حضرت تھانویؒ میرے متعلق فرماتے تھے کہ ایسا غیور آدمی میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ پاس تو ایک پائی نہیں اور کسی سے مانگتا بھی نہیں۔ بات یہ ہے کہ حضرت والا کو قناعت وتوکل اور نسبت مع اللہ کی جو دولت حاصل تھی، اس کے سامنے ہفت اقلیم کی سلطنت گرد تھی، اس کے بعد کسی جانب نگاہ اٹھنے، دست سوال دراز ہونے کا مفہوم ہی ختم ہو گیا تھا، لگے ہاتھوں حضرت ہی کا بیان فرمایا

ہوا ایک ملفوظ سنتے چلئے، شاید اس کیفیت کا کچھ سراغ مل جائے، فرمایا کہ:

''حضرت مولانا تھانویؒ فرماتے تھے کہ ہندوستان سے حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں مکہ شریف میں کچھ روپیہ گیا تھا، تقسیم کرنے کے لئے حضرت حاجی صاحب نے کسی سے فرمایا کہ جو لوگ میرے پاس رہتے ہیں ان کے نام لکھ کر دو، میں مقدار لکھ دوں گا پھر تقسیم کر دینا، تو بعض لوگوں کا انھوں نے نام لکھ دیا اور بعض کا نہیں لکھا، انھوں نے عرض کیا حضرت وہ تو حاجیوں سے بھی لے لیتے ہیں، فرمایا انھیں کا تو لکھنا چاہئے، اس لئے کہ جب ان کو اللہ تعالیٰ پر توکل نہیں ہے اور حاجیوں سے لے لیتے ہیں تو ہم تو ان کے پیر ہیں، ہم ہی سے لے لیں اور مجھ سے کوئی دینی فائدہ ان کو نہیں پہونچ رہا ہے تو دنیا ہی لے لیں، اور فرمایا کہ جن کا نام تم نے لکھا ہے، ہمارے پاس اس لئے یہ لوگ رہتے ہی نہیں، یہ تو ہفت اقلیم کی سلطنت کو لات مار دیں، جب حضرت مولانا نے یہ فرمایا تو یہ بات ایسی دل کو لگی کہ میں نے اس کو یاد ہی کر لیا۔ (ایضاً، ج:۱ص:۹۸)

حضرت کی زندگی کا ایک اور رُخ:

قیامِ دیوبند کے ذیل میں یہ بات لکھی جا چکی ہے کہ حضرت مولانا جہاں بالکل سیدھے سادے، لوگوں سے الگ تھلگ رہنے والے، کم گو اور بے زبان تھے، وہیں اعلیٰ درجہ کے ذہین وذکی اور صاحب فراست بھی تھے، عموماً ایسا دیکھا جاتا ہے کہ ذہین افراد بہت تیز وطرار، شوخ وشنگ اور دراز نفس ہوتے ہیں، اور بھولے بھالے لوگ عموماً غبی، کم سمجھ اور سپاٹ ہوتے ہیں، لیکن ہمارے حضرت اس معاملہ میں بھی منفرد اور اپنی مثال آپ تھے، انتہائی خاموش، مگر بہت ذہین، بہت بھولے اور نیک، مگر نہایت دانا اور رمز شناس، بیحد کم آمیز، مگر نفوس کی خرابیوں پر گہری نظر، بالکل بے زبان مگر علوم کی گہرائیوں میں اترے ہوئے۔

قیامِ تھانہ بھون کے عرصے میں اس کے بہت سے نمونے جابجا نظر آتے ہیں اس قسم کے بھی کچھ نمونے سنتے چلئے۔

کمالِ دانائی:

عام طور سے ذہنوں میں یہ بات پیوست ہے کہ تصوف وسلوک کی جانب عموماً وہی افراد آتے ہیں جو ذہنی اِفلاس اور دماغی رُبودگی میں مبتلا ہوتے ہیں، شاید تصوف اور تسبیح و مصلّیٰ کا شغل ایسے ہی لوگوں کے لئے ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ سیدھے سادے ذرا غبی مگر قدرے نماز روزہ کا اہتمام کرتے ہیں، انھیں ''صوفی جی'' کہا جانے لگتا ہے، اس لقب نوازی کے پیچھے کسی عزت وحرمت کا جذبہ نہیں ہوتا، بلکہ یہی ذہنیت ہوتی ہے کہ غبی اور بیوقوف افراد تصوف کی راہ چلیں۔ تھانہ بھون میں حضرت سے یہی سوال کسی نے کیا اور یہی سمجھ کر کیا کہ سیدھے سادے، سپاٹ اسی فہرست کے آدمی ہیں بھلا کیا جواب دے سکیں گے، لیکن حضرت نے جو جواب دیا ہے ہمیشہ کام آنے والا ہے۔ پورا واقعہ حضرت ہی کی زبان سے سنئے، فرمایا کہ:

> ''مجھ سے خانقاہ (تھانہ بھون) میں ایک صاحب کہنے لگے کہ اجی کیا بات ہے کہ جن لوگوں کو استعداد نہیں ہوتی وہ تصوف مین آجاتے ہیں، اور جو ذی استعداد ہوتے ہین وہ دوسری طرف چلے جاتے ہیں، میں نے کہا یہ بات نہیں ہے کہ اُدھر کی استعداد ان کو اِدھر آنے سے روکتی ہے، بلکہ اِدھر کی بے استعدادی (یعنی آخرت کی) ان کو اس میں آنے سے مانع ہوتی ہے (۳) اور میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ وہ سامنے جو بڑے میاں بیٹھے ہیں (مراد حضرت تھانوی تھے) کیا وہ ذی استعداد نہیں ہیں؟ اسی طرح مولانا قاسمؒ اور مولانا گنگوہیؒ ذی استعداد نہیں تھے، امام غزالی ذی استعداد نہیں تھے، اس پر وہ بالکل خاموش

ہو گئے، اور کہنے لگے کہ اجی تم تو سمجھتے ہو، میں نے کہا خوب ہم ہی لوگوں پر اعتراض کرتے ہو اور ہم تمہارے طعن کو دفع بھی نہ کریں، کیا ہم اتنا بھی نہیں سمجھتے، بزرگوں کی خدمت میں رہتے ہیں ان کی برکت سے ہماری سمجھ کھل گئی ہے، اس لئے بات سمجھتے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔ (حالات، ج:۱، ص:۸۸)

حکمت عملی:

دانائی اور فہم کا کھل جانا بھی خدا کی بہت بڑی نعمت ہے، اس کی وجہ سے بعض اوقات راہ اتنی جلد طے ہو جاتی ہے کہ سالک کو پتہ بھی نہیں چلتا اور منزل پر جا پہونچتا ہے۔ ایک واقعہ حضرت نے اپنی مجالس میں بکثرت بیان کیا ہے، خلاصہ اس کا یہ ہے کہ ایک صاحب دل بزرگ جو زبردست عالم بھی تھے، مگر غریب و فاقہ کش! ان کی خدمت میں ایک رئیس زادہ سبق پڑھا کرتے تھے، ایک روز صاحبزادے درس کے لئے حاضر ہوئے تو استاذ کے چہرے پر ضعف و نقاہت کے آثار نمایاں پائے، سمجھ گئے کہ کئی وقتوں کا فاقہ ہے کھانا نہیں کھایا ہے، چہرے کی زردی فاقہ کی وجہ سے ہے، عرض کیا آج سبق پڑھنے کو جی نہیں چاہتا، اگر چھٹی کر دیں تو مہربانی ہوگی، یہاں صورت حال یہ تھی کہ آواز بھی پورے طور سے نہ نکل سکتی تھی، فوراً منظور فرما لیا۔ صاحبزادے گھر گئے اور عمدہ کھانے پکوائے اور خوان میں سجا کر خود اپنے سر پر رکھا اور لے کر حاضر خدمت ہوئے کہ تناول فرمالیں، استاذ بہت خوش ہوئے اور دعائیں دیں، مگر کھانے سے یہ کہہ کر معذرت کردی کہ تم کو میرے فاقہ کا اندازہ ہو گیا تھا، جب تم یہاں سے رُخصت ہوئے ہو اسی وقت میں سمجھ گیا تھا کہ تم ضرور کھانا لاؤ گے، اس کے بعد میری طبیعت میں انتظار سا پیدا ہو گیا تھا، اسی کا نام اِشراف ہے اور حدیث میں اِشرافِ نفس

کے بعد جو کچھ ملے اس کے قبول کرنے سے ممانعت وارد ہے، اس لئے باوجود سخت ضرورت کے معذور ہوں۔ اب صاحبزادے کی دانائی ملاحظہ فرمائیے، اصرار بالکل نہیں کیا، چپکے سے خوان اٹھایا اور چل دیئے۔ استاذ نے تو یہی خیال کیا کہ واپس لے گئے، لیکن تھوڑی دیر کے بعد دیکھتے کیا ہیں کہ خوان لئے ہوئے پھر چلے آرہے ہیں، آکر نہایت لجاجت سے عرض کیا کہ حضرت اب تو انتظار ختم ہوگیا تھا، اب قبول فرمالیجئے، اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ ان بزرگ کو کیسی مسرت ہوئی ہوگی، اور دل کی گہرائیوں سے کتنی دعائیں نکلی ہوں گی اور کیا ان دعاؤں اور قبولیت کے درمیان کوئی حجاب رہا ہوگا؟ سبحان اللہ! اسے دانائی کہتے ہیں، اسی سے ملتا جلتا ایک واقعہ خود حضرت کا سنئے، فرماتے ہیں:

”حضرت تھانویؒ کے یہاں کوئی صاحب کچھ لائے، وہ حضرت کے اصول کے خلاف تھا، حضرت نے نہیں لیا، چونکہ کھانے پینے کی چیز تھی، خراب ہوجانے کا اندیشہ تھا، ایسی چیزیں ایسے موقع پر لانے والا خانقاہ میں مقیم حضرات پر تقسیم کردیتا تھا، چنانچہ وہ بھی تقسیم کردی گئی، میرے حصہ میں بھی اس کا حصہ آیا، میں نے خیال کیا حقیقۃً یہ جن کے لئے آئی ہے وہ تو اس میں ذرا بھی حصہ نہ لیں اور ہم لوگ کھالیں، کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا، اس لئے میں اپنا حصہ لے کر حضرت کے مکان پر پہونچا اور دستک دینے پر جب حضرت باہر تشریف لائے تو میں نے کہا حضرت اب تو یہ چیز میری ہوگئی ہے، مجھ سے قبول فرمالیجئے، فرمایا اچھا تم طالب علمانہ چال چلتے ہو، میں نے عرض کیا آپ کے ساتھ تو کبھی طالب علمانہ چال نہ چلوں گا، پھر حضرت نے قبول فرمالیا اور اندر تشریف لے گئے۔ (حالات، ج:۱،ص:۹۲)

سبق آموزی:

آدمی کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ معمولی واقعات ، معمولی لوگوں بلکہ ناگوار باتوں سے بھی اپنے لئے درسِ عبرت کا سامان فراہم کر لے اور زندگی کی تعمیر میں ان سے مدد لے، حضرت کے یہاں اس کے نمونے آخر عمر تک ملتے ہیں۔ہم تو صرف ان باتوں کا تذکرہ کر رہے ہیں جن کا تعلق خانقاہ تھانہ بھون میں قیام کے دور سے ہے۔

حضرت مولانا فرماتے ہیں:

’’جس زمانہ میں تھانہ بھون میں تھا، حضرت مولانا کے یہاں ایک مسلمان بڑھئی کچھ کام کر رہے تھے ، وہ کبھی کبھی مجھ سے خط لکھواتے تھے، بے چارے پڑھے لکھے نہیں تھے، ایک مرتبہ حضرت کی خدمت میں عرضِ حال کے طور پر کچھ لکھوایا اور اس میں یہ شعر بھی لکھوایا:

دل کو آزارِ محبت کے مزے آنے لگے
صدقے اس ساقی کے جس نے درد پیدا کر دیا

مجھے یہ سن کر بڑا تعجب ہوا، میں نے اپنے دل میں کہا کہ دیکھو اس شخص کا کیسا اچھا حال ہے، ایسا تو ہمارا بھی نہیں ہے، اس کو آزارِ محبت کے مزے آنے لگے، سبحان اللہ، ادھر تو آزار، ادھر مزے کیا اجتماع ضدین ہے، بس اس کے بعد سے سنبھل گیا کہ بھیا یہ دوسری جگہ ہے، یہاں بڑھئی بھی بہت اچھے ہوتے ہیں، کسی کے متعلق دم مارنے کی گنجائش نہیں ہے۔

ایک اور واقعہ سبق آموزی کا ملاحظہ ہو، فرمایا:

’’ایک مرتبہ تھانہ بھون میں مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک صاحب بعد میں آئے اور میرے آگے آکر بیٹھ گئے ، مجھے پہلے تو ناگوار ہوا، مگر پھر میں نے سوچا کہ یہ ناگواری کی جگہ نہیں ہے بلکہ ناگواری یہاں برداشت کرنے کی

جگہ ہے، لہٰذا برداشت کرو اور ایک یہی کیا ، یہاں ایسی ایسی بہت سی ناگواریاں برداشت کرنی پڑیں گی ، اس لئے کہ یہ اصلاح کی جگہ ہے اور تم اصلاح ہی کے لئے یہاں پڑے ہو، تو سمجھ لو کہ یہ باتیں تمہاری اصلاح کے لئے مفید ثابت ہوں گی ، لہٰذا اس سے گھبراؤ نہیں ، بس اس سے بہت تسلی ہوگئی ۔ (ایضاً ، ص: ۸۵)

علمی معاملات میں مرشد کا اعتماد:

جو لوگ حضرت مولانا تھانوی کے مزاج و مذاق سے واقف ہیں ، انھیں اندازہ ہے کہ امت کا یہ حکیم زندگی کے تمام گوشوں بالخصوص علمی مسائل میں کس درجہ محتاط، نکتہ بیں اور نکتہ رَس تھا، گمراہی اور بے راہ روی کی ابتدا علم ہی کی غلطی سے ہوتی ہے، کسی علمی معاملہ میں ٹھوکر کھانے کے بعد مشکل سے آدمی راہ یاب ہوتا ہے، اس سلسلے میں درس و افتاء ہو یا تصنیف و تالیف ، وعظ و تقریر ہو یا تصوف و سلوک کے علوم ومعارف ، ہر جگہ حضرت تھانویؒ بغایت محتاط رہتے تھے، قطعی علم کے بغیر محض ظن وتخمین کی بنیاد پر نہ خود کچھ کہتے اور نہ دوسروں کو کہنے کی اجازت دیتے ، اسی وجہ سے بعض اکابر علماء کی زبانیں بھی تھانہ بھون میں خاموش کردی جاتی تھیں ۔ حضرت حکیم الامت نے علماء کبار کو غور فکر ، بحث و تحقیق اور تلاش و جستجو کی نئی نئی راہیں دکھائیں ۔ ایک ایک مسئلہ پر ہفتوں اور مہینوں غور کرتے رہنا حضرت کا دستور بنا ہوا تھا، کبھی کوئی ناپختہ قول آپ کی زبان وقلم سے صادر نہیں ہوتا تھا، اتفاقاً کسی مسئلہ میں کچھ فروگذاشت ہوگئی اور کسی نے اطلاع کردی تو بے تکلف قبول کرلیا، اطلاع کرنے والا خواہ کسی حیثیت کا شخص ہو، حضرت نے اس کے لئے ”ترجیح الراجح“، مستقل ایک سلسلہ رسالہ ”النور“ میں قائم کر رکھا تھا، اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اتنی احتیاطی بندشیں رکھنے والا اگر کسی کے

علم پر اطمینان کر لے تو اس کی علمی لیاقت میں کیا شبہہ؟ حضرت کو جن لوگوں پر اعتماد ہوتا تھا ان سے اپنی تصانیف کے سلسلے میں گاہے گاہے مدد لیا کرتے تھے، کبھی اپنا لکھا ہوا مسودہ صاف کرنے کو دیتے، کبھی کسی کتاب کی تسہیل و تلخیص کراتے۔ حضرت والا کے ساتھ بھی حضرت تھانویؒ نے یہ امور وابستہ کر رکھے تھے، چنانچہ خود فرماتے ہیں کہ حضرت تھانویؒ اپنی تصنیفات کے سلسلے میں مجھ سے بھی اکثر کام لیتے تھے، مسودات صاف کرنے کے متعلق حضرت کا ایک ارشاد سنئے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت تھانوی کے لکھے ہوئے مسودات کو صاف کرنا ہر ایک کا کام نہ تھا، اس کے لئے علم وفن کی لیاقت شرط تھی، فرماتے ہیں:

”تم لوگوں کو کچھ لکھنے پڑھنے کا کام دے دیتا ہوں تو اس کو لے کر بیٹھے رہتے ہو، ذرا بھی محنت تم لوگوں سے نہیں ہوتی، اور تھانہ بھون میں حضرت مولانا بھی ہم لوگوں کو کام دیتے تھے، کوئی مسودہ لکھ کر دیدیتے تھے، اور فرماتے تھے کہ ابھی صاف کر کے لاؤ، اور حضرت کی تحریر ایسی ہوتی تھی کاغذ کا کوئی حصہ سفید نظر نہیں آتا تھا، قریب قریب سطروں میں لکھتے تھے اور ایک جانب سے لکھ لینے کے بعد اس کو الٹ کر بین السطور پھر لکھتے، کہیں کہیں خط کھینچ کر یا نشان لگا کر مضمون کا جوڑ لگاتے چلے جاتے، ہم لوگ جب اس کو صاف کرنے لگتے تو سر میں درد ہونے لگتا، مگر جو کام ملتا تھا کرتے تھے، چنانچہ بعض مرتبہ کام کی اس قدر کثرت ہوتی تھی کہ کھانا کھانے تک کا موقع نہیں ملتا تھا، اس لئے میں تو کبھی کبھی یہ کرتا تھا کہ دال یا سالن جو بھی کھانے میں ہوتا اس کو پہلے ہی پی لیتا اور پھر تنہا روٹی توڑ توڑ کر کھاتا رہتا تھا اور نظر سے لکھے ہوئے پروف کا مقابلہ کرتا جاتا، اس طرح ایک ہی وقت مین دو کام بسہولت ہو جاتے تھے۔

حضرت حکیم الامت کی مشہور تالیف حیوٰۃ المسلمین جس کے متعلق حضرت تھانوی کا ارشاد ہے کہ مجھ کو اپنی کسی تصنیف کے متعلق یہ خیال نہیں کہ یہ میرے لئے سرمایۂ نجات ہوگی، البتہ حیوٰۃ المسلمین کے متعلق میرا غالب خیال قلب پر یہ ہے کہ اس سے میری نجات ہوجائے گی، اس کو میں ساری عمر کی کمائی اور اپنے لئے آخرت کا سرمایہ سمجھتا ہوں، مگر لوگ اس کو دیکھتے ہیں اور بے وقعت سمجھتے ہیں، میرا تو ارادہ تھا کہ میں ایک بار حیوٰۃ المسلمین کو خود پڑھادوں، مگر ہجوم کے احتمال پر موقوف کردیا، مسلمانوں کو جتنی ذلت اور پریشانی آج کل ہورہی ہے اس کتاب میں ان سب کا علاج موجود ہے۔

اس کتاب کے مقدمہ میں حضرت تھانوی نے قرآن کی بہت سی آیات اور اکابر کے بعض اشعار درج فرمائے تھے، ان کے ترجمے کا کام حضرت ہی کے سپرد ہوا تھا، حضرت کا کیا ہوا یہ ترجمہ شروع کتاب میں بطورِ ضمیمہ کے طبع ہوچکا ہے۔

حضرت تھانوی کی ایک اور مشہور تالیف ''تربیت السالک'' ہے، جس میں راہِ سلوک کی تقریباً بیشتر جزئیات مبسوط طریقے پر بیان کی گئی ہیں، یہ کتاب حضرت تھانویؒ کے اندازِ اصلاح وتربیت کی مکمل آئینہ دار ہے، اسے شائع کرنے کا ارادہ ہوا تو بعض اہل علم وقلم سے حضرت نے اس پر مقدمہ لکھوایا۔ ہمارے حضرت اس وقت خانقاہ میں مقیم تھے، فرماتے ہیں کہ اس میں لندن امریکہ کا ذکر آگیا تھا، فرمانے لگے کہ یہ کتاب سالکین کی تربیت کے لئے ہے، اس کا لندن وغیرہ سے کیا جوڑ؟ حضرت نے جب یہ سنا تو مجھ کو بلا کر فرمایا کہ اگر تمہیں یہ مقدمہ پسند نہیں تو تم دوسرا لکھ کرلاؤ، میں نے عرض کیا حضرت دعا فرمائیں، پھر حضرت والا نے مقدمہ تحریر فرمایا جو حضرت تھانوی کو پسند خاطر ہوا اور وہی جزوِ کتاب بن کر شائع ہوا۔

حضرت تھانوی کے علمی کارناموں میں بیان القرآن کو جو مرتبہ ومقام حاصل ہے، اہل علم پر مخفی نہیں ہے، کہنے کو تو یہ تفسیر اردو زبان میں ہے، مگر علم وحکمت کی وہ نکتہ سنجیاں اور حقائق ودقائق اس میں ہیں کہ علامہ انور شاہ کشمیری جیسا متبحر اور وسیع النظر عالم بھی یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ میں اب تک یہی سمجھتا تھا کہ اردو میں علم نہیں ہے، مگر بیان القرآن نے اس کو غلط ثابت کردیا۔ یہ تفسیر نہایت جامع مگر کسی قدر دقیق ہے، اہل علم کے علاوہ کم لوگ اس سے مستفید ہوسکتے ہیں، اس کی تسہیل کی ضرورت ظاہر کی گئی، مولانا تھانوی نے فرمایا کہ میرے لئے یہ کام تو مشکل ہے ہاں کوئی صاحب اس کی تسہیل کردیں، میں اسے دیکھ لوں گا، چنانچہ ایک صاحب نے کسی قدر تسہیل کا کام انجام دیا، حضرت تھانوی نے ملاحظہ کے بعد فرمایا کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے، سب صحیح ہے مگر یہ تو مستقل تصنیف ہے، میری تفسیر کی تسہیل نہیں ہے، اس کے بعد حضرت والا نے کچھ حصہ کی تسہیل لکھ کر پیش کی، فرمایا کہ ہاں یہ میرے منشا کے مطابق ہے، اس میں میری ہی کہی ہوئی باتوں کی ترجمانی کی گئی ہے، مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے نام ایک مکتوب میں حضرت تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ''حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مشکل عبارات کی بین القوسین میں اپنے لفظوں میں عام فہم تقریر کردیتا تھا جو بلاشبہہ اس حیثیت سے تو نافع اور قابل اطمینان ضرور تھی کہ میں جس قدر لکھتا جاتا تھا حضرت کو حرفاً حرفاً سناتا جاتا تھا، چنانچہ حضرت نے اس کا اپنے منشا کے مطابق ہونا ظاہر بھی فرمادیا تھا، لیکن افسوس اس کا ہے کہ اس کی اب کوئی نقل میرے پاس نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مسودہ عبدالواحد صاحب نامی ایک صاحب کے پاس ہوگا جو کانپور کے تھے، اور میں نے انھیں کی فرمائش پر حضرت کے ایما سے یہ تسہیل شروع کی تھی، مگر ہنوز ڈھائی پارہ کی ہی تسہیل کرسکا تھا کہ بعض عوارض کی بنا پر وہ سلسلہ ہی ختم کردینا پڑا، چنانچہ وہ

سب انھیں کے حوالے کر دیا۔ (حالات: ج۱، ص۱۰۵)

مرشد کی قدر افزائی:

مرشد گرامی کی قدر دانی وعزت افزائی کا سراغ تو ان مکاتیب ہی سے کچھ مل سکتا تھا جو وقتاً فوقتاً آپ کی جانب سے صادر ہوتے رہتے تھے، لیکن افسوس ان کی گم شدگی نے تاریخ کا ایک قیمتی سرمایہ ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دیا، تاہم چند باتیں اس باب میں بھی اخلاف کی خوش قسمتی سے معلوم ہوگئی ہیں جنھیں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ حضرت ہی سے روایت سنئے، فرماتے ہیں کہ:

ایک مرتبہ حضرت تھانوی نے مجلس میں یہ شعر پڑھا:

بنمائے رخ کہ خلقے والہ شوند وحیراں
بکشائے لب کہ نالہ از مرد وزن برآید

رخ دکھاؤ کہ مخلوق تمہاری عاشق وشیدا ہو، لب کھولو کہ مرد وزن نالہ وفریاد میں مشغول ہوں۔

مجالس اور مواعظ میں حضرت تھانوی بکثرت اشعار تو پڑھتے ہی تھے، اس میں کوئی خاص بات نہ تھی، سننے کی بات یہ ہے کی مجلس کے اختتام کے بعد حضرت فرماتے ہیں کہ:

''خواجہ صاحب مجھ سے فرمانے لگے کہ یہ شعر حضرت نے آپ ہی کے لئے پڑھا ہے، خواجہ صاحب کے اس فرمانے پر میں شرما گیا اور اپنے دل میں کہا کہ یا اللہ میں کیا اور میری حقیقت کیا، لوگ بھلا میری بات کیا سنیں گے۔ (ایضاً)

کون کہہ سکتا ہے کہ خواجہ صاحب نے درست نہیں فرمایا تھا، دور بیں نگاہیں غالباً آنے والے دور کو دیکھ رہی تھیں کہ دیوبند اور تھانہ بھون میں نہایت خاموش اور ساکت وصامت طالب وسالک جس کے لب کبھی تکلم آشنا ہوتے ہی نہ تھے، جب

خدا اس کے منہ میں علوم ومعارف کی زبان عطا فرمائے گا، تو حکمت ودانش کا ایک دفتر تیار ہو جائے گا، چنانچہ دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ اٹھارہ سال کے عرصہ سے اس کے ارشادات وملفوظات کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے، اور ابھی ذخیرہ ختم نہیں ہوا، اور تاثیر کا یہ عالم ہے کہ مجلس کی مجلس محو گریہ وبکا اور مشغول نالہ وفریاد! ایک سماں ہوتا۔

مولانا حبیب اللہ صاحب مئوی، حضرت تھانوی کے مسترشدین ومتوسلین میں سے ہیں، تقسیم ہند کے بعد پاکستان تشریف لے گئے، ان کی روایت مئو کے ایک عالم بیان فرماتے ہیں کہ:

"حضرت تھانویؒ کے آخر زمانۂ حیات میں بعض لوگ حضرت سے عرض کرتے کہ حضرت اپنا جانشین کسی کو مقرر فرما دیجئے، چنانچہ خواجہ صاحب نے ایک مرتبہ میرے سامنے بہت اصرار کر کے یہی درخواست کی، تو حضرت نے فرمایا کہ ہمارے احباب مین علماء وصلحاء واتقیا سبھی ہیں، مگر جانشینی کے لئے جو فنا اور جو آداب وشرائط ہیں وہ کسی میں نہیں بجز ایک آدمی کے، مگر وہ اس قدر گمنام ہے کہ تم لوگوں کی نگاہ اس کی طرف نہیں جاسکتی اور بس وہی ایک آدمی اس کے لائق ہے، اس لئے معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں، جب وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ خود ہی کام لے لیں گے، اس وقت ہم بالکل نہ سمجھے کہ اس سے یہ حضرت (یعنی حضرت مصلح الامت) مراد ہیں، لیکن اب دیکھتا ہوں کہ بالکل خانقاہ تھانہ بھون ہی یہاں منتقل ہو کر رہ گئی ہے، اور اب مجھے یقین ہو گیا کہ حضرت تھانوی کے اس جملہ سے یہی مراد تھے۔ (حالات: ج،۱،ص:۱۰۲)

بابا نجم احسن صاحب پرتاب گڈھی نے خوب فرمایا ہے۔

دیکھ دیوانے دیکھ اے احسنؔ یہ بھی گلشن ہے اشرفی گلشن
مجلس حضرت وصی اللہ ہے نمودِ بہارِ تھانہ بھون

(۱) حضرت والا کی یہ کیفیت ابتداء ہی سے آشکارا تھی، آپ کے شیخ ومرشد اور رفقاء درس بھی اس سے واقف تھے، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اپنی پہلی حاضری تھانہ بھون کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ایک روز مجلس میں حضرت تھانویؒ نے مولانا وصی اللہ کا تذکرہ ایک خاص محبت وعنایت اور تحسین کے الفاظ میں فرما کر مجھ سے دریافت کیا کہ آپ ان کو جانتے ہیں، تھانہ بھون کے اس قیام نے اور بھی زیادہ میرے قلب میں اپنے ہم سبق کی سبقت کو قابل رشک اور اپنی تاخیر کو قابل حسرت وافسوس بنادیا تھا، اس سوال پر بے ساختہ حضرت کے سامنے ہی میری زبان سے وہی شعر ہم سبق والا نکل گیا۔

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
او بصحرا رفت و ما در کوچہا رُسوا شدیم

حضرت اقدس نے ایک خاص لطف کے انداز میں ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ ''ہاں یہاں کا یہی دستور ہے، کسی کو صحرا دیا جاتا ہے، کسی کو سہرا دیا جاتا ہے، ہر ایک کو جو کچھ عطا ہوا اس پر راضی ہونا چاہئے۔............ (البلاغ، کراچی، شوال ۸۷ھ)

☆☆☆☆☆☆☆

(۱) حضرت شاہ لطف رسول صاحبؒ نہایت ذکی وذہین، ذی استعداد عالم اور نہایت قوی الحال ذاکر وشاغل درویش تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے بذریعہ خط بیعت ہوئے تھے، لیکن تعلیم حضرت تھانوی کے سپرد فرمادی گئی تھی، اور حضرت ہی کے خلیفہ مجاز بھی ہوئے، آپ حضرت تھانوی کے شاگرد بھی تھے۔ آپ پر خشیت کا اس قدر غلبہ تھا کہ حضرت تھانویؒ فرماتے تھے کہ میں نے ایسے زبردست آثار خشیت کے کسی دوسرے میں نہیں دیکھے۔ عوام کے فائدے کے لئے حضرت تھانویؒ کے مشہور رسالے ''قصد السبیل'' کی تسہیل آپ ہی نے کی تھی، مزاج کی تیزی کے باوجود ایسے متواضع تھے کہ بارہا ایسا ہوا کہ کسی سے تیز گفتگو ہوگئی تو تھوڑی دیر کے بعد ان کی خدمت میں پہونچے اور ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔ آپ پر بعض اوقات شعر سننے پر اس قدر شدید کیفیت طاری ہوجاتی تھی کہ بسمل کی طرح تڑپنے لگتے تھے۔ حضرت تھانویؒ نے خود آپ کے تقویٰ وطہارت کے متعلق ارشاد فرمایا کہ:

''ان کے پاس ایک بیرنگ کارڈ آیا، انھوں نے بے ضرورت سمجھ کر پڑھے بغیر

واپس کردیا، حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ حضرت کارڈ کا مضمون تو پڑھ لیتے پھر واپس کردیتے تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ مضمون پڑھنے کے بعد واپس کرنا خیانت ہوتا، کیونکہ کارڈ سے فائدہ اٹھانا مقصود ہے، وہ فائدہ میں اٹھالیتا اور ڈاک خانہ کو اس کی خدمت کا معاوضہ نہ ملتا۔‘‘

آپ اخیر عمر میں مستقل طور پر تھانہ بھون ہی میں حضرت تھانویؒ کی خدمت میں آگئے تھے، اور وہیں شعبان ۱۳۴۴ھ میں انتقال فرمایا، عمر کوئی زیادہ نہیں تھی۔ حضرت تھانویؒ کے وقف کردہ قبرستان میں سب سے پہلے حضرت شاہ صاحب ہی دفن ہوئے تھے۔ (کاروانِ تھانوی، ص:۱۰۳، بحذفِ یسیر)

☆☆☆☆☆☆☆

(۳) مطلب یہ ہے کہ جن کو تم ذی استعداد سمجھ رہے ہو اور یہ سمجھ رہے ہو کہ وہ اپنی اسی استعداد کی وجہ سے ادھر نہیں آتے تو یہ بات نہیں ہے، بلکہ درحقیقت انھیں استعداد صرف دنیا کی ہے، آخرت کی استعداد انھیں حاصل نہیں ہے، آخرت کی یہ بے استعدادی انھیں طریق میں آنے سے روک رہی ہے اور جنھیں تم بے استعداد خیال کرتے ہو اور یہ بھی دیکھ رہے ہو کہ وہ طریق میں لگے ہوئے ہیں، تو خوب سمجھ لو کہ ہوسکتا ہے کہ وہ دنیاوی استعداد میں کوتاہ ہوں، ورنہ آخرت کی پوری استعداد رکھتے ہیں، اب خود فیصلہ کرلو کہ کس کو ذی استعداد کہو گے، اس کو جو صرف دنیا کی استعداد رکھتا ہے، آخرت سے کورا ہے یا اس کو جو آخرت کی پوری استعداد رکھتا ہے دنیا کی کم؟ اور وہ بھی تمہارے بقول!

☆☆☆☆☆☆☆

باب ۵

تدریس

پہلے یہ بات گذر چکی ہے کہ حضرت والا دیوبند سے فارغ ہوکر فوراً تھانہ بھون اپنے شیخ ومرشد کی خدمت میں باریاب ہوگئے تھے، اور جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ باریابیٔ تھانہ بھون کی تفصیلات مکمل معلوم نہیں ہوسکی ہیں، اس لئے یقینی طور سے نہیں بتلایا جاسکتا کہ اس کی مدت کتنی رہی ہے، اور اس کے بعد تدریس کا مشغلہ کب سے اختیار کیا؟ تاہم یہ بات حتمی ہے کہ تدریسی زندگی کا آغاز مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور ضلع اعظم گڈھ سے ہوا ہے، یہ مدرسہ ضلع اعظم گڈھ میں ایک مشہور ومعروف علمی وتدریسی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے، ۱۳۱۷ھ سے آج تک مسلسل دین اور علم دین کی خدمت کرتا چلا آرہا ہے، اس کی آغوشِ تعلیم وتربیت میں سینکڑوں علماء وحفاظ، واعظ ومصنف اور داعیانِ حق نے پرورش پائی ہے، مدرسہ کے قدیم دستاویزات کی شہادت ہے کہ حضرت مولانا فارغ ہونے کے بعد جلد ہی یہاں تشریف لائے تھے، صورتِ حال غالبًا یہ ہوئی تھی کہ شعبان ۱۳۳۶ھ میں جب دارالعلوم کی تعطیلات ہوئیں تو حضرت کی تھانہ بھون حاضری ہوئی، اور شوال ۱۳۳۶ھ یا اس کے بعد کسی مہینے میں مبارک پور تشریف لائے، کیونکہ ۱۳۳۶ھ میں حضرت مولانا کا احیاء العلوم میں موجود ہونا بعض اندراجات سے معلوم ہوتا ہے۔

جامعہ عربیہ احیاء العلوم کے قدیم طالب علم، حضرت والا کے شاگرد اور اس کی مجلس شوریٰ کے رُکن جناب مولوی محمد صاحب سے اس سلسلے میں کچھ تفصیلات

معلوم ہوئیں، ان کے والد جناب قاری سمیع اللہ صاحب کو اس زمانہ میں جبکہ حضرت مبارکپور میں مقیم تھے، میزبانی کا شرف حاصل تھا۔

اس وقت مولوی محمد صاحب نوعمر تھے، ان کے بیان کے مطابق مولانا محمود صاحب معروفی (۱) جب تک اس مدرسہ میں پڑھاتے رہے مدرسہ کا نظام چلتا رہا، ان کے چلے جانے کے بعد اس میں اختلال شروع ہوگیا، تعلیمی باقاعدگی قائم نہ رہ سکی جس کی وجہ سے طلبہ میں انتشار پیدا ہوگیا، مدرسہ کے منتظمین نے حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری نوراللہ مرقدہٗ سے مدرسہ کی سرپرستی کی درخواست کی، مولانا نے یہ درخواست منظور فرمالی اور مبارکپور نظام کی درستگی کے لئے تشریف لائے، مولانا نے منتظمین سے فرمایا کہ تھانہ بھون سے دو شیر بلا رہا ہوں، انشاء اللہ تعلیمی نظام کی چولیں بیٹھ جائیں گی، چنانچہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے پاس حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب اور مولانا علی احمد صاحب کوئریاپاری کے متعلق لکھا، حضرت نے ہر دو حضرات کو یہاں بھیج دیا، ان دونوں اکابر کے آجانے کی وجہ سے مدرسہ پھر جم گیا اور باقاعدگی کے ساتھ تعلیم ہونے لگی۔

اس دور کے حضرت کے تلامذہ میں مولانا عبدالستار صاحب سابق شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا عبدالجبار صاحب شیخ الحدیث مدرسہ قاسمیہ شاہی مسجد مرادآباد، مولانا حافظ منیر احمد صاحب ابراہیم پوری، مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب مبارکپوری، صدر المدرسین مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور، اور مولانا حکیم بشیرالدین صاحب کوپاگنج والے مشہور و معروف ہیں۔

حضرت کا مزاج و مذاق جسے آپ قیامِ دیوبند اور تھانہ بھون میں دیکھ چکے ہیں، یہاں بھی قائم رہا، تاہل کی زندگی میں ابھی قدم نہ رکھا تھا، مزاج و طبیعت میں

استغنا و توکل بطور ملکہ کے راسخ تھا، اربابِ مدرسہ کی روایت کے مطابق تنخواہ لینی منظور نہ فرمائی، بلکہ حسبۃً للہ درس دینا شروع فرمایا، میزبانی کا شرف جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، مولوی محمد صاحب کے والد جناب قاری سمیع اللہ صاحب کو حاصل ہوا۔

قاری صاحب مرحوم کا مکان مبارکپور کے آخری شمالی محلہ پورہ دلہن میں تھا، یہ مدرسہ سے کسی قدر فاصلہ پر ہے، حضرت کے قیام کا نظم محلہ کی ایک مسجد کے حجرے میں کیا گیا، اسی مسجد میں آپ امامت بھی فرماتے تھے، اس سے پہلے اس مسجد میں باقاعدہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا کوئی اہتمام نہ تھا، اذان کے بعد ایک دو آدمی آئے تو جماعت ہوگئی ورنہ تنہا تنہا لوگ نماز پڑھ لیا کرتے، حضرت نے باقاعدہ جماعت کا نظم کیا، اور ہر نماز کے بعد نماز میں حاضر ہونے والوں کا تفقد فرماتے، غیر حاضر لوگوں کو بلا کر سمجھاتے، کبھی مواخذہ و عتاب بھی فرماتے، پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس مسجد میں جماعت کا نظم آج تک متغیر نہیں ہوا۔

مبارکپور کے دورانِ قیام ذکر و فکر الٰہی کی جو دھن آپ کو لگی تھی، لگی رہی، نہ جانے رات کے کس حصہ میں اٹھ کر مبارکپور کے مغرب میں ایک میل کے فاصلہ پر ایک پوکھرا (تالاب) ہے، رات کے سناٹے میں وہاں چلے جاتے، اس کے کنارے ایک مختصر سی بوسیدہ مسجد ہے، باقی رات اسی میں مصروفِ عبادت رہتے، راقم الحروف نے وہ پوکھرا اور وہ مسجد دیکھی ہے، اب تو وہاں آبادی کے کچھ آثار ہوگئے ہیں ورنہ پہلے وہ ایسا سنسان اور ویران علاقہ تھا کہ دن میں بھی وہاں جاتے ہوئے دہشت و خوف معلوم ہوتا تھا، ادھر آدمیوں کا گذر بہت کم تھا، اس خاموش اور سنسان جگہ میں حضرت تن تنہا رات کو اٹھ کر نکل جاتے، اس میں کسی موسم کی تخصیص نہ تھی، جاڑا، گرمی، برسات، اندھیری اور اجالی رات سب برابر تھی۔

مولوی محمد صاحب کا بیان ہے کہ حضرت کے اس حال کی خبر کسی کو نہ تھی، اور ظاہر ہے کہ رات کی تاریکی اور سناٹے میں دہرایا جانے والا کوئی عمل مخلوق پر آشکارا ہوتا بھی تو کیونکر؟ لیکن جاڑوں کی ایک صبح کو صورتحال ایسی پیش آئی کہ یہ رازِ نہاں کھل کر ہی رہا، ہوا یہ کہ سردیوں کی ایک ٹھنڈی شب میں غالباً حضرت کو غسل کی ضرورت پیش آئی، آپ رات ہی میں حسب معمول پوکھرا پر تشریف لے گئے اور وہاں غسل فرمایا، سردی شدت کی تھی، بدن میں کپکپی جو لگی تو کسی طرح بند ہی نہ ہوئی، مجبوراً وہاں سے واپس تشریف لائے، اور اسی وقت قاری سمیع اللہ صاحب کا دروازہ کھلوایا، قاری صاحب نے آپ کو جو اس تھرتھراہٹ اور کپکپاہٹ میں دیکھا تو گھبرا گئے، حضرت نے فرمایا آگ جلاؤ، آگ جلائی گئی، اس سے گرمی حاصل ہوئی اور طبیعت کو قرار ہوا۔

مولوی محمد صاحب فرماتے ہیں اس وقت بھی حضرت پر بہت جلد جلد کیفیات کا ورود ہوتا تھا، اور ہم لوگ محسوس بھی کر لیتے تھے، چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ آنکھیں بالکل شعلہ کی طرح سرخ ہوجاتیں اور زبردست ہیبت طاری ہوجاتی تھی، اکثر خاموش رہتے، بس ایک خاص طرح کی دھن تھی۔

اس وقت کا ایک عجیب واقعہ بھی مولوی صاحب موصوف نے سنایا، وہ یہ کہ ایک بار بہت سخت قحط پڑا تھا، برسات کا موسم گذرتا جارہا تھا، مگر بارش کا ایک قطرہ زمین پر نہیں آیا، خلق خدا پریشان تھی، تین دن تک نمازِ استسقاء پڑھی گئی، دعائیں کی گئیں، دو دن حضرت والا نے دعاء کی اور نماز استقساء پڑھائی، اور ایک دن حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مبارک پوری (۲) نے، مگر بارش نہیں ہوئی، بعض ناخدا ترس رضا خانی جماعت کے افراد نے طنز وطعنہ شروع کیا کہ دیوبندیوں نے تین دن تک سر پٹکا مگر بارش نہیں ہوئی، اس سے لوگوں کو بہت ایذاء ہوئی۔ ایک دن حضرت والا اپنی

مسجد میں حجرے کی طرف منہ کئے بیٹھے تھے، محلّہ کے چند افراد اور موجود تھے، قاری سمیع اللہ صاحب نے عرض کیا کہ:

مولانا صاحب! ایک بات کہنی ہے، حضرت نے مسکراتے ہوئے فرمایا،

کہئے! انھوں نے کہا

ڈر معلوم ہوتا ہے، فرمایا

ڈر کی کیا بات ہے، کہئے! کہنے لگے

تین دن ہم لوگوں نے دعا مانگی، مگر بارش نہیں ہوئی، بریلوی لوگ طعنہ دے رہے ہیں، اتنا سننا تھا کہ حضرت نے خاموش ہو کر گردن جھکا لی اور تقریباً دس منٹ تک جھکائے بیٹھے رہے، معلوم نہیں اپنے کریم پروردگار سے کیا مناجات اور عرض و نیاز کی، دس منٹ کے بعد جو سر اٹھایا تو کسی کو نگاہ ملانے کی تاب نہ تھی، آنکھیں بالکل سرخ تھیں، تمام لوگ ہیبت زدہ ہو گئے، قاری سمیع اللہ صاحب متاسف ہوئے کہ میں نے کیوں سنا دیا؟ دو تین منٹ کے بعد جب اس کیفیت سے افاقہ ہوا تو فرمایا:

''حافظ صاحب! اگر آسمان سے ایک قطرہ بارش کا نہ گرے اور اللہ تعالیٰ امرتی (ایک طرح کی مٹھائی) کھانے کو دیں تو کیا حرج ہے'' یہی جملہ بار بار دہرایا، اس وقت تو لوگوں کو کچھ محسوس نہ ہوا، مگر چند ہی روز کے بعد حضرت کے اس جملہ کا مطلب سمجھ میں آنے لگا، کاروبار جو بالکل ٹھپ تھا کھلا، اور ایسا کھلا کہ گھروں میں دولت پانی کی طرح بہنے لگی۔ کپڑے کے جن تھانوں میں ساٹھ ستر روپئے کی بچت ہوتی تھی، ان میں پانچ پانچ سو کی بچت ہونے لگی، یہ حال تین سال تک قائم رہا۔ گویا تین دن کی دعاؤں کی قبولیت کا ظہور تین سال قائم رہا، پھر کاروبار حسب معمول آ گیا۔

حضرت کا قیام وہاں بسلسلۂ تدریس پانچ سال رہا، پھر تھانہ بھون تشریف

لے گئے، مولوی محمد صاحب کے بقول حضرت دوسال مسلسل وہاں مقیم رہے، اندازہ ہے کہ ۱۳۴۱ھ میں تھانہ بھون تشریف لے گئے ہوں گے، اور ۱۳۴۳ھ میں وطن واپسی ہوگئی ہوگی۔ احیاء العلوم کے قدیم ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۴۳ھ میں وطن کے پتے پر دوبارہ حضرت کو خط لکھ کر مدرسہ میں آنے کی درخواست کی گئی اور اسی سال حضرت نے نکاح کی سنت بھی ادا کی، حضرت کسی وجہ سے تشریف نہ لا سکے۔ صفر ۱۳۴۵ھ میں پھر درخواست کی گئی اور حضرت مع اہل خانہ کے مبارکپور تشریف لائے، حضرت کے چھوٹے بھائی جناب رفیع اللہ صاحب ہمراہ تھے۔ دلہن پورہ والوں نے بہت چاہا کہ حضرت کا قیام پھر اسی محلّہ میں ہو، مگر مناسب مکان نہ ملنے کی وجہ سے مبارکپور کے جنوبی محلّہ میں مکان لے کر قیام پذیر ہوئے، اور رجب ۱۳۴۵ھ تک احیاء العلوم میں درس دیا، اس کے بعد کچھ کبیدگی کی صورت ہوئی، اور احیاء العلوم چھوڑ دیا، مولانا شکر اللہ صاحب کلکتہ گئے ہوئے تھے۔ حضرت فتح پور تشریف لے گئے، اس کے بعد قیام زیادہ تر فتح پور ہی میں رہا۔

تلاوتِ قرآن سے تاثر:

حضرت کے برادر خورد جناب رفیع اللہ صاحب کا بیان ہے کہ حضرت مبارک پور میں بس مدرسہ میں پڑھانے جاتے اور وہاں سے آکر اپنی مسجد کے حجرہ ہی میں رہتے، قصبہ میں کہیں آنے جانے کا دستور بالکل نہ تھا۔ ہاں کبھی کبھی جمعہ کو کسی کسی جگہ تشریف لے جاتے۔ ایک مرتبہ اعلان ہوا کہ فلاں جگہ قرأت ہوگی، اس وقت مبارکپور میں کبھی کبھی حفاظ اور قراء اکٹھا ہوکر باری باری قرآن کی تلاوت کرتے، اس سے شرکاء محفل محظوظ ہوتے اور اپنا ایمان تازہ کرتے۔ چنانچہ اعلان کے مطابق لوگ جمع ہوئے، لوگوں نے حضرت سے بھی تشریف لانے کی درخواست کی، سب سے

پہلے پورہ معروف کے ایک قاری صاحب نے قرآن سنایا، اس کے بعد قاری نعمت اللہ صاحب نے کوئی رکوع پڑھا، جس میں قیامت کا ذکر تھا۔ تلاوتِ قرآن اور پھر قیامت کا بیان! قاری صاحب کے خوش الحانی سے پڑھنے نے ایک سماں باندھ دیا۔ حضرت سنتے رہے، بالآخر اثر ضبط سے باہر ہوگیا اور بڑے زور سے چیخ مار کر بیہوش ہوگئے، لوگ پریشان ہوگئے، قرأت موقوف ہوگئی اور حضرت کو آرام کرسی پر اٹھا کر لوگ قیام گاہ پر لائے۔ سبحان اللہ! یہ حضرت کے تعلق بالقرآن کا رنگ تھا اور حقیقی واصلی حال یہی ہے جو اللہ والوں کو حاصل ہوتا ہے۔ (حالات مصلح الامت، ج:۱،ص:۱۶۱)

کانپور کا قیام:

مبارک پور سے تعلق ختم ہونے کے بعد حضرت کچھ دنوں کے لئے کانپور بھی تشریف لے گئے، سنہ تو محفوظ نہیں، لیکن یہ بات متعین ہے کہ مبارک پور کے ترک اور کانپور کے تعلق کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے، مدرسہ عربیہ اشرف العلوم جس کے بانیوں میں مولانا محمد عثمان صاحب فتح پوری بھی تھے، اسی میں درس کا سلسلہ شروع فرمایا۔ ہادی حسن صاحب کی مسجد کے ایک حجرے میں قیام تھا، طلبہ وہیں آکر سبق پڑھا کرتے تھے، پھر مدرسہ میں کچھ اختلاف کی صورت پیدا ہوگئی، اصلاح کے بعد مدرسہ کا نام جامعہ اسلامیہ رکھا گیا، اس میں بھی تھوڑے عرصہ تک حضرت رہے۔ کانپور میں حضرت کے ہمراہ جناب رفیع اللہ صاحب بھی تھے۔ ایک دن حضرت نے بھائی سے فرمایا کہ حضرت مولانا تھانوی یہاں تشریف لا رہے ہیں، میرا اب یہاں رہنے کا ارادہ نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ میں حضرت کے ہمراہ تھانہ بھون چلا جاؤں، میرے جانے کے بعد تم گھر چلے جانا، چنانچہ مولانا تو حضرت تھانویؒ کے ساتھ تھانہ بھون تشریف لے گئے، اور رفیع اللہ صاحب گھر لوٹ گئے۔

اس بار تھانہ بھون کا قیام قدرے طویل ہوا، خانقاہ تھانہ بھون میں ایک مدرسہ بھی امدادالعلوم کے نام سے چلتا تھا، حضرت تھانویؒ نے تدریس کے فرائض حضرت کے سپرد کیئے اور مسجد خانقاہ کی امامت بھی۔ قیام تھانہ بھون کے حالات اپنی معلومات کے بقدر پیش کیئے جا چکے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

حضرت مولانا محمد محمود صاحب معروفی، پورہ معروف کے نامور عالم وطبیب مولانا حکیم محمد طاہر صاحب کے پوتے تھے، والد کا نام محمد ظاہر تھا۔ قرآن مجید کی تعلیم کے بعد عربی فارسی کی کتابیں گھر ہی پر پڑھیں، ۱۳۱۱ھ میں مدرسہ فیض عام کان پور میں داخل ہوئے اور مولانا احمد حسن کان پوری اور دیگر اساتذہ سے درس نظامیہ کی تکمیل کی۔ طالب علمی ہی کے زمانہ میں مولانا کو مطالعۂ کتب کا خاصا ذوق پیدا ہو گیا تھا، مطالعہ کے بعد ہر کتاب کے سرورق پر اپنی یادداشت کی فہرست، مجمل ومشکل مقامات کی تشریح وتوضیح اور کتابوں کے حوالے کے ساتھ تحریر کرتے رہتے تھے، یہ کتابیں آج بھی مولانا کے کتب خانہ میں موجود ہیں، جن سے ان کی وسعت مطالعہ اور کثرت معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا محمود صاحب اور ان کے چند رفقاء ایسے تھے جو سالوں درس وتدریس کے بعد مزید تحقیق وتدقیق کی غرض سے مولانا احمد حسن کانپوری سے دوبارہ پڑھ رہے تھے، مگر مولانا محمود صاحب سے اشکال واعتراض اور شکوک وشبہات پیش کرنے میں کوئی سبقت نہیں کر پاتا تھا، اسی لئے مولانا احمد حسن صاحب انھیں اپنے بچے کی طرح مانتے تھے، ۱۳۱۴ھ میں فارغ ہوئے، مولانا کان پوری نے جو انھیں سند دی ہے اس میں مختلف علوم وفنون کی اکیس کتابوں کے نام درج ہیں، تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد دو سال گھر ہی پر رہ کر طلباء کو پڑھاتے رہے، ۱۳۱۷ھ میں جب احیاء العلوم مبارکپور کا قیام عمل میں آیا تو آپ اس کے پہلے مدرس منتخب ہوئے، تفہیم مطالب میں مولانا کو غیر معمولی ملکہ حاصل تھا، آپ کے تلمیذ رشید مولانا شکر اللہ صاحب مبارکپوری فرمایا کرتے تھے کہ میں نے بہت سے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی مگر مولانا محمود صاحب جیسا پڑھانے والا کسی کو نہ پایا۔ مبارک پور میں آپ کے شاگردوں میں کئی نامور عالم ہوئے، جن میں مولانا نعمت اللہ مبارکپوری، مولانا شکر اللہ مبارکپوری، مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب، مولانا محمد امین ادروی، مولانا محمد صابر مئوی وغیرہ۔

ایک عرصہ تک احیاء العلوم میں تدریس کے بعد بعض قومی وملی امور اس کے متقاضی ہوئے کہ آپ پورہ معروف کے قریب ہی رہیں، چنانچہ آپ دارالعلوم مئو میں بحیثیت صدر مدرس آ گئے، لیکن

۱۳۲۴ھ میں والد ماجد کے انتقال کے بعد دارالعلوم سے مستعفی ہو کر گھر ہی پر رہنے لگے، اور ۱۳۳۰ھ میں مدرسہ معروفیہ کی بنیاد ڈالی، اس کے بعد ۱۳۵۶ھ میں ایک دوسرا مدرسہ اشاعت العلوم کے نام سے جاری کیا۔

مولانا کے مزاج میں بڑی ظرافت تھی، عموماً سوالات کے جواب ظرافت آمیز طور پر دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ میں نے انتہائی ناراضگی اور غصہ کے عالم میں اپنی بیوی کو طلاق دیدی ہے، کیا ایسی حالت میں طلاق پڑ جائے گی، آپ نے برجستہ فرمایا، ہمارے یہاں تو جب لوگ اپنی بیوی سے بہت خوش ہوتے ہیں تب طلاق دیتے ہیں۔

غیر معمولی علمی صلاحیتوں کے ساتھ مولانا طب وحکمت میں بھی مہارت رکھتے تھے، راجہ عظمت گڈھ کے خاص معالج تھے، اور خطیر رقم بطور وظیفہ کے آپ کو یہاں سے ملتی تھی۔ ۱۳۵۴ھ میں حج بیت اللہ کی سعادت سے بھی مشرف ہوئے۔ غرض مولانا محمود صاحب کی ذات جامع کمالات تھی، تالیفات میں آپ کے وہ حواشی ہیں جو اپنی کتابوں پر تحریر کئے ہیں، یہ علم وفن کے اعتبار سے بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں، مگر شائع نہ ہونے کی وجہ سے علمی دنیا میں معروف نہ ہو سکے۔ ۷/شعبان ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۴/اپریل ۱۹۵۱ء کو وفات ہوئی، اور اپنے آبائی قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔

(تذکرۂ علماء اعظم گڈھ، ص: ۳۰۵ تا ۳۰۷ ملخصاً)

(۲) حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مبارکپوریؒ، حضرت کے دورۂ حدیث کے رفقاء میں ہیں۔ (نہایت ذہین وفطین تھے، دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث میں پہلی پوزیشن سے کامیاب ہوئے تھے) حضرت والا سے بے تکلفی کے تعلقات تھے۔ ابتدائی تعلیم مبارک پور میں بڑی عسرت اور تنگدستی کے زمانے میں حاصل کی، گھر والوں کی جانب سے تعلیم میں رکاوٹ تھی، شوقِ علم کے ہاتھوں مجبور ہو کر چپکے سے الہ آباد مدرسہ مصباح العلوم چلے آئے، کچھ دنوں لاہر پور ضلع سیتاپور کے ایک مدرسہ میں رہے، پھر ریاست مینڈھو مولانا ماجد علی صاحب کی خدمت میں پہونچے، اور اخیر میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، فراغت کے بعد سے اخیر عمر تک مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور کے ناظم رہے۔ مدرسہ کی کوئی مستقل عمارت نہ تھی اسے تعمیر کرایا، شاندار جامع مسجد بنوائی، عیدگاہ تعمیر کرائی۔ مولانا کو حق تعالیٰ نے بڑا رعب وجلال اور دبدبہ وشوکت عطا فرمائی تھی، مولانا کے عہد سے پہلے مبارک پور میں اہل حق بہت کم تھے، مولانا کی مجاہدانہ وداعیانہ سرگرمیوں کے نتیجے میں اہل حق کی ایک منظم جماعت تیار ہوئی۔ بڑے بہادر اور بلند حوصلہ تھے، آج مبارکپور اور اس کے اطراف کا علاقہ مولانا کے کارناموں کا مرہون منت ہے، (۵/ربیع الاول) ۱۳۶۱ھ میں وصال ہوا۔ (تفصیل کیلئے دیکھئے "تذکرۂ علماء مبارکپور)

باب ٦

نکاح

اب تک کی تفصیلات سے یہ بات علم میں آچکی ہے کہ حضرت والا کو مزاجی اعتبار سے تجرد وتفرد کا خاص ذوق تھا، تعلقات، دل کی مشغولیت اور دنیاوی مصروفیتوں سے کوسوں دور رہنا آپ کی طبیعت کا ملکہ تھا۔ اللہ کی یاد دل میں اس طرح گھر کرچکی تھی کہ ماسوا کی گنجائش باقی نہ چھوڑی تھی، اسی بناپر عمر کا خاصا حصہ تجرد میں گزار دیا۔ عمر کا جو دور جوانی کی امنگوں اور جوشِ شباب کا ہوتا ہے اسے تو خانقاہی مشاغل ذکر وفکر اور عبادت وریاضت میں گزار دیا۔ والدہ کی خواہش تھی کہ نکاح ہوجائے اور اپنی آنکھوں سے آباد گھر دیکھ لیں، لیکن حضرت خوش اُسلوبی سے ٹال جاتے، دوسروں سے کہلواتیں تو انھیں صاف صاف جواب دیدیتے، آخر ایک ایسا واقعہ ظہور میں آیا کہ اس کے بعد والدہ کو تحریک بلکہ اصرار کا ایک اچھا موقع ہاتھ آگیا اور اس کے بعد ہی آپ نے نکاح پر آمادگی ظاہر کی، یہ واقعہ حضرت کے بردار خورد رفیع اللہ صاحب کی زبانی سنئے! کہتے ہیں:

> ”زمانۂ قیام تھانہ بھون میں جب ہمارے حضرت کو خلافت ملی تو اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد وہاں ایک صاحب تھے جو غالباً حضرت حکیم الامت کے قریبی عزیز بھی ہوتے تھے، ان کی یہ خواہش ہوئی کہ اپنی صاحبزادی کی نسبت ہمارے حضرت سے کردیں، اگرچہ دنیوی رسم ورواج کے مطابق ان کا خاندان اور حضرت کا خاندان الگ الگ تھا، لیکن انھوں نے حضرت والا کی دینداری

اور تقویٰ کی وجہ سے اس پہلو سے صرف نظر کر کے خواجہ صاحب سے عرض کیا کہ وہ اس مسئلہ میں کچھ سلسلۂ جنبانی فرمائیں، خواجہ صاحب نے مشورہ دیا کہ آپ خود اس خیال کو مولوی وصی اللہ صاحب سے براہ راست ظاہر کر دیجئے، اور اگر یہ آپ کے نزدیک مناسب نہ ہوتو پھر حضرت اقدس کو واسطہ بنایئے، چونکہ یہ خواہش ان کے دل میں گھر کر چکی تھی اس لئے حضرت تھانوی سے انھوں نے ہمت کر کے اپنا مدعا عرض کر ہی دیا، اور ساتھ ہی یہ بات بھی بتادی کہ سارا خرچ اپنی لڑکی کا اپنے ہی ذمہ رکھوں گا جب تک مولوی صاحب کہیں برسر روزگار نہ ہو جائیں، ان پر اس کا کچھ بار نہ ہوگا۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ آپ کی خاطر سے میں ان سے کہہ تو سکتا ہوں، لیکن میرے نزدیک مناسب یہی ہے کہ آپ خود گفتگو کرلیں، میرا اور ان کا تعلق آپ کو معلوم ہے، ایسا نہ ہو کہ میرے مشورہ کو وہ حکم کا درجہ دے کر اپنی رائے ختم کر دیں، اور نکاح مجبوراً انھیں کرنا پڑے، تاہم وہ صاحب اسی پر مصر رہے کہ حضرت فرمادیں۔

حضرت مولانا تھانویؒ نے ایک دن حضرت کو بلا کر فرمایا کہ میں اس وقت آپ کو صرف ایک صاحب کا پیغام پہونچانا چاہتا ہوں، جو نہ تو میرا حکم ہے اور نہ اس پر آپ مجبور ہیں، میں صرف ایک واسطہ ہوں، قبول عدم قبول کا آپ کو پورا اختیار ہے، اور آپ کے اطمینان کے لئے یہ بھی کہتا ہوں کہ آپ اگر اس بات کو رَد کر دیں گے تو مجھے ذرہ برابر نا گواری نہ ہوگی۔ اس کے بعد ان صاحب کی خواہش کا اظہار فرمایا، ہمارے حضرت نے ذرا تامل کے بعد عرض کیا کہ ابھی تو میرا ارادہ نکاح کا ہے ہی نہیں، اور اگر ہوگا تو میری والدہ موجود ہیں، ان کے مشورہ سے کروں گا، اور اپنے ہی خاندان میں کروں گا۔

حضرت نے فرمایا جزاک اللہ آپ کی اس صاف گوئی سے طبیعت بہت خوش ہوئی۔ (حالات مصلح الامت، ج:۱،ص:۱۰۷)

حضرت مولانا نے یہ گفتگو وطن آکر والدہ سے نقل کردی۔ آپ کا منشاء تو یہ تھا کہ میرا ابھی نکاح کا کوئی ارادہ نہیں، حضرت تھانوی کی وجہ سے شاید یہ ذمہ داری قبول کرنی پڑ جاتی، مگر آپ کے حوالے سے گلوخلاصی ہوگئی، لیکن ماں جو سب سے زیادہ اس بات کی دلدادہ ہوتی ہے کہ اپنے بچے کا گھر آباد ہوتا دیکھ لے، بھلا اس کو اسی بہانے آگے بڑھنے سے کون روک سکتا تھا۔ والدہ نے اسی بات کو پکڑ کر تلاشِ رشتہ کی فکر شروع کردی، ورنہ تو حضرت اپنے تجرید وتفرید میں خوش تھے، کبھی کبھی حضرت والا اپنے مخصوص مزاج کے لحاظ سے فرمایا کرتے تھے کہ:

''میں تو سمجھتا تھا کہ تین کام مجھ سے ہو ہی نہیں سکتے، ایک تو نکاح (اور اس کے بعد امورِ خانہ داری کے انتظامات) دوسرے مکان بنوانا، چنانچہ میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ مجھ سے یہ کام تو کسی طرح نہ ہوسکے گا۔ تیسرے مقدمہ بازی، اس جھنجھٹ کو تو یوں سمجھتا تھا کہ مجھ سے تو یہ کام کسی طرح ہو ہی نہیں سکتا، لیکن

مادر چہ خیالیم وفلک در چہ خیال

بالآخر ایک ایک کرکے مجھے سب ہی کرنا پڑا۔ (ایضاً،ص:۱۵۴)

تفصیل تو ہر ایک کی اپنے اپنے موقع پر آئے گی، یہاں تو ذکر ہے کہ نکاح کی مشغولیتوں سے جس نے اپنے کو دور رکھنے کی بات سوچ رکھی تھی، اتباعِ سنت کی ادائیگی پر اسی کو اس طرح آمادہ وتیار کیا جارہا ہے، تجرد وتفرد کا ذوق ایک طبعی ومزاجی خصوصیت تھی، اور نکاح واولاد کے تقاضوں میں مبتلا ہونا ایک شرعی مطالبہ اور ذمہ داری ظاہر ہے کہ جہاں ذوق وطبع پر شریعت اور دین کے غالب کرنے کا حکم ہو بھلا وہاں

ذوق ومزاج کیونکر غلبہ حاصل کرسکتا ہے۔

بہرکیف والدہ نے رشتہ گھر ہی میں طے کرلیا۔اس کی صورت یہ ہوئی کہ ایک صاحب جناب عبدالحی خاں صاحب جونویں پشت پر حضرت کے ہم جد تھے، فتح پور ہی کے باشندے تھے، نوعمری میں ان کا انتقال ہوگیا، پس ماندگان میں اہلیہ تھیں اور دو چھوٹی چھوٹی بچیاں۔ عبدالحی خاں کے انتقال کے بعد ان کی اہلیہ دشواریوں میں پڑگئیں، خود اپنے اخراجات کا مسئلہ تھا اوران دو بچیوں کی پرورش ونگہداشت! ان کے عزیز واقرباء کو بھی فکر تھی، حضرت کے بڑے بھائی جناب حافظ عبدالعلیم صاحب نے ان کو نکاح کا پیغام بھیجا، انھوں نے اس شرط پیغام منظور کیا کہ میری بچیوں کو مجھ سے جدا نہ کیا جاوے، حافظ صاحب نے یہ شرط منظور کرلی اور نکاح ہوگیا، وہ اپنی دونوں بچیوں کو لے کر حضرت کے آبائی مکان میں جو کہ مشترکہ تھا، آگئیں۔ حضرت ہی کے گھر میں دونوں کی پرورش ہوئی، ان میں چھوٹی صاحبزادی جمیلہ خاتون سے حضرت کی والدہ کو بہت تعلق خاطر تھا، لوگوں کا بیان ہے کہ وہ بہت شریف، نیک مزاج اور بے زبان خاتون تھیں، والدہ مرحومہ نے انھیں کی بات پختہ کرلی، لیکن ابھی حضرت کی منظوری کا مسئلہ باقی تھا، اس کیلئے والدہ نے چودھری عبدالوحید صاحب کو جو کہ حضرت کے ہم عمر اور بچپن کے ساتھی تھے، واسطہ بنایا، انھوں نے ایک عجیب عنوان سے حضرت کے سامنے بات رکھی۔ کہنے لگے کہ مولانا ایک مسئلہ بتائیے؟ فرمایا کہ پوچھو، کہا کہ یہ بتلائیے کہ نکاح کرنا سنت ہے نا؟ یہ سن کر مولانا ہنسے اور فرمایا کہ تمہارا مطلب خوب سمجھتا ہوں، ہمارے فتویٰ سے ہمیں کو محجوج کرنا چاہتے ہو، اچھی بات ہے، جا کر والدہ سے کہو کہ رشتہ تلاش کریں، حضرت کی آمادگی دیکھ کر والدہ نے بتایا کہ یہاں بات پختہ ہوچکی ہے، چنانچہ حضرت کا نکاح جمیلہ خاتون سے کردیا گیا، متعین طور سے تو نہیں بتایا

جاسکتا کہ نکاح کس سنہ میں ہوا؟ حضرت کے یہاں تاریخ وسنین کا کوئی اہتمام نہ تھا، وہاں تو ایک دوسری ہی دھن تھی جس نے سب حدیثِ ماسوا سے بے نیاز کر رکھا تھا، تاہم اندازہ ہے کہ ۱۳۴۳ھ یا ۱۳۴۴ھ رہا ہوگا، کیونکہ قیامِ مبارکپور کے ذیل میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت ابتداءً وہاں پانچ سال مقیم رہے وہ تجرد کا دور تھا، تدریس کا آغاز آپ نے ۱۳۳۶ھ میں کیا تھا، اس لحاظ سے ۱۳۴۱ھ تک مبارکپور میں تشریف فرما رہے، اس کے بعد دو سال تک مسلسل تھانہ بھون میں آپ کا قیام رہا، ۱۳۴۳ھ میں واپسی ہوئی، بعدازاں ۱۳۴۵ھ کے آغاز میں دوبارہ مبارکپور تشریف آوری ہوئی، اور مع اہلیہ کے ہوئی، اس لئے قیاس یہی ہے کہ ۴۳ھ یا ۴۴ھ کا زمانہ رہا ہوگا، اور عمر شریف تیس سے کچھ اوپر ہی تھی۔ حضرت پیرانی صاحبہ کی رفاقت حضرت کے ساتھ پچیس سال سال رہی، غالبًا ۱۳۶۶ھ میں ان کا وصال ہوا۔ چار صاحبزادیاں اپنی یادگار چھوڑیں، جن کا ذکر آگے آئے گا۔ حضرت نے ان کے وصال کے بعد نکاح نہیں کیا، بچیوں کی تربیت خود فرمائی۔ وصال کے وقت پیرانی صاحبہ کو صاحبزادیوں کی جانب سے فکرمند پایا تو انھیں اطمینان دلایا کہ میں تمہارے بعد نکاح نہیں کروں گا، اور رہا تربیت و پرورش کا مسئلہ تو اس سلسلے میں فرمایا کہ تم تو ہمیشہ بیمار ہی رہیں، تمہاری موجودگی میں بھی پرورش میں نے ہی کی اور تمہارے بعد بھی انشاء اللہ ان بچیوں کو کوئی تکلیف نہ ہوگی، چنانچہ حضرت نے اپنے دونوں وعدے پورے کر دکھائے۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب ۷

قیامِ وطن (۱)

اب وقت آ گیا ہے کہ امت کا یہ مصلح اور اللہ کا ولی ہر طرف سے یکسو ہو کر کسی ایک جگہ بارِ اقامت ڈال دے، اور دین خالص اور کلمۂ حق کی جانب لوگوں کو پوری قوت اور کوشش کے ساتھ دعوت دے، جو امانت حق تعالیٰ کی طرف سے حضرت تھانویؒ کے ہاتھوں سونپی گئی ہے اس کو مخلوق میں عام کرے، ضلالت و بے دینی نے عبد و معبود کے جس مقدس رشتہ کو توڑ رکھا ہے، پھر سے اسے اُستوار کرے، اللہ کا نور جو ابھی تک سینہ میں مستور ہے اسے آشکارا کرے، تا کہ عالم اس نور سے جگمگا اٹھے۔ دیکھئے کس خوش نصیب خطۂ ارض کا نصیبہ جاگتا ہے جہاں ذکرِ الٰہی کی تابانیاں بکھیری جائیں گی، اور جہاں عشق الٰہی اور محبت نبوی کی بے بہا دولت تقسیم کی جائے گی۔ اللہ کی ہزار رحمتیں ہوں اس خطۂ فتح پور پر جو حضرت کا مولد و منشاء بھی تھا اور بعد میں آپ کی ایمانی واصلاحی کوششوں کا محور و مرکز بھی بنا۔ ابتداءً یہی وہ خوش بخت وخوش نصیب سرزمین تھی جس نے حضرت کے نورِ ایمان سے تابانی اور گرمیٔ عمل سے حرارت حاصل کی، اسی گاؤں میں بیٹھ کر برسہا برس تک حضرت نے ایمان وعمل کے موتی لٹائے ہیں، یہیں رہ کر مدتوں آپ نے شک وارتیاب کے دلدل میں پھنسی ہوئی مخلوق کو اِذعان و یقین کے ہموار وپُر بہار میدان میں پہونچایا ہے، دلوں سے نفاق و معصیت کی آلودگیاں دھودھو کے اخلاص وحسنات کا لباس عطا فرمایا ہے، اور اسی علاقہ میں بیٹھ کر دعوت حق کا قرنا آپ نے اس زور سے پھونکا کہ ایک عالم کا عالم مدہوش و متوالا ہو کر

اس بانگ درا کی جانب چل پڑا، جو راہیں عام مسافروں کے بھی نقوشِ قدم سے آشنا نہ تھیں اب ان پر صالحین امت اور اولیاء کاملین کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی رہے، جن میدانوں میں گمراہی اور بے راہ روی کے نقیب غول بیابانی کی طرح چکراتے پھرتے تھے، اب وہاں حق و ہدایت کے فرشتے ٹوٹے پڑ رہے تھے، ظلمت کافور ہوتی چلی گئی، روشنی کا چارسو پہرہ قائم ہو گیا۔

وطن کا یہ قیام درحقیقت مرشد گرامی حضرت اقدس تھانوی قدس سرہٗ کے ارشاد کی تعمیل تھی، انھوں نے ہدایت کی تھی کہ:

”مولوی وصی اللہ! کام گھر سے شروع کرو، اور اپنے وطن میں رہ کر کام کرو، اس لئے کہ وہاں لوگ اپنے ہوتے ہیں اور اپنے لوگوں سے قوت رہتی ہے۔(حالات، ج:۱،ص:۱۸۴)

اسی ارشاد کے پیش نظر جب حضرت کو مخلوق کی ہدایت کے لئے دنیا والوں کی طرف متوجہ کیا گیا، تو کام کا مستقر آپ نے اپنے وطن ہی کو قرار دیا۔

اب مناسب ہے کہ فتح پور کا جائے وقوع کسی قدر تفصیل کے ساتھ آپ ملاحظہ فرمالیں تاکہ نہ جاننے والوں کو کچھ تو اندازہ ہو سکے کہ اللہ کے دین کا کام اخلاص کے ساتھ خواہ کسی علاقہ میں کیا جائے، اللہ کے نام میں وہ کشش ہے کہ خلق خدا بے تابانہ کھنچتی چلی آتی ہے، اس راہ کی تمام کلفتیں طالبین کی نگاہ میں عین راحتیں محسوس ہوتی ہیں۔ اس دورِ آخر میں فتح پور کی خانقاہ نے جو نقشہ دنیا کو دکھایا ہے اس نے دورِ اوّل کی یاد تازہ کردی، بلاشبہ اللہ کا نام ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا، اور اس کی حلاوت ولذت جیسے اگلوں نے محسوس کی تھی، پچھلے بھی اپنے اپنے ظرف کے بقدر محسوس کرتے رہیں گے، بہرکیف آیئے آپ کو فتح پور کی چوحدی سمجھائیں۔

آپ فتح پور گاؤں میں کھڑے ہیں، اس کے شمالی جانب میں چلئے، تقریباً ڈھائی میل کے فاصلے پر کاری ساتھ نامی گاؤں ہے، ہمارے حضرت کے خویش بزرگ اور جانشین حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب دام مجدہم کا نیز دوسرے تینوں دامادوں کا وطن یہی ہے۔ کاری ساتھ سے دو میل شمال ومشرق کی جانب چلئے آپ قصبہ گھوسی پہونچ جائیں گے جو اس علاقہ کا مرکزی مقام ہے، ساڑھے چار میل کا یہ راستہ خام اور پیدل کا ہے۔

فتح پور کے جنوب میں متصلاً نرجا تال واقع ہے، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، تال کے دوسرے کنارے پر دھوریا ساتھ نامی بستی ہے، اور اس سے تھوڑے فاصلے پر پورہ معروف نامی مشہور بستی ہے، پورہ معروف کا فاصلہ فتح پور سے تقریباً تین میل ہے، یہ راستہ بھی کچا اور پیدل کا ہے۔

فتحپور کے مغرب میں دو میل پر حمید پور ہے، اور اس کے ایک میل آگے کوئریا پار ہے، شمال ومغرب کی سمت میں تقریباً تین میل کی مسافت پر ندوہ سرائے ہے، فتح پور سے مشرق میں ہرداس پور، اِٹورہ وغیرہ قریبی بستیاں ہیں، اور جانب مشرق ہی میں تقریباً پانچ چھ میل کے فاصلہ پر قصبہ کوپا گنج واقع ہے۔

اس چوحدی کو نظر میں رکھئے اور یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ تمام مسافتیں پیدل ہی طے کی جاسکتی ہیں، خانقاہ تک پہونچنے کے لئے مختلف سمتوں سے تین راہیں تھیں، مغرب سے آنے والا اگر اس کو سواری کی سہولت ہو تو ندوہ سرائے تک کسی سواری یکہ تانگہ وغیرہ سے آسکتا تھا، وہاں سے پیدل فتح پور پہونچے، شمال کے واردین وصادرین کو گھوسی پہونچ کر سواری چھوڑنی پڑتی اور پاپیادہ مسافت طے کرکے منزل پر پہونچتے، دوسری سمتوں سے آنے والا مئو سے بذریعہ ریل یا موٹر کوپا گنج پہونچ کر پھر پیدل کی

راہ اختیار کرے۔ حاصل یہ کہ آنے والا کہیں کا ہو اور کیسا ہی نازک بدن، نازک طبع ہو، پیدل چلنے سے اسے مفر نہ تھا، کیسے کیسے ناز پروردہ امیر وکبیر، آرام وراحت کے خوگر رئیس اور علماء دین فتح پور حاضر ہوئے اور سب ہی کو یہ دشوار گزار راستہ طے کرنا پڑتا، یہ گویا پہلا مجاہدہ ہوتا تھا جو واردین وصادرین کے لئے ناگزیر تھا۔

خانقاہ کی ابتدائی شکل:

اب حضرت والا ہر طرف سے یکسو ہو کر فتح پور میں اقامت اختیار کر چکے تھے، گزشتہ صفحات میں یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ حضرت کی طبیعت تنہائی پسند اور گوشہ نشین قسم کی واقع ہوئی تھی، آبائی مکان میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں پورے طور پر خلوت ویکسوئی میسر آسکے، اس لئے آپ کے لئے ایک خام حجرہ علٰیحدہ بنوادیا گیا، اس میں ایک طرف پلنگ اور دوسری طرف نماز وذکر کیلئے چوکی ڈال دی گئی، اکثر اوقات حجرہ ہی میں تشریف رکھتے، ذکر ونماز کے اوقات میں اندر سے حجرہ بند فرمالیتے۔

پنج وقتہ فریضہ کی ادائیگی کے لئے گاؤں کی باہری مسجد میں تشریف لے جاتے اور وہیں امامت فرماتے، نمازِ فجر اور ظہر کے بعد کچھ دیر تک مسجد میں تشریف رکھتے، عصر پڑھ کر کبھی کبھی مغرب تک مسجد ہی میں رونق افروز رہتے، ان اوقات میں گاؤں کے کچھ باصلاحیت اور نیک طبع نوجوان حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے، آپ کے ارشادات سے مستفید ہوتے، ان بابرکت مجالس سے ان میں دینی شعور پیدا ہونے لگا۔ آپ نہایت خیر خواہی اور دلسوزی کے ساتھ انھیں احکام شرع سمجھاتے، اللہ کی محبت، رسول اللہ ﷺ کی عظمت اور شریعت کا تقدس وجمال ان کے دلوں میں پیوست کرتے، قیامت کی ہولناکیوں، جہنم کے عذاب اور جنت کی نعمتوں کا تذکرہ فرماتے، اس طرح

رفتہ رفتہ گاؤں میں دینی فضا پیدا ہونے لگی، کچھ نوجوان آپ سے بیعت ہوکر باقاعدہ ذکر وشغل میں لگ گئے، پھر ہر روز ایک وقت مجلس بھی فرمانے لگے جس میں بیعت ہونے والے تو پابندی سے، اور دوسرے گاؤں کے افراد کبھی کبھی شریک ہونے لگے اور دلوں میں ایمان ویقین کی تخم ریزی ہونے لگی۔ اس وقت تک یہ نشست مسجد ہی میں ہوتی تھی، مسجد کے باہر کوئی دالان یا سائبان نہ تھا، البتہ احاطۂ مسجد میں کچھ زمین خالی پڑی تھی، حضرت کی خواہش ہوئی کہ اسی زمین میں کچھ چھپر وغیرہ ڈال دیا جائے تاکہ نماز کے علاوہ اوقات میں لوگ اسی میں رہا کریں، چنانچہ حسب منشاء وہاں پھوس کا چھپر ڈال دیا گیا۔ حضرت کی پہلی خانقاہ یہی تھی، اسی میں حضرت والا کی اور گاؤں کے چند نوجوان سالکین کی نشست رہا کرتی تھی، مجلس بھی اسی میں ہوتی، تلاوت اور ذکر واذکار بھی اسی میں کرتے۔

یہ نقشہ بالکل ابتدا کا ہے، اس کے بعد حضرت نے اپنے آبائی مکان سے ہٹ کر تال کے قریب اپنا رہائشی مکان بنوالیا، اس کے قریب ہی چند قدم کے فاصلے پر وہ مسجد ہے جسے پہلے ''تال والی مسجد'' کہا جاتا تھا، اور اب خانقاہ کی مسجد کہلاتی ہے، حضرت اس میں نماز پڑھنے لگے، اپنے اسی مکان کے ایک کمرہ میں کتابوں کے درمیان تشریف فرما ہوتے، وہی کمرہ آپ کی عبادت گاہ، آرام گاہ اور دارالمطالعہ سب کچھ تھا، مجلس بھی اسی میں فرماتے۔ حضرت کے مکان سے متصل ہی مولانا عبدالقیوم صاحب مرحوم کا مکان تھا، باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کے لئے ان کے دالان میں چارپائیاں ڈلوادی جاتیں، رات کو لوگ وہیں آرام کرتے، دن میں اسی دالان میں مدرسہ چلتا، بقیہ اوقات لوگ مسجد میں گزارتے، پھر جب لوگوں کی آمدورفت زیادہ بڑھی تو ضرورت محسوس ہوئی کہ سالکین کے لئے مستقل کوئی عمارت بنادی جائے، اسی

ضرورت کے پیش نظر قدیم خانقاہ معرض وجود میں آئی ، موجودہ خانقاہ جہاں پر ہے قدیم خانقاہ بھی وہیں تھی ، البتہ اس کا رقبہ کم تھا ، ایک مختصر سا صحن ، اس کے مشرق ومغرب میں دو دالان ، اور دالان کے اندر دو کمرے ، اس طرح چار کمروں پر مشتمل یہ خانقاہ تھی ، جنوب میں چھپر پڑا ہوا تھا جو باورچی خانہ کا کام دیتا تھا ، اس میں مہمان اپنی ضرورت کی چیزیں خود تیار کر لیتے تھے ، ایندھن کا انتظام خانقاہ کی طرف سے تھا ، اس وقت زیادہ تر اَطراف کے لوگ آتے تھے ۔ مئو ، کوپا گنج ، کوئریا پار ، پورہ معروف ، ندوہ سرائے سے لوگوں کی آمد ورفت ہوتی تھی ، یہ لوگ صبح کو یا مجلس کے وقت آتے ، بقیہ دن رہتے ، خانقاہ میں چہل پہل رہتی ، شام ہوتے ہی اپنے اپنے گھروں کو چل دیتے ، دو چار مہمان جو دور سے آئے ہوئے ہوتے وہی رہ جاتے ، ان کے لئے یہ خانقاہ کفایت کرتی ۔

جدید خانقاہ:

لیکن جب یہ خوشبو تیزی کے ساتھ پھیلی اور دور دراز مقامات سے لوگوں کی آمد ہونے لگی ، بنارس ، غازی پور ، الہ آباد ، جون پور ، بلیا ، دیوریا اور گورکھپور سے تشنگانِ ہدایت کے قافلے آنے لگے تو جگہ کی تنگ دامانی کا احساس ہوا ، اب ہر روز بیس پچیس آدمی خانقاہ میں مقیم ہوتے ، پھر تو یہ کمرے ناکافی ثابت ہوگئے ، خانقاہ میں توسیع کی بات سوچی جانے لگی ۔ طے کیا گیا کہ جگہ تو یہی رہے البتہ کچھ اور زمین اس میں شامل کر لی جائے ، ان دنوں حضرت کے بڑے بھائی جناب حافظ عبد العلیم صاحب بھی آئے ہوئے تھے ، وہ ایک اچھے نقشہ نویس تھے ، انھوں نے موجودہ خانقاہ کا نقشہ تیار کیا اور اسی نقشہ پر خانقاہ بنی طے ہوگئی ، حسن اتفاق جب یہ معاملہ طے ہو رہا تھا پندرہویں شعبان کی شب نصیب ہوگئی ، حضرت نے بعد مغرب گاؤں کے سربرآوردہ لوگوں کو

بلا کر فرمایا کہ خانقاہ کا بننا تو طے ہی ہے، اس وقت خیال آیا کہ کیوں نہ اس مبارک تعمیر کی ابتداء آج ہی کی مبارک رات سے کر دی جائے، سب لوگوں نے مسرت و آمادگی کا اظہار کیا۔ حضرت کے ایما سے گاؤں کے نوجوانوں کو اطلاع کر دی گئی، اسباب مہیا کر لئے گئے، حضرت بھی تشریف فرما تھے، خانقاہ میں مقیم حضرات تھے ہی، آن کی آن میں قدیم خانقاہ شہید کر کے سارا ملبہ کنارے لگا دیا، آدھی رات کو کام مکمل ہو گیا، بقیہ رات لوگوں نے تسبیح و تہلیل، دعاء و مناجات اور ذکر و تلاوت میں گزاری، صبح کو معمار اور مزدور بلوائے گئے اور تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ یہ خانقاہ دو منزلہ تیار ہوئی۔ پہلی منزل کی تعمیر کا اختتام ۳۰/ شعبان ۱۳۷۲ھ کو ہوا، ۱۳/ کمرے مع ان کے سائبان کے تیار ہو گئے، رمضان شریف میں کام روک دیا گیا، عمارت اتنی ہو چکی تھی جو رمضان میں آنے والوں کیلئے کافی تھی، رمضان کے بعد پھر کام لگا اور دوسری منزل تیار ہوئی، دوسری منزل میں ۱۲/ کمرے تھے، دونوں منزلوں کی تعمیر میں مجموعی طور سے ۳۳/ دن صرف ہوئے، خانقاہ چھوٹے چھوٹے پچیس حجروں پر مشتمل ہے، ہر ایک میں بس دو یا تین آدمی کی گنجائش ہے، حضرت نے چھوٹے حجرے بنوائے جانے کی وجہ خود ارشاد فرمائی کہ:

> ’’میں نے خانقاہ کے کمرے چھوٹے چھوٹے اس لئے بنوائے ہیں کہ ایک ایک دو دو آدمی ان میں رہ سکیں اور تنہائی و خلوت جو خانقاہ کا اصل مقصد ہے وہ حاصل ہو، ورنہ یہاں بھی لوگ آ کر بتُکلّچن (یعنی گپ شپ) ہی کریں گے، تو یہاں کا قیام کچھ نفع بخش نہ ہوگا، اور جب یہی سب کچھ کرنا ہے تو یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے، اپنا ہی گھر کیا برا تھا، وہیں رہتے اور یہی سب کچھ کرتے۔ (حالات، ج:۱ص:۴۶)

ایک مخلص ایمن صاحب نے ایک قطعہ تاریخ تعمیر خانقاہ کے سلسلے میں کہا

ہے اور اچھا کہا ہے:

عالم باوصف وصی اللہ — حق پسند وحق شناس، حق کوش
بہر اصلاحِ ما گنہ گاراں — کرد تعمیرے فیض در آغوش
سال تعمیر آں بگفت ایمؔن — خانقاہے زمردمِ باہوش

مسجد کی جدید تعمیر:

حضرت اقدس کے مکان سے چند قدم کے فاصلے پر تال والی مسجد اپنی قدیم تعمیر کے اوپر کھڑی تھی، یہ مسجد مختصر صرف ایک درجہ پر مشتمل تھی، جس میں تین در تھے اور آگے صحن تھا، اسی مختصر مسجد میں خانقاہی حضرات نماز ادا کرتے تھے، پھر سالکین کے ہجوم کی وجہ سے ایک طرف تو مسجد میں تنگی محسوس کی گئی جس کا اقتضاء تھا کہ مسجد کی توسیع کی جائے اور.......... دوسری وجہ مسجد کی جدید تعمیر کے تقاضے کی یہ بھی ہوئی کہ ایک طرف حضرت کا پختہ دومنزلہ مکان تھا، اور دوسری طرف دومنزلہ پختہ خانقاہ کھڑی تھی، درمیان میں مسجد کی خام عمارت! اس وقت حضرت بار بار تاسف اور رنج وحزن کے لہجے میں فرماتے تھے کہ:

اجی! ہمارا مکان پختہ اور اونچا بن گیا، اور خانقاہ پختہ اور دومنزلہ ہوگئی، درمیان میں مسجد نیچی اور بوسیدہ ہے، اچھا نہیں معلوم ہوتا، جب اس کو دیکھتا ہوں تو دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔

مثل مشہور ہے کہ ؎

می دہد یزداں مرادِ متقیں

غیب سے سروسامان شروع ہوگئے۔

فتح پور کا جائے وقوع ناظرین ملاحظہ فرما چکے ہیں، کتنا دشوار گزار راستہ طے کر کے وہاں پہونچنا ہوتا ہے، اسباب تعمیر کی فراہمی ایک مستقل مسئلہ بن کر سامنے آگئی، کہیں سے کوئی پختہ سڑک نہیں آئی ہے کہ سہولت کے ساتھ سارے ساز وسامان مہیا کئے جاسکیں، اسے محض نصرت خداوندی اور ایک اللہ والے کی قلبی لگن کی برکت کہا جائے گا کہ دیکھتے ہی دیکھتے عالیشان مسجد کی تعمیر کھڑی ہوگئی۔

ہوا یہ کہ اس سال بارانِ رحمت کا نزول بڑی بہتات اور فروانی سے ہوا، حتیٰ کہ تمام جل تھل ایک ہوگیا، فتح پور سے کوپا گنج تک ایک وقتی سمندر وجود میں آگیا، اس کی وجہ سے کشتیوں کے ذریعے سے تعمیری اسباب کا فتح پور پہونچانا نہایت آسان ہوگیا، تمام اسباب ووسائل جلدی جلدی مہیا کر کے فوراً مسجد کی تعمیر چھیڑ دی گئی، حضرت نے گاؤں میں اعلان فرمادیا کہ مسجد کی تعمیر ہورہی ہے، جس کا جی چاہے آکر کام میں شریک ہوجائے، اجرت دی جائے گی۔ خانقاہ کے مہمان تو خالصۃً للہ کام میں لگے، اور گاؤں کے کے غرباء کو آمدنی کا ایک ذریعہ منجانب اللہ ہاتھ آگیا، سیلاب کی وجہ سے کھیتیاں برباد ہوچکی تھیں، اس لئے اس کی قدر وقیمت اور بڑھ گئی، اور حضرت نے اس طرح ان کی امداد کرنی چاہی۔ دن بھر لوگ کام کرتے اور شام کو اُجرت حاصل کر کے گھر کے نان ونمک کا انتظام کرتے، تعمیر مکمل ہونے کے بعد مختلف حضرات نے قطعاتِ تاریخ لکھ کر بھیجے، جناب صوفی عبدالرب صاحب علیہ الرحمہ جو حضرت کے مسترشد اور نہایت قادر الکلام اور پُرگو شاعر تھے ان کا قطعہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

جیسے تاروں میں چاند جلوہ نما — وہ ہیں اصحاب میں رسولِ خدا
پیکر نور ہے غبار آلود — باغِ طیبہ میں بن رہی ہے قبا
وہی عالم دکھادیا تو نے — حَبَّــــذا بادشاہِ صدق وصفا

زندہ باد اے خدا وصی اللہ — چشمۂ فیض، بحر جود وسخا
زیر تعمیر از سرِ نو ہے — مسجد فتح پور، شکر خدا
مدرسہ ، خانقاہ اور مزدور — ہمہ تن محو کار وسعی ودعا
مستعد خود کھڑے ہوئے ہیں حضور — جیسے کعبہ کے پاس کوہِ صفا
اس قدر جلد اور یہ کارِ عظیم — اک کرامت ہے تیری سرتاپا
سالِ ہجری میں یہ لکھی تاریخ — یاد کر کے حال وکیف قبا
چوں قبا کیف بـــنـــی اللہ — مسجد أسس علی التقویٰ

سالِ آغاز ۱۳۷۴ھ

ایک قطعہ تاریخ مولوی ابوالحسنات فانیؔ نے بھی کہا تھا، جو حضرت کی اجازت سے مسجد کے صدر دروازے پر کندہ کرادیا گیا۔

خوشا مسجد ومنظر نو بہارے — مرصع زلعل وگہر خوش نگارے
بہر گوشہ تہلیل وتسبیح خوانی — بہ ذکر خدا مست ہر ہوشیارے
دلم گفت در سالِ تعمیر فانیؔ — زہے مسجد شیخ من یادگارے

سالِ اختتام ۱۳۷۵ھ

مرتب حالات حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامیؔ تحریر فرماتے ہیں:

’’بعض ہونے والے امور وقوع سے پہلے لوگوں کی زبان پر خدا کی جانب سے آجاتے ہیں، چنانچہ خدا تعالیٰ کا کرنا کچھ ایسا ہی ہوا کہ تعمیر مسجد کو شاید ایک سال بھی پورا نہ گذرا ہوگا کہ ایسے کچھ ناخوشگوار واقعات اور اسباب پیش آئے کہ حضرت کو وطن سے ہجرت ہی کرنی پڑی، چنانچہ رمضان ۱۳۷۵ھ میں آپ یہاں سے گورکھپور تشریف لے گئے ، اور یہ مسجد حضرت کی جانب سے بس

حضرت کی یادگار ہی بن کر رہ گئی، اور آج بھی اس کا یہ عالم ہے کہ اپنے باطن میں نور کا ایک ذخیرہ رکھتے ہوئے اپنے ظاہر سے کسی کی یاد میں بالکل خاموش اور سوگوار بنی کھڑی ہے، گو پانچوں وقت اذان اور جماعت سب پابندی سے ہوتی ہے، مگر آہ حضرت اقدس کے زمانے والی بات کہاں؟ اللہ تعالیٰ اس کی تعمیر جدید کے ساتھ ساتھ اس کو دوبارہ آباد اور ذاکرین کے مجمع اور ان کی برکت سے اہل بستی کے دل کو شاد فرمادے۔ آمین

مدرسہ وصیۃ العلوم:

سلسلۂ بیان میں مدرسہ کا بھی ذکر سناتا چلوں۔ حضرت کی اصلاحی سرگرمیوں سے پیشتر موضع میں کیا، ساری برادری میں باقاعدہ کوئی دینی مدرسہ نہ تھا، ۱۳۵۰ھ میں فتح پور میں ایک مکتب کی بنیاد ڈالی گئی، یہ صرف مکتب تھا جس میں گاؤں کے سبھی افراد شریک تھے، حضرت والا کی شرکت بھی اس میں گاؤں کے ایک فرد ہی کی حیثیت سے تھی، اس وقت تک خانقاہ فتح پور میں حضرت نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع نہیں فرمایا تھا، بعد میں آپ کے خویش بزرگ حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب دامت برکاتہم کی نسبت بڑی صاحبزادی سے جب طے ہوئی اس وقت حضرت قاری صاحب دارالعلوم مئو میں زیرِ تعلیم تھے، حضرت نے تعلیم کے ساتھ چاہا کہ آپ ہی کے زیر تربیت رہیں، اس مقصد کے پیش نظر انھیں مئو سے اپنے پاس بلالیا اور بطور خاص آپ کے اسباق شروع کرادیئے، آپ کے ساتھ اسباق میں شرکت حضرت کے دوسرے داماد جناب مولانا قمر الزماں صاحب کی بھی رہی، نیز اس وقت خانقاہ میں حاضر ہونے والے علماء بھی اس میں شریک ہوتے تھے، فتح پور ہی میں مولانا محمد حنیف صاحب جونپوری مدظلہٗ نے بھی حضرت سے تعلیم حاصل کی، بعد میں اور دامادوں مولوی نور

الہدیٰ صاحب اور مولوی ارشاد احمد صاحب کو بھی پہلے اپنے پاس رکھ کر تعلیم دی، ان حضرات نے مختلف اوقات میں حضرت ہی کے پاس رہ کر تعلیم مکمل کی، فتح پور میں تدریس کا سلسلہ تو تھا مگر باقاعدہ مدرسہ آپ نے قائم نہیں فرمایا تھا، جب آپ گورکھپور تشریف لے گئے تو طالبین کے ساتھ طلبہ بھی وہاں منتقل ہوئے، اور وہاں بھی تعلیم جاری رہی، تاہم باقاعدہ مدرسہ گورکھپور میں بھی قائم نہیں فرمایا، پھر الہ آباد میں مستقل قیام فرمالینے کے بعد تعلیم وتدریس کے اسی سلسلے کو باقاعدہ مدرسہ کے قالب میں ڈھال دیا۔ اب یہی مدرسہ وصیۃ العلوم کے نام سے معروف ہے، حضرت کے دورِ حیات میں مدرسہ نے اچھا خاصا پھیلاؤ حاصل کرلیا تھا، طلبہ دور دور سے آنے لگے تھے، حضرت کے وصال کے بعد مدرسہ اب حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم کی سرپرستی اورنگرانی میں چل رہا ہے، ہدایہ وجلالین تک تعلیم کا نظم ہے۔

فتح پور کا مکتب جو پہلے انوار العلوم کے نام سے چل رہا تھا، حضرت کے وصال کے بعد اہل موضع نے حضرت کی یادگار کے طور پر اس کا بھی نام بدل کر وصیۃ العلوم رکھ دیا، اور وہ بھی حضرت قاری صاحب ہی کی سرپرستی ونگرانی میں چل رہا ہے، وہاں ابتدائی فارسی اور درجۂ حفظ کی تعلیم ہوتی ہے، گاؤں کے بچے ناظرہ قرآن، ابتدائی اردو درجات اور شعبۂ حفظ میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

حضرت کی خدمت میں رہ کر تعلیم مکمل کرنے والے چند حضرات کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ (۱) مولانا محمد حنیف صاحب جونپوری۔ (۲) حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب۔ (۳) مولانا قمر الزماں صاحب۔ (۴) مولانا نور الہدیٰ صاحب۔ (۵) مولانا عبد العلیم عیسیٰ صاحب۔ (۶) مولانا عمار احمد صاحب۔ (۷) مولانا ارشاد احمد صاحب وغیرہم۔

باب ۸

قیامِ وطن (۲)

شروع میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ حضرت کے دورِ اوّل میں کچھ نوجوان علماء نے برادری کے سر برآوردہ لوگوں کو شامل کر کے ایک اصلاحی انجمن کی تشکیل کی تھی، اس کا بنیادی کام شادی بیاہ کی غلط اور ناجائز رسوم کا مٹانا تھا، کچھ مدت تک یہ انجمن بہت کامیاب رہی، مگر پھر بعض ایسے حالات پیش آئے جو عموماً اس طرح کی اصلاحی انجمنوں کو پیش آجایا کرتے ہیں، جن کی وجہ سے انجمن کی سرگرمیاں ڈھیلی پڑتی چلی گئیں۔ حضرت کو کمیٹی اور انجمن کے انگریزی طریقے پسند نہ تھے، آپ کے سامنے اپنے شیخ ومرشد حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کا طریقۂ کار تھا، آپ دیکھ رہے تھے کہ انجمن وغیرہ سے اوّلاً تو اصلاحات محض فروعی ہوتی ہیں اور طریقہ بھی اس کا شریعت کے مزاج سے میل نہیں کھاتا، مثلاً یہ کہ رسومات بند کردی جائیں، اور اگر کسی نے کیا تو اتنا اتنا جرمانہ یا رسومات کی ایک خاص مقدار پر تحدید، ظاہر ہے کہ یہ اصلاحات شرعی اصول کے لحاظ سے خود غلط ہیں، حضرت کے نزدیک اصل بات یہ تھی کہ لوگوں کا ایمان درست کیا جائے، دل کی اصلاح کی جائے، اللہ تعالیٰ کی عظمت ومحبت، شریعت کی اہمیت وتقدس اور سنت کے اتباع وپیروی کا جذبہ اگر دل کے اندر اتر جائے تو پھر رسوم وبدعات اور اوہام وخرافات سب کا صفایا ہوتا چلا جائے، کام کو اس کے آغاز سے لینا چاہئے، جڑوں کو پانی سے محروم کر کے اگر کوئی شخص شاخوں اور پتیوں کو سیراب کرتا رہے تو اس سے کیا توقع کی جاسکتی ہے؟

ثانیاً پھر انجمن کی بنیاد پر اختلافات بھی شروع ہوجاتے ہیں، صدارت کس کو ملنی چاہیے؟ سکریٹری کون ہو؟ مالیات کی ذمہ داری کس کو سونپی جائے؟ دسیوں اختلافات ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ پھر وہ انجمن اور کمیٹی جو معاشرہ کے سدھار اور اصلاح کی دعویدار بن کر اٹھی تھی خود اختلافات اور نزاعات کا گہوارہ بن جاتی ہے، اس سے معاشرہ میں سدھار تو کیا پیدا ہوتا وہ خود اجتماعی ماحول کے جسم میں ایک لاعلاج ناسور بن کر رہ جاتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ تمام تر دینی مساعی کے لئے اخلاص شرطِ اوّل ہے، اگر یہی متاع گم ہوجائے تو آگے فساد ہی فساد کی شاخیں نکلتی چلی جائیں گی۔ حضرت سمجھ چکے تھے کہ ان انجمنوں سے چاہے ظاہراً کچھ قوت وشوکت معلوم ہو، مگر حقیقت کے گم ہونے کی وجہ سے اس مل بیٹھنے کا کوئی اچھا انجام نہ ہوگا، تاہم حضرت خاموش تھے، جب تک آپ نے اپنا اصلاحی کام شروع نہیں کیا تھا اس وقت تک خاموشی سے تماشا دیکھتے رہے، آویزش سے تو آپ ہمیشہ دور ونفور رہے، اور اس وقت تو بالکل یکسوئی کا دور تھا۔ بالآخر جب پانی کے یہ بلبلے بیٹھ گئے اور میدان خالی ہوگیا تب آپ نے اپنے کام کی ابتدا فرمائی۔

بتایا جاچکا ہے کہ شروع میں گاؤں کے چند افراد آپ کی طرف متوجہ ہوئے، انھیں لوگوں کو لے کر آپ نے کام شروع کردیا۔ آپ نے نہایت نرمی اور دلسوزی کے ساتھ دین کی باتیں سکھلائیں، نبی کریم ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کی عظمت ومحبت دلوں میں جمائی، جس کا لازمی اثر یہ ہوا کہ گو چند ہی لوگوں نے سہی باقاعدہ نماز وجماعت کا اہتمام شروع کردیا۔ گاؤں میں بلکہ پوری برادری میں ہندوانہ طرز پر دھوتی باندھنے کا رواج تھا، جس سے مکمل ستر پوشی نہیں ہوتی تھی، حضرت کے متوسلین

نے دھوتی ترک کر کے تہبند اور پاجامہ اختیار کرلیا، اٹھتے بیٹھتے ذکر الٰہی اور درود شریف وِردِ زبان رہنے لگا، ہاتھوں میں تسبیح آ گئی۔ باہری مسجد کے احاطہ میں جو چھپر ڈالا گیا تھا، لوگ فارغ اوقات میں وہاں آکر بیٹھتے، ذکر و تلاوت میں مشغول رہتے، معاملات کی صفائی اور درستگی کی فکر لوگوں میں آچلی، غرضیکہ ایک دینی رنگ طبیعتوں پر چڑھتا چلا گیا اور اس کے اثرات بھی کھلے طور پر محسوس ہونے لگے۔ رحمت اللہ خاں صاحب، حاجی محمد ادریس مسنہ والے، حافظ فرید الدین صاحب، حقن صاحب، حافظ محمد زکریا صاحب، حق العباد خاں صاحب، محمد فاروق صاحب اور ان کے علاوہ چند خوش نصیب حضرات تھے جن کو حضرت سے ابتداءً تعلق ہوا۔ مقامی افراد کے علاوہ آس پاس کے علاقہ سے بھی لوگ آنے لگے تھے، مولانا جامؔی صاحب حافظ محمد زکریا صاحب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''ادھر حضرت کا اصلاحی کام شروع ہو چکا تھا، ابتداءً اپنے لوگوں نے بڑی شد و مد سے حضرت کی تعلیم و تربیت اور اصلاح پر لبیک کہا، دھوتی اتار کر پاجامہ پہنا، تسبیح ہاتھوں میں آگئی، ہر وقت زبان پر ذکر اور ان کی نجی مجلسوں میں بھی دینی تذکرہ رہنے لگا، حضرت والا نے بھی اس زمانہ میں بڑی مشقت اٹھائی، اور برادری کی اصلاح کے لئے رات دن ایک کر دیا، چنانچہ اب گاؤں سے باہر جانا بھی شروع کر دیا، یہاں تک کہ تہجد کے وقت اگر فتح پور میں موجود ہیں تو نمازِ فجر پورہ معروف میں ادا ہو رہی ہے، کبھی ندوہ سرائے میں فجر کی نماز میں موجود ہیں، کبھی کاری ساتھ پہونچ گئے، غرض صحت بھی حضرت کی اچھی تھی اور بہت تیز رفتار تھے، بڑے بڑے چلنے والے اگر بعد فجر کی تفریح میں ساتھ ہو جاتے تو بول جاتے تھے، اور چونکہ صفتِ نبوی ''دائم الفکرۃ'' سے سے بھی بحمد اللہ

حضرت نے حصہ پایا تھا، اس لئے ہر وقت مسلمانوں کی دینی اصلاح، افراد کے سدھار ہی کی فکر میں ڈوبے رہتے تھے، اور کبھی کبھی اس کا اثر یہ ہوتا کہ طبع والا پر ایک کیفیت سی طاری ہوجاتی تھی، جس کے متعلق صحیح بات تو یہ ہے کہ ہم لوگ سمجھ ہی نہ سکے کہ وہ تھی کیا چیز؟ کس نے اس کو جذب کہا، کسی نے غصہ سے تعبیر کیا، حالانکہ اگر جذب تھا تو انتہائی ہوش وحواس والا تھا، اور غصہ کا اثر تھا تو بلاشبہ غضب للہ کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا کہ اس حالت میں چہرہ منور اور دمکتا ہوا دیکھا جاتا تھا اور خدائی جلال کا ایک خاص رعب طاری ہوجاتا کہ اس حالت میں نظر کا ملانا ناممکن تھا، اور اثر کے لحاظ سے نور کی بارش کا منظر ہوتا، بہرکیف یہ کیفیت اگر چلتے ہوئے کہیں راستے میں طاری ہوجاتی تو دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کو ملتے ہوئے بہت ہی تیز چلنے لگتے تھے، اور چلتے کیا اُڑتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، یہاں تک کہ ہمراہیوں کو ساتھ پکڑنے کیلئے دوڑنا پڑتا۔

بہرکیف جب باہر کے مواضعات میں لوگوں نے آپ کی دعوت کو قبول کیا تو پھر حضرت کبھی کبھی دوسری جگہ ہفتہ ہفتہ بھر بلکہ کہیں کہیں مہینہ بھر تک قیام فرمانے لگے۔ (حالات: ۱۲۵)

غرضیکہ شیخ ومرشد حضرت تھانوی کے اس فرمان:

بنمائے رخ کہ خلقے والہ شوند وحیراں
بکشائے لب کہ نالہ از مرد وزن برآید

(رخ دکھاؤ کہ مخلوق تمہاری عاشق وشیدا ہو، لب کھولو کہ مرد وزن نالہ وفریاد میں مشغول ہوں)

کا ظہور شروع ہوچکا تھا، شمع ہدایت پوری قوت کے ساتھ نورِ حق کی تابانیاں بکھیرنے لگی تھی، اور پروانے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

دعوتِ حق کی راہ میں دشواریاں:

تاہم یہ نہ سمجھا جائے کہ مسلمانوں کی پوری جماعت جیسے کسی ہادی اور داعیٔ حق کی بس منتظر تھی، اور جیسے ہی حق وہدایت کی بھنک کانوں میں پڑی اور اس کی خوشبو محسوس ہوئی، فوراً لوگ ساتھ ہو گئے، چند سعید روحیں تو یقیناً پہلی آواز پر لبیک کہہ کر ساتھ ہو گئیں، لیکن عمومی طور پر پورا قبیلہ کا قبیلہ فوراً اپنے آبائی رسم ورواج کی بندشوں کو توڑ کر اور بے راہ روی وبدعملی کا جوا گردن سے اتار کر حضرت کے قافلے میں شریک ہو گیا ہو، ایسا نہیں ہے۔ اس سلسلے میں حضرت کو بڑی جانکاہیوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، بہت غور وتامل سے پورے معاشرہ کا جائزہ لیا، اس کے خاص خاص امراض کو پہچانا، اور اس کے بنیادی روگ کی تشخیص کی جس کے اثر بد سے تمام بیماریاں پیدا ہو رہی تھیں، پھر پوری قوت کے ساتھ لوگوں کو اسے سمجھایا، تاکہ انھیں بھی احساس ہو کہ ہم کس مہلک مرض میں گرفتار ہیں، ورنہ مریض اگر اپنے مرض کا انکار کردے تو طبیب کیا علاج کر سکتا ہے، حضرت نے امراض کی نشاندہی کی، پھر ان کے علاج کی طرف توجہ دی۔ اوّلاً تو بہت سے لوگوں نے یہ تسلیم کرنے سے گریز کیا کہ ہم میں واقعۃً یہ امراض ہیں، اور جن لوگوں نے مان لیا ان میں سے بھی کتنے علاج کی تلخ سامانیوں سے گھبرا رہے تھے، حضرت والا ہی سے سنئے، وہ اپنے مخصوص طرزِ کلام میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

> ’’میں شروع شروع میں حیران تھا کہ یا اللہ کس طرح کام کروں؟ چنانچہ نہایت عمدہ عمدہ مضامین قرآن وحدیث سے نکال نکال کر لوگوں کو سناتا تھا، جس میں فضائل بھی ہوتے تھے، مسائل بھی ہوتے تھے مگر دیکھا کہ جس قسم کا نفع ان میں دیکھنا چاہتا تھا وہ نظر نہ آتا تھا، اس کے بعد ایسا معلوم ہوا جیسے دل میں کسی

نے کہہ دیا ہو کہ اس طرح سے لوگوں کو نفع نہ ہوگا ، لوگ اس زمانے میں کچھ دوسرے ہی قسم کے ہو گئے ہیں ، ان کے لئے یہ سب مضامین مفید نہ ہوں گے ، سنیں گے اور واہ واہ کر کے ختم کر دیں گے ، اہل نفس ہیں ، ان کے سامنے تو نفس کے رذائل اور اس کے کید کا بیان کرو اور سنت و شریعت کا معیار ان کے سامنے پیش کرو ، اس لئے کہ شریعت کی وضع ہی اس کے لئے ہوئی ہے کہ انسان کو صحیح معنوں میں عبداللہ (اللہ کا بندہ) بنادے ، اور اس کو نفس و ہویٰ کی پیروی سے نکال کر نص و ہدیٰ کی پیروی میں لگادے ۔ اس قسم کا بیان ان کے سامنے کرو اور پھر دین کی باتیں بیان کر کے ان پر عمل کا مطالبہ بھی کرو اور پھر جو رستہ پر لگتا ہوا نظر آئے اس کو تو رکھو اور جو کام نہ کرے اور مہمل ثابت ہو اس کو نکال دو ، جائے یہاں سے اور جا کر دنیا ہی کما کر دکھاوے ۔ اور اگر تم نے اس طریقہ میں ذرا سی بھی سستی کی تو یہ لوگ تمہارا سب وقت لے لیں گے اور عجب نہیں کہ تم کو بھی اپنے مقام پر اتار لانے کی کوشش کریں ۔ اس پر یہ واقعہ سناتے کہ ہمارے اطراف میں ایک بزرگ آیا کرتے تھے ، وہ فرماتے تھے کہ میں پہلے ان اطراف کے لوگوں کو مرید کرلیا کرتا تھا ، لیکن اب نہیں کرتا ، اس لئے کہ میں دیکھتا ہوں کہ یہ سب میرے پاس جمع ہو جاتے ہیں ، جب میں کوئی بات کہنا شروع کرتا ہوں ، تو قبل اس کے کہ وہ پوری ہو ، یہ لوگ رونا شروع کر دیتے ہیں ، یعنی بات کو نہ سنتے ہیں ، نہ سمجھتے ہیں ، بے سمجھے ہی روتے ہیں ، اور وہ بزرگ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میں نے دیکھا کہ ان لوگوں کو تو میں اپنی طرف نہیں کھینچ سکتا ، لیکن البتہ یہ لوگ مجھ کو اپنی طرف کھینچ لے جائیں گے ، اس موقع پر وہ ایک مثال بیان کرتے تھے کہ ایک بار ایک شخص نے کسی بت پر ایک بھینسا چڑھا دیا

تھا، جب وہ اس کو بت سے باندھ کر چلا گیا تو اس بھینسے نے اپنے کو چھڑانے کے لئے زور لگانا شروع کیا، وہ بھینسا قوی تھا ایک مرتبہ جو زور لگایا تو بت کو اپنی جگہ سے اکھاڑ لیا، اور اس کے سمیت وہاں سے بھاگ گیا۔ اس کو بیان کر کے وہ فرماتے تھے کہ جس طرح وہ بھینسا بت کو کھینچ لے گیا، اسی طرح یہ لوگ مجھ کو کھینچ لے جائیں گے اور میں ان کو اپنی طرف نہیں لاسکوں گا، اس واسطے میں نے اس اطراف کے لوگوں کو چھوڑ ہی دیا۔ جانتے ہو ان کا مطلب کیا تھا، وہ یہ کہ میں تو ان کو ذکر و طاعت کی طرف نہیں لاسکتا مگر یہ لوگ اتنے قوی ہیں کہ مجھ کو غفلت میں ڈال دیں گے۔ (حالات، ص:۲۴۱)

تاہم حضرت کے دل میں مسلمانوں کی اصلاح و ہدایت کا جذبہ جس قوت کے ساتھ موجزن تھا، اس نے حضرت کو چین سے بیٹھنے نہ دیا، بلکہ مسلسل آپ کو حرکت و جوش میں رکھا، آپ کے پیش نظر یہ اصول تھا۔

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم

آپ ہدایت کے جذبہ سے بے تاب ہو کر کبھی گاؤں کے لوگوں کو متوجہ کرتے، کبھی علاقہ والوں کو سمجھاتے، کبھی انتہائی نرمی و ملائمت کے ساتھ دین کی تلقین کرتے، ضرورت پڑتی تو جلالِ خداوندی کا نمونہ بن کر ڈانٹ ڈپٹ، دار و گیر اور تنبیہ و سرزنش بھی فرماتے، حضرت کے یہاں رحمت و غضب دونوں کا اس شان سے ظہور ہوتا کہ نہ تو کوئی شخص مایوسی کا شکار بننے پاتا اور نہ کسی کو یہ جرأت ہوتی کہ کاہل و غافل بن کر پڑا رہے، اگر کسی پر یاس و ناامیدی کی پرچھائیں بھی پڑ جاتی تو حضرت والا فوراً سراپا رحمت بن کر اسے ڈھارس اور تسلی دیتے اور کام پر لگا دیتے، اور کسی میں غفلت و سستی دیکھتے تو فوراً غضب للہ کا ہاتھ نمودار ہوتا اور ساری غفلت اور کاہلی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا۔

مولانا روم فرماتے ہیں ؂

اندریں رہ می تراش و می خراش　　　تادم آخر دمے فارغ مباش

یعنی اس راہ میں ہمیشہ تراش وخراش میں لگے رہو، اور آخر دم تک فارغ نہ بیٹھو

حضرت کے یہاں ہر وقت اس کا عملی نمونہ سامنے رہتا تھا، ہر شخص کو ایک فکر لگی رہتی تھی کہ کہیں حضرت جانب سے کوئی سوال اور پُرسش نہ ہوجائے، غفلت ولاپرواہی کا کہیں گذر تا تک نہ تھا۔

مگر یہ بھی نہیں کیا کہ اپنے کام کو اتنا پھیلا دیتے کہ قابو سے باہر ہو جاتا، ایک محدود دائرے میں رہ کر اپنے مشن کی پختگی اور تکمیل میں کوشاں رہے، اطراف اور علاقے کے لوگوں کو دعوت دیتے رہے، جو لوگ قبول کرتے ان کی زندگیوں میں اتنی نمایاں تبدیلی آجاتی کہ وہ بجائے خود دوسروں کے لئے سامانِ دعوت اور حضرت والا کے کام کی شہرت کا باعث بن جاتے۔ لوگوں نے بیگانوں کو دیکھا کہ دین سے آشنا ہوتے جارہے ہیں جن کی مصروفیات ومشاغل میں فرائض کی گنجائش نہیں نکلتی تھی، اب وہ شب بیدار، تہجد گزار ہوگئے ہین، دیکھنے والے جستجو کرتے کہ اس تبدیلی کا سرچشمہ کہاں ہے؟ معلوم ہونے پر لگاؤ ہوتا، قریب آتے پھر یکے بعد دیگرے جذب ہوتے چلے جاتے۔

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے ۱۹۴۹ء میں دوسری بار جب فتح پور کے قصد سے سفر کیا ہے، اس وقت مئو سے کوپا گنج تک یکے چلتے تھے، مولانا موصوف یکے سے تشریف لے جارہے تھے، یکے والے سے مولانا نے فرمایا کہ اگر کوپا گنج سے آگے فتح پور کے راستے میں جہاں تک یکہ جاسکتا ہے پہنچادو، تو جو کرایہ تم مانگو گے خوشی سے دوں گا اور تمہارا احسان بھی مانوں گا، اس یکہ پر ایک نوجوان تعلیم یافتہ ہندو بھی تھا،

مولانا لکھتے ہیں کہ:

اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ فتح پور کس کے پاس جائیں گے؟ میں نے کہا وہاں ہمارے ایک بزرگ رہتے ہیں، میں بس ان سے ملنے جارہا ہوں، اس نے کہا اچھا وہ جو فتح پور کے شاہ صاحب ہیں، آپ ان کے درشن کرنے جارہے ہیں، میں نے کہا ہاں میں ان کے درشن کرنے جارہا ہوں، میں نے اس نوجوان سے پوچھا آپ ان کو جانتے ہیں؟ اس نے کہا میں نے بس ان کا نام سنا ہے، مجھے بھی ان کے درشن کرنے کا بہت شوق ہے، میں نے کہا آپ کو ان کے درشن کرنے کا کیوں شوق ہے؟ اس نے کہا میں کانپور کا رہنے والا ہوں، میرے ہاں رنگ کا بیوپار ہوتا ہے، میں اس سلسلے میں ملک بھر میں گھومتا پھرتا ہوں، ہزاروں ہندوؤں، مسلمانوں سے میرا واسطہ پڑتا ہے، یہاں کوپا میں ہمارے ایک بیوپاری حاجی صاحب ہیں، وہ بڑے ایمان دار، سچے اور دھرمی آدمی ہیں، مہاتما ہیں، ایسا آدمی میں نے کہیں نہیں دیکھا، نہ ہندوؤں میں نہ مسلمانوں میں۔ میں نے ان سے ایک دفعہ پوچھا تھا کہ تم میں ایسی سچائی اور ایمان داری کہاں سے آئی؟ تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ مجھ میں تو کوئی اچھائی نہیں ہے، میں تو بہت گندہ آدمی ہوں، ہاں ہمارے یہاں سے قریب ہی فتح پور تال نرجا ایک گاؤں ہے، اس میں ایک بزرگ ہمارے مولانا صاحب ہیں، میں ان کے پاس آتا جاتا ہوں، اگر تمہیں میرے اندر کچھ اچھائی نظر آتی ہے تو ان کا اثر ہوگا، اور بھی کئی آدمیوں سے میں نے ان مولانا صاحب شاہ صاحب کا ذکر سنا ہے، اس لئے مجھے بھی ان کے درشن کرنے کا شوق ہے، اس نوجوان نے اپنی یہ بات ختم کرتے ہوئے بڑے جوش سے کہا کہ میرا تو ایمان دھرم ہے کہ میرے ملک کا

بگاڑ جب ہی ٹھیک ہوگا جب یہ ملنگ (یعنی درویش لوگ) ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیں گے۔ (حالات، ص:۳۴۲)

یہ تو ایک واقعہ ہے، اس جیسے نہ جانے کتنے واقعات ہوں گے، چراغ سے چراغ جلتا ہے، ایک جگہ روشنی چمکی، دوسرے نے اس روشنی کی رہنمائی میں مرکز نور کی راہ پائی۔ کام اس طرح بڑھتا اور پھیلتا گیا، ہدایت کی لہریں دور دراز تک پہونچنے لگیں شہرت سن کر باہر بھی لوگ آنے لگے، مشقتیں جھیلتے، کلفتیں برداشت کرتے، تکلیفیں اٹھاتے، پیدل چلنا پڑتا، دھوپ اور گرمی کی سختیاں سہنی پڑتیں، کبھی بارش میں بھیگتے، ایسا بھی ہوتا کہ برسات اور سیلاب میں کئی کئی فرلانگ تک پائنچے چڑھا کر پانی میں چلتے رہنا پڑتا، لیکن جاتے اور مسلسل جاتے، بات کیا تھی۔

ہر کجا بوئے خدا می آید　　　　خلق بیں بے سرو پا می آید

چلا ہی جا رہا ہے گرتا پڑتا اس کی محفل تک
جہاں سے جس نے جس حالت میں اس دلبر کی بو پائی

حضرت فرماتے تھے:

''آدمی خدا کے لئے کام تو کرے، اگر اخلاص سے کوئی کام کرے گا تو اللہ تعالیٰ لوگوں کی گردنیں پکڑ پکڑ کر اس کے پاس بھیجیں گے، کیونکہ سب لوگوں کی پیشانی خدا کے قبضے میں ہے (حالات، ص:۴۴۳)

چراغ سے چراغ جلنے اور تاثیر وتاثر کا ایک نمونہ بھی ملاحظہ کرتے چلئے، حضرت نے فرمایا کہ:

''کل یہاں ایک واقعہ پیش آیا، بار بار اس کو سوچتا ہوں، حیرت ہوتی ہے اور حضرت مولانا تھانویؒ کا اصول یاد آتا ہے، اور سمجھتا ہوں کہ بس اسی میں فلاح

اِس زمانہ میں ہے، مال وغیرہ کے بارے میں مرید کا بھی اعتبار نہیں۔

ایک صاحب بمبئی سے آئے تھے، خانقاہ میں ٹھہرے تھے، جن صاحب سے متعلق کھانے وغیرہ کا نظم ہے، ان سے چائے وغیرہ پی، چلتے وقت ان سے حساب پوچھا تو چھ آنے ہوئے تھے، انھوں نے بتادیئے، ان مہمان صاحب نے ایک روپیہ نکال کر دیا اور کہا کہ لیجئے اور پیسے واپس کرنے کی ضرورت نہیں ہے، انھوں نے کہا کہ یہ تو نہیں ہوسکتا، بزرگوں کے یہاں ہم لوگ رہتے ہیں، وہ اس لئے تھوڑا ہی رہتے ہیں، اس لئے ہم لوگ اس کو بالکل جائز نہیں سمجھتے۔ لہٰذا ہم اس کو نہیں لے سکتے، بالآخر مجبور ہوکر اور نہایت افسوس کے ساتھ انھوں نے وہ پیسے واپس لئے اور کہا یہ تو عجب جگہ ہے، ہم نے ایسے لوگ تو دیکھے ہی نہیں۔ (ایضاً، ص:۲۴۴)

''ہم نے ایسے لوگ تو دیکھے ہی نہیں'' اس ایک جملہ میں کے پس منظر میں مسلمانوں کے معاشرہ میں پھیلی ہوئی بدمعاملگی کی پوری تصویر نظر آرہی ہے، اتنی دیانت داری، اتنی سچائی اور ایسا حسن معاملہ واقعی خال خال ہی کہیں نظر آسکتا ہے۔ حضرت مولانا کی تعلیم وتربیت کے اثر سے خانقاہ کا ماحول اس قسم کے روشن نمونوں سے جگمگا رہا تھا، قلوب میں ایمان کی نورانیت اس طرح بھر گئی تھی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مشتبہ چیز تک کی قباحت اس کی روشنی میں صاف دیکھ لی جاتی تھی، اس حسن معاملہ کے باعث جہاں خالق کی جانب سے رحمتِ بے حساب کی بارش ہوتی تھی، وہیں مخلوق کے بھی آپس کے ٹوٹے ہوئے رشتے جڑتے چلے جاتے تھے، اس طرح کے نمونے آگے اور بھی پیش کئے جائیں گے۔

کام کے پھیلنے اور بڑھتے چلے جانے کے تکوینی اسباب چل ہی رہے تھے کہ

۱۹۵۵ء میں حضرت کے پیر بھائی، مشہور اہل علم وقلم حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے مجاز، مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ فتح پور کی خانقاہ میں تشریف لائے، حضرت کا طرز وطریق ان کو ایسا بھایا کہ بے ساختہ انھیں تھانہ بھون کی یاد تڑپا گئی، بے اختیارانہ ایک طویل مکتوب مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام لکھا، جو فوراً ہی قسط وار ''چار ہفتہ ایک کہف میں'' کے عنوان سے صدق میں شائع ہونا شروع ہوگیا، اس مکتوب کا شائع ہونا تھا کہ شہرت کے پر لگ گئے، پھر یکا یک فضا میں جو تموج آیا ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے حضرت کی خانقاہ پر طالبین وسالکین ٹڈی دل کی طرح گرنے لگے، دین ودیانت کی ایک عظیم رَو چل پڑی اور ایسا منظر نگاہوں نے دیکھا کہ قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ ہونے لگی۔ مذکورہ مکتوب کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب ۹

خانقاہ کے شب وروز

حضرت مولانا نے اپنے شیخ ومرشد حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کے ایما پر فتح پور جیسے کوردہ نیز اسبابِ مواصلات اور سامانِ معیشت سے کٹے ہوئے علاقہ میں ایسا عظیم الشان روحانی شفا خانہ قائم کیا، جس میں دور دور سے روح کے مریض آتے اور شفایاب ہوکر جاتے، مغربی یوپی میں عشق ومعرفت کی دکانیں متعدد تھیں، جہاں سے لوگ دردِ محبت کی متاع گرانمایہ حاصل کرتے تھے، مگر مشرق میں یہ چیز نایاب نہیں تو کمیاب ضرور تھی، حضرت نے جب محبت ومعرفت کا چشمۂ فیض جاری کیا تو ہر طرف سے پیاسی انسانیت ٹوٹ پڑی، یہاں آکر زنگ آلود قلوب نے جلا پائی، غافلوں نے طلب وشوق کی راہ میں قدم ڈالا، طالبین نے وصال وقرب کے مراتب طے کئے، بجھے ہوئے چراغوں میں روشنی آئی، معصیت میں آلودہ نفوس نے طاعت وعبادت کی پاکیزگی پائی، غرض ہر ایک اپنے اپنے ظرف کے مطابق گوہر مراد سے دامن بھر لے گیا۔

حضرت نے ان آنے والوں کے لئے اپنے مخصوص تجربہ اور خداداد بصیرت نیز حضرت تھانوی کے تعلیم فرمودہ اصولوں کی روشنی میں ایک دستور العمل متعین فرمادیا تھا تاکہ اس کے مطابق سالکین اپنے اوقات کو مشغول رکھیں اور ایمان ویقین اور اخلاص ومحبت کی لو بڑھاتے رہیں، حضرت نے اپنے تمام کاموں کے لئے اصول متعین کررکھے تھے، بے اصولی گوارا نہ تھی، خود بھی پابندی فرماتے اور دوسروں کو بھی

پابندی کی تاکید فرماتے، یہ اصول وہدایات یہاں نقل کی جاتی ہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ سالکین کے اوقات کو کس طرح ضروری مشاغل میں محصور فرمارکھا تھا، اورانھیں مجامع کی خرابیوں سے کس طرح بچانے کی کوشش فرمائی تھی۔

(هـــدايـــات)

(۱) خانقاہ میں مہمانوں کا انتظام مولوی عبد الرؤف صاحب اور مولوی جامی صاحب سے متعلق ہے، ان دونوں میں سے کسی صاحب سے مل کر پہلے اپنے قیام کا کمرہ معلوم کرلیں۔

(۲) چارپائی اور بستر کا انتظام خانقاہ کی طرف سے نہیں ہے، ہر شخص خود اپنا بستر اپنے ہمراہ لاوے، اور کمرہ میں بچھے ہوئے ٹاٹ اور چٹائیوں کو کمرہ سے باہر نہ نکالا جائے۔

(۳) طعام کا انتظام حقّن صاحب سے متعلق ہے، ان سے تفصیلات معلوم کریں۔

(ان کے علاوہ دیگر اوقات میں کبھی رفیع اللہ چچا صاحب، کبھی مولوی بندہ رضا صاحب اور کبھی بھائی ادریس صاحب مسناوغیرہ سے بھی متعلق رہا ہے۔)

(۴) خانقاہ میں چونکہ طلبہ بھی رہتے ہیں، اس لئے سب کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ دوسری جماعت کے کسی فرد کے ساتھ، اور آپس میں بھی اختلاط سے سخت اجتناب کریں، کوئی سالک کسی طالب علم کے حجرے میں نہ جائے اور نہ ان کے ساتھ خورد ونوش رکھے۔

(۵) خانقاہ میں بیڑی، سگریٹ پینے، زور زور سے باتیں کرنے اور بلاضرورت بالخصوص دنیاوی اور سیاسی گفتگو کرنے کی ممانعت ہے۔

(۶) کوئی شخص کسی دوسرے کی چیز بدون اسکی صریح اجازت کے استعمال نہ کرے۔

(۷) ہر شخص اپنی چیز کے تحفظ کا خود ذمہ دار ہے، اگر کسی کی کوئی چیز خانقاہ میں سے چوری ہوگئی تو سارق (چور) اور مسروق منہ (جس کی چیز چوری ہوگئی ہے) دونوں کا اخراج کر دیا جائے گا، کیونکہ جو شخص اپنی دنیا کی حفاظت سے قاصر ہوگا، وہ بھلا دین کی کیا حفاظت کرے گا (مطلب یہ تھا کہ صوفی کو صرف بھولا ہی نہیں ہونا چاہئے بلکہ متیقظ اور ہوشیار بھی رہنا چاہئے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مومن نہ دھوکا دیتا ہے اور نہ دھوکہ کھاتا ہے)

(۸) یہاں کے آنے جانے والے حضرات اثناءِ قیام میں مسائل صرف حضرت والا مدظلہ العالی سے دریافت کریں یا مولوی جامی صاحب سے پوچھ لیں، کسی تیسرے سے پوچھنے کی اجازت نہیں ہے، تجربہ سے اس کا مضر ہونا ثابت ہوا ہے، لوگ یہاں بھی آکر بتکلچن (لغو باتیں) کرتے ہیں۔

(۹) آنے والوں کو چاہئے کہ آنے کے ساتھ ہی اگر وقت مناسب ہو تو اطلاع کرا کے حضرت والا سے ملاقات کر لیں، اگر چند دن قیام کرنے کا ارادہ ہو تو جانے کی اطلاع ایک دن قبل ہی کر دیں۔

(۱۰) تعویذ لینے والوں اور پانی دم کرنے والوں کو چاہئے کہ جس کے متعلق یہ کام ہو معلوم کر کے اس کو اطلاع کر دیں، ان کا کام کرا دیا جائے گا، حضرت والا کے پاس براہِ راست اس غرض کے لئے نہ آئیں۔

(۱۱) جو صاحب خانقاہ سے باہر بغرضِ تفریح یا آس پاس کے مواضع میں کسی ضرورت سے جانا چاہیں تو حضرت والا مدظلہ سے اجازت لے کر جائیں، اسی طرح گاؤں میں کسی سے ملنے کی ضرورت ہو تو بھی بغیر اجازت کسی سے نہ ملیں۔

اس دستور العمل سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت نے سالکین وطالبین کی

تربیت کا کام نہایت باضابطہ اور منظّم طور پر کیا ہے۔ رسالہ قشیریہ کی عبارت **إنما حرموا الوصول لتضييعهم الاصول** کا حوالہ اکثر دیتے کہ لوگ اصول کے ترک کرنے کی وجہ سے وصول الی اللہ سے محروم رہ جاتے ہیں اور فرماتے تھے کہ تصوف نہایت ہی منظّم اور با اصول شے ہے، ایسا نہیں ہے جیسا کہ لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ یہ وہ جامہ ہے جس کا نہیں الٹا سیدھا

اللہ کے راستے پر چلنے والوں کو متیقظ اور بیدار رہنا چاہئے۔

ایک اعلان تو آپ نے ملاحظہ فرمایا، اب ایک اور اعلان دیکھئے جو خانقاہ کی دیوار پر آویزاں رہتا تھا، اس میں طالبین وحاضرین کو انضباطِ اوقات کی ہدایت درج تھی۔

نظام الاوقات برائے طالبین وحاضرین خانقاہ

بعد نمازِ فجر:۔ تلاوت قرآن مجید ومناجات مقبول وغیرہ

بعد اشراق:۔ ناشتہ وحوائج ضروریہ

بعد ناشتہ:۔ مطالعۂ تصانیف حضرت مولانا (تھانوی) رحمۃ اللہ علیہ، مواعظ ودیگر کتب

بعد مطالعہ:۔ مطالعہ سے اخذ کردہ مضامین کا باہم مذاکرہ

بعد مذاکرہ:۔ کھانا وقیلولہ

بعد نمازِ ظہر:۔ شرکت تقریر، بعدۂ تلاوت قرآن (تھوڑی دیر تک کوئی صاحب حضرت کے حکم سے کچھ بیان کیا کرتے تھے، تقریر سے یہی مراد ہے)

بعدۂ:۔ شرکت مجلس حضرت والا

بعد نمازِ عصر:۔ تفریح ومذاکرہ ملفوظات حضرت والا

بعد مغرب:۔ نوافل وذکر

بعد نمازِ عشاء:۔ استراحت

ہدایات

(۱) طلوعِ صبح صادق سے تقریباً ایک گھنٹہ قبل آخر شب کو معمولات کیلئے اٹھ جانا۔

(۲) بعد اذانِ ظہر کوئی صاحب جہر کے ساتھ تلاوت نہ کریں اور نہ قرآن شریف لے کر صف میں بیٹھ کر پڑھیں (اس سے دوسروں کو انتشار ہوتا ہے)

(۳) بعد اذانِ فجر ذکر جہر نہ کریں (لوگوں کو سنت کی ادائیگی دشوار ہوتی ہے)

(۴) بعد نمازِ عشاء بات چیت نہ کی جائے، بلکہ سو رہنا چاہئے تاکہ آخر شب میں اٹھنے میں آسانی ہو، نیز حدیث شریف میں بھی اس وقت کلام دُنیوی کی ممانعت آئی ہے۔

(۵) اوقاتِ ذکر میں تلاوت یا اوقاتِ تلاوت میں ذکر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جس کو جس سے اُنس ہو وہی کرے، کیونکہ کام میں لگنا ہے نہ کہ کسی خاص ذکر کا پابند ہونا۔

(۶) کچھ کتابیں خانقاہ میں موجود ہیں، اہل خانقاہ ان سے مستفید ہو سکتے ہیں، ذمہ دار خانقاہ سے حاصل کی جائیں اور انھیں کو واپس کر دی جائیں۔

(ابتداء میں خانقاہ کے نگراں ماسٹر محمد عیسیٰ صاحب حمید پوری اور مولوی بندہ رضا صاحب مرحوم تھے)

ان ہدایات پر پابندی کے ساتھ عمل کیا جاتا تھا، خانقاہ میں ہر طبقہ کے افراد ہوتے، امراء ورؤسا بھی، علماء وطلبہ بھی، کاشتکار و پیشہ ور بھی، تاجر و ملازم بھی، لیکن اس درسگاہِ آخرت میں سب اپنے اپنے امتیازات فنا کر کے خانقاہ کے رنگ میں رنگ جاتے تھے، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اخیر شب کو عجیب سہانا اور دل کشا منظر ہوتا تھا،

لوگ عموماً صبح صادق سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل اٹھ کر حوائج ضروریہ سے فارغ ہوکر اپنے معمولات میں لگ جاتے، تہجد کی نماز پڑھ کر شب کے سناٹے میں ذکر اللہ کی آوازیں گونجنے لگتیں تو ایک عجیب روح پرور اور ایمان افزا سماں ہوتا۔ غافل سے غافل انسان بھی سوتا نہیں رہ سکتا تھا، رات کا سناٹا اور دیہی علاقہ، فضا پر سکوت چھایا ہوا ہوتا کہ اچانک لاالـــہ الا اللہ اور اللہ، اللہ کی سامعہ نواز صدائیں فضا کے سکوت کو توڑ کر آسمانوں سے جاٹکراتیں۔ اللہ اللہ کیا سماں ہوتا، گاؤں کی پُرسکون فضا میں ذاکرین کی آوازیں گونجتی رہتیں، پھر مختلف لوگوں پر مختلف کیفیات طاری ہوتی رہتیں۔ کوئی آہ وبکا میں محو ہے، کسی کی ہچکیاں بندھی ہوئی ہیں، کوئی اپنے رب سے اُنس وشوق کی باتیں کررہا ہے، کسی کی آنکھوں سے آنسوؤں کا مینہ برس رہا ہے، کوئی خاموش اپنے فکر میں ڈوبا ہوا ہے، کسی پر خوشی وشادمانی کا غلبہ ہے، غرض جو ہے ایک رنگ میں مست ہے، اور یہ سب اسی شیخ طریقت کے فیضانِ توجہ کا اثر ہے، جو خود بھی عرصۂ دراز تک اس بحر ناپیدا کنار کی شناوری کر چکا ہے، اور اب ''تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل'' کی رہنمائی فرمارہا ہے۔

مجلس:

فتح پور میں حضرت والا عموماً عصر کی اذان سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ قبل مجلس فرماتے تھے، جس کا سلسلہ اذان تک چلتا رہتا تھا، مجلس میں حضرت کا وعظ ہوتا، مگر اس وعظ کو عام جلسوں کے مواعظ پر قیاس نہیں کرنا چاہئے۔ حضرت کی مجلس میں تسلسل کے ساتھ لچھے دار تقریر کا گذر نہ تھا جس میں فصاحت وبلاغت کے دریا بہائے جاتے ہیں، حضرت کے پیش نظر مخاطبین کی دینی، اخلاقی، قلبی اور روحانی اصلاح تھی، اس لئے اپنے اوپر مشقت برداشت کرکے علماء متقدمین کی کتابوں سے مناسب اور برمحل

مضامین محفوظ رکھتے، مجلس میں وہ کتابیں تپائی یا الماری میں موجود رہتی تھیں، جو مضمون بیان کرنا ہوتا اپنی طرف سے کہنے کے بجائے انھیں کتابوں سے پڑھ کر سناتے۔ اس کی توضیح وتشریح کرتے اور اسی ذیل میں اصلاحی ارشادات بھی فرماتے جاتے، حضرت کی مجالس جو بیشتر معرفت حق اور وصیۃ العرفان میں شائع ہوچکی ہیں، اور ابھی تک ان کا سلسلہ جاری ہے، نیز حضرت کی تالیفات (جن کے اب پانچ مجموعے شائع ہوچکے ہیں) ان میں کتابوں کے حوالے جو نہایت بہتات کے ساتھ نظر سے گذرتے ہیں، ان کی یہی صورت ہوتی تھی کہ وعظ کے دوران حضرت والا کتابوں سے عبارتیں پڑھ کر سناتے رہتے تھے، یہ مضامین بیشتر حضرت کو یاد ہوتے تھے، اس کے باوجود معمول یہی تھا، اس سلسلے میں حضرت خود فرماتے تھے کہ:

''میں جو یہ کتابیں دکھاتا رہتا ہوں، تو وہ مضمون مجھے زبانی بھی یاد ہوتا ہے، لیکن اس لئے دکھاتا ہوں کہ ان بزرگوں کو بھی ثواب ملے۔ (حالات:۲۵۲)

مرتب حالات جناب مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامیؔ ان کتابوں کی اطلاع دیتے ہوئے جن کے مضامین حضرت اکثر سنایا کرتے تھے، تحریر کرتے ہیں کہ:

''تفسیر میں بیان القرآن، روح المعانی اور تفسیر مظہری تو اکثر، اور ابن کثیر اور کشاف کبھی کبھی۔ حدیث میں فتح الباری اور کبھی کبھی فتح الملہم بھی۔ فقہ میں طحطاوی علی مراقی الفلاح اور شامی۔ تصوف میں احیاء العلوم اور التنبیہ الطربی، اور ان کے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حجۃ اللہ البالغہ، تفہیمات الٰہیہ، خیر کثیر اور الفوز الکبیر کا ذکر اور ان سے استفادہ بھی برابر رہتا تھا، نیز خواجہ محمد معصوم علیہ الرحمہ خلف الرشید حضرت مجدد صاحب قدس سرہٗ کے مکتوبات معصومیہ اور حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کی مالا بدمنہ اور ارشاد

الطالبین، اور علامہ شعرانی کی الیواقیت والجواہر، یہ سب کتب بھی پیش نظر رہتی تھیں، یوں تو حضرت خود فرماتے تھے کہ طریق سمجھنے میں مجھے مکتوبات قدوسیہ اور مکاتیب رشیدیہ سے بہت زیادہ مدد ملی، اسی طرح مکتوبات یعقوبیہ (اب بیاضِ یعقوبی کے نام سے دستیاب ہے) کی بھی بہت تعریف فرماتے تھے۔

کتابوں کا کافی ذخیرہ خود حضرت اقدس کے پاس اپنا ذاتی موجود تھا، لیکن الہ آباد تشریف لانے کے بعد مزید کتب کا ایک جدید انتظام یہ ہوگیا کہ ایک مقامی عالم کا مسلم کتب خانہ بقیمت حاصل ہوگیا، چنانچہ حسب موقع وضرورت حضرت والا ان کتب سے بھی مضامین سناتے تھے، اسی ذخیرہ میں ترصیع الجواہر المکیہ بھی ملی تھی، جس کو حضرت والا نے حاضرین خانقاہ میں سے اہل علم حضرات کو سبقاً سبقاً پڑھایا بھی اور بالآخر راقم کو اس کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا، چنانچہ وہ ترجمہ اولاً رسالہ میں حضرت والا کو لفظ بلفظ سنانے کے بعد قسط وار طبع ہوا اور پھر مستقل کتابی صورت میں بھی شائع ہوا، انھیں کتابوں میں جن کو حضرت والا مجلس میں سناتے تھے گلستاں و بوستاں اور اخلاق محسنی بھی تھی۔ (ایضاً ص: ۲۵۳)

مرتب حالات پھر چند سطروں کے بعد ایک دلچسپ حکایت سناتے ہیں کہ:

"مجلس میں گلستاں بوستاں سنانے پر ایک واقعہ یاد آیا، جن دنوں حضرت والا کا قیام وطن کے بعد گورکھپور میں تھا، تو وہاں میاں صاحب مسلم انٹر کالج گورکھپور کے ایک اردو فارسی کے مدرس مولوی شکیل احمد صاحب عباسی (اب مرحوم ہوچکے) بھی حضرت والا کی مجلس میں تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے خود حضرت والا سے اپنا واقعہ عرض کیا کہ کل جب میں یہاں سے حضرت کی مجلس سے واپس گھر جارہا تھا تو راستہ میں ایک دوست ملے، انھوں نے پوچھا

مولوی صاحب اس وقت کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟ میں نے برجستہ کہا کہ گلستاں بوستاں کا سبق پڑھ کر آ رہا ہوں، دیکھا کہ اس جملہ کو انھوں نے بہت تعجب کے ساتھ سنا، کہنے لگے کہ آپ نے تو نہ جانے کتنوں کو گلستاں بوستاں پڑھا دیا ہوگا، یہ آپ کیا فرما رہے ہیں کہ میں اس کا سبق پڑھ کر آ رہا ہوں؟ میں نے جب ان کو متحیر دیکھا تو خود ہی اپنے قول کی شرح کی اور کہا کہ بھائی میرے! میں اس وقت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کی مجلس سے آ رہا ہوں، اور حضرت نے تمام مجلس گلستاں بوستاں ہی سنائی ہے، اور اس سلسلے میں ایسی ایسی باتیں بتائی ہیں کہ کیا کہنا، سبحان اللہ میں نے اس سے قبل اس انداز سے اس کا مطلب کسی سے نہیں سنا تھا، حضرت سے سننے کے بعد میں نے سمجھا کہ جواب تک اس کو پڑھا پڑھایا تھا وہ کچھ نہیں تھا، دراصل گلستاں بوستاں ان حضرات سے پڑھنے کی کتاب ہے، اور بڑوں کے پڑھنے کی کتاب ہے۔ ہم لوگوں نے جو بچوں کے حوالے کر دیا، حق یہ ہے کہ شیخ سعدی پر ظلم ہے، اسی کو میں نے کہہ دیا ہے کہ گلستاں بوستاں پڑھ کر آ رہا ہوں۔ (ایضاً:۳۵۴)

اس سلسلے میں حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی چشم دید شہادت بھی سنتے چلئے، اپنے مضمون ''چار ہفتہ ایک کہف میں'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''کتابوں کی الماریاں سامنے رکھی ہیں، ذرا کوئی اہم بات ہوئی فوراً کتاب نکالتے، نکلواتے اور سند وشہادت پیش ہو جاتی۔ کثرت سے کتابوں میں نشانیاں رکھی ہوئی ہیں، مطلوب مقام بات کی بات میں نکالتے ہیں، مجلس میں بہت محققانہ وعارفانہ ہی نہیں بڑے بڑے پتہ کی باتیں ہاتھ آتی رہتی ہیں، خصوصاً طالبین وسالکین کے لئے اور کم وبیش سب کی تائید وتوثیق اگلے پچھلے مسلم اکابر کی کتابوں اور سندوں سے فرماتے جاتے ہیں۔

مجلس کی ایک عجیب خصوصیت:

حضرت کی مجالس میں شریک ہونے والے تمام حضرات......تقریباً......اس خصوصیت پر متفق ہیں اور سب اس کی شہادت دیتے ہیں کہ نفس کی کوئی خرابی خواہ وہ کسی گوشہ میں چھپی ہوئی ہو، عمومی مواعظ میں اس پر گرفت ضرور ہو جاتی تھی، کسی کے دل میں کوئی سوال ہے، کوئی اعتراض سوچ رہا ہے، ہر ایک کا جواب اور تشفی بخش جواب مجلس میں کسی نہ کسی عنوان سے آ ہی جاتا تھا، بعض اوقات تو ناواقف عجب کش مکش میں پڑ جاتا کہ میرے دل کی بات ان پر کیسے کھل گئی، لیکن بات یہ ہے کہ جو شخص **نَبَّأَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ** (مجھے علیم وخبیر پروردگار نے بتلا دیا ہے) کہنے والے نبی (**علیہ ألف ألف تحیة وسلام**) کا سچا جانشین تھا، جسے حق تعالیٰ نے منصب اصلاح پر مامور فرمایا تھا، اگر اس کے اوپر لوگوں کے امراضِ قلبی مکشوف ہو جاتے رہے ہوں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے، آخر زبان وقلب اور مضامین ومعارف سب خداوند تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کسی نفسانی عیب میں ملوث مجلس میں حاضر ہوا، حضرت کو کچھ معلوم نہیں، ناگاہ آپ کے مصفیٰ ومجلیٰ قلب پر ایسے علوم ومعارف کی بارش شروع ہو گئی جس سے یہ گندگی دھوئی جا سکے۔ ادھر وہ شخص حیران کہ انھیں کیونکر خبر ہوئی، ادھر حضرت نہیں جانتے کہ یہ مضمون بارش کی طرح کیوں امنڈ رہا ہے۔ مربی حقیقی تو خدا ہیں، یہ ان کے انداز ہیں تربیت کے، کون جانتا ہے کہ کیسی کیسی پردہ پوشیوں کے ساتھ بندوں کی روحانی کثافتوں کو دور کیا جاتا ہے، **فسبحان اللہ**۔

کبھی کبھی حضرت والا خود بھی ارشاد فرماتے تھے کہ بھائی مجھے کیا معلوم کہ کس کے قلب میں کیا مرض چھپا ہوا ہے، یہ اور بات ہے کہ اس کے حال کے مطابق اللہ تعالیٰ مجھ سے مضامین کہلوا دیتے ہیں، ہمارے ایک دوست اکثر کہا کرتے ہیں کہ کبھی

ایسا نہیں ہوا کہ میں مجلس میں حاضر ہوا ہوں اور اپنا کچا چٹھا عمومی بیان میں کھل کر نہ آیا ہو۔ ہر بار کا یہی تجربہ ہے، اس لئے توبہ کرکے شریک مجلس ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ آیئے اس سلسلے میں ایک نہایت وقیع شہادت سناؤں۔

مولانا عبد الماجد دریابادی ۱۹۶۳ء میں الہ آباد حضرت کی خدمت میں تشریف لائے تھے، واپسی پر حضرت کے ایک مجاز کو تحریر فرماتے ہیں کہ:

"مولانا وصی اللہ حفظہ اللہ کے افراطِ کرم سے شرمسار اور محجوب ہوکر واپس آیا، بعد ظہر کی مجلس میں انھوں نے ایک بات ایسی فرمادی جو دل میں تیر کی طرح پیوست ہوگئی۔ فرمایا کہ ایسے علماء بھی ہیں جو مسائل تفسیر پر تو خوب گفتگو کر لیتے ہیں لیکن تلاوت قرآن سے ان کے دل کو لگاؤ نہیں، اس لئے اس کے انوار و برکات سے محروم ہی رہتے ہیں، یہ تو گویا اپنے کشف سے یا فراست سے میرے ہی دل کا چور پکڑ لیا، اب آں عزیز اگر میرے اس خط کے حوالے سے موصوف سے کچھ آدابِ تلاوت دریافت کرکے مجھے لکھ بھیجیں تو یہ آں عزیز کا بڑا کرم ہوگا۔ ایک شکل یہ ہے کہ مولانا ایک وعظ اسی آدابِ تلاوت پر ارشاد فرمادیں اور آں عزیز اس کا خلاصہ نقل کرکے مجھے ارسال فرمادیں، ان دونوں صورتوں میں سے جو آسان تر ہو۔ عبد الماجد ۳۱/ اکتوبر ۱۹۶۳ء

شہادتوں کا سلسلہ چھڑ گیا ہے تو حضرت کے ایک رفیق درس جناب مولانا حکیم رمضان الحق لکھیم پوری کی شہادت بھی سن ہی لیجئے۔ حکیم صاحب حضرت پیرانی صاحبہ کے علاج کے لئے فتح پور تال نرجا تشریف لے گئے تھے، حکیم صاحب کے ساتھ ان کے ایک عزیز...... جو حضرت کے مرید ہیں...... بھی تھے، حکیم صاحب نے کسی وقت ان سے کہا کہ مولانا کی باتیں بہت پسند آتی ہیں، قلب کا میلان بھی ہے، مگر رہ رہ کر یہی خیال آڑے آتا ہے کہ میرے ساتھی ہیں، حضرت نے دوسرے دن مجلس میں

اسی مضمون پر گفتگو فرمائی، جس کا حاصل یہ تھا کہ:

”جس طرح طب جسمانی میں رجوع کرنے کیلئے ساتھی ہونا مانع نہیں ہوتا، اسی طرح طب روحانی میں بھی چھوٹا ہونا مانع نہیں ہونا چاہئے اور نہ ساتھی ہونا۔

حکیم صاحب نے مجلس کے بعد اپنے عزیز سے ذکر کیا کہ میاں! مولانا کا کشف تو بڑا بے ڈھب ہے، دیکھو کل جو باتیں ہم دونوں ذکر کر رہے تھے، اس وقت مجلس میں انھوں نے سب دہرا دیں۔

شروع میں عرض کیا جا چکا ہے مجلس میں حضرت والا تسلسل کے ساتھ وعظ نہیں فرماتے تھے، بلکہ بار بار کتابیں بھی سامنے رکھ کر مضامین سناتے، درمیان مجلس میں سالکین وطالبین سے کبھی بالواسطہ اور کبھی بلا واسطہ سوال وجواب اور اصلاح ومواخذہ کا سلسلہ بھی جاری رہتا، اور کبھی کبھی تو پوری مجلس یہی سلسلہ چلتا رہتا، غرض ایک عجیب رنگ تھا، جس کی تصویر کشی اب ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، اور بالخصوص ایسے شخص کے لئے جس نے مجلس کا یہ پُر لطف منظر صرف چشم تصور سے دیکھا ہے، ورنہ اسے مادی اور جسمانی حاضری سے محرومی رہی۔

مجلس میں باریاب ہونے والوں کی شہادت ہے کہ جب وہاں سے اٹھتے تو نمایاں طور پر قلوب میں نورانیت، گناہوں پر ندامت، خوف وخشیت الٰہی میں شدت اور یقین وایمان میں اضافہ محسوس ہوتا۔ اپنی زندگیوں میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا کرنے کا نیا جذبہ وحوصلہ صاف طور پر اپنے قلوب میں موجزن پاتے، اور وہیں سے یکا یک زندگی کا دھارا دنیا سے مڑ کر دین وآخرت کی جانب بہنے لگتا، کتنے چہرے نورِ سنت سے جگمگا اٹھے، کتنے دل خوفِ آخرت سے لبریز ہو گئے، کتنے نفوس کا تزکیہ ہو گیا، اللہ کے سوا کون جانتا ہے؟

باب ۱۰

حضرت مصلح الامت اور کوپا گنج

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے سوانح حیات کا ایک زرّیں عنوان قصبہ کوپا گنج سے بھی متعلق ہے، گذشتہ صفحات میں کوپا گنج کا تعارف کسی قدر آچکا ہے، عرض کرچکا ہوں کہ حضرت کی تبلیغی اور اصلاحی کاوشوں کا دائرہ فتح پور کے باہر اطراف کے علاقوں میں بھی پھیلا ہوا تھا۔قرب وجوار میں حضرت کے چشمۂ معرفت سے سیراب ہونے والی بستیوں میں قصبہ کوپا گنج سب سے نمایاں مقام کا حامل ہے، یہاں کے باشندے حضرت کے ابتدائی دور سے آخر حیات تک یکساں عقیدت منداور وفادار رہے ہے،تقریباً پوری آبادی، کیا خواص اور کیا عوام حضرت کی معتقداور مخلص تھی، اور حضرت بھی ان کی عقیدت ومحبت کی بڑی قدر فرماتے تھے، الہ آباد یا بمبئی میں کوپا گنج کے لوگ حاضر ہوتے تو حضرت فرماتے کہ ہمارے وطن کے لوگ آئے ہیں۔

حضرت کی آمد ورفت کوپا گنج میں اس وقت سے تھی جبکہ آپ زیادہ تر تھانہ بھون میں آستانۂ شیخ پر حاضری دیا کرتے تھے، وطن سے تھانہ بھون جاتے ہوئے عموماً کوپا گنج ہوکر ہی جاتے تھے،کوپا گنج میں سب سے پہلا تعلق غالباً حاجی نعمت اللہ صاحب مرحوم کو ہوا تھا، حاجی صاحب کے یہاں حضرت کبھی کبھی فتح پور سے تشریف لایا کرتے تھے، اورانھیں کے تنگ وتاریک مکان میں قیام ہوتا۔حاجی صاحب کے یہاں چوڑیاں بنانے کا کام ہوتا تھا، منظر یہ ہوتا کہ حاجی صاحب لاکھ گرم کرکے چوڑیاں تیار کرتے

ہوتے اور حضرت اقدس ایک جانب بیٹھے تسبیح اور ذکر میں لگے رہتے تھے، کبھی کبھی بات چیت بھی ہوتی رہتی، کھانے کے وقت بے تکلف ماحضر پیش کردیتے اور حضرت والا بے تکلف تناول فرمالیتے۔

حاجی نعمت اللہ صاحب کے واسطے سے حکیم مولوی حفیظ اللہ صاحب نے حضرت سے تعلق قائم کیا، اور بہت جلد اپنی والہانہ محبت وعقیدت کی وجہ سے حضرت کے یہاں ایک خصوصی مقام حاصل کرلیا۔ کوپا گنج کے عقیدت مندوں میں حکیم صاحب کو ایک نمایاں مقام حاصل تھا۔ حضرت کبھی کبھی ان کے دواخانہ پر بھی جا کر بیٹھنے لگے۔ ایک روز حکیم صاحب کی دوکان پر ایک عجیب واقعہ پیش آیا، جس سے حضرت کے قلبی انکسار اور تواضع کا کچھ سراغ ملتا ہے، مولانا حکیم بشیر الدین صاحب راوی ہیں کہ:

> ’’حضرت مولانا، حکیم حفیظ اللہ صاحب کی دکان پر تشریف رکھتے تھے، حکیم صاحب پان کھاتے تھے، حضرت کو بھی پان پیش کیا، حضرت والا پان نہیں کھاتے تھے، ان کی خاطر سے کھالیا اور اندر بیٹھے بیٹھے اس کی پیک جو منہ سے باہر پھینکی تو راستہ مین ایک غیر مسلم جو اس وقت وہاں سے گذر رہا تھا اس پر پڑگئی ،وہ قوم کا شاید چمار تھا۔ یہ دیکھ کر حضرت والا فوراً باہر نکلے اور اس کو روک کر اس سے معذرت کی اور معافی مانگی۔ یہ وہ دور تھا کہ یہ رعایا لوگ تھے، میاں لوگوں کا بڑا احترام کرتے تھے، اور ان سے بہت ڈرتے تھے، حضرت مولانا کا معافی مانگنا اس کو بہت عجیب سا معلوم ہوا، اس نے کہا نہیں مولانا صاحب! کوئی بات نہیں ہے، میں خود معافی مانگتا ہوں، فرمایا نہیں زبان سے کہہ دو کہ میں نے معاف کیا، غرض اس سے کہلوالیا تب سکون ہوا، اور اس کے بعد سے پھر حضرت والا نے پان بالکل ترک فرمادیا۔‘‘

حضرت کی آمد و رفت کو پا گنج میں ہوتی رہی، مگر اس طرح کہ صبح آئے اور شام کو لوٹ گئے، یا ایک شب قیام کر کے واپس ہو گئے، طویل قیام اور عام وعظ و پند کا سلسلہ ابھی نہیں شروع ہوا تھا، اس لئے عمومی طور سے لوگ حضرت سے واقف نہ ہو سکے تھے، اللہ کی مشیت نے چاہا کہ حضرت سے اہل کو پا گنج کو عمومی نفع ہو۔ اس کا سامان یوں ہوا کہ حضرت پیرانی صاحبہ کی طبیعت ناساز ہوئی، علاج کو پا گنج کے ایک حاذق طبیب جناب حکیم مولوی محمد شفیع صاحب والد بزرگوار حکیم مولانا نثار احمد صاحب کا شروع ہوا، مرض کی نوعیت دیکھ کر حکیم صاحب کا مشورہ ہوا کہ حضرت والا مریض کو لے کر کچھ دنوں کو پا گنج میں مستقل قیام کریں تا کہ باقاعدہ طبیب کی نگرانی میں علاج جاری رہ سکے، یہ قدرے طویل قیام ہوا، اب اہل کو پا گنج کو عمومی طور پر آپ سے قرب اور تعلق ہونے لگا، مساجد میں حضرت کے مواعظ کا سلسلہ بھی جاری رہا، اس سلسلے میں سب سے زیادہ پیش پیش حکیم حفیظ اللہ صاحب تھے، حضرت نے ایک بار ارشاد فرمایا کہ:

> ”مولوی حفیظ اللہ مجھے کو پا گنج میں آپ ہی نے مشہور کیا، اور وہاں کام آپ کی وجہ سے ہوا۔ یہ بھی فرماتے کہ آپ نے ہر ہر جگہ میرے وعظ کا اعلان شروع کر دیا، اس کی وجہ سے لوگوں میں میرا تعارف بڑھا اور لوگ مجھ سے قریب ہوتے گئے۔

کام تو درحقیقت حضرت کے اخلاص کی برکت سے ہوا، مگر یہ دنیا اسباب وعلل کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ کو کسی سے کام لینا ہوتا ہے تو اس کے لئے انصار واعوان کی ایک وفادار جماعت مہیا کر دیتے ہیں، اس کی وجہ سے کام بڑھتا چلا جاتا ہے۔ حضرت مولانا جذبۂ امتنان میں اپنے مددگاروں کی خدمت وکوشش کا

اعتراف اس طرح کے الفاظ میں اکثر فرماتے تھے۔

حضرت کے مواعظ کو پاگنج کی تمام مساجد میں ہونے لگے، اور ان کے اثرات بھی نمایاں ہونے شروع ہو گئے، نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا، کتنے لوگ ذکر و شغل میں لگ گئے۔ تہجد، اذکار اور تلاوت کی پابندی کرنے لگے، چہروں پر داڑھی کا نور جگمگانے لگا، لیکن عام طور پر چونکہ لوگ دین سے زیادہ لگاؤ نہ رکھتے اس لئے بعض نگاہوں میں یہ تبدیلی کھٹکنے لگی، اور جیسا کہ ہمیشہ کا دستور ہے کہ نیک اور دیندار افراد دوسروں کے طعن استہزاء کا نشانہ بن جاتے ہیں، یہاں بھی یہی ہونے لگا، حضرت فرماتے تھے کہ:

”جب میں کو پاگنج آنے جانے لگا اور وہاں کی مسجدوں میں وعظ کہنے لگا تو آہستہ آہستہ لوگوں پر اثر ہوا، لوگ نمازی ہونے لگے اور مساجد آباد ہونے لگیں، یہاں تک کہ فرائض سے بڑھ کر لوگوں کو چاشت، اشراق اور تہجد کا بھی شوق پیدا ہو گیا، اور بہت سے لوگ شب بیدار اور تہجد گزار ہو گئے، اور بہت سے ان میں ذکر و اذکار میں بھی لگ گئے، چنانچہ آخر شب میں ان کے ذکر کرنے ہی کی وجہ سے دوسروں کو بھی ان کے تہجد کا علم ہوا۔ اب سنئے کہ دین سے بعض لوگ اس قدر دور تھے کہ صبح صبح گوشت لینے کے لئے جب گوشت کی دوکان پر سب کا اجتماع ہوتا تو انھیں میں سے کوئی بے نمازی ان نمازیوں پر طنز کرتے ہوئے یوں کہتا کہ بھائی ان کو گوشت پہلے دیدو اور ذرا اچھا اور زیادہ دینا، یہ تہجد پڑھتے ہیں۔ یہ کہنا احترام کے طور پر نہ ہوتا، بلکہ تمسخر کرنے اور اس کو بنانے کیلئے ایسا کہتا تھا، جب اس کا سلسلہ بڑھا اور یہی ان سب کا شیوہ بن گیا تو کچھ لوگوں نے مجھ تک یہ بات پہونچائی کہ ہم کو ایسا ایسا کہا جاتا ہے، میں نے ان سے کہا

کہ تم لوگ سن لیا کرو اور صبر کرو۔ اپنی زبان سے اس کا کچھ جواب نہ دو، اور اس کے بعد میں نے یہ کیا کہ پھر اپنے وعظ میں جو ہر ہر مسجد میں ہوتا تھا یہ کہنا شروع کیا کہ تم لوگ دینداری سے دور رہو، خوب فسق کے کام کرو اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کو ہدایت بخشے تو اور وہ تمہاری برادری سے نکل کر صالحین کا طریقہ اختیار کرے اور کچھ نماز روزہ کرنے لگے تو اس کو بناؤ اور یوں کہو کہ...... ان کو گوشت پہلے دیدو اس لئے کہ یہ تہجد پڑھتے ہیں...... اب مجمع میں مجھ سے یہ باتیں سن کر لوگ سٹپٹائے اور وعظ کے بعد تفتیش جاری ہوئی کہ یہ کون بے ہودہ ہے جو ایسی بات کہتا ہے، سب لوگ اس کو غائبانہ ملامت کرنے لگے، اب اس نے سمجھا کہ اگر ظاہر ہو گیا کہ میں کہہ رہا ہوں تو لوگوں میں رُسوا ہو جاؤں گا، پھر لوگوں نے مجھ سے آکر کہا کہ اب وہ کچھ نہیں کہتا۔ اس کے بعد میں نے بھی اس کو وعظ میں کہنا چھوڑ دیا۔

یہ بات بالکل ابتداء میں تھی، جوں جوں وقت کی رفتار آگے بڑھتی رہی کوپا گنج میں حضرت کو قبول عام حاصل ہوتا گیا، چنانچہ اس کے آثار آج تک وہاں دیکھے جاتے ہیں، مساجد آباد ہیں، کئی کئی عربی کی درسگاہیں قائم ہیں۔ چہروں پر شرعی داڑھی کا نور نمایاں، مزاج میں نرمی و مسکنت! گو حالات اب پہلے جیسے نہیں ہیں تاہم جو کچھ ہے، کہا جا سکتا ہے کہ حضرت کے فیضانِ توجہ کو اس میں بیشتر دخل ہے۔

کوپا گنج میں حضرت کی تعلیمات جب عام ہونے لگیں اور یہاں کے لوگوں کے اخلاص و تعلق کا اندازہ ہوا تو حضرت نے کبھی کبھی بہت طویل قیام بھی فرمایا ہے بلکہ یوں کہئے کہ خانقاہ اس وقت کوپا گنج میں منتقل ہو جاتی تھی۔ مولانا عبد الرحمٰن صاحب جامیؔ نے یہاں کی خانقاہ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

''جس وقت یہ ناکارہ (یعنی مولانا جامی صاحب) حضرت کی خدمت میں اس طور پر حاضر ہوا کہ اس کے بعد پھر وہیں قیام ہی کرنا طے ہوگیا تو حضرت اقدس اس وقت کوپا گنج ہی میں تھے، سیٹھ عبدالرب صاحب کی کوٹھی پر قیام تھا۔ ایک طرف حضرت والا کا قیام تھا اور دوسری جانب حضرت کی صاحبزادیاں اور ان کے بچے رہتے تھے، اور نیچے بڑے ہال میں باہر کے لوگ اٹھتے بیٹھتے تھے، اور صبح کی عمومی مجلس ہوتی تھی ۔ مہمانوں کا قیام مولوی بشیرالدین صاحب کے احاطہ میں تھا، انھوں نے ایک لمبا سا کمرہ خالی کردیا تھا، جس میں پیال ڈال کر ٹاٹ کا فرش بچھا دیا تھا، بس اسی کے اوپر آنے والا سالک خواہ امیر ہو یا غریب سب اپنا اپنا بستر لگا دیتے تھے، قطار سے صوفیوں کے بستر لگے ہوتے تھے، کہیں گدا اور سفید چادر لگی ہوتی اور اس کے بازو میں کوئی صرف دری ہی بچھائے ہوتا، کسی طرف بستر کا کام صرف ایک تہبند ہی بچھا کرلیا جاتا تھا، کوئی مسکین صرف سرہانے اپنا جھولا رکھ لیتا، اور اسی بچھے ہوئے ٹاٹ پر قناعت کرتا، یہ تھا کوپا گنج کی خانقاہ کا نقشہ۔''

(کوپا گنج میں اس وقت خانقاہ کی نگرانی مولوی بندہ رضا صاحب مرحوم کے سپرد تھے۔)

کوپا گنج میں جہاں مردوں کی اصلاح پر آپ نے توجہ فرمائی ، وہیں عورتوں میں دینداری پیدا کرنے کیلئے بھی آپ کوشاں رہے، تعلیم بالغاں کا نظم بھی حضرت کے مواعظ سے متاثر ہوکر کیا گیا۔ مولوی عبدالقیوم صاحب کوپا گنجی راوی ہیں کہ کوپا گنج کے ایامِ قیام میں برابر مختلف جگہوں پر حضرت کا وعظ ہوتا رہتا تھا، جس میں مردوں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ عورتوں کی بھی اصلاح کے مضامین بیان ہوتے تھے ، وعظ حضرت والا بالعموم مسجد ہی میں فرماتے تھے ، ہر ہر محلّہ کی مسجد میں نوبت بہ نوبت

تشریف لے جاتے اور نماز کی اہمیت اور اس کے مسائل وعظ میں بیان فرماتے، اور یہ فرماتے تھے کہ دین پر عمل کرنے کے لئے دین کا علم ضروری ہے، لہٰذا بچوں کی تعلیم کے علاوہ تعلیم بالغاں کا بھی نظم ہونا چاہئے، چنانچہ کوپا گنج کی متعدد مساجد میں تعلیم بالغاں کا انتظام فرمایا، جس کو یہاں کے اہل علم حضرات نے بھی پسند کیا اور اس سلسلہ میں حضرت کا تعاون کیا۔ چنانچہ مولانا عبدالصمد صاحب مرحوم جو کوپا گنج کے سر برآوردہ علماء میں شمار ہوتے تھے، انھوں نے اپنی مسجد میں لوگوں کو خود پڑھانا شروع فرمادیا۔ بوڑھے سن رسیدہ لوگ بہشتی زیور پڑھنے لگے، عورتوں نے بھی، مردوں نے بھی۔ اس طرح دین کا قصبہ میں ایک عام چرچا ہوگیا۔ اللہ کی شان کہ تنہا ایک ذات کے اخلاص اور اس کی محنت و کوشش نے پورے قصبہ اور اطرافِ قصبہ میں دین پھیلا دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب ۱۱

رند جو ظرف اٹھا لے وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لے وہی میخانہ بنے

حضرت والا کے قلب میں اللہ تعالیٰ نے دینی حمیت وغیرت اور مسلمانوں کی اصلاح وتربیت کا کچھ ایسا ولولہ اور جذبہ بھر دیا تھا جو ہمہ دم اور ہمہ تن آپ کو بے چین وبے تاب رکھتا تھا۔ دین کے خلاف کسی کام، کسی رسم اور کسی عقیدہ کو دیکھنے کے بعد آپ کے جذب وجلال کا ایک عجیب عالم ہوتا تھا، ایسا جلال جسے ناواقفوں نے غصہ سے تعبیر کیا، حالانکہ وہ غصہ نہ تھا، غضب تھا، غضب خداوندی کا مظہر! غصہ نہ تھا، غیرت تھی، غیرت خداوندی کا عکس! بعض اوقات آپ کی یہ جلالی شان اس صورت میں رونما ہوتی کہ دیکھنے والے متحیر ہوتے، لیکن اندر ہی اندر دلوں کی کثافت دور ہوتی چلی جاتی۔ قیام فتح پور کے ابتدائی دور میں جبکہ حضرت والا انتہائی محنت وکاوش کے ساتھ گاؤں اور اطراف کے حلقوں کو دین سے قریب لانے کی کوشش کررہے تھے، اور لوگ متوجہ ہو چلے تھے۔ ایک بار کوئی خاص بات ایسی پیش آئی کہ حضرت والا نے بستی کی سکونت یکلخت ترک کردی۔ زمانہ گذر گیا اب اس کی تفصیل کسی کے ذہن میں نہیں ہے، اس دور کو دیکھنے والے اس دنیا سے جا چکے، اور جو باقی ہیں ان کا حافظہ ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ واقعہ کے راوی حضرت کے برادر خورد جناب رفیع اللہ صاحب ہیں، ان کے بیان کے مطابق وہ کوئی بہت اہم بات تھی کس کی وجہ سے حضرت والا گاؤں والوں سے ناراض ہوئے، اور ایک روز فجر کی نماز ادا کر کے کوپا گنج کے راستے پر چل کھڑے

ہوئے، ایک صاحب سمیع اللہ خاں ہمراہ تھے، حضرت کی خفگی معلوم تھی، اس لئے فوراً کسی کو کچھ عرض و معروض کی ہمت نہ ہوسکی۔ چند آدمیوں نے باہم مشورہ کیا کہ آپ کے پیچھے ضرور چلنا چاہئے تاکہ جیسے بھی ہو حضرت کو راضی کر کے لایا جائے، چنانچہ چند لوگ جن میں رفیع اللہ چچا بھی شریک تھے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ راستہ میں سمیع اللہ خاں کی چھاؤنی پڑی (اس جگہ کا نام اِٹورہ ہے) وہاں آپ ٹھہر گئے، پیچھے جانے والوں کو سامنے پہونچنے کی ہمت نہ ہوئی، ایک طرف درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں ہوگئے، حضرت نے سمیع اللہ خاں سے فرمایا دیکھو پیچھے سے کوئی آرہا ہے؟ خاں صاحب نے عرض کیا، جی ہاں کچھ لوگ آئے ہوئے ہیں، فرمایا بلاؤ، انھوں نے رفیع اللہ چچا سے کہا کہ حضرت نے آپ کو بلایا ہے، چچا کا بیان ہے کہ میں بہت ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا، سامنے پہونچا تو فرمایا آپ کیسے تشریف لائے؟ میں نے عرض کیا کہ آپ کو واپس لے چلنے کیلئے۔ فرمایا مجھے لے جا کر کیا کروگے، جو کچھ کہوں گا کروگے بھی؟ میں نے عرض کیا جی ہاں ضرور، فرمایا گاؤں کے باہر کونڑا میں جو تمہاری زمین ہے وہ مجھے دوگے؟ میں نے عرض کیا بالکل وہ حضرت ہی کی ہے، فرمایا اچھا تو چلو، چلتا ہوں۔ اس درمیان میں آناً فاناً کوپاگنج تک اس کی خبر پہونچ گئی کہ حضرت اِٹورہ میں تشریف رکھتے ہیں، چنانچہ وہاں سے کچھ لوگوں کی ایک جماعت فوراً پہونچی، لیکن حضرت کی اس قسم کی ناراضی درحقیقت اصلاح کی غرض سے ہوتی تھی، کام کا کوئی نقشہ ذہن میں بنالیا تھا اور منشاء کے مطابق کام کی توقع ہوگئی تھی، اس لئے آگے تشریف نہیں لے گئے وہیں سے واپس ہوگئے، اور مجھ سے فرمایا کہ گاؤں میں نہیں جاؤں گا، ہرداسپور کے ظہور صاحب اور چند لوگوں کا نام لے کر فرمایا کہ انھیں بلوالو۔ یہ لوگ حضرت کے عقیدت مند باا ثر زمیندار تھے، حضرت نے فرمایا کہ کونڑا میں چھپر ڈال دو اور نماز

پڑھنے کے لئے ایک جگہ مخصوص کردو، لوگ فوراً تعمیل ارشاد میں لگ گئے، ظہر تک جھونپڑا ڈالا جاچکا تھا، اسی میں ظہر کی نماز ادا کی گئی۔ نماز کے لئے علیحدہ چبوترہ بنادیا گیا۔ حضرت والا کیلئے لوگوں نے الگ ایک حجرہ بھی بنادیا کہ اس میں خلوت اور عبادت کے اوقات میں تشریف رکھیں، اس طرح اس افتادہ زمین کو حضرت کے اقدامِ عالیہ کی برکت سے ابرار و صالحین کی قیام گاہ بننے کا شرف حاصل ہوگیا، چنانچہ اسی ''عریشی خانقاہ'' (جھونپڑے کی خانقاہ) میں حضرت کے محبّ و محبوب خواجہ تاش، حضرت اقدس تھانوی قدس سرہٗ کے عاشق زار خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب کی بھی تشریف آوری ہوئی، خواجہ صاحب کسی سرکاری کام سے اعظم گڈھ تشریف لائے تھے، اور وہیں سے اطلاع بھیجی کہ کوپا گنج ہوتا ہوا فلاں روز فلاں وقت آرہا ہوں۔ حضرت نے کوپا میں کہلوادیا کہ خواجہ صاحب آرہے ہیں کوپا سے فتح پور تک سواری کا معقول نظم رہے، چنانچہ اہل کوپا نے خواجہ صاحب کا خاطر خواہ استقبال کیا، اور بہت سے لوگ فتح پور تک ہمراہ آئے۔ خواجہ صاحب کے لئے سواری کا انتظام کیا گیا تھا، فرمایا کہ جب فتح پور کی حد شروع ہوجائے تو مجھے بتادینا، چنانچہ فتح پور کی حد شروع ہوتے ہی آپ سواری سے اتر گئے اور پیدل چل پڑے۔ ادھر حضرت بھی استقبال کی غرض سے اپنے خدام کے ساتھ آگے نکل آئے تھے، خواجہ صاحب کی نظر حضرت پر پڑی تو بے ساختہ دوڑ کر آپ سے لپٹ گئے، اور بہت دیر تک معانقہ فرمایا، **سبحان اللہ**

یہی تھیں وہ شمیم انگیزیاں عطر محبت کی
کہ جن سے بوستانِ اشرفی یکسر معطر تھا

گاؤں کے بعض لوگوں نے موقع غنیمت سمجھ کر خواجہ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت ہم لوگوں سے ناراض ہوکر گھر سے یہاں آگئے ہیں، خواجہ صاحب تو بے تکلف

تھے ہی، دریافت فرمایا کہ آپ کا مکان تو گاؤں میں ہوگا، یہاں کیسے قیام ہے؟ فرمایا ہاں ہے تو لیکن آج کل مخلوق سے وحشت غالب تھی ، اس لئے تنہائی کے خیال سے یہاں چلا آیا۔ خواجہ صاحب نے گاؤں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی ، حضرت نے کچھ لوگوں کو ساتھ لگا دیا، خواجہ صاحب گاؤں کا ایک چکر لگا کر آ گئے ،شب کو اسی عریش میں قیام رہا، جگہ نہایت پُر فضا، پاس میں ندی بہ رہی تھی ،خواجہ صاحب کی مجذوبانہ طبیعت کو یہ منظر راس آیا، وجد میں آ کر خوب اشعار سنائے ،خود بھی محظوظ ہوئے اور دوسروں کو بھی مست و بے خود بنایا۔ دوسرے دن خواجہ صاحب اعظم گڈھ تشریف لے گئے۔

تقریباً ایک سال عریش کی یہ خانقاہ آباد رہی ، دن میں سالکین وذاکرین کی ایک خاصی تعداد حاضر ہوتی ، اپنے اَوراد واَشغال میں لگی رہتی ، حضرت کی مجلس ہوتی ، اصلاح نفس اور تعلیم وتلقین کا سلسلہ چلتا ، عشاء کی نماز پڑھ کر لوگ گھروں کو واپس ہوجاتے ، البتہ حضرت والا کے بڑے بھائی جناب فصیح اللہ خاں صاحب وہیں رہتے۔

انھیں دنوں جبکہ آپ کونڑا کے اس چھپر میں مقیم تھے، ایک دن گھر میں والدہ مکرمہ صبح کو اٹھیں ، وضو کرنے کے لئے لوٹے میں پانی لیا اور مسواک اٹھا کر منہ میں ڈالی ہی تھی کہ ایک بھڑ نے جو شاید مسواک پر بیٹھی ہوئی تھی ، زبان پر ڈنک مار دیا، والدہ مکرمہ پریشان ہوکر بلبلا اٹھیں ،تھوڑی دیر میں پوری زبان ورم آلود ہوکر منہ سے باہر لٹک آئی ، والدہ کی اس تکلیف کی خبر حضرت کو ہوئی تو بے چین ہو گئے۔ حافظ عبدالمنان صاحب (۱) کو بلایا اور کچھ پڑھ کر اپنا لعابِ دہن ان کی انگلی پر لگا دیا، اور کچھ ان کے کان میں فرمایا، اور رفیع اللہ چچا سے فرمایا کہ ان کو لے جاؤ، چنانچہ دونوں گھر آئے ، یہاں والدہ تکلیف سے سخت پریشان تھیں ، حافظ صاحب نے حضرت کا لعاب دہن زبان پر مل دیا ، والدہ کو فوراً سکون ہوگیا اور تھوڑی دیر میں ورم تحلیل ہوگیا۔ حافظ

صاحب جانے لگے تو والدہ نے کہلا بھیجا کہ جاؤ بھیا (مولانا) سے دعا کہنا اور کہہ دینا کہ اب ہم بالکل ٹھیک ہیں۔ (بروایت جناب رفیع اللہ چچا)

☆☆☆☆☆☆☆

(۱) **حافظ عبد المنان** صاحب کو پا گنج کے رہنے والے ایک نابینا شخص تھے، بہت نیک صالح اور با کرامت، حضرت کے یہاں رہ پڑے تھے، بچوں کو قرآن شریف پڑھاتے تھے، حضرت کے بڑے عاشق تھے، حضرت کی خدمت بڑی سعادت مندی اور خوشدلی سے کرتے تھے۔ مولانا حکیم بشیر الدین صاحب فرماتے ہیں کہ گرمیوں میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ حضرت آرام فرما ہوتے اور حافظ صاحب رات بھر حضرت کو پنکھا جھلتے رہتے اور بالکل تکان نہ مانتے۔ حضرت بھی ان کی بڑی قدردانی فرماتے، کبھی کبھی لوگوں کو حکم فرماتے کہ فلاں بات کے لئے حافظ جی سے دعا کراؤ۔ ایک بار سیلاب آیا ہوا تھا، حضرت کے مکان اور مسجد کے درمیان پانی بھر گیا تھا، مسجد کا زینہ غرق تھا، حضرت نے کہلوایا کہ حافظ جی دعاء کریں۔ رات کو حافظ صاحب اٹھے اور زینہ کے پاس بیٹھ کر پانی کو ڈھکیلتے جاتے اور یہ کہتے جاتے کہ ”جا بے جا، جا بے جا۔ حضرت نے کہا ہے“ بس پانی اترنا شروع ہو گیا۔

حضرت کے وصال کی خبر سن کر الہ آباد آئے اور صحن خانقاہ میں مدینہ کا ایک درخت تھا، اس سے لپٹ کر حضرت کی یاد میں زار و قطار روتے تھے۔ الہ آباد سے واپس جا کر بیمار ہوئے اور پھر نہ اُٹھ سکے، حتیٰ کہ اپنے محبوب شیخ و مرشد سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے۔

باب ۱۲

مخالفت اور اس کی اصلاح

حضرت نے جب وطن میں مستقل اقامت اختیار فرمالی اور دینی واصلاحی کام کا آغاز فرمادیا، جس کی برکت سے آہستہ آہستہ علاقہ میں دین کا نور پھیلنے لگا، جہالت کی تاریکی کافور ہونے لگی، گھر گھر علم کا چرچا شروع ہو گیا، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ حضرت کی مقبولیت وشہرت بھی روز افزوں ہونے لگی۔ باہر کے لوگوں کی آمدورفت کی وجہ سے حضرت کے یہاں اور رونق بڑھی تو دوسری طرف بھی پر پُرزے نکلنے شروع ہوگئے، آخر جس نے روزِ ازل ہی انسانیت کو گمراہ کرنے اور راہ سے ہٹانے کی قسم کھا رکھی ہے، بھلا اس کو یہ دینی ترقی کب برداشت ہوتی، اس نے مختلف ہتھیاروں سے مسلح کر کے اپنی فوج میدان میں اتارنی شروع کی، کسی کی نگاہ میں دین ہی کو خار بنا کر دکھایا۔ کسی پر کچھ داؤ نہیں چلا تو اس کے دل میں حسد ہی کی چنگاری جلادی، لیکن حضرت کا رعب ودبدبہ اور جاہ وجلال ایسا نہ تھا کہ کوئی فتنہ کھل کر آنے کی ہمت کرتا، پس پردہ سازشیں ہوا کرتیں اور مٹتی رہتیں۔ کام بڑھتا گیا اور سازشیں ابھرتی اور دبتی رہیں۔

شروع میں گذر چکا ہے کہ ابتداء میں بعض لوگوں نے جمعہ کے مسئلے کو بناءِ اختلاف بنایا، مگر حضرت کی دانش مندی نے اسے دبا دیا، تو اسی کے سہارے دیوبندی بریلوی کے فتنہ کو آگے بڑھانے کا مشورہ ایک اسی قسم کے مفسد اور متفنی مولوی نے دے ڈالا۔ اس وقت فتح پور میں ایک درویش قسم کے سیدھے سادے میلاد خواں جناب

مولوی علیم اللہ صاحب تھے۔ آواز پاٹ دار تھی، میلا د میں اشعار وغیرہ پڑھ مجمع کو مسحور کر لیتے تھے، سادہ مزاج تھے، بعض بدعات میں انھیں ابتلاء تھا، مگر کافر ساز بدعتی نہ تھے، کبھی کبھی حضرت تھانویؒ کے مواعظ وملفوظات بھی سناتے، جمعہ کے مسئلہ میں انھیں ہی آلۂ کار بنایا گیا اور یہ کسی غلط فہمی میں پڑ کر ایک نیا راگ الاپنے لگے، یعنی کافر سازی بھی شروع کر دی۔ بریلی کے خاں صاحب کے صاحبزادے بھی بلائے جانے لگے، جہاں جہاں ان کا اثر تھا، لوگوں کو جا کر حضرت کے یہاں آنے سے روکتے، اور حضرت اور دوسرے اکابر دیوبند کو برا بھلا کہتے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ لطیفہ حضرت کے ایک خادم مولوی محمد مستحسن صاحب بیان کرتے ہیں کہ:

"میں نے ابھی فتح پور آنا شروع ہی کیا تھا کہ ایک مرتبہ مکان سے آ رہا تھا، نالہ جب پار کیا تو دیکھا کہ سامنے سے ایک بزرگ صورت صاحب تشریف لا رہے ہیں، قریب آئے تو میں نے سلام کیا۔ میں ان کو جانتا نہیں تھا، انھوں نے جواب دیا، مصافحہ ہوا۔ انھوں نے پوچھا آپ کہاں آئے ہیں، میں نے کہا حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب میرے شیخ ہیں، انھیں کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا ہوں، یہ سن کر کہنے لگے کہ ارے بھائی وہ وصی اللہ ہیں تو بندہ بھی علیم اللہ ہے۔ یہ کہہ کر چل دیئے۔

ان کے اس کہنے میں رَشک ورقابت کا جو جذبہ پنہاں ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں، لیکن بقول مولانا روم ع

گرچہ باشد در نوشتن شیر شِیر

صرف اسمی مناسبت سے کمال میں بھی مساوات کب لازم ہے، تاہم مولوی علیم اللہ صاحب چونکہ فطرۃً سادہ مزاج تھے، اس لئے لوگوں نے چاہا کہ وہ آپ کی

مخالفت ترک کردیں، مگر حب جاہ کا نشہ اتنی جلد نہیں اترتا۔ علاقہ کے لوگوں نے اصلاحی انجمن جو قائم کررکھی تھی اس کی بنیادوں میں بھی تزلزل انھیں کی ذات سے شروع ہوا، ان کے یہاں کسی تقریب میں کچھ غیر شرعی رسوم کا ارتکاب ہورہا تھا، انجمن کے ارکان نے ان کی روک تھام کرنی چاہی، لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکے، بالآخر انجمن کی سرگرمیاں سرد پڑ گئیں۔

بہرکیف وہ اپنی مخالفت میں سرگرم رہے، حضرت کے متوسلین میں بھی جواباً کبھی کبھی اشتعال کی لہر اٹھ جاتی تھی، لیکن حضرت والا آویزش اور کشمکش سے بہت دور رہنا چاہتے تھے، اس لئے ہمیشہ اس کی روک تھام فرماتے رہتے، کبھی کوئی ناخوشگواری پیدا نہیں ہونے دی، لیکن آخر کب تک! ایک طرف سے مسلسل اشتعال انگیزی کی جاتی اور دوسری طرف سے مکمل سکوت! بالآخر ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آکر رہا لیکن ؎

عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

یہی ناخوشگواری صدہا خوشگواریوں کا پیش خیمہ بن گئی۔ اس کی تفصیل حضرت والا کے بیان سے ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں کہ:

> ”میری بستی میں ایک مولوی صاحب رہتے ہیں جو دوسرے مسلک کے لوگوں میں سے ہیں، چنانچہ اطراف میں میلاد وغیرہ پڑھنے جایا کرتے ہیں۔ ایک دفعہ قریب ہی کی بستی میں میلاد پڑھ کر واپس آرہے تھے کہ راستے میں میرے ایک آدمی نے جو اسی بستی کا تھا، ان سے کچھ پوچھا، انھوں نے کچھ جواب دیا، اس پر اس نے پھر کچھ کہا، غرض بات بڑھ گئی اور ان مولوی صاحب نے چھڑی سے اس کو مار دیا۔ وہ بھی جوان آدمی تھا اس نے مولوی صاحب کو اٹھا کر پٹک دیا، اور غالباً کچھ مارا بھی، میں ان دنوں مئو میں تھا، یہاں دوسرے

فریق کو بہت اشتعال ہوا اور اندیشہ ہوا کہ فساد ہو جائے گا، ایک آدمی سائیکل سے فوراً میرے پاس پہونچا اور کہا کہ دو واقعے کی اطلاع کرنے آیا ہوں۔ ایک تو یہ کہ گاؤں میں پولیس آئی ہے اور گھر گھر ہتھیاروں کی تلاشی لی جارہی ہے، دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ سب کو محفوظ رکھے۔ اور دوسرا واقعہ اس سے بڑھ کر ہے وہ یہ کہ فلاں شخص نے فلاں مولوی صاحب کو پیٹ دیا ہے، اس کی وجہ سے دوسری جماعت کے لوگ بہت مشتعل ہیں، اور معلوم نہیں اس وقت گاؤں کا کیا حال ہوگا، میں نے کہا پہلی بات کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ عزت وآبرو کی حفاظت فرمائے۔ اور دوسرے واقعے کے سلسلہ میں تم یہ کرو کہ ان مولوی صاحب کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ بات وہاں تک (یعنی حضرت مولانا تک) پہونچ گئی ہے، اور اس شخص نے آپ کو نہیں مجھ کو مارا ہے، اب اس کا بدلہ ہمارے ذمہ ہے، اور ان کی مسجد پر کھڑے ہو کر زور سے اعلان کردو کہ اس واقعہ کا فیصلہ اب مولانا کریں گے، اب آپ لوگ قطعی مشتعل نہ ہوں، اگر انصاف نہ ہوا تو پھر جو چاہے کیجئے گا، پھر میں مئو سے کوپا آیا، وہاں وہ مجرم صاحب بھی تشریف لائے، سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ سب کے سامنے ان پر بہت خفا ہوا اور خوب مارا، اور کہا کہ تم سے کیا مطلب تھا؟ اگر انھوں نے اپنی تقریر میں کچھ کہا بھی تھا تو میں اس کا رد کرتا یا نہ کرتا، اس کا تعلق تو مجھ سے تھا، تم نے ان کو کیوں مارا، اور ان کی توہین تم نے کیوں کی۔ لوگوں نے جو اس کو دیکھا تو یقین آگیا کہ میں واقعی اس سے ناخوش ہوں، اور اس سے ان کے اشتعال میں بہت کچھ کمی آگئی، پھر میں نے ان صاحب سے کہا کہ جاؤ اور مولوی صاحب کا پاؤں پکڑ کر ان سے معافی مانگو اور اس کا تتمہ یہ ہے کہ پالکی پر ان کو

اپنے گھر لے جا کر ان کی دعوت کرو تب میں معاف کروں گا ورنہ نہیں۔ چنانچہ وہ صاحب گئے اور معافی مانگی، انھوں نے معاف کردیا، لوگوں نے کہا آپ نے اتنی جلدی معاف بھی کردیا، کہنے لگے بھائی اس شخص نے ایسے طور پر مجھ سے معافی مانگی کہ مجھے معاف کرنا ضروری ہوگیا، اور میں معاف کرنے پر مجبور ہوگیا۔ پھر اس نے دعوت کے لئے کہا تو ان کے گھر کی عورتوں نے کہا کہ اسی گاؤں سے کل پٹ کر آئے ہو اور آج وہیں دعوت کھانے جاؤ گے، یہ تو بڑی بے غیرتی کی بات ہے، تو کہنے لگے بھائی عورتیں منع کرتی ہیں، اس نے کہا اچھا کھانا میں یہیں لاؤں گا، اور دعوت کرنی تو مجھے ضروری ہے۔ اس لئے کہ ہمارے حضرت کی معافی اسی پر موقوف ہے، خیر اس کو منظور کرلیا، وہ گھر گیا اور عمدہ کھانے پکوا کر لایا اور ان کے گھر دے آیا۔ اور دوسرے دن جب وہ برتن لینے گیا تو مولوی صاحب وہی کھانا کھا رہے تھے، کہنے لگے دیکھو جی تمہارے ہی یہاں کا بچا ہوا کھانا اس وقت بھی کھا رہا ہوں، غرض وہ بالکل راضی ہوگئے اور ایک اتنا بڑا فتنہ جس کو سن کر میں اول وہلہ میں تو سمجھا تھا کہ اب ایسی آگ لگ گئی ہے کہ اس نے تو اب تک کی میری ساری محنت ہی خاکستر کر کے رکھ دی ہے، لیکن الحمدللہ کہ وہ فتنہ فرو ہوگیا، اور اپنے بعد اپنا کوئی اثر بھی نہیں چھوڑا، اس سے میں نے سمجھا کہ یہ اخلاق کی فتح ہے، یہی سکھلاتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ لوگ اس طور پر کام کریں۔ (حالات، ص۱۳۴)

یہ واقعہ تو گذر گیا، مگر نہ صرف مولوی صاحب موصوف بلکہ ان کی پوری جماعت کے دل پر حضرت کی اخلاقی برتری اور حسن سلوک کا ایک دیرپا نقش چھوڑ گیا۔ اب مولوی صاحب نرم پڑ گئے، برا بھلا کہنا بالکل بند کردیا، اس کے بجائے اب کبھی

کبھی ان کی زبان سے تعریف و تحسین کے کلمات سنائی دینے لگے۔ لو ہے میں اب وہ سختی باقی نہ رہی تھی، بہت کچھ نرمی آ گئی تھی، حضرت والا مزید حسن اخلاق کی آنچ سے اسے پگھلاتے چلے گئے۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامؔی کا بیان ہے:

”راقم نے خود دیکھا ہے کہ گرمیوں کے رمضان میں حضرت والا برف کا ایک ٹکڑا اور کبھی شربت روح افزا کی کچھ مقدار کٹورے میں رکھ کر عین اِفطار کے وقت اپنے ایک خادم (ان کا نام حق العباد تھا) کے ہاتھ جو مولوی صاحب سے بھی بے تکلف تھے بھیج دیا کرتے تھے، حضرت کے ان تمام اخلاق کو دیکھ کر وہ پانی پانی ہو جاتے اور دل سے موافق تو ہو ہی چکے تھے، صرف ظاہراً بُعد وہ بھی مصلحۃً تھا، لیکن کچھ دنوں کے بعد جب خود ان کے گھر والوں نے ان کو بہت تنگ کیا جس سے وہ بہت نالاں رہا کرتے تھے، اور جس وقت مسجد اور خانقاہ بنی ہے، مسجد دیکھنے کے سلسلے میں آئے اور حضرت والا سے آکر ملے، حضرت کے مکان پر بھی گئے، حضرت نے چائے ناشتہ کی دعوت کی، مسجد کی جدید تعمیر اور خانقاہ کو دیکھ کر مولوی صاحب نے بے ساختہ یہ شعر بھی پڑھا۔

زہے مسجد و مدرسۂ و خانقاہ　　　　که باشد دراں قیل وقال محمد

کیا ہی خوب ہے، وہ مسجد مدرسہ اور خانقاہ جہاں محمد ﷺ کی گفتگو شب و روز ہوتی رہے۔

اب حجاب جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ بھی اُٹھ گیا، اس کے بعد ان کی آمد و رفت گاہے ماہے حضرت کے یہاں ہونے لگی۔ ان کی جماعت نے انھیں روکنا چاہا، اس کے لئے احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے صاحبزادے بھی آئے، انھوں نے بھی بتاکید منع کیا، مگر مولوی صاحب موصوف کہنے لگے کہ ان کو (حضرت کو) کچھ مت کہو، میں ان کو اچھی طرح سمجھ چکا ہوں، غرض وہ اپنی رائے پر قائم رہے اور پھر اخیر تک

حضرت سے تعلقات خوشگوار رہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس جماعت نے مولوی صاحب کو قیادت کے منصب سے معزول کر دیا اور باگ ڈوران کے بعد ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آگئی، جنھوں نے انسانیت کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ دیا، حضرت جب وطن سے ہجرت کر کے گورکھپور تشریف لے گئے تو مولوی علیم اللہ صاحب مرحوم اپنی جماعت کو یہ کہتے سنے گئے کہ:

''اللہ کا ایک ولی تھا، شیطانوں نے اس کو بھی بستی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

اور یہ بھی کہتے کہ:

''اس بستی میں ایک ہی تو بزرگ پیدا ہوا تھا، مگر تم لوگوں نے اس کو پریشان کیا ، یہاں تک کہ وہ تم لوگوں پر تھوک کر چلا گیا، تف ہے تم لوگوں پر۔''

جس زمانے میں حضرت مقامی اہل بدعت کا فتنہ فرو کرنے کی سعی فرما رہے تھے، اس وقت آپ نے قرب وجوار کے گاؤں کے بھی دورے فرمائے، اور وہاں کے سربرآوردہ افراد کو اس پر آمادہ کیا کہ اپنے مسلک پر ہر شخص رہے، مگر دوسرے کے اکابر کو برا بھلا ہرگز نہ کہے، چنانچہ لوگوں نے آمادگی ظاہر کی اور عمل درآمد بھی ہوا۔ حضرت نے اس سلسلے میں بہت مشقت جھیلی ہے۔ بار بار اطراف کے دورے کئے، اس کا اثر یہ ہوا کہ ہر جگہ بہت سے لوگ دل وجان سے آپ کے ساتھ ہو گئے، اور ان لوگوں نے ہر ہر موقع پر آپ کی مدد کی۔

اجمالاً چند حضرات کے نام یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

فتح پور میں:۔ رحمت اللہ خاں صاحب، منشی محمد عباس صاحب، چودھری عبدالوحید صاحب، حبیب خاں صاحب، مستقیم خاں صاحب۔ یہ سب حضرات مرحوم ہو چکے۔

ندوہ سرائے میں:۔ محمد خلیل خاں صاحب، عبدالوحید خاں صاحب، توحید خاں صاحب

کاری ساتھ میں :۔ جناب قاری امین اظہر صاحب (والد بزرگوار حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب) حافظ مختار احمد صاحب (والد بزرگوار مولوی نورالہدیٰ صاحب) نذیر احمد خاں صاحب (حضرت قاری صاحب کے نانا اور مولانا قمر الزماں صاحب کے دادا، بڑے بہادر اور ذی اثر تھے)

گھوسی میں :۔ مشتاق احمد خاں صاحب، عبدالقیوم خاں صاحب، ملک عبدالجلیل صاحب، مولوی عبدالغفار صاحب (والد بزرگوار مولوی وقار احمد صاحب مرحوم) مولوی عبدالمجید صاحب، اور قاضی عبدالمجید صاحب۔

حمید پور میں :۔ ماسٹر محمد عیسیٰ صاحب اور علیم اللہ خاں صاحب۔

سپاہ میں :۔ عبدالجبار خاں صاحب۔

ان حضرات نے حضرت کی پوری نصرت واعانت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے اور آخرت میں ان کو اپنی نصرت وحمایت میں رکھے۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب ۱۳

ہجرت

مشہور واقعہ ہے کہ جب آنحضرت نبی کریم روحی وقلبی فداہ ﷺ خلعتِ نبوت سے سرفراز ہوئے ، اور حضرت جبریل علیہ السلام کی پہلی بار آمد غارِ حراء میں ہوئی ، تو پہلا سابقہ ہونے کی وجہ سے آپ پر ایک خاص تاثر ہوا ، اور اسی حالت میں کانپتے تھرتھراتے گھر تشریف لائے ، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو سب حوال کہہ سنائے ، انھوں نے کلماتِ تسلی عرض کرنے کے بعد مناسب سمجھا کہ اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل ...... جو توریت کے بڑے عالم تھے ...... کے پاس لے جائیں ، حضرت ورقہ نے تمام باتیں سن کر کہا کہ آپ کے پاس وہی ناموس آیا ہے ، جو آپ سے قبل حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کے پاس آیا کرتا تھا ، اور اس کے ساتھ انھوں نے ایک بات یہ بھی کہی تھی کہ کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا جبکہ آپ کی قوم آپ کو وطن سے نکالے گی تو میں اس وقت آپ کی نصرت وحمایت کرتا ، حضرت نے ازراہِ تعجب دریافت فرمایا کہ کیا میری قوم مجھ کو یہاں سے نکالے گی ؟ عرض کیا جی ہاں ! تمام انبیاء یہی کا دستور رہا ہے کہ جب انھوں نے پیغامِ الٰہی اپنی قوم کو پہونچایا ہے تو قوم کی جانب سے انھیں اس حادثہ سے دوچار ہونا پڑا ہے ، چنانچہ تاریخ نے پھر ایک بار شہادت مہیا کی کہ وہ نبی آخرالزماں جو اخلاق وانسانیت کی بلندترین معراج اور حسن کردار وعمل کا عظیم شاہکار تھا ، مجبور ہوکر اسے وطن کی محبوب سرزمین چھوڑنی پڑی ۔ یہی واقعہ ہے جسے قرآن وسنت کی اور تاریخ وسیر کی کتابیں ہمیں ’’ہجرت‘‘ کے عنوان سے سناتی ہیں ، انبیاء کرام

جب ہجرت کی سنگین صعوبتوں سے گذرے تو ضرور ہوا کہ ان کے نائبین بھی اپنے اپنے ظرف کے بقدر اس سنت نبوی سے حصہ حاصل کریں، چنانچہ کوئی داعی حق، نائب نبی ایسا نہیں ہوا ہے، جس کو کسی نہ کسی عنوان سے اُن مصائب وشدائد میں نہ ڈالا گیا ہو، جن سے نبی کو گذرنا پڑا تھا۔

ہمارے حضرت جو سراپا اتباعِ سنت تھے، اور سنت ہی کی جانب تمام عمر دعوت دیتے رہے، بھلا آزمائش کی اس کٹھالی سے کیونکر محفوظ رہتے، لیکن تاریخ جہاں ہمیں ہجرت کی صعوبتوں کے واقعات سناتی ہے، وہیں اس کی شہادت یہ بھی ہے کہ ہجرت کے بعد دعوت وتبلیغ کے وہ بہت سے بند دروازے یکایک کھلنے لگتے ہیں جن کی طرف عام حالات میں داعی حق کا ہاتھ نہیں پہونچ سکتا تھا، دشمن خوش ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے چمن سے ایک کانٹا نکال دیا، مشیت الٰہی مسکراتی ہے کہ ظالمو! جس کو تم کانٹا سمجھ رہے ہو درحقیقت چمن کا وہی تو ایک پھول تھا، تم نے اسے اپنے چمن سے نکال دیا تو کیا ہوا؟ اب اسی ایک پھول سے سینکڑوں چمن لہلہائیں گے، وہ ایک گل تھا مگر اس کی ہمہ گیری دیکھو کہ کتنے گلستاں روئے زمین پر نمودار ہو گئے؟ نبی کریم ﷺ نے ہجرت کی راہ اختیار کی تو مدینہ کا دروازہ کھلا، اور پھر رفتہ رفتہ دائرہ بڑھتا ہی چلا گیا، یہاں تک کہ ایک دن وہ بھی آیا کہ جو دروازہ آپ پر بند کیا گیا تھا وہ بھی کھولا گیا، اور کس شان سے کھولا گیا۔ آٹھ ہزار قدسیوں کا لشکر مکہ کے دامن میں جابجا اپنے خیمے نصب کئے ہوئے ہے، ابوسفیان کے منہ سے بے ساختہ حیرت واستعجاب کے کلمات نکل رہے ہیں۔ اللہ، اللہ

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرَاغَماً كَثِيراً وَّسَعَةً۔

جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت اختیار کرتا ہے، اسے زمین میں بہت سی سہولت اور وسعت مل جاتی ہے۔

کی واقعاتی تفسیر دنیا والوں کو دکھا دی گئی۔

پونے چودہ سو سال بعد اسی نبی کے ایک برگزیدہ امتی کے ساتھ اسی طرح کی داستان پھر دہرائی گئی، اور اس باب میں بھی اسے سنت نبوی کا تمغہ عطا فرمایا گیا۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ فتح پور میں حضرت کی مخالفت وعناد کے لئے جس شخص کو آلۂ کار بنایا گیا تھا، اس نے حضرت کے حسن اخلاق کے آگے بالآخر سپر ڈال دی۔ اس جماعت کے لوگوں نے جب دیکھا کہ ہمارا ستون منہدم ہوگیا تو عمارت کی بقاء کے لئے کچھ اور جدوجہد شروع کی۔ اب اس مجمع میں کوئی ایسا فرد نہ تھا جو یہ ذمہ داری قبول کرتا، لیکن ہمیشہ کا دشمن ......شیطان...... کب چین سے بیٹھنے والا تھا، بالآخر اس نے ایک ایسے شخص کو ڈھونڈھ نکالا جس سے مخالفت کا کام پورے طور پر لیا جاسکتا تھا، یہ شخص محکمۂ پولیس میں ملازم تھا، ریٹائرڈ ہو کر گھر آیا ہوا تھا، کچھ تو پولیس کا آدمی! زندگی بھر حکومت کئے ہوئے، گھر پر عام حیثیت سے زندگی بسر کرنی مشکل، کسی سرداری کی تلاش اس کو تھی ہی، ادھر جماعت میں جگہ خالی، گونٹی بیٹھ گئی، لوگوں نے اسی کو یہ منصب سپرد کر دیا۔ اس شخص نے حضرت کے خلاف بغض وعناد کی ہانڈی پکانی شروع کر دی، کبھی کبھی اس کی کھدکھداہٹ باہر بھی سنائی دے جاتی، مگر حضرت کے رُعب ودبدبہ کے سامنے کھل کر آنے کی جرأت کوئی نہ کرسکتا تھا، اُس شخص کے ایک بھائی حضرت کے جاں نثار خادم تھے، بھائی سے کب کوئی بات پوشیدہ رہ سکتی تھی۔ اسی دوران الیکشن کی ہماہمی شروع ہوگئی، حضرت کا الیکشنی سیاست سے مدت العمر کوئی تعلق نہیں رہا، حضرت کی اپنی مشغولیت ہی بہت تھی، البتہ آپ کے متعلقین ومنتسبین کو اس سے مفر نہ تھا، حضرت کے لوگوں نے جس امیدوار کی حمایت کی، مخالف گروپ نے اس کی مخالفت میں دوسرے امیدوار کی حمایت شروع کر دی۔ حسن اتفاق یا سوء اتفاق مخالف گروپ کا

امیدوار ہار گیا، عناد تو پہلے ہی تھا، اب اور بڑھ گیا، گاؤں میں اختلاف کی صورت ظاہر ہوکر سامنے آئی۔ حضرت نے کوشش کی کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا، اب کیا ضرورت ہے کہ گاؤں میں عداوت کی آگ بھڑکا کر مسلمانوں کو اس میں جھونکا جائے، گاؤں کے سربرآوردہ لوگوں کے نام آپ کے پیغام پہونچ رہے تھے کہ جس کا جو مسلک ہے قائم رہے، لیکن اختلاف وانشقاق کی باتیں چھوڑ دے۔ یہ بات ایک حد تک کامیاب بھی ہو چلی تھی، اس وقت یہ شخص جو سرغنہ بنا ہوا تھا، گاؤں سے باہر اپنی کسی رشتہ داری میں گیا ہوا تھا، کسی فتنہ پرور نے جا کر صلح وآشتی کی اس سرگرمی کو جو حضرت کی طرف سے جاری تھی، اس صورت میں اس کے سامنے رکھا کہ مولانا کے لوگ تمہارے قتل کی سازش کر رہے ہیں، یہ سن کر وہ بے تحقیق ہی آگ بگولہ ہو گیا، اس نے اپنے حامیوں کو کہلوایا کہ تم لوگ تیار رہو، میں آرہا ہوں، رمضان کا مہینہ تھا، غالباً ساتویں تراویح حضرت کی نوتعمیر مسجد میں ہو رہی تھی، اس شخص نے اپنے لوگوں کو لٹھ بند مسلح کر کے مختلف گلیوں کے سرے پر تعینات کر دیا، اور خود اپنے بھائی، حضرت کے خادم کے گھر پہونچ کر کوئی بہانہ تراش کر ان کی عورتوں اور بچوں کو مارنا اور زور زور سے دروازوں کو پیٹنا شروع کر دیا، بچے روتے ہوئے مسجد کی طرف چلے، شور سن کر مسجد سے لوگ نکل پڑے کہ کیا بات ہے، جونہی گلیوں میں پہونچے، سروں پر لاٹھیاں پڑنے لگیں، اس طرح فتنہ کی آگ بھڑک گئی، بعد میں حضرت کے لوگ پہونچے تو شب خون مارنے والی فوج فرار ہو گئی تھی، یہ سب کچھ اتنا ناگہانی ہوا کہ اکثر لوگ اصل صورتحال سے واقف بھی نہ ہو سکے، حضرت کے متعلقین کو زیادہ چوٹ آئی، جب صورتحال ذرا ظاہر ہوئی تو حضرت نے فوراً اپنے لوگوں کو واپس بلا لیا۔ اس واقعہ میں مخالف نے جہاں انتہائی عیاری اور چالاکی کا مظاہرہ کیا، وہیں اپنے لوگوں سے قدرے چوک ہو گئی، وہ

یہ کہ حضرت کو پہلے سے اس کی ریشہ دوانیوں کی اطلاع نہیں کی گئی، ورنہ شاید بات اس پیمانہ پر نہ ہوتی، جیسی ہوگئی۔ تاہم یہ نکتہ بعد الوقوع ہے، مشیت کو یہی منظور تھا، اس کے فوائد بعد میں سامنے آئے۔ یہ واقعہ ۷؍رمضان ۱۳۷۵ھ کی شب میں پیش آیا، اس ہنگامہ میں حضرت کا نام غلط طور پر لیا گیا۔ اس کا سبب قریب تو دونوں بھائیوں کا نجی اختلاف تھا، ہاں اس کا پس منظر البتہ وسیع تھا۔

حضرت کو اس ہنگامہ سے سخت صدمہ ہوا، حضرت کے لوگوں کو اس میں کافی نقصان اٹھانا پڑا، اس کا بھی بہت رنج تھا۔ آپ نے برسہا برس کی محنت کے بعد گاؤں میں جو دینی اور ایمانی فضا تیار کی تھی فساد کی آگ میں وہ بھی جل گئی، اس کا رنج سب سے بڑھ کر تھا۔ اس سال رمضان المبارک کے ایام حضرت کی خدمت بابرکت میں گزارنے کے لئے حضرت کے خادم دو بھائی گورکھپور کے رئیس جناب مولوی نثار اللہ صاحب اور جناب مولوی امجد اللہ صاحب بھی حاضر ہوئے تھے، انھوں نے اور بعض حضرات سے مشورہ کیا، اور حضرت کے کرب و بے چینی کو دیکھتے ہوئے باہم یہ طے کیا کہ کچھ دنوں کے لئے حضرت فتح پور چھوڑ دیں اور گورکھپور تشریف لے جائیں۔ مولانا جامی صاحب تو لکھتے ہیں کہ ''واقعہ کے دوسرے یا تیسرے دن'' لیکن حضرت کے خادم جناب حاجی زکی اللہ خاں صاحب پورے یقین کے ساتھ بتلاتے ہیں کہ واقعہ کے دو ہفتہ بعد یعنی ۲۲؍رمضان المبارک ۱۳۷۵ھ کو کار منگوائی گئی، اور حضرت والا ظہر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد بجائے گھر جانے کے کار میں بیٹھ گئے۔ مولوی نثار اللہ صاحب اور مولوی امجد اللہ صاحب اور غالباً سیٹھ عبد الرب صاحب بھی ہمراہ ہوگئے، کار روانہ ہوگئی۔ اب تک کسی کو معلوم نہیں کہ حضرت کہاں تشریف لے جا رہے ہیں، خانقاہ میں مقیم حضرات نے خیال کیا کہ آس پاس کسی قریبی گاؤں میں تھوڑی دیر

کے لئے تشریف لے گئے ہوں گے، ابھی آجاتے ہیں، لیکن جب نہ عصر میں تشریف لائے نہ مغرب وعشاء میں تو اندازہ ہوا کہ کہیں دور تشریف لے گئے۔

دوسرے دن مولوی امجد اللہ صاحب تشریف لائے اور ۲۴/ رمضان کو حضرت کے بچوں کو بھی گورکھپور لے گئے۔ اطلاع ہوجانے کے بعد باہر سے آنے والے مہمان بھی ایک ایک کر کے چلے گئے، صرف چند طلبہ اور طالبین خانقاہ میں رہ گئے، چند روز کے بعد حضرت نے انھیں بھی گورکھپور بلالیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب ۱۴

قیامِ گورکھپور والہ آباد

اب تک جو بادِ بہاری فتح پور کے کوردہ دیہات میں چل رہی تھی ، اب گورکھپور کے وسیع وعریض شہر میں چلنے لگی ۔ حضرت گورکھپور تشریف لائے ، تو چونکہ حضرت کو گورکھپور لانے والے مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم (۱) تھے ، اس لئے آپ کا قیام مولوی صاحب موصوف کی کوٹھی میں ہوا ۔ دو تین دن کے بعد حضرت کے بچے آئے تو ان کا قیام مولوی امجد اللہ صاحب (۲) کے مکان میں تجویز ہوا جو اسی سے متصل تھا ۔ مولوی نثار اللہ صاحب کی کوٹھی حضرت کی خانقاہ بن گئی ۔ کوٹھی کے اندرونی حصہ میں حضرت کا قیام تھا ، باہر کے بڑے ہال میں واردین وصادرین اور باہر کے مہمان ٹھہرتے تھے اور حضرت وہیں مجلس فرماتے ۔ یہاں بھی فتح پور کے معمولات جاری ہو گئے ۔ گورکھپور میں حضرت کا فیض اور عام ہو گیا ، علماء و روؤسا ، اہل دانش اور انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کا بڑا طبقہ مجلس میں حاضر ہوتا ، اور حضرت کے ارشادات وملفوظات سے فیضیاب ہوتا ۔ گورکھپور میں اس طرح کی عالمانہ اور عارفانہ مجالس کا پہلے سے تجربہ نہ تھا ، اب جو علم ومعرفت کا دریا رواں ہوا تو ہر طرف سے لوگ ٹوٹ پڑے ، مجلس کا یہاں بھی وہی رنگ ہوتا تھا جسے آپ فتح پور میں دیکھ چکے ہیں ، مولوی شکیل احمد عباسی کا واقعہ بھی آپ پڑھ چکے ہیں ، اس کا تعلق یہیں کے قیام سے ہے ۔

گورکھپور کے دورانِ قیام فتح پور کے لوگ بھی آجاتے تھے ، حضرت کا اصلاحی مواخذہ ان پر بہت شدید تھا ، اور یہ مواخذہ عام تھا ، جب کوئی آجاتا تو حضرت پر ایک

کیفیت چھا جاتی، واسطہ سے گفتگو شروع ہو جاتی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ان کی قدر حضرت کے دل میں نہ تھی، حضرت کے مواخذے برائے اصلاح ہوا کرتے تھے۔ حضرت کا یہ مواخذہ آن کی آن میں قلوب میں وہ رقت، نرمی اور عجز وانکسار پیدا کر دیتا تھا جو شدید مجاہدوں کے بعد بھی نہ حاصل ہو، اپنی غلطی پر ندامت، گریۂ وزاری اور اللہ کی جناب میں توبہ واستغفار یہی سب اثرات ان پر مرتب ہوتے تھے۔

غیرتِ دینی کا ایک نمونہ:

گورکھپور کے دورانِ قیام ایک واقعہ ایسا گذرا ہے جس سے حضرت کی اعلیٰ درجہ کی دینی غیرت کا ظہور ہوتا ہے، ایک بار حضرت کی طبیعت سخت علیل ہوئی۔ بیماری ایسی تھی کہ اس میں جسم کا پانی خشک ہو گیا، حضرت پر غشی طاری ہو گئی، کسی طرح ہوش نہ آتا تھا، ایک غیر مسلم ڈاکٹر جو مولوی نثار اللہ مرحوم کا گویا گھریلو طبیب تھا، اس کا مشورہ ہوا کہ حالت بہت نازک ہے، پانی بدن میں چڑھانا ضروری ہے، ورنہ معاملہ خطرناک ہے اس نے ہاتھ میں رگ تلاش کی مگر نہ مل سکی، پاؤں میں تلاش کی وہاں بھی نہیں مل رہی تھی، بڑی مشکلوں سے رگ دستیاب ہوئی۔ رات بھر میں کئی بوتل پانی چڑھایا گیا بالآخر حضرت کو ہوش آ گیا اور آنکھیں کھول دیں، رات میں بھی ڈاکٹر بار بار آیا، صبح کے وقت جب ڈاکٹر آیا تو حضرت ہوش میں تھے، اس نے برجستہ کہا:

''کہئے مولانا صاحب! رات تو آپ چل دیئے تھے، میں نے آپ کو بچا لیا''

حضرت نے یہ جملہ سننے کو تو سن لیا، مگر چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا، اس وقت تو نہ بولے، جب ڈاکٹر چلا گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں اس ڈاکٹر کی دوا نہیں کروں گا، ایک خوراک بھی اس کی لکھی ہوئی دوا نہ کھاؤں گا، اور فرمایا کہ جب اس نے یہ جملہ کہا تو میرے دل پر ایک تیر سا لگا، میں نے اپنے جی میں کہا کہ اب ہم لوگوں کی یہ حالت

ہوگئی ہے کہ کفار ہمارے سامنے ایسی باتیں کرنے لگے ہیں۔ غرض اس شدید بیماری میں حضرت نے اس کی دوا نہ کھائی، دوسرے ڈاکٹروں کا علاج ہوا، اور حضرت کو اللہ تعالیٰ نے شفا عطا فرمائی۔

مولوی نثار اللہ صاحب کے مکان سے منتقلی:

مولوی نثار اللہ صاحب کے یہاں رہتے ہوئے حضرت کو ایک سال ہوگیا تھا، یہاں بھی حق وہدایت کی لہر چلتے جب بعض اہل باطل مبتدعین نے دیکھی تو ان کے سینوں پر سانپ لوٹنے لگا، سامنے آنے کی ہمت کون کرتا؟ مولوی نثار اللہ صاحب کے دور کے قرابت داروں میں چند لااُبالی قسم کے نوجوانوں کو آمادہ کیا گیا کہ وہ حضرت کی مخالفت میں کوئی حرکت کریں، چنانچہ دور دور سے اس قسم کے شگوفے پھوٹنے لگے کہ مولانا صاحب کو اس مکان میں رہنے نہیں دیا جائے گا، ایسا کریں گے اور ویسا کریں گے۔ مولوی نثار اللہ صاحب کے علم میں بھی یہ باتیں آئیں، مگر وہ یہ کہہ کر مطمئن ہوگئے کہ مکان میرا ہے، دوسرا کوئی کیا کرسکتا ہے، مخالفین نے دیکھا کہ اس طرح کام نہیں چلتا تو انھوں نے ایک مکروہ سا پوسٹر مولوی نثار اللہ مرحوم کے مکان پر چسپاں کردیا، حضرت کو جب اس بات کا علم ہوا تو شہر کے سربرآوردہ لوگوں کو طلب کیا، فرمایا کہ آپ کے شہر میں مجھ کو یہ تحفہ ملا ہے، لوگ بہت پریشان ہوئے۔ تلاش ہوئی کہ کن لوگوں نے یہ حرکت کی ہے، لیکن پردہ کی اوٹ سے تیر ونشتر چلانے والے کب سامنے آسکتے تھے، تاہم بات کھل ہی گئی، پھر تو ان کی بڑی رُسوائی ہوئی۔ معاملہ ختم ہوگیا لیکن حضرت کی غیرت نے گوارہ نہیں کیا کہ پھر اس مکان میں مقیم رہیں۔ ذی رائے اصحاب کے مشورے اور گورکھپور کے مشہور طبیب جناب حکیم وصی احمد صاحب کی دعوت پر ان کے مکان میں منتقل ہوگئے، حضرت کے انتقال مکانی کا مولوی نثار اللہ اور

مولوی امجد اللہ مرحوم پر ایسا رنج وغم طاری ہوا کہ وہ بھی سامان لے لوا کر مکان سے نکل پڑے کہ جس مکان سے حضرت چلے آئے ہم بھی اس میں نہ رہیں گے، حضرت نے انھیں سمجھایا کہ میرے چلے آنے میں مصلحت ہے، آپ کا وہ مکان ہے، آپ لوگ وہیں تشریف لے جائیں، اب خانقاہ کا نقشہ حکیم وصی احمد صاحب کے مکان پر جم گیا، چھ سات ماہ وہاں قیام رہا، پھر وہاں سے الہ آباد منتقل ہو گئے۔

حکیم وصی احمد صاحب کے مکان پر قیام کے دوران حضرت کو ہچکی کا مرض لاحق ہوا، مسلسل ہچکیاں آتی تھیں، نہ دن کو چین تھا نہ رات کو سکون، نیند کا آنا محال ہو گیا، تھوڑی دیر آنکھ لگی اور پھر ہچکی نے جگا ڈالا، علاج معالجے ہوتے رہے۔ گورکھپور کے چھوٹے بڑے تمام اطباء اور ڈاکٹر صاحبان عاجز اور پریشان ہو گئے، مگر ہچکی رُکنے کا نام نہ لیتی تھی، بالآخر فیصلہ یہ کیا گیا کہ اب دوسری جگہوں کا بھی علاج کر کے دیکھنا چاہئے، دو جگہیں زیرِ غور آئیں، لکھنؤ اور الہ آباد۔ لکھنؤ میں ایک سے بڑھ کر ایک طبیب ہیں، اور الہ آباد میں حضرت مولانا حکیم فخر الدین صاحب جعفری ہیں، جو حضرت کے معالج بھی رہ چکے ہیں اور ایک صاحب نسبت بزرگ بھی ہیں، حضرت نے الہ آباد ہی کا رجحان ظاہر کیا، چنانچہ بذریعہ کار گورکھپور سے الہ آباد کے لئے روانگی ہوئی، غالباً برسات یا اس کا قریبی زمانہ تھا، باہر میدانوں اور کھیتوں میں ہر طرف ہریالی اور شادابی تھی، اطراف، گورکھپور کی چھوٹی چھوٹی ندیاں جو بارش کی وجہ سے بھری ہوئی تھیں، پار کرتے ہوئے سبزہ زاروں سے آپ کی کار گذر رہی تھی، حضرت یہ دل کُشا اور روح پرور مناظر جو دیکھے تو فرمانے لگے اب فرحت محسوس ہوئی، غالباً بڑھل گنج یا دوہری گھاٹ میں جب کار روکی گئی تو فرمایا کہ اس مرض میں فلاں حکیم نے ایک قسم کے چیاں کا لیپ بتایا تھا، وہ تلاش تو کرلاؤ، مولانا حکیم بشیر الدین صاحب ہمراہ تھے،

لوگوں نے بازار میں جستجو کی، خوش قسمتی سے مطلوبہ چیاں دستیاب ہوگیا، اس کو کوٹ کر سر پر لیپ رکھا گیا، رکھتے ہی آرام ہونا شروع ہوگیا، لیکن سفر جاری رہا۔ الہ آباد پہونچ کر باقاعدہ علاج ہوا، اور اس مرض سے مکمل افاقہ ہوگیا۔ یہ سفر ۲؍ ربیع الثانی ۱۳۷۷ھ کو ہوا۔

الہ آباد حضرت کو پسند آیا، یہاں اہل حق کی کوئی ایسی شخصیت بھی نہ تھی جس سے حق کی ترویج واشاعت ہوتی، حضرت کے متعلقین ومتوسلین کی تعداد پہلے ہی سے الہ آباد میں بہت تھی، لوگوں کی خواہش ہوئی اور حضرت نے منظور بھی فرمالیا کہ مستقل قیام یہیں کرلیا جائے، چنانچہ ابتداءً قیام جناب حاجی شفیع اللہ صاحب اور حاجی عبد الوحید صاحب کے مکان پر حسن منزل میں ہوا۔ حضرت کے گھر کے سب لوگ بھی یہیں آگئے، مجلس اور خانقاہ کے تمام معمولات از سرِ نو جاری ہوگئے، طالبین اور اہل ذوق حاضر ہوکر فیضیاب ہونے لگے، الہ آباد میں باہر کے لوگوں کی آمدورفت ہائیکورٹ کی وجہ سے بکثرت ہوتی ہے، یہ لوگ بھی حضرت کا شہرہ سن سن کر حاضر ہوتے، حضرت کی بابرکت مجالس سے الہ آباد میں ایک خوشگوار اور ایمان افروز تبدیلی نظر آنے لگی، بیماری کی وجہ سے یہاں وہاں کی آمد وشد تو گویا ایک بہانہ تھی حضرت کے فیضان کو عام کرنے کا۔ ہر طرف سے شیدائی کھنچ کھنچ کر آنے لگے، اہل الہ آباد نے ایسی آباد وشاداب دینی فضا کب دیکھی تھی، بعض اہل بدعت نے مخالفت کی اور جی بھر کی، مگر خدا کا یہ نور پھونکوں سے بجھ جائے، کب ہوسکتا تھا؟ ہوا یہ کہ یہ لوگ جتنی مخالفت میں سرگرمی دکھاتے اسی کے بقدر حضرت کی شہرت ہوتی، جو ایک بار مجلس میں شریک ہوجاتا پھر دوبارہ کسی جانب رُخ نہ کرتا۔

الہ آباد میں یوں تو بزرگوں کے دائرے اور خانقاہیں کئی ایک ہیں، مگر اَخلاف

میں وہ دینی ذوق، ریاضت ومجاہدہ، اخلاص وللٰہیت موجود نہ تھی، جس سے خانقاہیں آباد ہوا کرتی ہیں، ہر طرف افسردگی اور پژمردگی طاری تھی۔ حضرت کی للٰہیت واخلاص اور دعوت حق کے سلسلے میں جذبہ اور تڑپ نے پورے شہر میں ایک حرکت پیدا کردی، گھر گھر میں چرچا ہونے لگا کہ ایک صاحب تاثیر، جذب وجلال اور ہوش وکمال والے بزرگ شہر میں تشریف فرما ہیں۔ اللہ کے نام کی خوشبو کھینچ کھینچ کر آپ کے آستانے پر لوگوں کو لانے لگی، کم وبیش ایک سال حسن منزل میں قیام رہا۔ الہ آباد کی پریشان کن گرمی حسن منزل کے مکان میں بہت تکلیف دہ ثابت ہوئی، ڈاکٹر صلاح الدین صاحب نے حضرت کے رہنے کے لئے مچھلی کوٹھی منصور پارک میں ایک کمرہ تجویز کیا، دن کو آپ وہاں تشریف رکھتے تھے، لیکن حضرت کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ میں تو کسی قدر آرام سے ہوں، مگر بچیاں اور گھر کے دوسرے افراد سخت گرمی میں پریشان ہیں، حضرت کی خواہش ہوئی کہ جب الہ آباد میں مستقل رہنا ہے تو کیوں نہ کوئی مکان بنا بنایا یا خالی زمین خرید لی جائے، جس پر ذاتی مکان تعمیر کیا جاسکے، منصور پارک کے قریب ایک وکیل صاحب کا مکان فروخت ہونے والا تھا، حضرت نے اسے دیکھ کر پسند فرمایا۔ گھر والوں اور ذی رائے اصحاب کے مشوروں سے اس کا خریدا جانا طے ہوگیا، مکان بہت کشادہ، وسیع وعریض اور آرام دہ تھا، اس کے مختلف حصوں میں کرایہ دار آباد تھے، ان سے خالی کرانا خالی از تکلف نہ تھا، تاہم جتنا مکان بروقت قبضے اور دخل میں آتا وہ بھی کم نہ تھا، مکان خرید لیا گیا، اور حضرت کے متعلقین وہاں منتقل ہوگئے۔

مکان مل جانے کی وجہ سے حضرت اور حضرت کے متعلقین نے تو اطمینان کا سانس لیا، لیکن کچھ ایسے لوگ بھی پس پردہ محسوس کئے جانے لگے جنھیں سخت تکلیف ہوئی، انھوں نے دیکھا کہ اب تو یہاں ان کے قدم جم گئے، اب بدعت وجہالت کے قدم یہاں

سے اکھڑنے ضروری ہیں، آپس میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں، کوئی کہتا کہ یہ کیسے پیر ہیں؟ ان کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی کہ ایسا لق ودق مکان خریدا، کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ، حضرت کے کانوں میں بھنک پڑی تو حضرت نے مجلس میں اس عنوان پر بہت مؤثر وعظ فرمایا، ہم یہ وعظ آخر کتاب میں بتمام وکمال نقل کریں گے۔

مسجد کی تعمیر:

حضرت کے خرید کردہ مکان کے قریب ایک مسجد بھی تھی، جس کو ڈھال والی مسجد کہا جاتا تھا، چونکہ اس کے متولی حضرت کے خدام میں سے تھے، اس لئے ان کی درخواست نیز قرب کی وجہ سے سب لوگ نماز کے لئے وہیں جانے لگے، اب حضرت کے وہاں نماز پڑھنے کی وجہ سے طلبہ اور اور باہر آنے والے مہمان حضرات نیز شہر کے بھی بہت سے حضرات آآکر حضرت اقدس ہی کے ساتھ شریک جماعت ہونے لگے، جس کا اثر یہ ہوا کہ مسجد کی رونق خوب بڑھ گئی، مگر جگہ تنگ ہونے لگی، یہ مسجد پہلے تو بہت ہی مختصر تھی، لیکن بعد میں محلّہ والوں کو اس کی توسیع کا خیال ہوا، چنانچہ قدیم مسجد شہید کرکے جدید مسجد کی تعمیر کی ابتداء بھی کردی، مگر صرف ایک دالان ہی بن سکا تھا اور وہ بھی ناتمام ہی تھا، اس سے زائد اس وقت نہ ضرورت تھی اور نہ لوگوں میں سکت تھی، اس لئے نامکمل پڑی تھی کہ اسی زمانہ میں حضرت والا اس محلّہ میں تشریف لائے۔

حضرت کا یہ اصول تھا کہ کسی دوسری جگہ کے نظم ونسق میں ذرا بھی دخل دینا پسند نہیں فرماتے تھے، اسی پر یہاں بھی عمل فرمایا، چنانچہ مسجد میں تشریف لانے کے بعد بھی یہاں کے امام اور موذن وغیرہ وہی حضرات رہے جو پہلے سے چلے آرہے تھے، نماز کے اوقات کا نظم بھی امام صاحب ہی سے متعلق تھا، لیکن اب اس کو کیا کیجئے کہ ''صدر ہر جا کہ نشیند صدر است'' حضرت والا کے ساتھ لوگ معاملہ ہی ایسا کرنے لگے

جیسے مسجد کے جملہ معاملات حضرت ہی سے متعلق ہوں، حتیٰ کہ اگر مسجد میں پہونچنے میں آپ کو کبھی دوایک منٹ کی تاخیر ہو جاتی تو لوگ انتظار کرتے رہتے، کہ حضرت تشریف لائیں تو جماعت شروع ہو، لیکن حضرت اقدس کی طبع عادل پر لوگوں کا یہ انتظار نہایت شاق ہوتا، بارہا ایسا ہوا کہ نماز کے بعد کسی خادم کے ذریعہ اعلان فرمادیا کہ:

> ’’آپ حضرات میری وجہ سے انتظار نہ کیا کیجئے، میری حیثیت بھی عام مسلمان کی سی ہے، جس طرح سے اور سب لوگ آتے ہیں میں بھی نماز پڑھنے آجاتا ہوں، اگر کبھی دیر سے پہونچوں گا تو اپنی نماز بعد میں پوری کرلوں گا، لیکن اتنے سب مسلمانوں کو انتظار کی تکلیف دینا مجھے گوارا نہیں۔‘‘

حضرت والا چونکہ حکیم الامت کے جانشین اور مصلح الامت تھے، اس لئے نبض شناس بھی تھے، یہ اعلان اس لئے فرمایا کہ لوگوں کے حالات سے اندازہ فرمالیا تھا کہ یہ مشترک مجمع ہے، ہوسکتا ہے کہ انھیں میں بعض لوگ ایسے بھی ہوں جن کو یہ انتظار پسند تو کیا شاید حضرت کا اس مسجد میں آنا ہی پسند نہ ہو، اس لئے بھی اپنے لئے اہل مسجد سے کسی خصوصیت کو پسند نہ فرماتے تھے، نیز مسجد کے کسی معاملہ میں آگے ہونا تو بجائے خود رہا، دخل دینا بھی پسند نہیں فرمایا، لیکن جب تنگی حد سے زیادہ بڑھی تو متولی نے حضرت والا سے بڑی ہی لجاجت سے درخواست کی کہ حضرت! ہم لوگوں میں تو سکت ہے نہیں، اگر حضرت ہی توجہ فرمادیں تو مسجد کی توسیع ہو جائے، نمازیوں کو بہت تکلیف ہو رہی ہے۔

غرض ان کی درخواست اور واقعی ضرورت کے پیش نظر حضرت والا نے بھی اب ارادہ فرمالیا کہ کام شروع کردیا جائے، چنانچہ

می دہد یزداں مرادِ متقیں

بہت ہی قلیل عرصہ میں ایک اور دالان اور دو نہایت شاندار مینار تیار ہو گئے، اور دیواروں پر پلاسٹر اور مزیک کا فرش بن کر قابل دید ہوگئی، اور شہر کے لوگ اس کو دیکھنے کے لئے آنے لگے، ان کی حیرت اور تعجب میں اس امر نے مزید اضافہ کر دیا کہ بدون کسی عام تحریک اور اعلان چندہ کے لق ودق حسین اور مستحکم دو منزلہ مسجد کیسے تیار ہوگئی، بہر حال ایک سال کام لگا اور مسجد بن گئی، پھر دوسرے سال کام لگا اور مسجد کے دونوں جانب طلبہ کے لئے کمرے بنے، پھر ان کے اوپر دو منزلہ کمرے تیار ہوئے، یہ سب ہوا لیکن صحن مسجد کو عدم ضرورت کے پیش نظر نہیں چھیڑا گیا، بلکہ معمولی مرمت کر کرا کے کام چلایا گیا، مگر اب اس کو کیا کیجئے کہ اللہ والوں کے سب کام منجانب اللہ انجام پاتے ہیں، یہاں بھی یہی ہوا کہ ع

''مردے از غیب بروں آید و کارے بکند'' کا منظر سامنے آیا، ایک صاحب اطراف مراد آباد کے اپنی کسی ذاتی ضرورت سے الہ آباد آئے، غالباً کوئی مقدمہ تھا، دعاء کے لئے حضرت اقدس کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے، نماز کے لئے مسجد گئے، تعمیر جدید کی سادگی اور دل آویزی سے مسرور ہوئے، کسی سے پوچھ لیا کہ یہ صحن کیوں نیا نہیں بنا۔ لوگوں نے کچھ کہا، اس پر ان کو خود خیال ہوا کہ اس کو بھی بننا چاہئے، چنانچہ حضرت والا سے اپنا ارادہ ظاہر کیا، اور نہ صرف ظاہر ہی کیا بلکہ سنگ مرمر کے فرش کا تخمینہ کر کے اتنی رقم پیش کر دی، چنانچہ بے شان وگمان مسجد کے صحن میں سنگ مرمر لگ گیا، اس پر حضرت والا بطورِ تحدیث نعمت کے فرماتے تھے کہ دیکھتے ہو اللہ تعالیٰ نے کس طرح سے انتظام فرمایا، میرے تو وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ سنگ مرمر کا فرش بنواؤں گا، لیکن ایک مسلمان خود یہ خواہش کرتا ہے کہ میں اس کو ایسا بنوا دوں تو اس کو کیسے منع کر دوں، جن لوگوں کو وسعت اور استطاعت حاصل ہے اور وہ اپنے مکان کا

فرش مزیک اور سنگ مرمر کا بنواتے ہیں اور وہ خدا کے گھر کے لئے بھی اس تجویز کریں تو اس میں کیا حرج ہے، اسی سلسلہ میں فرمایا کرتے تھے کہ مسجد نبوی پہلے بالکل سادہ تھی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے باہر سے عمدہ عمدہ لکڑیاں اور بیش قیمت پتھر منگوا کر اس کو نہایت عمدہ تعمیر فرما دیا، علماء نے اس فعل کی تحسین کی ہے اور فرمایا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بہت سے امراء اور رؤسا کا ایمان بچالیا، اس لئے کہ لوگ اپنے اپنے محل اور کوٹھیوں کو چھوڑ کر وہاں جاتے اور وہاں کی تعمیر دیکھ کر اگر کسی قسم کی کمی کا خیال آجاتا، اور یہ کہتے کہ اس سے تو اچھا ہمارا ہی مکان ہے تو ایمان کے لالے پڑ جاتے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کی ظاہری تعمیر بھی ایسی کرادی کہ کسی کو اب دم مارنے کی مجال نہیں۔

بہر حال مسجد اور مدرسہ دونوں اپنی ظاہری تعمیر اور زیب وزینت کے ساتھ مکمل ہو گئے، اس درمیان میں امام صاحب جو حضرت سے بیعت بھی ہو گئے تھے اور یہاں الہ آباد میں علم تجوید کی تکمیل کے لئے مقیم تھے، اپنے وطن تشریف لے گئے، ان کے جانے کے بعد متولی صاحب کے اصرار پر حضرت والا کے محبوب امام اور بڑے خویش یعنی قاری محمد مبین صاحب نے منصب امامت سنبھالا، اس طور پر مسجد کا نظم بھی فی الجملہ حضرت والا ہی کی جانب آہستہ آہستہ منتقل ہونے لگا، مگر بقول حضرت والا کے جہاں کوئی بڑا کام ہوتا ہے وہاں شیطان بھی بڑا ہوتا ہے، کیونکہ شیطان کو دینی تعمیر ایک آن گوارا نہیں، اس لئے وہ شروع ہی سے اس کی تخریب کی فکر میں لگ جاتا ہے، یہی یہاں بھی ہوا، آپ جانتے ہیں کہ علم اور جہل میں ہمیشہ سے جنگ جاری ہے، اس لئے ابلیسی قوت نے بعض جاہل عوام کو اپنے حصولِ مقصد کا آلۂ کار بنایا، چنانچہ وہ لوگ کبھی کوئی مسئلہ اور کبھی کوئی شگوفہ لے کر کھڑے ہونے لگے اور کبھی بعض ایام میں کچھ رسوم وبدعات مسجد کے اندر جاری کرنے نہ کرنے کے سوال کو باہم مابہ النزاع بنا کر ایک

ہنگامہ برپا کردیا، جس کی زد میں بہت سے پڑھے لکھے اور سنجیدہ لوگ بھی آ گئے، چنانچہ بحث کے وقت سب سے قوی دلیل جو مخالفین نے پیش کی وہ یہ تھی کہ:

"مسجد سب کی ہے، کسی ایک فرقہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے مسلک والوں کو ان کے مراسم کی ادائیگی سے روک دے۔"

محلّہ کے جو سمجھ دار لوگ اس اختلاف اور فتنہ کو فرو کرنا چاہتے تھے، ان کے پاس اس معقول بات کا کوئی جواب نہ تھا، اس لئے مسئلہ بجائے سلجھنے کے الجھتا چلا گیا، حضرت والا کو جب اس کی اطلاع ملی تو ایک صاحب سے فرمایا کہ مسجد کے اہل کمیٹی اور معزز لوگوں کو جمع کر کے ان سے میرا یہ پیغام کہہ دو کہ:

"مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ ان حضرات کا یہ خیال ہے کہ یہ مسجد سب کی ہے، لہٰذا کسی طبقہ کے لوگوں کو ان کی رسوم سے روکنے اور منع کرنے کا دوسرے فریق کو حق نہیں ہے، تو اس کے متعلق آپ حضرات سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں بھی ایک پڑھا لکھا آدمی ہوں، ایک زمانہ تک بزرگوں کی خدمت میں رہا ہوں، اور بہت دنوں سے اصلاح کا کام کر رہا ہوں، اس لئے لوگوں کے نفوس سے بھی کچھ کچھ واقف ہوں، چنانچہ کسی کے کلام کو، اس کے منشاء کو بھی سمجھتا ہوں، اس بنا پر آپ سے کہتا ہوں کہ جن صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ "یہ مسجد دونوں فریق کی ہے" اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ یہ مسجد صرف ایک جماعت ہے اور دوسری جماعت کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے یعنی صرف انھیں لوگوں کی ہے، اور ہم لوگوں کا کوئی حق نہیں ہے، اور دلیل اس کی یہ ہے کہ آج ہی آپ کی زبان سے یہ سن رہا ہوں اور اس سے قبل نہیں سنا، اور آپ لوگوں نے ہمارے اس آدمی کو جس نے یہ کہہ دیا تھا کہ مسجد ہم لوگوں کی ہے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ مسجد کسی

خاص شخص یا جماعت کی ملکیت نہیں ہوا کرتی، سب مسلمان اس میں برابر کے شریک ہیں، لیکن اسی شہر کی دوسری مساجد میں جنھیں آپ خوب جانتے ہیں آپ کے اس اصول کے بالکل خلاف عمل رآمد ہے، مگر آپ کا یہ انصاف اور یہ خیالِ مساوات وہاں حرکت میں نہیں آتا، یہ کیا بات ہے؟

اب آپ لوگوں سے صاف کہتا ہوں کہ میں نے کبھی مسجد پر قبضہ نہیں کرنا چاہا حتیٰ کہ انتظامی امور میں کبھی دخل دینا پسند نہیں کیا، لیکن جب آپ لوگوں نے مجبور کیا تو اس کی تعمیر میں حصہ لیا اور مسجد کس حال میں تھی اور اب جیسی ہے آپ کے سامنے ہے، اس وقت آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ جس وقت مسجد بن رہی تھی، اس کے منارے بن رہے تھے، مدرسے کے کمرے بن رہے تھے، اوپر کی منزل بن رہی تھی، اس وقت آپ لوگ کہاں تھے، اور جو صاحب یہ فرمارہے ہیں کہ مسجد دونوں فریق کی ہے انھوں نے اس وقت کیوں نہیں کہا کہ یہ مسجد تو دونوں جماعتوں کی ہے، اس لئے ایک حصہ تم نے بنوادیا ہے تو اب ایک حصہ ہم بنوادیتے ہیں، یا ایک مینار تم نے بنوادیا ہے تو دوسرا ہم بنوادیں گے، یا ایک کمرہ تم نے بنوادیا ہے تو اب دوسرا کمرہ ہم بنوادیں گے، اس وقت تو آپ لوگ بلکہ سارا شہر خاموش تھا، پھر جب ہم نے مدرسہ قائم کیا تو اس وقت بھی آپ ہی لوگوں کے بچے زیادہ تر آئے، اس لئے بھی ہم نے سمجھا کہ آپ لوگ ہمارے اس اقدام سے خوش ہیں، لیکن جب یہ سب کچھ ہوگیا، یعنی مسجد بن گئی، مدرسہ جم گیا تو اب آپ لوگوں میں حرکت پیدا ہوئی اور ہم سے کہا جارہا ہے کہ مسجد دونوں جماعتوں کی ہے، معمولی عقل رکھنے والا انسان بھی اس کا مطلب سمجھ سکتا ہے، آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ فساد نہیں تو اور کیا ہے؟

خیر یہ تو آپ کی بات کا جواب تھا، اب آپ کہتے ہیں تو ہم ایسے لوگ نہیں ہیں ہم کو مسلمانوں کے نزاع اور فساد سے چڑھ ہے، فساد ہی سے بچنے کے لئے میں نے اپنا وطن چھوڑا۔ اس لئے ہم یہاں بھی اس کو کسی قیمت پر گوارا نہیں کریں گے، آپ سے یہ باتیں اس لئے کہہ دیں تا کہ آپ کو یہ بتا دیں کہ ہم بھی ان باتوں کو سمجھتے ہیں، مگر چونکہ فساد کو پسند نہیں کرتے اس لئے اپنے بارے میں یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ آج سے اپنا اور اپنے لوگوں کا تعلق اس مسجد اور اس مدرسہ سے ختم کرتے ہیں، چنانچہ اپنے لوگوں کو بلائے لیتا ہوں اور مسجد خالی کئے دیتا ہوں، آج سے آپ لوگ اس کا انتظام سنبھالئے۔''

یہ فرما کر ایک صاحب سے فرمایا کہ جائیے اور سب طلبہ اور مہمانوں سے کہہ دیجئے کہ سب لوگ میرے مکان میں آجائیں اور مسجد ابھی خالی کر دیں، اور فرمایا کہ ہم نے مسجد بنا دی ہے اور مسلمان اس میں نماز پڑھیں گے، ہم کو ثواب مل ہی گیا۔ اور ہمارے پاس دوسری جگہ موجود ہے، ضرورت سمجھیں گے تو دوسری مسجد بنوالیں گے، حضرت والا کا حکم پہونچتے ہی سب چھوٹے بڑے طلبہ اپنی کتابیں، قرآن شریف، برتن، بستر وغیرہ لے کر مسجد سے نکل گئے، حضرت والا اس کے بعد سے مکان ہی پر جماعت سے نماز ادا فرمانے لگے، الحمد للہ جگہ وسیع تھی، اس لئے نماز، درس و تدریس اور ذاکرین کے قیام وغیرہ کا سب انتظام حضرت کے مکان ہی پر ہو گیا۔

اب خیال فرمایئے کہ جس مسجد میں ڈیڑھ دو سو نمازی ہر وقت نماز پڑھتے ہوں وہاں جب صرف ایک امام اور دو تین مقتدی رہ گئے ہوں تو مسجد میں کیسا ہو کا عالم ہو گیا ہوگا، اور مقتدی بھی متولی صاحب اور ان کے گھر کے دو چار آدمی تھے جن کو حضرت نے حکماً فرمایا تھا کہ آپ لوگ مسجد ہی میں نماز پڑھئے، اگر خدانخواستہ وہاں

اذان و جماعت بھی نہ ہوگی تو بڑے ہی وبال کی بات ہو جائے گی۔

غرض حضرت والا کے نہ جانے سے مسجد میں سناٹا ہو گیا، جو لوگ تخریب میں پیش پیش تھے ان کو مسجد کی تعمیر سے کیا سروکار، کیونکہ تعمیر مسجد سے متعلق تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

"إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی مساجد کی تعمیر اور اس کی آبادی کا خیال تو اسی کو ہوتا ہے، جو اللہ تعالیٰ پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہے، یہاں اگر ایمان ہی کامل ہوتا تو یہ روزِ بد کیوں دیکھنے میں آتا۔

الغرض حضرت والا نے یوں کرنے کو تو مسجد خالی کر دی، لیکن اس کی اطلاع بجلی کی طرح پورے شہر میں آناً فاناً پھیل گئی، عام لوگ تو تماشائی ہوتے ہی ہیں، پہلے تعمیر کی تعریف سن کر دیکھنے آتے تھے، اب اس کی ویرانی کا تماشا دیکھنے آنے لگے، لیکن ایمان چونکہ ہر ادنیٰ مسلمان کے قلب میں ہوتا ہے، اسلئے یہ نقشہ دیکھ کر رنج سب ہی کو ہوا، چنانچہ شہر کے بعض خواص معززین کو یہ احساس ہوا کہ حضرت والا کی ناراضگی ٹھیک نہیں ہے، اس کو جلد از جلد ختم کرنا چاہئے، اس لئے یہ حضرات خود ان لوگوں سے ملے جو اس معاملہ میں اختلاف کر رہے تھے، اور ان لوگوں کو کچھ اس طرح ملامت کی کہ ان کے لئے گھر سے نکلنا اور احباب میں اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو گیا، سب لوگوں نے اتنے بڑے خیر و برکت کے ختم ہو جانے کا ذمہ دار انھیں کو ٹھہرایا، سوسائٹی کا دباؤ سخت ہوتا ہے، اور ماحول کا مقابلہ آسان نہیں ہوتا، اس لئے ان سب کے لئے بجز اس کے چارۂ کار نہیں تھا کہ حضرت کے آگے گریں اور اپنی خطا کی معافی مانگیں، چنانچہ وہ لوگ حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دل سے نادم ہو کر معافی مانگی، حضرت نے

بھی نہایت شفقت سے معاف فرمادیا، ان لوگوں نے درخواست کی کہ حضرت اب طلبہ کو اجازت دیدیجئے کہ وہ لوگ بدستور مسجد میں جا کر رہیں، حضرت نے فرمایا بہت اچھا اور طلبہ کو اجازت دیدی۔ پھر ان لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت بھی اب نماز کیلئے مسجد تشریف لے چلیں، فرمایا اچھا آؤں گا، لوگوں نے عرض کیا کل جمعہ ہے، درخواست ہے کہ حضرت والا بعد جمعہ مسجد میں ایک عام وعظ فرمادیں تاکہ جس طرح حضرت کی ناراضگی کا چرچا عام ہوگیا ہے اب اس کی وجہ سے حضرت کی خوشی کا بھی شہرہ شہر میں ہوجائے۔ حضرت نے اسے بھی منظور فرمالیا، اور دوسرے دن بعد نماز، جمعہ ایک وعظ فرمایا جس میں باہمی محبت وتعلق کی اہمیت، اختلاف وانشقاق کی مذمت نہایت بلیغ انداز میں بیان فرمائی۔ کتاب کے خاتمہ میں یہ وعظ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

(تعمیر مسجد کا یہ پورا مضمون ''معرف حق'' شمارہ اگست ۱۹۷۰ء سے نقل کیا گیا ہے)

☆☆☆☆☆☆☆

(۱) مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم کا شمار گورکھپور کے رؤسا میں تھا، ایک زمانہ میں یوپی اسمبلی کے ممبر بھی رہ چکے تھے، دنیا کے ساتھ اللہ نے دین سے بھی نوازا تھا۔ قرآن شریف کے حافظ تھے، قرآن سے گویا عشق تھا، فارغ اوقات میں تلاوت کیا کرتے تھے، خوش مزاج، خوش مذاق، خوش پوشاک اور خوش خلق انسان تھے۔ حضرت سے بیعت تھے، مدینہ شریف میں مکان بنوالیا تھا، خیال تھا کہ ہجرت کر کے آخری ایام وہیں گزاریں گے۔ جامی صاحب لکھتے ہیں کہ جن دنوں حضرت والا کا قیام الہ آباد میں تھا، ہجرت کے خیال سے گورکھپور سے سفر کر کے حضرت سے آخری ملاقات کرنے کے لئے الہ آباد تشریف لائے، حضرت اقدس بھی بہ نفس نفیس ان کو رُخصت کرنے کے لئے اسٹیشن تشریف لے گئے، ہم سب خدام بھی گئے، اس وقت عظمت ومحبت شیخ کا جو مظاہرہ مولوی صاحب مرحوم نے کیا ہے آج بھی وہ نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے، حضرت اقدس سے آخری مصافحہ اور معانقہ، چشم گریاں اور دل بریاں کے ساتھ کرتے ہوئے حضرت کے قدموں میں گر گئے اور حضرت کا جوتا حضرت کے پیروں سے نکال کر

اپنے سینے سے لگالیا اور بھرے پلیٹ فارم پر اپنے سر پر رکھ لیا۔ چنانچہ جاننے والوں نے دیکھا کہ **نعم الامیر علیٰ باب الفقیر** کا یہ مصداق تھے، اور حضرت والا نے انتہائی مسرت کے ساتھ انھیں دعائیں دیں، اور خوشی خوشی رُخصت کیا، اللہ کی مرضی کہ مدینہ شریف جا کر بیمار ہوئے، قلب کے مریض تھے۔ دورہ شدید پڑا، علاج کیلئے لوگوں نے ہندوستان آنے کا مشورہ دیا، کیونکہ یہاں کے علاج سے پہلے نفع ہوتا رہا تھا۔ کوئی کہنے والا نہ ملا کہ جب مدینہ شریف مرنے ہی کے لئے آئے ہیں تو پھر یہ رجعت قہقریٰ کیسی؟ لیکن **ماشاء اللہ کان** (خدا ہی جو چاہتا ہے ہوتا ہے) بمبئی اترے تو حالت نازک سے نازک تر ہوگئی۔ جھانسی پہونچتے پہونچتے اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہوگئے۔ **إنا للہ وإنا إلیہ راجعون** لکھنؤ میں نعش اتاری گئی اور وہیں مدفون ہوئے۔ **رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً** (جامی صاحب)

☆☆☆☆☆☆☆

(۲) **مولوی امجد اللہ صاحب**، مولوی نثار اللہ صاحب کے چھوٹے بھائی تھے، مگر حضرت سے تعلق میں ان کے پیشرو، گورکھپور کے بڑے رؤسا میں سے شمار تھا، بڑے خلیق منکسر المزاج، مہمان نواز اور غریب پرور تھے۔ ہر ایک سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے، حضرت سے گہری عقیدت ومحبت تھی، حضرت مولانا ایک بار مجلس میں فرما رہے تھے کہ مالداری کا ایک خاص اثر ہوتا ہے اور وہ زہر ہوتا ہے، اور کم وبیش ہر امیر میں ہوتا ہے **إلا ماشاء اللہ**، اور اس کے بعد مولوی امجد اللہ صاحب کی جانب اشارہ کر کے فرمایا کہ آپ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں، آپ اس سے نکل گئے ہیں۔ مولوی نثار اللہ صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد مدینہ کی جائداد کے نظم وانتظام کے لئے سال کا اکثر حصہ وہیں گزارتے تھے، ایک روز عید کا دن گزار کر شب میں تقریباً ۱۲/۱۱ بجے تک مدینہ شریف کے علماء اور شیوخِ عرب کو اپنے مکان پر مدعو کیا تھا، خاطر مدارات کے بعد بھی باہم تفریحی گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا، بالآخر سب لوگ اپنے اپنے گھر رخصت ہوئے، اور مولوی صاحب بھی اپنے بستر پر لیٹے اور سو گئے، تھوڑی دیر بعد حوالی قلب میں شدید درد ہوا، ڈاکٹر بلائے گئے مگر وقت موعود آچکا تھا، کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ رات ہی میں انتقال ہوگیا، مسجد نبوی میں جنازہ کی نماز ہوئی اور جنت البقیع میں تدفین ہوئی۔ **رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً** (جامی صاحب)

☆☆☆☆☆☆☆

باب ۱۵

اَسفار (۱)

گذشتہ صفحات میں یہ ذکر آچکا ہے کہ حضرت کا مزج بہت زیادہ کہیں آنے جانے کا نہ تھا، گوشۂ تنہائی میں اللہ اللہ کرنا، اور جو خدا کا بھیجا ہوا اصلاحِ نفس کے لئے خدمت والا میں حاضر ہو اس کی خدمت کر دینا، یہ آپ کی افتادِ طبع تھی۔ اس کو اپنے لئے اور اپنے دین کے لئے ضروری سمجھتے تھے، اور یہ بات تو تجربہ کی ہے کہ کثرتِ اسفار کے بعد آدمی اپنے اوراد واذکار اور عبادت وتلاوت وغیرہ معمولات کو پورے طور پر نباہنے پر قادر نہیں رہتا، پھر حضرت یہ بھی سمجھتے تھے کہ یہ دور سخت فتنوں کا ہے، کب اور کہاں کیا فتنہ برپا ہو جائے کچھ نہیں کہا جا سکتا، اور فتنوں سے بڑھ کر آدمی کے دین کے لئے اور کوئی زہر شاید ہی ہو، اس لئے اپنے لئے طریقۂ عمل آپ نے یہی بنا رکھا تھا کہ بغیر شدید ضرورت کے کہیں آنا جانا بالکل نہیں ہوتا تھا، آدمی ایک جگہ جم کر کام کرے، تو کچھ کام ہو جاتا ہے، مسلسل ادھر ادھر مارے مارے پھرنے سے کہیں کا کام پائیداری حاصل نہیں کرتا، نیز آدمی مفتون ہو کر رہ جاتا ہے، حضرت کے پیشِ نظر یہ حدیث تھی:

عن علی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نعم الرجل الفقیه فی الدین إن احتیج إلیه نفع وإن استغنی عنه اغناه نفسه، رواه رزین (مشکوٰۃ)

حضرت علیؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ کیا ہی اچھا ہے وہ عالم دین کہ جس کی جانب اگر لوگ احتیاج ظاہر کریں تو وہ ان کو نفع پہونچائے، اور

اگراس سے استغنا برتیں تو وہ بھی ان سے بے نیاز ہو کر اپنا کام کرے۔

اسی بنا پر حضرت کے جب کام کا وقت آیا تو فتح پور کے کوردہ دیہات میں بیٹھ گئے، اور اس یقین کے ساتھ بیٹھے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو مجھ سے کوئی کام لینا ہوگا تو اس کے اسباب ووسائل یہیں مہیا ہو جائیں گے، چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ حضرت کا یہ توکل سچا تھا۔ ایک عالم فتح پور کے دیہات میں ٹوٹ پڑا، اور تشنگانِ ہدایت نے دور دور سے آکر سیرابی حاصل کی، تاہم جب خدا کو دین کا فروغ حضرت کے واسطے سے منظور تھا، تو بات صرف اسی پر موقوف نہ رہی کہ آپ اپنے گاؤں میں مستقل قیام فرما رہتے، آخر بہت سے پیاسے دنیا میں ایسے بھی تو ہوں گے جنھیں کنویں تک رسائی آسان نہ ہوگی، پھر ان کی سیرابی کا سامان کیا ہوتا؟ پھر یہی ہوا کہ جس نے کنواں بن کر ایک جگہ جم جانے کا عزم کیا تھا اسے بادل بنا کر مختلف علاقوں میں بھیج کر برسایا گیا اور مردہ زمینوں میں اس کے واسطے سے زندگی کی لہر دوڑائی گئی، حضرت اپنے اسفار کے بارے میں کبھی کبھی یہ شعر پڑھتے تھے۔

رشتۂ درگردنم افگندہ دوست ‌ ‌ ‌ ‌ می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

دوست نے میری گردن میں ایک رسی ڈال رکھی ہے، پھر اس کا جہاں جی چاہتا ہے لے جاتا ہے۔

معاملہ خدا کے سپرد تھا، جہاں جہاں مشیت الٰہی نے بھیجنا چاہا اس کے اسباب فراہم کردیئے۔

(۱) سفر حج:

طلب علم اور اصلاحِ نفس کے سلسلے کے اسفار تو ناگزیر اور ضروری تھے، ان کی تفصیلات آپ پڑھ چکے، ان کے علاوہ آپ کا پہلا طویل سفر جو ہمارے علم میں آیا، وہ آپ کا سفر حج ہے، حج کا یہ سفر آپ نے حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کی حیات میں کیا ہے،

تاریخ اور سنہ کچھ معلوم نہیں، بس اتنا معلوم ہے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی اجازت سے یہ سفر ہوا ہے، اس سفر کی یادگار کے طور پر حضرت والا ایک مصری عالم کی تقریر کا ایک حصہ اپنی مجالس میں اکثر نقل فرماتے تھے، آپ بھی سن لیجئے، فرماتے ہیں کہ:

''ایک مصری عالم نے حرم شریف میں تقریر کی میں وہاں موجود تھا، انھوں نے کہا سنو!

''رسول اللہ ﷺ دونوں جہاں کی فلاح کا طریقہ بتانے کیلئے تشریف لائے تھے، آپ نے آخرت کی فلاح کا طریقہ بھی بتایا اور دنیا کی فلاح و بہبود کے طریقے بھی ہمیں سکھلائے، تم نے آخرت سے متعلق امور میں آپ کی تصدیق ضرور کی، چنانچہ نماز روزہ وغیرہ وہ تمام اعمال جن سے اُس جہان کی فلاح وابستہ ہے، تم نے ان پر عمل کیا تو اس کی وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ تم کو وہاں کی فلاح نصیب ہو جائے گی، لیکن رسول اللہ ﷺ چونکہ دارین کی فلاح کا طریقہ بتانے اور سکھانے تشریف لائے تھے، اسلئے آپ نے دنیوی فلاح کی تدبیریں بھی بتلائیں، ہر ہر صیغۂ زندگی پر آپ نے روشنی ڈالی، اخلاق سکھائے، شوہر بیوی کے تعلقات اور ان کے باہمی حقوق بتائے، بھائی کو بھائی کا حق بتایا، پاس پڑوس والوں کے حقوق تعلیم فرمائے، اسی طرح امیر وغریب، مالک ومملوک کے حقوق بیان فرمائے، غرض کہ دنیا میں جتنے بھی تعلقات ہو سکتے تھے سب کے حقوق بیان فرمائے، مگر افسوس کہ تم نے اس امر میں آپ کی تصدیق نہیں کی یعنی آپ کے تعلیم فرمودہ دستور العمل اور اصول پر عمل نہیں کیا، چنانچہ دنیا نے اس کا انجامِ بد دیکھ لیا اور تم بھی یہ روزِ بد دیکھ رہے ہو کہ آج میاں بیوی میں نااتفاقی ہے، بیٹا باپ سے جدا ہے، لڑکی اور ماں میں اختلاف ہے، بھائی بھائی میں

خلاف وشقاق ہے۔کوئی کسی کا دلی دوست نظر نہیں آتا بلکہ ہر شخص دوسرے کی جانب سے یوں منہ پھلائے ہوئے ہے (اس کو انھوں نے منہ بنا کر بتایا) غرض کوئی لطف زندگی باقی نہیں رہ گیا، یہ سب نحوست اسی کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ان احکام میں جو اِس دنیا کی زندگی سے متعلق تھے تم نے آپ کی تصدیق نہیں کی، یہ بھی کہا کہ جو کچھ دنیا میں تم دیکھ رہے ہو بہت کم ہے، اس سے کہیں زیادہ وہاں دیکھنے کے لئے تیار رہو۔

اس مضمون کو ایسے اچھے مؤثر عنوان سے بیان کیا، اور لوگوں کے حالات کو اور ان کی بداخلاقیوں کو ایسا سمجھایا کہ طبیعت خوش ہوگئی، میں نے اپنے دل میں کہا کہ الحمد للہ ایک شخص نے کھل کر کہہ دیا اور صاف صاف بیان کر دیا اور جس بات کو میں بہت دنوں سے سمجھ رہا تھا، آج اس اللہ کے بندے نے مجمع میں اس کو کہہ ہی دیا۔ (معرفت حق، ص:۱۳، جمادی الاخریٰ ورجب ۱۳۹۰)

(۲) لکھنؤ کا پہلا سفر:

یہ سفر بھی حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی حیات میں ہوا ہے، حضرت پیرانی صاحبہ علیل ہوئیں، آنکھ میں کچھ تکلیف ہوگئی تھی، علاج کے سلسلے میں لکھنؤ تشریف لے گئے، حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے بڑے بھائی جناب مولانا ڈاکٹر سیّد عبدالعلی صاحب کا علاج ہوا، محلّہ بازار جھاؤلال میں ایک مکان کرایہ کا لے کر حضرت والا نے مع اہل خانہ قیام فرمایا، محمد نور خان سپاہ والے کہتے ہیں کہ میں اور میرا چھوٹا بھائی دونوں اس سفر میں حضرت کے ساتھ رہے، تقریباً ڈیڑھ دو ماہ قیام رہا، حضرت کے پاس اس وقت بھی کانپور اور ملیح آباد کے کچھ لوگ آتے تھے۔

(حالات مصلح الامت، ج:۱، ص:۱۳۶)

(۳) سفر مانی کلاں:

یہ سفر بھی حضرت پیرانی صاحبہ کی علالت کے سلسلے میں ہوا۔ حضرت پیرانی صاحبہ علیل ہوئیں، اور علالت نے طول کھینچا، مانی کلاں، ضلع جونپور میں جناب ڈاکٹر محمد غفران صاحب کا علاج ہو رہا تھا، ڈاکٹر صاحب حضرت کے خدام میں سے تھے، وہ فتح پور میں طویل قیام کر کے علاج کے لئے بخوشی آمادہ تھے، لیکن حضرت نے خیال فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب اتنے دنوں تک مطب بند کر کے بسلسلہ علاج یہاں رہیں گے اور وہ مجھ سے فیس وغیرہ تو لیتے نہیں، اس سے ان کو مالی نقصان ہوگا۔ دوسرے مطب بند رہنے کی وجہ سے وہاں کے مریضوں کو بھی تکلیف ہوگی، یہ سوچ کر آپ نے فیصلہ کیا کہ جتنے دن علاج کی ضرورت ہو مانی ہی چل کر رہا جائے، چنانچہ حضرت پیرانی صاحبہ کو لے کر مانی تشریف لائے اور پانچ چھ ماہ قیام کیا، یہاں بظاہر تو حضرت پیرانی صاحبہ کے علاج کا بہانہ تھا، ورنہ حضرت یہاں کے روحانی مریضوں کے لئے گویا خدا کی طرف سے روحانی طبیب بن کر تشریف لائے تھے، چنانچہ اس مدت میں مانی کلاں اور اس کے اطراف کے لوگوں نے حضرت سے بہت کچھ دینی نفع حاصل کیا، اور آج بھی جو وہاں دینی فضا اور دینی ماحول نظر آتا ہے اس میں حضرت کی اس فیض رسانی کا بڑا دخل ہے۔

(۴) فتح پور تال نرجا کا سفر:

وطن سے ہجرت کئے ہوئے تقریباً چار برس کی مدت گذر چکی تھی، اس دوران ڈیڑھ برس گورکھپور میں یہ ابر گہربار دُرفشاں رہا، پھر الہ آباد کا نصیبہ جاگا، اور شریعت وطریقت کا دریائے بیکراں یہاں جاری ہوا، وطن کے لوگ دونوں جگہ بار بار

حاضر ہوتے رہے، حضرت کی طرف سے سوال وجواب اور مواخذۂ دار وگیر کا سلسلہ بھی چلتا رہا، اتنی مدت کی جدائی اور فتح پور کی خیر وبرکت اٹھ جانے کی وجہ سے وہاں کے مسلمان اور غیر مسلم سب ہی متاثر اور رنجیدہ تھے، ملاحوں کو یہ کہتے ہوئے بار بار سنا گیا کہ جب سے مولانا صاحب یہاں سے چلے گئے ہیں، تال کی مچھلیاں بھی ختم ہوگئیں۔ایک وقت تھا کہ ہر گھر میں تال کی مچھلی تلی اور بھونی جاتی تھی، قرابت داریوں مین بھیجی جاتی تھی، یا اب یہ حالت ہوگئی کہ تال کے ساحل پر آباد ہیں اور مچھلی کے لئے ترس رہے ہیں۔مخالف گروہ کا سرغنہ جو اصل فساد کا بانی تھا، اس پر قوم اور معاشرہ نے اس درجہ تفو کی کہ اس کا گھر سے نکلنا دشوار ہوگیا، اب اسے احساس ہورہا تھا کہ میری شرارت کی وجہ سے فتح پور کا نور اور یہاں کی شادابی رُخصت ہوگئی۔حضرت کے متعلقین خانقاہ اور مسجد کے پاس سے گذرتے تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا، یہی وہ جگہ ہے جہاں کا ذرہ ذرہ اللہ ھُو کے نعروں سے مست تھا، فضاؤں میں نور کی بارش ہوتی تھی، ہر طرف علماء وصالحین کی نورانی صورتیں جگمگاتی رہتی تھیں، ہر روز ایک قافلہ یہاں کمر کھولتا تھا، ہائے آج وہ جگہ بالکل سنسان اور سوگوار پڑی ہے، فضا میں ایسا سکوت چھا گیا ہے جیسے یہاں کوئی انیس وجلیس رہا ہی نہیں۔جن کی آنکھیں اسی آباد وشاداب گہوارہ میں کھلی تھیں اب وہ خاموشی اور سناٹا پاکر بے تاب وبے چین ہوجاتے تھے، اہل فتح پور دعائیں کرتے رہے، کوشاں رہے کہ کسی طرح حضرت ایک بار پھر تشریف لاکر اس اجڑے چمن کی آبیاری فرماتے، اصل بانئ فساد نے بالواسطہ حضرت سے معافی کی درخواست کی، لیکن حضرت کو زمانہ ساز پالیسیوں کا خوب تجربہ تھا، یہی شخص ہے جس نے اتنے بڑے پیمانہ پر ہنگامہ وفساد کھڑا کیا، حضرت کے لوگوں کو جانی ومالی نقصان پہونچانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی، خود حضرت کا نام داخل مقدمہ کیا، کہتا

پھرتا تھا کہ مولانا عدالت میں کھنچ کر چلے آئیں یہی ہماری کامیابی ہے، تاہم حضرت کے ساتھ اللہ کا فضل شامل حال رہا، اسے اپنے عزائم میں ناکامی رہی، اب وہی شخص معافی کا خواستگار ہے، حضرت اس کا اطمینان کرنا چاہتے تھے کہ اس طرح سے دشمن کوئی اور وار تو نہیں کرنا چاہتا، کیونکہ دشمن جب جنگ ہارتا ہے تو صلح کا ہاتھ بڑھا کر مات دیتا ہے، حضرت جہاں آخری حد تک نرم خو، رحمدل اور مشفق ومہربان تھے، وہیں انتہائی بیدار مغز، متیقظ اور محتاط بھی تھے، بار بار معافی اور فتح پور تشریف لانے کی درخواست ملتی رہی، اس کے متعلق حضرت نے ایک تحریر لکھ کر بھیجی جس کے لفظ لفظ سے رنج وغم اور دل کے زخموں کی ٹیس محسوس ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ حزم وتدبر کا بھی اندازہ ہوتا ہے، فرماتے ہیں:

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم: اس جھگڑے کی ابتدا دنیاوی امر سے ہوئی، مگر بعد میں اس کو مذہبی رنگ دے کر دینی جھگڑا قرار دے دیا گیا، اور مجھے ایک جماعت کا پیشوا اور اصل قرار دیا گیا، اس بنا پر آپ کی جماعت نے زبردستی استغاثہ میں میرا نام لکھوایا اور اس بات کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ مجھے کچہری میں حاضر ہونا پڑے، یہاں تک کہ آپ لوگ کہتے تھے کہ ہم لوگوں کو سزا ہو جائے اس کی ہم کو پرواہ نہیں، مگر ان کو کچہری حاضر کر دینا ہم لوگوں کی فتح ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل فرمایا اور مجھے حاضر نہ ہونا پڑا اور میرا نام بھی نکل گیا۔ اس طرح میری فتح آپ کی کل جماعت کے مقابلہ میں بہت روز ہوئے ہوگئی تھی، جس کا شاید آپ لوگوں کو احساس ہو، اگر یہ دنیوی جھگڑا تھا تب آپ کو اس روز شکست ہوگئی تھی جب آپ اس میں ناکامیاب ہوئے، اور اگر دینی تھا تو میرا نام نکل جانے پر آپ کو شکست فاش نصیب ہوئی

۔ یہ دونوں شکستیں آپ کی جماعت کو بہت پہلے مل گئی تھیں، اصل نزاع تو یہیں ختم ہو جاتا ہے، اب گاؤں میں ایک جماعت آپ کی قیادت میں ہے اور دوسری آپ کے خلاف ہے، آپ ان لوگوں کو ضرر پہونچانے کے درپے تھے تو آپ نہیں پہونچا سکے اور وہ بے داغ بری ہو گئے، رہا یہ کہ آپ لوگوں کو ضرر نہیں پہونچا سکے تو دوسری جماعت کا قصد ہی نہیں تھا، یا قصد کے موافق کامیاب نہیں ہوئے۔

بہر حال یہ دور گذر گیا، اس میں آپ کو بھی اپنی نیت اور جماعت والوں کی نیت کا حال معلوم ہو گیا کہ کس طرح اس واقعہ میں جھوٹ اور افتراء سے کام لیا گیا، اور یہ کس قدر دیانت کے خلاف ہے، حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے:

علیکم بالصدق فإن الصدق ینجی و الکذب یھلک،

رہا معافی کا قصہ تو سنئے اب معافی کا کیا سوال، میں نے ترکِ وطن کر دیا، اور یہاں (الہ آباد میں) مکان لے لیا، تو اب یہ میرا وطن ہو گیا، یا میں نے اس کو وطن بنا لیا، اس طرح اب میں مقیم ہوں، اب آپ لوگوں کو پردیسی سمجھ کر رحم نہ کھانا چاہئے، آپ کے فائدے کی بات عرض کرتا ہوں کہ سکون کی زندگی اچھی چیز ہے، وہ صرف اخلاقِ حمیدہ اور اوصافِ جمیلہ کے ساتھ ہی رہنے سے حاصل ہو سکتی ہے، میل جول میں نفع ہی نفع ہے۔ آپ شاید اس سے اختلاف نہ رکھتے ہوں گے۔

معافی کے متعلق ایک اور بات سنئے، اگر زبانی ہوگی تو میں بھی زبان سے لفظ ''معاف کر دیا'' کہہ دوں گا مگر ظاہر ہے کہ اس کا نفع آخرت میں تو کچھ نہیں ہوگا، میرے متعلق جو ادھر ادھر کہا گیا یا کیا گیا اگر آپ توبہ سے اس کا تعلق سمجھتے

ہیں اور برأۃ عند اللہ کے لئے اس کو ضروری سمجھتے ہیں تو اس کا اظہار بھی ضروری ہے، ورنہ زبانی معافی یا حقیقی معافی کا مجھ کو انتظار نہیں، نہ اس سے میرا نفع یا ضرر متعلق ہے۔

اب باقی رہا جانے یا لے جانے کا خیال، تو اس کے متعلق عرض ہے کہ وہاں سے میں اپنے اختیار سے اپنی مصلحت سوچ سمجھ کر آیا ہوں، بے بس مجبور ہو کر نہیں آیا ہوں کہ آپ پر میرا وہاں رہنا یا نہ رہنا موقوف ہو، رکھیں تو رہوں اور نکال دیں تو چلا جاؤں۔ لے چلیں تو چلوں اور نہ لے چلیں تو مجبور ہوں۔ آپ لوگوں کے لیجانے کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ دشمن کے کہنے سے جانا! اس کو کون عقل مند قبول کر سکتا ہے، اور اس کو کون گوارا کر سکتا ہے؟ رہا اپنی رغبت سے جانا تو یہ اطمینان پر مبنی تھا جو حالات نمودار ہو رہے ہیں اس سے یہ اطمینان جاتا رہا، نہ عزت و آبرو کی طرف سے اطمینان اور نہ دین و ایمان کی طرف سے اطمینان، ایسی بے اطمینانی کی حالت میں نہ دین اجازت دیتا ہے نہ عقل، اور مجھ کو ضرورت ہی کیا ہے وہاں جانے کی، بہت دن رہا اور جب تک ہو سکا رہا۔ اس وقت نشیب و فراز کا بھی تجربہ ہو گیا، اب اس کے خلاف کرنا نقل و عقل دونوں کے خلاف ہے، اس لئے اس کے خلاف مجھ سے گفتگو نہ کرنا چاہئے، بہت لوگ ہیں، دین کی خدمت کریں، میری کیا حاجت ہے۔

والسلام خیر ختام

وصی اللہ عفی عنہ

شعبان ۱۳۷۹ھ، الہ آباد

یہ تحریر اصل بانی فساد کے لئے بھیجی گئی تھی، اس طرح کی اور بھی تحریریں اہل

فتح پور اور علاقے والوں کے پاس بھیجی گئیں۔ منشا یہ تھا کہ بار بار جو فتح پور آنے کی دعوت دی جارہی ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ صرف ظاہری خفت اور رسوائی کو مٹانے کے لئے ہے، اور کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کے بعد فساد و ہنگامہ کا کوئی اور لاوا پھوٹ پڑے، حضرت کے پیش نظر دین کا فروغ تھا، اگر یہ لوگ واقعی اپنی غلطی کا احساس کر کے اس پر دل سے نادم ہوں، اللہ رب العزۃ کے حضور سچی توبہ کریں، حضرت والا کے اوپر جو جھوٹے اتہامات تراشے تھے...... جیسا کہ اس طرح کے فتنوں میں عام دستور ہے...... ان کا خلوصِ دل سے تدارک کریں اور شریعت حقہ کی پیروی اور اس کے پاس ولحاظ کا عہد کریں، تب تو معاف کرنا اور جانا کچھ مفید ہو ورنہ اگر صرف یہ نیت ہے کہ کسی طرح حضرت ایک بار آجائیں، اس کے بعد ہماری اس قابل نفریں حرکت پر جو مسلسل تھوتھو کا عمل جاری ہے وہ بند ہو جائے گا، اور ہم پھر اطمینان سے اپنی سابقہ حالت پر قائم اور باقی رہیں گے، اگر یہ نیت ہے تو پھر گفتگو ہی بے کار ہے۔ حضرت کے پیش نظر یہ اور اس طرح کی اور دینی مصلحتیں رہی ہوں گی، اسلئے معاملہ میں درازی پیدا ہوتی چلی گئی۔

حضرت کی اس تحریر کے بعد اصل بانیٔ فساد بذاتِ خود ہمت کر کے الہ آباد حاضر ہوا، کچھ دیر واسطوں سے گفتگو ہوتی رہی، پھر حضرت نے اپنے پاس آنے کی اجازت مرحمت فرمائی، جونہی وہ خدمت میں باریاب ہوا نہایت تڑپ اور بے قراری کے ساتھ رونے لگا، کچھ کہنا چاہتا تھا مگر الفاظ ساتھ نہیں دے پا رہے تھے، حضرت اس سے متاثر ہوئے، فرمایا بس بس اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، حضرت نے خدام سے فرمایا انھیں لیجاؤ اور چائے ناشتہ کرا دو۔ اس طرح ایک بہت بڑے شر کا خاتمہ ہو گیا۔

دوسرے وقت موقع پاکر اس شخص نے عرض کیا کہ حضرت علاقے میں جس طرف نکلتا ہوں انگلیاں اٹھنے لگتی ہیں کہ اسی شخص کی وجہ سے حضرت نے یہ علاقہ

چھوڑ دیا، حضرت کا بڑا اکرم ہوگا اگر ایک مرتبہ تشریف لے چلیں، لیکن حضرت والا ابھی جانے کے سلسلے میں پوری طرح مطمئن نہ تھے، کیونکہ معافی کا مسئلہ شخصی تھا اور حضرت کا جانا ایک اجتماعی مسئلہ بن جاتا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ کس جگہ کون سا شگوفہ چھوٹنے لگے، اس لئے حضرت نے مزید اطمینان کرنا چاہا، فتح پور اور اطراف کے لوگوں کے پاس کچھ شرطیں لکھیں، ہر جگہ کے لوگوں نے تحریراً معافی چاہی، حضرت کی تمام شرطیں منظور کیں اور وعدہ کیا کہ خلوص کے ساتھ دین کو اختیار کریں گے، کسی طرح کا فتنہ وفساد نہیں ہونے دیں گے۔ اہل ہنود نے بھی حضرت کو اطمینان دلایا کہ تشریف لائیں ہماری جانب سے کسی خدشے کا اندیشہ نہیں، جب حضرت کو اطمینانِ کامل ہوگیا تب فتح پور جانا منظور فرمالیا۔

چنانچہ ۱۹؍شوال ۱۳۸۰ھ بروز پنجشنبہ کی روانگی طے ہوگئی، یہ اطلاع جب اہل فتح پور اور اطراف کو ہوئی تو مردہ دلوں میں زندگی کی حرارت دوڑ گئی، مرجھائے اور کمھلائے ہوئے چہروں پر خوشی ومسرت کے پھول کھلنے لگے، ہر ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہا تھا، چمن کی کھوئی ہوئی بہار پھر چمن میں خیمہ زن ہوگی، چہل پہل اور حرکت وعمل کی سرگرمیاں پھر سے شروع ہوگئیں۔ اہل الٰہ آباد کو معلوم ہوا تو یہاں سے ایک بڑی تعداد حضرت کی ہمرکابی میں چلنے کی خواہش مند ہوئی۔ ایک وقت تھا کہ حضرت نے حفاظت دین کی خاطر وطن سے ہجرت کی تھی، ایک وقت یہ ہے کہ لوگوں نے دین ودیانت اختیار کرنے کا وعدہ کیا تو حضرت فاتحانہ شان سے وہاں تشریف لے جارہے ہیں۔ تاریخ کی مسافت لپیٹ دیجئے تو آپ کو نظر آجائے گا کہ قدوۂ عالم وعالمیاں، فخر رسل، نبی آخرالزماں ﷺ کس شانِ جلال اور محبوبانہ جمال کے ساتھ اسی مکہ کی سرزمین پر نزول اجلال فرمارہے ہیں، جہاں سے ۱۰؍سال قبل اللہ کے حکم سے

نکلے تھے، آج انھیں کے ایک فرمانبردار اور مطیع امتی کے ساتھ اگر یہی سنت دہرائی جارہی ہے تو کیا تعجب ہے۔

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ جس وقت حضرت مصلح الامت پالکی پر رونق افروز ہوکر کوپا گنج سے فتح پور کی جانب روانہ ہوئے تو راستہ کے دونوں جانب مشتاقانِ دید قطار اندر قطار کھڑے دیدہ ودل کو آپ کی زیارت سے شادکام وسیراب کررہے تھے، عقیدت کی نگاہیں بچھی جارہی تھیں، قلوب میں خوشی ومسرت کا اتھاہ سمندر لہریں لے رہا تھا، آج فتح پور کا ستارہ پھر سے عروج پر ہے۔ حضرت کی ہمرکابی میں الہ آباد کے جو حضرات تھے، انھوں نے مقبولیت ومحبوبیت کا یہ عجیب نظارہ حیرت ومسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھا، ان کا دل ہی جانتا تھا کہ جو بیش قیمت دُرِّ بے بہا سرمایہ بغیر ان کی طلب کے گھر بیٹھے ہاتھ آگیا ہے اس کا یہاں کس شدت واشتیاق کے ساتھ انتظار تھا، اور اس کو پاکر یہاں کی سرزمین کیسی نہال وخوشحال ہورہی ہے، الہ آباد میں اہل بدعت آپس میں یہ کہتے سنے جاتے تھے کہ میاں انھیں کون پوچھتا ہے؟ ان کو وطن کے لوگوں نے نکال دیا ہے تو یہاں پناہ لے رکھی ہے، لیکن الہ آباد والوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اہل وطن میں حضرت کی جو عزت وحرمت اور تعظیم واحترام ہے ابھی الہ آباد کو اس کا عشر عشیر حصہ بھی نہیں ملا ہے۔ حضرت جو فرماتے تھے کہ میں نے کسی مجبوری اور بے بسی کی وجہ سے وطن نہیں چھوڑا ہے، بلکہ اپنے اختیار وارادہ سے اپنے دین کی حفاظت کی نیت سے ہجرت کی ہے، سب نے اس کی تصدیق کھلی آنکھوں دیکھ لی۔

اسی اعزاز واکرام کی فضا میں حضرت فتح پور پہونچے، اوّلاً مسجد میں تشریف لے گئے، آپ نے اور تمام ہمراہیوں نے تحیۃ المسجد ادا کی، پھر گھر میں داخل ہوئے اور وہاں دو رکعت شکرانہ ادا کیا۔

فتح پور تشریف لے جانے پر حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے مبارکباد کا ایک مکتوب بھیجا تھا، ملاحظہ ہو:

حضرت مخدومی ومحترمی! بارك الله فی بركاتكم

السلام علیکم ورحمة الله وبركاته

ہجرت کے بعد اخلاق کی پوری فتح کے ساتھ فتح پور میں داخلہ نے الحمدللہ سنت پوری کرادی۔ الہ آباد کے مستقل دارالہجرت بن جانے کی بڑی مصلحت بھی سمجھ میں آرہی ہے کہ ماشاء اللہ افادات وبرکات کا دائرہ بہت ہی وسیع فرمادیا گیا، بلکہ اس وقت شہر ہی جس طرح دینی فتنوں کا مرکز بہت زیادہ ہورہے ہیں، اصلاح کا مرکز بھی انھیں کو زیادہ ہونا چاہئے۔

حق تعالیٰ امت کو بیش از بیش متمتع اور آں مخدوم کو زیادہ سے زیادہ ماجور فرماویں۔ احقر العباد عبدالباری

حضرت نے اس کے جواب میں جو کچھ ارقام فرمایا ہے، اس میں فتح پور کی ایک اجمالی جھلک دیکھی جاسکتی ہے، تحریر فرماتے ہیں:

واقعی میں اس وقت فتح پور میں ہوں، بظاہر لوگ خوش معلوم ہورہے ہیں، ان لوگوں نے میرے سب شرائط منظور کرلئے، اس لئے آگیا ہوں، آیا تو تھا چند روز کے لئے مگر آنے کے بعد زمین ہموار نظر آئی اور توقع ہوئی کہ شاید اب لوگ سنیں اور قبول کریں، اس لئے قیام کچھ زیادہ ہوگیا.......... کام کررہا ہوں، دعاء فرمایئے اور اصل ہجرت تو یہ ہے کہ **المهاجر من هجر مانهى الله عنه** (مہاجر تو درحقیقت وہ ہے جو حق تعالیٰ کی منع کردہ چیزوں کو چھوڑ دے) اللہ تعالیٰ اس کی توفیق عطا فرمائیں، اور میرا منشا یہی ہجرت تھی، جس کا ذکر حدیث

میں ہے، **یفر بدینه من الفتن** ، اپنے دین کو فتنوں سے محفوظ رکھنا، یہ فرار اسی لئے تھا، اس فرار سے وہاں بھی (الہ آباد میں) کچھ صورت دین کی پیدا ہوگئی، اور یہاں لوگوں کی سمجھ درست ہوگئی۔ اصل بانیٔ فساد مطیع ہوگئے، اور انھیں لوگوں نے الہ آباد جا کر خلوص سے مع یہاں کے اکابر ہنود اور دیگر اشخاص معززین کے درخواست کی کہ فتح پور چلیئے، چنانچہ بمقتضائے اخلاقِ الٰہی ان کی درخواست منظور کی اور نہایت اعزاز واکرام کے ساتھ جس طرح فتح مکہ میں حضور کا داخلہ مکہ میں ہوا تھا فتح پور میں داخلہ ہوا، اس طرح کہ راستوں پر عورتیں (ہنود) اور مرد دورویہ استقبال میں کھڑے نظر آتے تھے، غرض عجیب منظر دیکھنے کے قابل تھا، پہلے مسجد میں داخل ہوکر تحیۃ المسجد ادا کی اور سب ساتھیوں نے بھی ادا کی، اس کے بعد گھر میں داخل ہوکر دو رکعت نمازِ شکرانہ ادا کی، **فالحمد لله علیٰ ذٰلک**، اور خوشی خوشی یہاں ہوں اور کام کر رہا ہوں۔

اہل الہ آباد بھی یہاں آتے ہیں تو یہاں کی فضا سے متاثر ہوکر جاتے ہیں، اہل الہ آباد پر بھی یہاں کا خاصا اثر پڑ رہا ہے، یہ وجہ ہے یہاں قیام طویل کی، آگے اللہ کی مرضی۔'' ذی قعدہ ۸۰ھ

فتح پور میں حضرت کا قیام کم وبیش تین ماہ رہا۔ محرم الحرام ۱۳۸۱ھ کی کسی تاریخ کو واپسی ہوئی، لیکن افسوس جس خوشی ومسرت کے ساتھ فتح پور تشریف لے گئے تھے، بعض لوگوں کی غلطی کی وجہ سے واپسی کسی قدر کبیدگی کے ساتھ ہوئی۔ اس کی تفصیل آپ مولانا عبد الرحمٰن صاحب جامیؔ کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں۔ مولوی عبد القیوم صاحب کوپا گنجی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''مولوی صاحب موصوف کہتے تھے کہ مجھے یاد ہے کہ جب حضرت والا

الہ آباد سے پہلی بار فتح پور تشریف لائے تو وہاں کے کسی صاحب سے جو مسلمان ہی تھے کوئی غلطی صادر ہوگئی، اس کی وجہ سے حضرت کو بہت ایذا ہوئی، اس پر ناراض ہو کر ریک بیک اٹھے اور سیدھے کو پا گنج تشریف لے آئے اور پھر یہاں سے مئو تشریف لے گئے۔ حضرت والا کے اس طرح اچانک چلے آنے سے گاؤں کے بہت سے لوگ ہندو اور مسلمان سب ہی جس میں ملاح وغیرہ بھی تھے، پیچھے پیچھے کو پا گنج اور پھر وہاں سے مئو پہونچے، باہم یہ کہتے تھے کہ مولانا صاحب اگر ہم لوگوں سے ناراض ہو جائیں گے تو ہم بھی یہاں چین سے نہ رہ سکیں گے، ان آنے والوں میں مسلمانوں کی گنتی کا تو شمار نہیں، ملاحوں کو شمار کیا گیا تو چالیس نفر تھے، تو ان لوگوں کو بلایا اور فرمایا کہ تم لوگ فتح پور سے مئو تک ۱۲ر میل پیدل کیوں چلے آئے، انھوں نے کہا کہ ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ آپ بستی والوں سے ناراض ہو کر جا رہے ہین، یہ سنتے ہی ہم لوگ بھی بھاگے ہوئے چلے آرہے ہیں اور آپ سے نہایت عاجزی کے ساتھ ہم سب درخواست کرتے ہیں کہ آپ ناراض ہو کر ہمارے یہاں سے تشریف نہ لے جائیں، ورنہ ہم لوگ پنپ نہ سکیں گے، چنانچہ ان کی اس عاجزی نے حضرت والا کو بالکل نرم کر دیا، اور حضرت خوش ہوگئے اور فی نفر ایک ایک روپیہ کے حساب سے چالیس روپئے ان کے چودھری کو دیئے اور فرمایا جاؤ سب لوگوں کو لواجاؤ اور بازار سے کچھ لے کر پانی وغیرہ پی لو۔'' (حالات، ج:۱ص:۲۳۰)

حضرت کا کہیں سے ناراض ہو کر آنا یونہی محض غصہ ہی کی وجہ سے نہیں ہوتا تھا، بلکہ ایسا اپنے قصد واختیار سے اصلاح کی غرض سے کرتے تھے، پہلے بھی یہ بات گذر چکی ہے کہ حضرت کے مواخذے اور حضرت کی ڈانٹ ڈپٹ محض اصلاحِ حال کے

لئے ہوتی تھی، شفاءِ غیظ کا وہاں تصور بھی نہ تھا، حضرت کی اس نوع کی ناراضگیاں بسا اوقات چند لمحوں میں ایسے اثرات پیدا کرتی تھیں جن کی توقع شاید طویل مدت میں بھی نہ کی جا سکتی تھی، آن کی آن میں قلب کی حالت الٹ پلٹ ہو جاتی، وہی دل جو ابھی کچھ دیر پہلے غفلت کے زنگ میں مبتلا تھا، ایک مواخذے کی بھٹی میں پڑتے ہی نکھر کر صاف ستھرا ہو جاتا تھا، جن لوگوں نے حضرت کے معاملات دیکھے ہیں وہ شہادت دیں گے کہ حضرت کا غصہ ہونا، ناراضگی ظاہر فرمانا بے اختیارانہ نہیں ہوتا تھا، بلکہ اختیاراً کسی مصلحت کی وجہ سے غصہ کا اثر ظاہر فرماتے تھے، چنانچہ اسی اثناء میں اگر کوئی غیر متعلق شخص کسی ضرورت سے آجاتا تو اس سے اس طور پر مخاطب ہوتے جیسے کوئی بات ہی پیش ہی نہ آئی ہو۔

حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بھی مواخذہ، دار و گیر اور ڈانٹ ڈپٹ کا سلسلہ چلتا رہتا تھا، ایک مرتبہ کسی نے ہمت کر کے عرض کیا کہ حضرت آپ کی سب باتیں سنت کے مطابق ہیں، لیکن یہ گھڑکی اور جھڑکی سمجھ میں نہیں آتی، حضرت نے اس کے کان میں کہا میاں! اوپر کے جی سے کڑکا کرتا ہوں، اگر ایسا نہ کروں تو یہ دیہاتی مجھے نماز تک پڑھنے نہ دیں گے، معلوم ہوا کہ اصلاح و تربیت کا یہ انداز محض ضرورتاً استعمال کیا جاتا تھا، اور اس کے فوائد بھی ظاہر ہوتے تھے۔ تفصیل تو آئندہ آئے گی، تاہم گفتگو جب ایک حد تک آگئی ہے تو لگے ہاتھوں حضرت ہی کا ایک واقعہ حضرت ہی کے لفظوں میں سنتے چلئے، بمبئی کے ایک سفر سے واپسی کے بعد کی بات ہے، فرماتے ہیں:

''اب کی دفعہ بمبئی میں یہاں آنے سے ایک روز قبل جبکہ لوگ مجلس کے لئے وہاں جمع ہو چکے تھے اور میں ٹہل کر واپس آیا تو ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ اخبار

میں آپ کا نام آ گیا ہے، حالانکہ میں پہلے ہی سے ان لوگوں کو منع کر چکا تھا کہ اس قسم کی کوئی حرکت مت کرنا، اور وہاں کے عوام وخواص ہر طبقہ کو برابر دیکھتا رہا، ان عوام الناس کو ہم لوگ دیکھتے رہتے کہ یہ کدھر جا رہے ہیں، اسی طرح علماء کو بھی دیکھتے رہتے ہیں، چنانچہ وہاں کسی نے کچھ نہیں کہا، لیکن چلتے چلاتے ایک بات پیش آ گئی۔

میں نے اخبار منگا کر دیکھا تو اس میں میرے متعلق کہ میرا ایک خاص چیز سے تبریہ کیا گیا تھا کہ وہ اس میں نہیں ہیں (کسی سیاسی پارٹی میں شرکت کی حضرت والا سے نفی کی گئی تھی) اور فلاں آدمی نے غلط ان کے بارے میں یہ شہرت کی ہے، پھر میں نے جامی صاحب سے کہا کہ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا، تم کو اگر کہنا ہو تو کچھ کہہ دو، اس کے بعد ایک آدمی سے کہا کہ موٹر لاؤ اسٹیشن جائیں گے، اور کسی گاڑی پر سوار ہو کر چلے جائیں گے، راستہ میں کسی اسٹیشن پر رہیں گے، جب بقیہ لوگ جن کا ٹکٹ کل کا ہے وہ آئیں گے تو راستہ سے ان کا ساتھ ہو جائے گا۔

وہاں بہت سے لوگ موجود تھے، میں نے کسی کی طرف رُخ بھی نہ کیا اور نہ ان سے کچھ کہا، اور ان میں سے کسی مجال نہیں ہوئی کہ کوئی کچھ کہتا یا آ کر مجھ کو روکتا۔ آپس میں گفتگو کرنے لگے کہ آخر کیا بات ہوئی جس کی وجہ سے بہت ناراض معلوم ہوتے ہیں، کسی آدمی نے بتلایا کہ اخبار دیکھو اس میں یہ بات لکھی ہے جس کا یہ نتیجہ ہوا، لوگوں نے جب اخبار دیکھا تو بہت خفا ہوئے کہ ان کا نام کیوں اخبار میں آیا، وہ تو ان چیزوں میں رہتے نہیں۔ اور میں وہاں سے موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا اور ایک مسجد میں جا کر بیٹھ گیا، جہاں میرے کچھ لوگ تھے، پھر لوگوں نے آ کر بہت کوشش کی اور کہا چلئے، میں نے کہا کہ وہاں سے تو

چلے آئے اب پھر وہیں جائیں ایسا نہیں کریں گے۔ ایک صاحب نے کہا کہ ہمارے وہاں چلئے، میں نے کہا کہ ہاں آپ کے یہاں چل سکتا ہوں، لیکن گھر کے لوگ جہاں پر ہیں وہیں رہیں اور وہیں سے اسٹیشن جائیں گے۔

اصل میں مجھے ان لوگوں کو یہ بتلانا تھا کہ ہم منع کر چکے تھے کہ کوئی چیز خلاف نہ کرنا، شاید تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم اسی طرح آتے ہیں کہ تمہاری پھونک سے اُڑ جائیں گے، تو ایسا نہیں ہے، ہم یہاں سمجھ بوجھ کے آئے ہیں کہ تمہاری خصلت یہ ہے کہ عوام وخواص سب مل کر ایک آدمی کو اڑا دینا چاہتے تو ہم تمہاری پھونک سے نہیں اُڑ سکتے اور چاہو کہ یہاں سے نکال دو تو یہ بھی نہیں کر سکتے۔

چنانچہ اس کا اچھا اثر ہوا، اور اسی کا یہ نتیجہ ہے جس کو حکیم صاحب لکھ رہے ہیں کہ لوگوں کے چہروں پر رونق نہیں ہے، حالانکہ میں نے یہ اس لئے نہین کیا تھا کہ کسی کے چہرے پر رونق نہ رہے یا گھٹنوں سے نہ چل سکے، بلکہ میرے دل میں یہی بات آئی کہ یہاں بہت دن رہ چکے، اب یہاں سے چلیں اور جانا دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک خوشی کے ساتھ، اور ایک ناخوشی کے ساتھ، اب یہ ان لوگوں کے اختیار کی بات ہے کہ جس صورت کو چاہیں ترجیح دیں، اگر کوئی بات نہ ہوتی تو خوشی خوشی جاتا، اب ناخوشی کے ساتھ جا رہا ہوں، لیکن دیکھا کہ لوگوں پر اس کا بہت اثر ہوا اور میں نے اندازہ کیا کہ اتنے دنوں کی تعلیمات سے جو اثر ہوا اس سے کہیں زیادہ اس بات سے متاثر ہوئے۔

وہاں پر میری حیثیت ایک مسافر کی سی تھی اور وہ جگہ بہت بڑی تھی، لیکن میں کسی سے بھی ڈرا نہیں، اور نہ اس لئے یہ معاملہ کیا تھا کہ ان پر اثر ہو، بلکہ یہ سوچا کہ جب یہ لوگ اثر پذیر نہیں ہو رہے ہیں تو یہاں سے چلا جانا چاہئے، مگر

جب میں دیکھا کہ یہ متاثر ہیں اور سمجھ گئے کہ ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا، اور وہاں اسٹیشن پر بھی بہت کافی تعداد میں لوگ آئے اور اثر لئے ہوئے تھے، سنئے محبت سے اصلاح ہوتی ہے اور خوف سے بھی، کسی عالم کا اگر اتنا بھی خوف نہ ہو کہ اس کی ناراضگی کا لوگ اثر لیں تو پھر اس کا وجود اور عدم دونوں برابر ہے۔

(معرفت حق، ص:۱۵، جمادی الاخری ۱۳۸۷ھ)

بہر کیف مقصد یہ ہے کہ حضرت کا کہیں سے ناراضی کے ساتھ جانا بہت سی اصلاحات کا پیش خیمہ بن جاتا تھا، چنانچہ فتح پور سے جب حضرت والا ناراض ہوکر چلے تو وہاں کے سبھی لوگ خواہ مسلمان ہوں یا ہندو سب متاثر ہوئے، یہاں تک کہ حضرت کو راضی کرلیا، پھر حضرت نے دعائیں دے کر لوگوں کو رخصت کیا، اور آپ الہ آباد واپس تشریف لائے۔

(۵) ڈھاکہ کا سفر:

۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہونے کے بعد حضرت تھانویؒ کے بیشتر خلفاء پاکستان تشریف لے گئے، حضرت پر بھی لوگوں کا اصرار تھا کہ مشرقی پاکستان کی سکونت اختیار فرمائیں، ایک صاحب نے بریسال میں ایک بہت بڑا مکان بھی حضرت کے لئے لے لیا تھا، لیکن حضرت نے اپنے لوگوں کے مشورے کے بعد اس پیش کش کو منظور نہیں فرمایا اور فرماتے تھے کہ میں اپنے بال بچوں کو لے کر جہاں چاہوں جا سکتا ہوں، مغرب میں بھی میرے احباب ہیں اور مشرق میں بھی، لیکن میرا تعلق ان کے علاوہ یہاں کے لوگوں سے بھی تو ہے جن میں خاصی تعداد ایسے محبین کی ہے کہ وہ میری جدائی برداشت ہی نہ کرسکیں گے، اور کتنے ایسے ہیں کہ رو رو کر مر جائیں گے، اس لئے میں یہاں سے نہ جاؤں گا۔

تاہم حضرت والا نے تقسیم کے بعد لیکن پاسپورٹ کی بندش سے قبل جبکہ مشرق کا سفر آزاد اور کھلا ہوا تھا، ڈھاکہ کا سفر فرمایا تھا اور چند یوم قیام کر کے وطن واپس تشریف لے آئے تھے، اسی سفر کے بارے میں فرمایا تھا کہ:

''میں ایک جگہ گیا ہوا تھا، اور احباب سے منع کر دیا تھا کہ میرے آنے کا اعلان نہ کیا جائے اور نہ کوئی اشتہار دیا جائے، مگر مجلس کے وقت دیکھتا کہ بہت لوگ آجاتے تھے، ایک دن وہاں کے ایک بڑے عالم جو واقعۃً عالم معلوم ہوتے تشریف لائے۔ لوگوں نے مجھ سے ان کا تعارف کرایا اور یہ بتایا کہ آپ یہاں کے مسلّم عالم ہیں، میں بھی ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا وہ دیر تک خاموش بیٹھے رہے، میں نے جب دیکھا کہ یہ صاحب تو کچھ کہتے نہیں تو سوچا کہ لاؤ میں ہی کچھ کہوں، چنانچہ میں نے اپنے احباب میں سے ایک صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ بہت دنوں کے بعد ایک بات میری سمجھ میں آئی، اگر اجازت ہو تو کہوں، انھوں نے کہا کہیے، میں نے کہا کہ ایک مدت کے بعد میری سمجھ میں یہ آیا کہ عقل کے معنی ہیں مال، یعنی جس کے پاس مال زیادہ ہو تو سمجھو کہ وہ زیادہ عقلمند ہے، یہ سن کر وہ عالم صاحب ذرا چوکنے ہوئے، میں نے ان کو متوجہ پا کر اپنے ان صاحب سے کہا کہ ایک بات اور سمجھ میں آئی ہے، وہ یہ کہ علم نام ہے زبان کا، یعنی جو شخص جتنا زیادہ بولنے والا ہوگا اور عمدہ مقرر ہو وہ اتنا ہی بڑا عالم ہے۔ اس طرح سے مختلف باتیں کرتا رہا۔ تفسیر روح المعانی لے کر آیت:

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنَّ كَثِيْراً مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاكُلُوْنَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ۔ کے متعلق اس سے تفسیر بیان کر رہا تھا، اور احیاء العلوم میں بھی وہ جگہ نکال کر سنا رہا تھا، جہاں امام نے لکھا

ہے کہ جو علماء دین کو دنیا کمانے کا ذریعہ بناتے ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص نہایت ہی قیمتی دوشالہ سے پیر کا گرد آلود تلوا صاف کرے، اور امام غزالی نے یہ بھی لکھا ہے کہ عجب نہیں کہ اس طرح کے لوگوں کا حشر بھی انھیں لوگوں کے ساتھ ہو جن کے بارے میں ارشاد ہے: وَلَوْ تَرَىٰ اِذِالْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْارَؤُوْسِهِمْ ، کیونکہ انھوں نے بھی دنیا میں اپنے علم سے الٹا کام لیا تھا، لہٰذا سزا بھی اسی کے مطابق ملے گی، میرے سامنے تو کچھ کہا نہیں مگر لوگ بیان کرتے تھے کہ مجلس سے اٹھنے کے بعد باہر جا کر کہتے تھے کہ جیسی عمدہ عمدہ اور کام کی باتیں ان کی مجلس میں سننے میں آئیں، میں نے ساری عمر نہیں سنیں، حالانکہ خود وہ مولوی صاحب تفسیر اچھی جانتے تھے اور اس سے ذوق بھی تھا۔

اور فرمایا کہ اسی سفر میں ایک گاؤں میں جانا ہوا تھا، جاتے وقت اسٹیشن پر ایک صاحب ملے، جوان صاحب کے داماد تھے جن کے یہاں جا رہا تھا، انھوں نے کہا کہ ان صاحب نے (اپنے خسر کو کہا) آپ کے آنے کی پہلے سے مجھے اطلاع نہیں کی ورنہ اشتہار دے دیتا، چاروں طرف باقاعدہ اعلان کرا دیتا، حسن اتفاق کہ واپسی میں اسٹیشن ہی پر پھر ان سے ملاقات ہوئی، اس بار کہنے لگے کہ انھوں نے آپ کے جانے کی پہلے سے اطلاع نہیں کی، اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو آپ کے لئے دو سو روپئے چندہ کر لیتا، میں نے خیال کیا لو بھائی اس نے تو مجھے بھی دنیادار پیروں کی فہرست میں شمار کر دیا، اس لئے اب یہ موقع خاموشی کا نہیں ہے، پہلی بار تو خاموش رہ گیا مگر ان اس کے خیال کی اصلاح کرنی چاہیئے، چنانچہ میں نے اپنے ساتھ کے لوگوں میں ایک صاحب سے کہا کہ جو کچھ میں کہتا جاؤں تو اس کو ان کی زبان میں یعنی بنگلہ میں سمجھا دو، لیکن

جب یہ دیکھا کہ سلسلۂ کلام کا ربط ہی ختم ہوا جاتا ہے اور میرے مافی الضمیر میں بھی خلط واقع ہورہا ہے، تو میں نے ان صاحب کا واسطہ ختم کر دیا، اور خود اردو ہی میں بیان کرنے لگا، چہرے بشرے سے اندازہ کرتا تھا کہ میری بات کو خوب سمجھ رہے ہیں، میں نے کہا آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ ذرا ہوش کی دوا کیجئے، کچھ جانتے بھی ہیں کہ پہلے زمانہ میں پیر ہی لوگ دین کے ساتھ دنیا بھی بانٹتے تھے، نہ معلوم کتنے وزرا اور سلاطین ان کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے تھے ، ان سے مانگتے تھے اور کامیاب ہو جاتے تھے۔ آج یہ حالت ہوگئی ہے کہ مرید اُلٹا پیر کو دیتا ہے، تف ہے ایسے پیر پر جو اپنے کو مریدین کا محتاج سمجھتا ہو، اگر پیر میں غیرت ہو تو اس کو یہ خیال کر کے کہ مرید اسے حاجت مند سمجھ رہا ہے ڈوب مرنا چاہئے، میں نے یہ بھی کہا کہ عجب بات ہے کہ مرید سے اگر پوچھا جائے کہ تمہیں روزی کون دیتا ہے؟ تو آسمان کی جانب اشارہ کر کے کہے گا کہ اللہ دیتا ہے، اور پیروں کے بارے میں یہ چاہتے ہیں کہ کہا جائے کہ ہم دیتے ہیں، یہ کیوں؟ تم کو خدا دے اور پیر کو تم دو، یہ ناانصافی نہیں ہے؟ پس جب یہ بات ہے تو ہم بھی کہتے ہیں کہ ہم کو بھی اللہ تعالیٰ دیتے ہیں، جب میں کہہ چکا تو اس نے لوگوں سے کہا کہ جانتے ہو یہ کیوں خفا ہو رہے ہیں، وہ جو روپیہ کے لئے ان سے کہا گیا تھا وہی بات ان کو ناگوار گذری ہے، سچا ہے نا، اور یہ بھی کہا کہ ہدیہ دینے سے خفا ہوتے، سوا اس کے کسی کو نہیں دیکھا۔

(حالات مصلح الامت، ج:۲،ص:۲۶۳)

باب ۱۶

اَسفار (۲)

سفرعلی گڈھ:

ترتیب کے لحاظ سے بمبئی کا پہلا سفر علی گڈھ سے پہلے ہوا، لیکن چونکہ بمبئی کے اسفار کو یکجا ذکر کیا جائے گا، اس لئے اصل ترتیب سے قطع نظر علی گڈھ کا سفر ذکر کیا جاتا ہے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے بعض مخلص حضرات کا رابطہ جب سے حضرت والا سے قائم ہوا، ان لوگوں کا اصرار تھا کہ حضرت ایک بار علی گڈھ تشریف لائیں، لیکن حضرت انکار فرما دیتے تھے، کبھی یہ فرماتے کہ اگر کہیں آنے جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا تو ہر جگہ کے لوگ مجھے بلائیں گے اور میں ایک جگہ جم کر کام کرنے کا پسند کرتا ہوں، کیونکہ یہی کام ٹھوس اور پائیدار ہوتا ہے، اور کبھی یہ فرمایا کہ آخر میری وہاں ضرورت کیا ہے، وہاں تو علماء کرام تشریف لاتے ہیں۔ تاہم اہل علی گڈھ کا اصرار بڑھتا ہی رہا اور ان کے خلوص نے یہ اثر دکھایا کہ حضرت کو بھی شرحِ صدر سا ہو گیا۔ سفر سے پہلے آپ نے ایک صاحب کو علی گڈھ بھیجا بھی کہ معلوم کریں کہ واقعی وہاں ضرورت اور اشتیاق پایا جاتا ہے یا یہ دعوت صرف رسمی ہے، انھوں نے آکر بیان کیا کہ وہاں دین کی طلب اور تشنگی غیر معمولی پیمانہ پر موجود ہے، جس سے بھی میری ملاقات ہوئی ہر شخص کی زبان پر یہی چرچا تھا، زمین بالکل تیار ہے، آپ کی تشریف ارزانی سے انشاء اللہ دین کی کھیتی لہلہا اٹھے گی۔ حضرت نے جب لوگوں کا اخلاص واشتیاق ملاحظہ فرمایا تو چند روز کیلئے

علی گڈھ کا سفر منظور فرمالیا، چنانچہ اس کے لئے ۱۸/شوال ۸۴ھ کی تاریخ طے ہوگئی۔

حضرت ۱۸/شوال بوقت شام الہ آباد سے اپنے مخصوص رفقاء وخدام کے ساتھ علی گڈھ کے لئے روانہ ہوئے، اثناءِ راہ میں مختلف اسٹیشنوں پر مقامی خدام اطلاع پاکر حضرت کی زیارت وملاقات کے لئے آتے رہے۔ رات کو کسی وقت علی گڈھ پہونچے، یہ وہی علی گڈھ ہے جہاں کسی زمانہ میں اپنے اکابر میں سے ایک بزرگ کی آمد کی خبر پاکر ایک من چلے نے لکھ بھیجا تھا۔

حضرت ناصح جو آئیں دیدۂ ودل فرش راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھاؤ کہ سمجھائیں گے کیا

اس شعر کے آئینہ میں انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ اور علماء دین کے درمیان پیدا ہوجانے والی وہ خلیج دیکھی جاسکتی ہے جس نے شروع ہی سے ملت کے قافلہ کو دو الگ الگ راہوں پر لگادیا تھا۔ علم دین اور علماء کا مرکزی عنوان دار العلوم دیوبند تھا، اور دنیوی علوم اور انگریزیت کا نشان مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔ اس تفریق باہمی نے امت کو جس پیمانہ پر نقصان پہونچایا ہے، اسے کون حساس اور دردمند محسوس نہیں کرتا، بار بار کوشش کی گئی اور دونوں جانب سے کی گئی کہ ملت کے دونوں گروہوں کا فاصلہ کسی قدر کم ہوجائے، مگر دونوں کے مقاصد میں تفاوت اور بیگانگی کی وجہ سے اس میں کامیابی نہ ہوسکی، تاہم تھوڑا سا قرب ضرور پیدا ہوا، جس کی وجہ سے غلط فہمیوں کے دبیز پردے کسی قدر چاک ہوئے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ علماء کرام وہاں جاتے ہوئے خوف کھاتے تھے کہ علی گڈھ کے منچلوں کے ہاتھوں نہ جانے کب عزت وحرمت کا دامن تار تار ہوجائے، یا اب ایک وقت یہ ہے کہ وہاں سے اشتیاق وانتظار کی خبریں چلی آرہی ہیں، اور خطوط پر خطوط آرہے ہیں کہ یہاں علی گڈھ میں علم کی کمی نہیں ہے،

کتابوں کی کمی نہیں، لیکن جو کمی ہے وہ روحانیت کی ہے، اور آج کے دور میں ہم کو اسی چیز کی ضرورت ہے، اور ہماری یہ ضرورت جناب والا ہی کی ذاتِ والا صفات سے پوری ہوسکتی ہے۔

حضرت نے اپنی خداداد بصیرت سے سمجھ لیا کہ اب وہاں جانا نہ صرف مفید ثابت ہوگا بلکہ یہ وقت کی ضرورت ہے، اگر یہ ضرورت نہ پوری کی گئی تو شاید خدا کے یہاں مسئول ہوجائیں۔ فرماتے ہیں کہ میں علی گڈھ سوچ سمجھ کر اور بصیرت کے ساتھ جارہا ہوں، بالفرض اگر اپنی ذات سے متعلق وہاں کوئی ناخوشگوار واقعہ بھی پیش آئے گا تو صبر کروں گا، لیکن خلافِ امید وہاں کے حالات بہت کچھ بدلے ہوئے نظر آئے، عمائدین اور طلبہ کی ایک بہت بڑی جماعت اسٹیشن پر پہلے ہی سے استقبال کے لئے موجود تھی، پھر جیسا ذوق وشوق علماء کا ادب واحترام اور مسجد ونماز کا اہتمام حضرت نے وہاں دیکھا اس سے بہت متاثر اور مسرور ہوئے۔ فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں شعائر اللہ میں سے ہیں، ان کا احترام واہتمام ایمان کا پتہ دیتا ہے، باقی یہ ضرور ہے کہ اب تک صرف نماز روزہ ہی کو اسلام سمجھ کر لوگ قانع رہے اس لئے حقیقی دین اور روحانیت کا یہاں اب تک اہتمام نہیں کیا گیا، تاہم ان کی موجودہ حالت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو بھی اپنی اس کمی کا احساس ہوگیا ہے، یعنی یہ خیال پیدا ہوگیا ہے کہ ہم مسلمان ہیں، مگر ہمارا رشتہ اللہ سے اُستوار نہیں ہے، اور یہ اس لئے کہ ہر خطہ اور ہر جماعت میں اللہ کی طلب موجود ہے، مگر تنہا طلب حصولِ مقصد کے لئے کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے کسی رہبر کی بھی ضرورت ہے۔

حضرت نے علی گڈھ میں سات روز قیام فرمایا۔ صبح وشام دونوں وقت پابندی کے ساتھ مجلس ہوتی تھی، جس میں یونیورسٹی کے عمائدین، طلبہ اور شہر کے معزز

حضرات شریک ہوتے تھے، یہاں آپ کے مخاطب تعلیم یافتہ اصحاب تھے ان کی فہم پر اعتماد تھا، اس لئے حضرت کی طبیعت خوب کھلی، علم و معرفت کے سوتے پھوٹ پڑے۔ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے مناسب حال مضامین نہایت مدلل اور مربوط طریقے پر بیان فرمائے۔ تقریر کا مقام و مرتبہ، خموشی کے فوائد، ربط بالخالق، مقاصد قرآن، منازل طریق، اعتقاد کی درستگی، ولایت و رسالت کی تحقیق، کشف و کرامت کی بحث، وسوسہ اور شک کا فرق، اتباع سنت کی اہمیت اور تلاوت قرآن کے فوائد و برکات، یہ اجمالی عنوانات ہیں، ان تفصیلی مجالس کے۔ ایسے علوم، ایسے وجد آفریں نکتے ارشاد فرمائے کہ مجلس کی مجلس وجد میں آ گئی، یہ مجالس حضرت ہی کے الفاظ میں ضبط تحریر میں آ کر معرفت حق ۱۹۶۵ء کے شماروں میں شائع ہو چکی ہے۔

نواب چھتاری خدمت والا میں:

نواب حافظ سعید احمد خاں صاحب چھتاری، جو ایک زمانہ میں یو پی کے گورنر رہ چکے تھے، نہایت نیک اور بزرگ صفت انسان تھے، ابھی حال ہی میں انتقال ہوا۔ اللہ نے دینی اور دنیوی دونوں دولتوں سے نوازا تھا، بہترین حافظ قرآن تھے، گورنری کے زمانے میں محراب سناتے تھے، طویل عمر پائی۔ غالباً نوے یا اس سے زائد مرتبہ محرابیں سنائی ہیں۔ نواب صاحب بھی ایک مرتبہ خدمت والا میں حاضر ہوئے۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ:

”حضرت! یہ اہل علی گڈھ اور ہم سب کی خوش قسمتی ہے کہ آپ کے قدم مبارک یہاں آئے، اس آمد پر ہم جتنا بھی فخر کریں وہ کم ہے، حضرت والا میرے لئے، میری اولاد کے لئے دعاء فرمائیں، اور ہم پر کیا منحصر ہے بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے دعاء فرمائیں، بڑی نازک حالت ہے۔

تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد حضرت سے رُخصت ہوتے وقت نواب صاحب نے عرض کیا ع

وقت پر بھول نہ جانا مجھے یہ یاد رہے۔ (گلستانِ معرفت)

آخری دن نواب چھتاری نے بعد عصر چائے کیلئے حضرت کو اپنی قیام گاہ راحت منزل میں مدعو بھی کیا، اور حضرت کی دعائیں حاصل کیں۔

علی گڈھ میں حضرت نے یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کو ملاحظہ بھی فرمایا، طبیہ کالج اور آزاد لائبریری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

دعاء کا منظر:

تبلیغی جماعت کے چند ذمہ دار حضرات نے حضرت والا کی خدمت میں درخواست کی کہ ہم سب کو جمع کر کے کسی خاص وقت میں دعاء فرمادیں، چنانچہ شام کو قبل مغرب حضرت نے دعاء کا وعدہ فرمالیا، مغرب سے کچھ پہلے حضرت مسجد تشریف لے گئے۔ پوری مسجد طلبہ علی گڈھ سے بھری ہوئی تھی، حضرت نے محرابِ مسجد میں ہاتھ دعاء کے لئے اٹھائے۔ دل سے متوجہ تھے، گو زبان سے کچھ نہیں فرمایا، لیکن حاضرین کے اوپر ایک کیف سا طاری تھا، بے اختیار لوگوں پر گریہ طاری تھا، حتیٰ کہ بعض لوگ اپنی چیخیں ضبط کرنے پر قابو نہ پاسکے، تضرع وزاری کا ایک سماں تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جناب قدس میں قلوب باریاب ہیں، اور عرض و نیاز پوری یکسوئی اور حضوری کے ساتھ ہو رہا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ تاریخ بھی آگئی جبکہ حضرت کو یہاں سے رُخصت ہونا تھا، لوگوں نے ۲۵ رشوال کو باچشم نم علی گڈھ کے اسٹیشن پر الوداع کہا، اور بہت سے حضرات ہاتھرس اور ٹنڈلہ تک حضرت کی معیت میں آئے۔ ۲۶ رشوال کو حضرت

الہ آباد تشریف فرما ہوئے۔

سفر لکھنؤ:

مرکز علوم دنیوی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے سفر کے بعد مرکز علوم دینی دارالعلوم دیوبند کے اربابِ نظم ونسق کو خیال پیدا ہوا کہ حضرت سے دیوبند تشریف آوری کی درخواست کی جائے۔ چنانچہ حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے یہ چاہا کہ علی گڈھ ہی سے حضرت دیوبند کا قصد فرمائیں، لیکن حضرت نے عذر فرمادیا اوراس کے اسباب بھی مفصل تحریر فرمادیئے، پھر دو ماہ کے بعد سلسلہ جنبانی کی گئی۔ مہتمم صاحب نے دعوت نامہ بھیجا، اہل دیوبند کو بھی اشتیاق وانتظار تھا، حضرت نے بھی آمادگی ظاہر فرمادی تھی اور بظاہر جانے کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں، چنانچہ اکثر اوقات دارالعلوم دیوبند ہی کی باتیں زیر تذکرہ رہتیں، کبھی علم اور علماء کا مقام اوران کے مرتبہ پر گفتگو فرماتے، کبھی مشائخ اور بزرگانِ دین اور دین میں ان کا جو مقام ہے اس پر گفتگو فرماتے، اور کبھی خانقاہ اور مدرسہ دونوں کی ضرورت پر بیان ہوتا، اور کبھی افسوس فرماتے کہ جس قدر ان دونوں سلسلوں میں قرب ونسبت تھی، فی زمانہ ان دونوں میں اتنا ہی بعد ہوگیا ہے۔

غرض انھیں موضوعات پر مجالس ہورہی تھیں، اورسب سے اہم شے یعنی خلوص کی ضرورت اورموجودہ زمانہ میں اس کی کمی پرنہایت شدومد کے ساتھ بیان ہورہا تھا۔

ایک دن کی مجلس میں گفتگواس بات پر چل پڑی کہ صوفیاء کا بھی بڑا مقام ہے اوران کا نہایت ہی عظیم کارنامہ ہے۔اسی مضمون کو کتاب ''الیواقیت والجواھر'' اور'' التنبیہ الطربی'' سے عبارتیں سنا سنا کر بیان فرمارہے تھے، کہ ان حضرات نے رسول اللہ ﷺ کے باطنی احوال کی حفاظت فرمائی ہے، پھر علماء اسلام کا ذکر کرتے

ہوئے فرمایا کہ صوفیاء کی خدمات مسلّم، لیکن ہمارے علماء ربانیین نے بھی اسلام کی کچھ کم خدمت نہیں کی ہے، اوران کا کارنامہ بھی حضرات صوفیاء سے کم شاندار نہیں ہے، حضرات صوفیاء نے اگر رسول اللہ ﷺ کے باطنی احوال کی حفاظت فرمائی ہے تو علماء ظاہر نے بھی رسول اللہ ﷺ کے اقوال اور اعمال کی حفاظت فرمائی ہے اور ایک ایک قول اور آپ کی ایک ایک شان اور آن کو کتابوں میں مدوّن اور محفوظ فرمادیا ہے، اسی مضمون کو حضرت والا انتہائی جوش وخروش کے ساتھ اور نہایت ہی شدومد سے بیان فرمارہے تھے، اور آواز تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھی کہ اچانک آواز بھرائی، ہاتھ کانپنے لگے اور کتاب جو ہاتھ میں تھی ہاتھ سے چھوٹنے لگی، اگر گاؤ تکیہ کا سہارا نہ ہوتا تو شاید حضرت والا بھی بہ نفس نفیس اس چوکی سے جس پر تشریف فرماتھے، زمین پر آجاتے۔

اب اچانک جو یہ صورتحال پیش آئی تو کچھ دیر تک تو کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ہوا کیا، بالآخر معلوم ہوا کہ حضرت پر فالج کا حملہ ہوا ہے، چنانچہ خدام نے حضرت کو پلنگ پر لٹادیا۔ یہ واقعہ ۲۱؍ مارچ ۱۹۶۵ء کو پیش آیا، متعلقین ومنتسبین اور خدام وطالبین کا اس حادثہ سے جو حال ہوا ہوگا وہ محتاجِ بیان نہیں، مقامی اطباء اور ڈاکٹروں سے رجوع کیا گیا جس سے کچھ وقتی افاقہ ہوا، لیکن مستقل علاج کے لئے حضرت والا کی خواہش ہوئی کہ شفاء الملک جناب حکیم شمس الدین صاحب لکھنوی کا علاج کیا جائے، اور حکیم صاحب موصوف کو بلاکران سے مشورہ کرلیا جائے کہ یہیں الہ آباد رہ کر علاج بسہولت ہوسکے گا یا اس کے لئے لکھنؤ چلنا ضروری ہے۔ حکیم صاحب چند دن کے بعد تشریف لائے، مشورہ کے بعد یہی طے پایا کہ لکھنؤ جاکر ہی علاج مناسب ہوسکے گا۔

چنانچہ ۲۸؍ مارچ ۱۹۶۵ء کو الہ آباد سے لکھنؤ کے لئے روانگی ہوئی، جناب سیّد مظفر حسین صاحب وزیر ٹرانسپورٹ ...... جو کہ حضرت سے بیعت بھی تھے ...... کے

مکان پر قیام ہوا۔ اصل معالج تو حکیم شمس الدین صاحب تھے اور مشورہ میں بہت سے مقامی وغیر مقامی طبیب وڈاکٹر صاحبان بھی شریک رہے، چنانچہ بمبئی سے حکیم اجمیری صاحب تشریف لائے، دیوبند سے حکیم محمد عمر صاحب، علی گڈھ سے حکیم افہام اللہ صاحب، بنارس سے ڈاکٹر محمد ظفر صاحب حاضر خدمت ہوئے، اور مقامی حضرات میں سے حکیم عبدالمعید صاحب اور ڈاکٹر عبدالجلیل صاحب فریدی برابر تشریف لاتے رہے۔

حکیم شمس الدین صاحب نے اوّلاً منضج دیا، پھر مسہل دیا، جو الحمدللہ کامیاب رہا، حضرت والا کو بہت تیزی کے ساتھ صحت وقوت کا احساس ہونے لگا۔ اصل مرض کے دور ہوجانے کے بعد اعضاء میں قوت کے لئے مالش کی ضرورت تھی، اطباء نے مشورہ دیا کہ حضرت کو کچھ دنوں تک ایسے مقام پر رہنا چاہئے جہاں کی آب وہوا معتدل ہو، نہ گرمی زیادہ ہو اور نہ سردی۔ چنانچہ مشوروں کے بعد بمبئی کا قیام بچند وجوہ طے پایا، ایک تو یہ کہ آب وہوا وہاں کی معتدل ہے، دوسرے جناب حکیم اجمیری صاحب جیسے مخلص ماہر فن اور حاذق طبیب بھی وہاں موجود ہیں، ان کی نگرانی میں قیام نہایت مفید ہوتا، اور ایک بڑی آسانی یہ بھی تھی کہ کرلا میں حضرت والا کے بعض قریبی اعزہ اور وطن کے لوگ موجود تھے، جن کی وجہ سے پردیس کی الجھن اور مسافرت کی پریشانی کا بھی یہاں کوئی سوال نہ تھا، نیز تیمارداری بالخصوص مالش وغیرہ کے لئے یہاں بہت سہولت تھی، ان وجوہ سے حضرت والا نے بھی بمبئی کے قیام کو پسند فرمایا۔

آب وہوا راس آنے کی وجہ سے حق تعالیٰ کے فضل وکرم سے بہت جلد صحت عود کرنے لگی، اور مسلسل مالش کی وجہ سے آناً فاناً ہاتھ پاؤں میں طاقت بھی آنے لگی، بلکہ صحت قریب قریب بحال ہوگئی، اور رفتار وگفتار نیز نشست وبرخاست کسی گوشہ سے حضرت والا کو پہلی نظر میں دیکھنے والا یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ آپ پر کبھی

کوئی دورہ بھی پڑا ہے۔

لکھنؤ میں جب مسہل والا عمل ختم ہوا اور کئی دن کے بعد حضرت کو غذا ملی تو حضرت نے نعمت صحت کی خوشی میں ان تمام اطباء کی جو علاج اور مشورہ میں شریک رہے، اسی طرح ان علماء اور عمائدین شہر کی جن سے حضرت واقف تھے، اور ان تمام مہمانوں کی جو اس وقت وہاں کی عارضی خانقاہ میں مقیم تھے۔ ان سب حضرات کی نہایت پُر تکلف دعوت فرمائی، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سب حضرات نے حضرت والا کی کامل صحت اور حصولِ قوت کے لئے دعا فرمائی۔

اس علاج کی وجہ سے سفر دیوبند کا ارداہ تو فسخ ہوگیا، البتہ لکھنؤ اور بمبئی کے فیض یاب ہونے کا دروازہ کھل گیا، لکھنؤ میں بسلسلۂ علاج کم وبیش ایک ماہ قیام رہا۔

بمبئی کے اسفار:

بمبئی کا پہلا سفر حضرت اقدس نے وہاں کے بعض خصوصی حضرات کے مسلسل اصرار پر ۸/ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں فرمایا۔ وہاں شہری علاقہ میں کلیر روڈ پر دس گیارہ روز تک قیام رہا۔ اثناءِ قیام میں شہر کے مختلف مقامات پر متعدد وعظ ہوئے، بمبئی کے دنیادارانہ ماحول، ہمہ وقتی مشغولیت اور حد سے بڑھے ہوئے کاروباری انہماک کی دنیا میں حضرت کے یہ مواعظ انقلاب آفریں ثابت ہوئے، حضرت کے فیوض وبرکات کا ظہور جو بعد میں بمبئی میں ہوا، اس کا پہلا بیج اسی سفر میں بویا گیا تھا، وہاں کے متعدد مواعظ ضبط تحریر میں آسکے، اور انھیں یکجا کتابی صورت میں وصیۃ التلاوۃ کے نام سے شائع کیا جاچکا ہے۔ اب یہ رسالہ تالیفات مصلح الامت حصہ سوم میں دیکھا جاسکتا ہے۔

بمبئی کا دوسرا سفر بسلسلۂ علاجِ مرضِ فالج ہوا، جس کی کسی قدر تفصیل سفر لکھنؤ کے ذیل میں گذر چکی ہے، اس بار بمبئی کا قیام تقریباً دو ڈھائی ماہ رہا۔ ۱۸/ ربیع الاول

۱۳۸۵ھ مطابق جولائی ۱۹۶۵ء کو الہ آباد واپسی ہوئی۔ دورانِ قیام کسی قدر صحت وقوت آجانے کے بعد حضرت نے مجلسی افادہ کا سلسلہ قائم فرمادیا تھا، جس میں بمبئی کے ہر طبقے کے لوگ شریک ہوکر حضرت کی تعلیمات سے مستفید ہوتے تھے۔

بمبئی کا تیسرا سفر ۱۱/اپریل ۱۹۶۶ء کو ہوا۔ گرمی کی شدت چونکہ حضرت کے لئے بیحد مضر تھی، اور الہ آباد کی گرمی پناہ بخدا! دوآبے کا علاقہ ہے، نہایت گرم اور خشک، اچھے اچھے صحت منداور شہ زور حواس باختہ ہوکر رہ جاتے ہیں، نیز کچھ روز قبل فروری میں رعاف (نکسیر) کا مرض لاحق ہوگیا تھا، تین ہفتے مسلسل خون آتا رہا، ان اسباب سے گرمی میں حضرت کا بمبئی جانا گویا متعین ہوگیا تھا، سلیمان بلڈنگ کرلا میں قیام ہوا۔ مجلسی افادات حسب معمول جاری رہے۔ ۱۱/ستمبر ۱۹۶۶ء کو واپسی ہوئی۔

بمبئی کا چوتھا سفر اس کے چند ہی دنوں بعد ۲۶/اکتوبر ۱۹۶۶ء کو ہوا، چونکہ یہ سفر صرف ڈیڑھ ماہ کے وقفہ سے ہورہا تھا، اس لئے اہل الہ آباد کو تشویش سی ہوگئی تھی کہ حضرت کا قیام بمبئی مستقل نہ ہوجائے، اور ہم لوگ ایک بڑی خیر و برکت سے محروم نہ ہوجائیں، اس لئے عام طور پر شدید تاثر اور مفارقت کی وجہ سے انتہائی رنج وغم کے آثار چہروں سے ظاہر ہورہے تھے، مدیر معرفت حق نے اس وقت کے تاثرات جنوری ۱۹۶۷ء کے شمارے میں ذکر کئے ہیں۔ پورا مضمون قابل ملاحظہ ہے۔ لکھتے ہیں:

''حضرت والا دامت برکاتہم گرما میں ایک طویل مدت تک قیام فرمانے کے بعد ۱۱/ستمبر کو الہ آباد واپس تشریف لائے تھے کہ بعض مصالح کی بنیاد پر نیز اطباء کے مشورے سے حضرت اقدس نے پھر عارضی طور پر بمبئی کے لئے ارادۂ سفر فرمالیا۔ جب لوگوں کو یہ خبر معلوم ہوئی تو اس قدر جلد حضرت کی مفارقت کے تصور سے یہاں کے بچے بچے کے قلب وجگر فرطِ الم سے پاش پاش ہونے

لگے۔ جس طرف دیکھئے لوگوں پر اداسی کا عالم اور ان کی آنکھیں آنسوؤں سے نم نظر آنے لگیں حتیٰ کہ وہ تاریخ آپہونچی جس روز حضرت سے مفارقت کے رنج والم کا پہاڑ ہم سب کو اٹھانا تھا، ۲۶؍اکتوبر ۱۹۶۶ء مطابق ۱۱؍رجب ۱۳۸۶ھ یوم چہارشنبہ کی صبح کو مجلس کے وقت معتقدین کا ایک کثیر مجمع جس میں زیادہ تر الہ آباد اور اس کے اطراف ونواح کے لوگ تھے، نیز ان کے علاوہ دوسری جگہوں سے جن حضرات کو حضرت کی تشریف بری کا علم ہوگیا وہ بھی قدم بوسی کے لئے آگئے تھے، یہ سب حضرات آخری مجلس میں شرکت کے لئے جب حاضر ہوئے تو اس وقت حضرت والا دامت برکاتہم پر خود بہت زیادہ تاثر تھا، اس لئے ابتداء مجلس میں خود تشریف نہیں لائے، بلکہ مولوی جامی صاحب سے فرمایا کہ کوئی مضمون سناؤ! میں ابھی آتا ہوں، چنانچہ انھوں نے ان مجالس کا خلاصہ سنانا شروع کیا جو بمبئی سے الہ آباد کی واپسی سے پیشتر وہاں پر ہوئی تھیں، پھر حضرت والا سے درخواست کی گئی تو بنفس نفیس مجلس میں تشریف لائے، اور اس مضمون کی تکمیل فرمانے کے بعد فرمایا کہ اب یہ سن لیجئے کہ میرا ارادہ آج سفر کا ہے، مگر یہاں سے ناراض ہوکر نہیں جارہا ہوں بلکہ آپ لوگوں سے بہت خوش ہوں، آپ لوگوں سے ناراضگی کے کیا معنی؟ یہاں میں قیام کر چکا ہوں اور میں نے الہ آباد کو اپنا وطن بنالیا ہے، یہاں کے توطن کو چھوڑوں گا نہیں، بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں یہاں آیا اور آپ لوگوں نے مجھ کو جگہ دی، پھر اب دوسری جگہ کی وجہ سے اس کو چھوڑ کر چلا جاؤں، یہ کوئی دین کی بات نہیں، بلکہ مجھ کو وہاں کچھ کام کرنا ہے اس لئے دین کی ضرورت سے جارہا ہوں۔ وہاں وطن بنانے کے لئے اور ہمیشہ کے لئے نہیں جارہا ہوں، اور ہوسکتا ہے کہ اگر باوجود ضرورت

کے وہاں نہ جاؤں تو اللہ تعالیٰ ناخوش ہوجائیں۔لہٰذا میرے جانے کی وجہ سے آپ لوگوں کو ناخوش نہیں ہونا چاہئے ، اس لئے کہ اگر کچھ لوگوں کو ہدایت ہوجائے اور خدا کا راستہ پکڑلیں تو اس میں آپ کا کیا نقصان ہے، بلکہ اس میں مدد کرنے کی وجہ سے آپ کو بھی ثواب ملے گا، البتہ آپ لوگوں سے درخواست کرتا ہوں کہ میری صحت کے لئے دعا کیجئے کہ اس بڑھاپے میں مجھ کو قوت رہے تا کہ کچھ کام کرسکوں اور سفر بھی کرسکوں، اگر صحت وقوت رہے گی تو آنا جانا کچھ مشکل نہیں ،اور آپ لوگوں سے یہ بھی کہتا ہوں کہ جو لوگ موجود نہیں ہیں ان کو بھی میری طرف سے یہ بات پہونچا دیجئے نیز یہ کہ یہاں کے کسی شخص نے مجھ کو کوئی تکلیف نہیں دی اور کوئی کلمہ غیر مناسب میرے متعلق نہیں کہا ہے۔

اتنا فرمانا تھا کہ تمام اہل مجلس پر ایسا اثر ہوا کہ ہر طرف سے لوگ چیخیں مار مار کر رونے لگے اور گریہ وزاری کا ایک سماں بندھ گیا، لیکن حضرت والا دامت برکاتہم باوجود انتہائی تاثر کے اب تک ضبط فرماتے جا رہے تھے، اسی اثنا میں حضرت والا نے حضور ﷺ کے اس خطبہ کا ذکر فرمایا جس کو آپ فتح مکہ کے بعد انصار کو جمع کر کے فرمایا تھا جبکہ انصار کو یہ خیال ہوا کہ اب شاید حضور اپنے وطن مادری کی طرف راغب ہوجائیں اور ہم لوگوں کو چھوڑ دیں، اس کو بیان فرماتے ہوئے بالآخر یہ کوہِ تحمل بھی برس پڑا، یعنی حضرت والا دامت برکاتہم بھی بالکل بے تاب ہوگئے اور آواز بھرا گئی ،اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے، اس کا اثر سامعین پر جو ہوا اس کو تحریر کرنے سے قلم قاصر ہے۔

الغرض مجلس ختم ہوئی اور سفر کی تیاری شروع ہوئی، وہ گھڑی اور وہ وقت بھی آپہونچا جب الہ آباد کے ریلوے اسٹیشن پر لوگوں کا اِزدحام تھا، حالت

یہ تھی کہ کاندھے سے کاندھا چھل رہا تھا، ایک دوسرے سے لوگ مجمع کی وجہ سے ٹکرا رہے تھے، ان ہی لوگوں میں بعض حضرات پروانہ وار حضرت کی دست بوسی کے لئے گرے جا رہے تھے، کچھ لوگ کیا بلکہ سب ہی کا یہ حال تھا، کون کسی کو روک سکتا تھا، اور حضرت اقدس کبھی مسکرا دیتے تھے اور کبھی لوگوں کو تسلی کے محبت بھرے جملوں سے نوازتے تھے، جلد ہی آؤں گا، پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ بہت سے مشتاقِ دیدار ایسے بھی تھے جو بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے مصافحہ نہ کر سکے، بہت سے لوگ نینی اسٹیشن تک گئے، کچھ لوگ شنکر گڑھ اسٹیشن پر نظر آ رہے تھے، بعض دیوانے تو مانک پور تک ساتھ رہے، کوئی اپنے دامن سے آنسو پونچھ رہا تھا، تو کوئی رومال سے، کسی کی مصافحہ کرتے کرتے آواز بھرا جاتی تھی، اور کسی کی چیخ نکل جاتی تھی۔"

اس سفر میں حضرت کا قیام بمبئی میں چار ماہ رہا، ۲۳؍فروری ۱۹۶۷ء کو الہ آباد مراجعت فرمائی۔

بمبئی کا پانچواں سفر پھر گرمیاں شروع ہوتے ہی حسب معمول اپریل کی کسی تاریخ میں ہوا، اور ۱۴؍جولائی ۱۹۶۷ء کو الہ آباد واپسی ہوئی۔

چھٹا سفر حضرت والا کا ۳۰؍اگست ۱۹۶۷ء کو ہوا، اور پھر وہیں سے سفر حج کا قصد فرما کر سوئے رب البیت تشریف لے گئے۔

حضرت والا نے ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۷ء تک محض چار سال میں بمبئی کے طویل طویل چھ سفر فرمائے، اور یہ سفر محض سفر ہی نہ تھے، بلکہ طویل مدت تک آپ وہاں قیام فرما بھی رہتے تھے۔ جاننے والے خوب واقف ہیں کہ بمبئی جو ہندوستان کا عروس البلاد ہے اور بیرونی ممالک کے لئے گویا ملک کا دروازہ ہے، یہاں پورے ملک کے

باشندے اپنی کاروباری ضروریات کے باعث رہتے ہیں اور دوسری ضروریات کے لئے یہاں سفر مسلسل کرتے رہتے ہیں۔ تہذیب جدید کی رنگینیاں، تمدن کے تکلفات، بے انتہا مصروفیت، زندگی کی گرم بازاری جتنی بمبئی میں آپ کو ملے گی، ملک کے کسی دوسرے شہر میں یہ نمونہ دیکھنے کو نہ ملے گا، اسی کے ساتھ ساتھ عریانی، فحاشی، گناہوں پر دیدہ دلیری، خدافراموشی اور غفلت و بے دینی یہاں اپنے عروج پر ہے، اہل اسلام بھی بڑی حد تک اپنے دین و مذہب سے غافل یا تو تجارتی مشغولیات میں منہمک رہتے ہیں یا کسی کو دین کا کچھ خیال ہوا تو چند رسوم و بدعات کو دین سمجھ کر ان کی ادائیگی کر لی اور فارغ! اہل حق کا عرصہ سے یہاں گذر نہ تھا، حضرت والا جب پہلی بار یہاں تشریف لائے تو فرمایا کہ:

''میرے جیسے آدمی کے متعلق آپ لوگوں کو خیال ہوسکتا ہے کہ یہ یہاں کیوں آیا ہے، تو اس کے متعلق یہ کہتا ہوں کہ یہاں ہر قسم کے لوگ آتے ہیں، ایک میں بھی آ گیا تو کیا جرم کیا؟ آ گیا کسی وجہ سے، پھر میں نے کہا کہ یہاں میں آیا ہوں آپ لوگوں کو دیکھنے کے لئے، اور دیکھنے سے مراد آپ لوگوں کی شکل وصورت نہیں ہے، اس لئے کہ صورت وشکل کے اعتبار سے تو الہ آباد میں لوگ کچھ کم نہ تھے، وہاں ہائی کورٹ ہے، بلکہ یہاں جو آیا ہوں تو آپ کا دین دیکھنے آیا ہوں کہ دیکھوں آپ میں کتنی دینداری ہے۔ میں آپ کے یہاں مال کے لئے نہیں آیا ہوں، لہٰذا سنبھل کر آیئے گا اور یہ سمجھ کر آیئے گا کہ دین وتدین کا امتحان دینے جارہے ہیں، اور سب آنے والوں کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکئے گا۔ (معرفت حق: ذی قعدہ ۱۳۸۷ھ)

حضرت والا نے بمبئی میں بڑے پیمانے پر دینی کام کا آغاز کیا، پھر دیکھا گیا

کہ وہی بمبئی جہاں غفلت خداوفراموشی کاروباری مصروفیات اور رسوم وبدعات کے علاوہ کسی چیز کا گذر نہ تھا۔اسی بمبئی سے لوگ کشاں کشاں حضرت کی مجلس میں آنے لگے اور بڑی تعداد ان کی حاضری دینے لگی ، دین ودیانت کی فکر قلوب میں پیوست ہونی شروع ہوگئی ۔ بدعات وخرافات کی اندھیریوں سے لوگ باہر آنے لگے ، دین خالص کی روشنی ملی تو دلوں میں یادِ الٰہی اور فکر آخرت کے چراغ روشن ہوتے چلے گئے ، ہر طبقے کے افراد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے ،تاجر، ملازم پیشہ،صنعت کار،غریب مزدور اور امیر کبیر ،سرمایہ دار سبھی اس آستانہ پر دامن پھیلا کر آئے اور دین کی سوغات لے گئے ،نقشہ کچھ اس تیزی سے پلٹا کہ نگاہیں حیران ہوگئیں ،بمبئی میں حضرت والا کے قیام کے اثرات حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی سے سنئے ، لکھتے ہیں کہ:

’’اب وہ وقت آگیا کہ مولانا کے لئے اپنے مرضِ رعاف کی وجہ سے الہ آباد کی گرمیوں میں رہنا مشکل ہوگیا ، اور معالجین نے معتدل آب وہوا کے کسی مقام پر گرمیاں سردیاں گزارنے کا مشورہ دیا..........اب بمبئی کی قسمت نے زور کیا ، ظاہر بیں سمجھے کہ مولانا اپنے علاج کے لئے تشریف لے جاتے ہیں ، لیکن حقیقت میں اہل بمبئی کا علاج مقصود تھا ، اور وہاں ایک روحانی مطب کھلنے کا قضاوقدر میں فیصلہ ہو چکا تھا۔ مولانا کی دلبستگی ......جس کے ساتھ اہل بمبئی کی دل کشائی وابستہ تھی ......بمبئی اور اہل بمبئی سے بڑھتی گئی ، اور اہل بمبئی کو بھی مولانا کی ذاتِ گرامی سے گرویدگی اور عقیدت آناً فاناً ترقی کرتی گئی ، سارے قرائن واسباب اس بات کے مؤید تھے کہ مولانا کہ آمد وقیام سے ہندوستان کے اس عظیم ترین شہر..........جس کا مزاج ہمیشہ سے تجارتی اور کاروباری رہا ہے اور کسی زمانہ میں مسلک دیوبند کے داعیوں اور علم برداروں کے لئے ارضِ

ممنوعہ کی حیثیت رکھتا تھا .... کے ساکن سمندر کی سطح میں ادنیٰ تموج وحرکت بھی پیدا نہ ہوگی، مولانا کے پاس ان اسلحہ اور وسائل میں کوئی ایک چیز بھی نہ تھی جو بمبئی کے لوگوں کو گرویدہ اور متاثر کرسکتی، یعنی خطابت، ظاہری وجاہت، پروپیگنڈہ اور ظاہری شان وشوکت وغیرہ، لیکن قضاوقدر کے فیصلے ان میں سے کسی چیز کے بھی تابع اور پابند نہیں، لوگوں نے جو کچھ دیکھا تمامتر قیاسات کے برخلاف تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیبی قوت کام کررہی ہے، اور لوگوں کے دلوں اور روحوں کو ان کی طرف متوجہ کررہی ہے۔ میں نے ان تاجروں کو اور بمبئی کے چوٹی کے کاروباری لوگوں کی عقیدت ورجوع کو دیکھا جو اس سے پہلے کسی دینی دعوت وتحریک سے متاثر نہ ہوتے تھے، اور جو علماء حق کی طرف سے شدید بدگمانیوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا تھے، ان کا رجوع برابر بڑھتا گیا اور تیزی سے ان میں اصلاح وتغیر آنے لگا، دیکھتے دیکھتے ان کی صورت وسیرت میں نمایاں تبدیلیاں ہونے لگیں۔ مجھے ۱۹۵۰ء سے بمبئی جانے کا برابر اتفاق ہوتا رہا اور اس میں مشکل سے کسی سال وقفہ ہوتا تھا، لیکن اب مولانا کے قیام کے بعد جو بمبئی جانا ہوا تو وہاں کی حالت ہی دوسری دیکھی، جن لوگوں کو مولانا کی مجلس میں دیکھنے کی بالکل امید نہ تھی، ان کو وہاں سر بہ زانو پایا، حالانکہ یہاں کشش کے وہ اسباب مفقود تھے جو بمبئی کے لئے ضروری تھے

۱۹۶۷ء میں حجاز جاتے ہوئے چند روز بمبئی ٹھہرا تھا، ایک دن صبح کرلا جہاں مولانا کا قیام رہتا تھا، ٹھیک صبح درس کے وقت پہونچا، مجھے مولانا کی کرسی کے پایہ کے پاس جگہ دی گئی، مولانا تشریف لائے، میکروفون سامنے تھا، کچھ بیان فرمایا شروع کیا۔ درمیان میں تفسیر وحدیث کی کی کتابیں منگوا کر ان کی عبارتیں

سناتے اور تقریر فرماتے۔ میں پایہ سے لگا بیٹھا ہوا تھا، مولانا کے لہجہ اور طرزِ کلام سے بھی مانوس تھا، لیکن خود بھی گفتگو کا خاصا حصہ نہیں سمجھ سکا، لیکن دیکھتا ہوں کہ لوگوں کے چہرے اور آنکھوں میں گہرا اثر ہے، کئی بار کی طرح اس موقع پر بھی اندازہ ہوا کہ تاثیر کے لئے خطابت اور الفاظ کی کوئی شرط نہیں۔

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

ورنہ اس کے برخلاف بڑے بڑے شعلہ بیان مقرر تقریر کا سماں باندھ دیتے ہیں، لیکن نہ تو قلوب پر کوئی اثر ہوتا ہے اور نہ زندگی میں کوئی انقلاب، اس لئے کہ بقول جگر

آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں چہرے پہ یقین کا نور نہیں

سفر جون پور:

شدتِ گرما کے موسم میں جب حضرت کے سفر بمبئی کا سلسلہ شروع ہوا تو کبھی کبھی افسوس کے ساتھ فرماتے کہ اب میرے لئے سخت سردی بھی مضر ہے اور سخت گرمی بھی مضر ہے، اب اگر اسی طرح ہر موسم میں الہ آباد چھوڑ کر چلا جایا کروں تو یہاں کا کام کس طرح چلے گا، اور اگر قرب وجوار کے کسی مقام پر رہنا چاہوں تو کہاں رہوں، سبھی جگہ کا حال تقریباً ایسا ہی ہے، اس پر حکیم منظور احمد صاحب جونپوری مرحوم نے جو حضرت کے خدام میں سے تھے، جونپور چلنے کی تحریک کی اور عرض کیا کہ شہر کے باہر دریائے گومتی کے کنارے ایک جدید مکان تعمیر کروا رہا ہوں، وہاں الہ آباد سے کم گرمی پڑتی ہے، انشاءاللہ راحت ملے گی، حضرت نے جانے پر آمادگی ظاہر فرمادی تھی، مگر بعض اسباب کی وجہ سے اس وقت تشریف نہ لے جاسکے، بلکہ بمبئی تشریف لے گئے۔

۱۴ر جولائی ۱۹۶۷ء کو جب بمبئی سے واپسی ہوئی تو اہل جونپور نے پھر

تحریک کی، چنانچہ ۲۴؍جولائی ۱۹۶۷ء کو حضرت والا بذریعہ ریل جونپور تشریف لے گئے۔الہ آباد سے آپ کی ہمراہی میں تقریباً ۴۰؍اشخاص تھے، جن میں بعض تو خانقاہ میں مقیم باہر کے مہمان تھے، اور بعض الہ آباد کے لوگ تھے۔

اہل جونپور نے حضرت کے قیام کا انتظام اٹالہ مسجد کے قریب کیا تھا۔ایک وسیع وعریض اور نیا مکان تھا، اسی میں حضرت والا علیٰحدہ کمرے میں اور رفقاء دوسرے کمروں میں ٹھہرے۔جونپور میں حضرت تین روز قیام فرما کر تیسرے ہی دن الہ آباد واپس ہونا چاہ رہے تھے، لیکن حکیم منظور احمد صاحب نے نہایت لجاجت سے عرض کیا کہ حضرت کل جمعہ ہے، اس لئے جی چاہتا ہے کہ اپنے قیام میں ایک دن کی توسیع فرمادیں اور بجائے پنجشنبہ کے جمعہ کو بعد نماز جمعہ روانہ ہوں، اور جمعہ بڑی مسجد میں ادا فرمائیں، اور چند کلمات اپنی زبانِ فیض ترجمان سے وہاں بھی ارشاد فرمائیں۔حضرت والا کو چونکہ حکیم صاحب کی خاطر عزیز تھی، اس لئے منظور فرمالیا، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ بڑی مسجد کی کرسی بہت بلند ہے، ۳۲/۳۰؍زینے چڑھنے پڑتے ہیں اور حضرت کی علالت اس کی اجازت نہیں دیتی اس لئے جامع مسجد جانے کا ارادہ فسخ کردیا، لیکن وعظ کا چونکہ شہر میں شہرہ ہوچکا تھا اس لئے حضرت نے مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامی اور مولانا محمد میاں صاحب فاروقی سے فرمایا کہ چونکہ اعلان وعظ کا ہوچکا ہے، لوگ آویں گے اس لئے آپ لوگ چلے جایئے گا اور میری باتیں جن پر میں نے یہاں زیادہ تر زور دیا ہے، بیان کردیجئے گا تاکہ لوگوں کی فی الجملہ اشک شوئی ہوجائے۔

حسب معمول جمعہ کو مجلس ہوئی، قیام گاہ حاضرین سے کھچا کھچ بھری تھی، مجلس کے بعد حضرت الہ آباد واپس تشریف لائے۔۳۰؍اگست کو پھر بمبئی جانے ریزرویشن تھا، اسی دوران دو ایک روز کیلئے حضرت کوپاگنج بھی تشریف لے گئے۔

مئو کے پروگرام:

الہ آباد کے دورانِ قیام مئو ناتھ بھنجن، ضلع اعظم گڈھ کے لوگوں کے اصرار پر حضرت نے ہر ماہ ایک بار جانا قبول فرمالیا تھا، چنانچہ تاریخ مقرر کرکے وہاں کے خدام حاضر ہوتے تھے اور حضرت ان کی معیت میں تشریف لے جایا کرتے تھے، جامع مسجد میں بڑے پیمانے پر آپ کے مواعظ ہوا کرتے ۔ مئو کے عوام وخواص بالخصوص علماء کبار آپ ان مجالس میں شریک ہوتے اور آپ کے مواعظ سے مستفید ہوتے، چند ماہ کے بعد بعض موانع کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔

موضع اُتراؤں اور بمرولی:

مضافاتِ الہ آباد میں موضع اُتراؤں اور بمرولی کو یہ خصوصیت حاصل رہی ہے کہ حضرت نے دونوں جگہوں پر بعض اوقات طویل مدت تک قیام فرمایا ہے۔ مولانا محمد فاروق صاحب (۱) جو حضرت کی خدمت میں حاضری دینے والے الہ آبادی حضرات میں سابقین اولین کی فہرست میں ہیں ۔ اُتراؤں کے رہنے ہیں ۔ حضرت اقدس کے بڑے محبّ وجاں نثار! حضرت والا ان کے یہاں اُتراؤں بار بار تشریف لے گئے ہیں، اور کئی کئی دن قیام فرمایا ہے۔ حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے جب حضرت اقدس سے ملاقات کا ارادہ فرمایا، تو ان کو ملاقات کی جگہ حضرت اقدس نے بعض مصالح کی بنا پر بجائے شہر الہ آباد کے اُتراؤں کو تجویز فرمایا۔ چنانچہ مہتمم صاحب وہیں تشریف لائے ۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی، مولانا افتخار الحق صاحب اور مولانا وصی الدین صاحب بھی وہیں پہونچے۔

۱۳۷۹ھ میں جب حضرت کی صاحبزادیوں کا چند ہی دنوں کے وقفے سے

یکے بعد دیگرے انتقال ہوا تو اس وقت حضرت نے چند ماہ کے لئے الہ آباد سے قریبی موضع بمرولی میں قیام فرمایا۔ بمرولی کے چودھری حبیب الرحمٰن صاحب کے مکان پر حضرت کا قیام تھا، مجلس کا سلسلہ ہر جگہ برابر جاری رہتا۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی بھی اس موقع پر تشریف لائے تھے، اور ایک ہفتہ بمرولی میں قیام کیا۔ اس کے علاوہ بھی گاہے گاہے بمرولی آپ تشریف لے جاتے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆

(۱) مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ مولانا محمد فاروق صاحب سے متعلق وہ مضمون درج کر دیا جائے، جو میں نے ان کی وفات (۱۴؍صفر ۱۴۲۱ھ) پر لکھا تھا۔

زندگی کی کتنی یادیں اور کتنی تاریخیں ہیں جو الہ آباد سے وابستہ ہیں، الہ آباد میرے قیام کی مدت صرف ۴؍سال تھی، لیکن مدت خواہ کتنی ہی قلیل ہو، چونکہ اس کا دامن ایک بزرگ، وقت کے بڑے شیخِ طریقت اور ایک بلند پایہ صاحب نسبت شخصیت سے وابستہ ہے۔ اس لئے اس کا ہر لمحہ کسی نہ کسی متاعِ گرانمایہ سے مالا مال ہے۔ وہاں رہ کر علم وکمال کی ایک ایسی دنیا کا انکشاف ہوا، جہاں شہرت ونا موری کے تمام اسباب موجود تھے، مگر اس دنیا کے رہنے والے ہر شہرت اور ہر ناموری سے بے نیاز اپنے اپنے حلقے میں خاموشی سے اپنے استاذ کا پڑھایا ہوا سبق دہرا رہے تھے۔ انھیں اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ دنیا نے انھیں جانا یا ان سے انجان رہی وہ جس کی خدمت کر رہے تھے، بس یہ کافی تھا کہ ان کے آقا و مخدوم کو ان کی خدمت کی خبر ہے، استاذ ان کا کامل تھا۔ جو سبق استاذ نے پڑھا دیا تھا، اسے انھوں نے لوحِ قلب سے مٹنے نہیں دیا۔ ان سے میرا تعارف ہوا، میں ان کے لئے اجنبی تھا۔ مگر انھوں نے بڑی محبت سے خیر مقدم کیا، وہ بہت کچھ تھے، مگر ہمیشہ یہی کہتے رہے اور یہی سمجھتے رہے کہ وہ کچھ نہیں ہیں۔ اور اگر کسی نے ان کے اندر کچھ دیکھ لیا، تو یہ کہہ کر ٹال گئے کہ یہ استاذ کا فیضانِ نظر ہے، شیخ کی چشمِ التفات ہے۔ ع

وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم (میں وہی مشتِ خاک ہوں جو کہ ہوں)

اور جو کچھ نہیں تھا، اسے مجلس میں صدر مقام پر بیٹھانے کی کوشش کی، اور اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا، جیسے وہ کوئی حیثیت رکھتا ہو، استاذ نے ان کے خمیر میں خاکساری اور تواضع کو ایسا گوندھ دیا تھا کہ جو بھی ان کے سامنے آیا، اپنے کو اس سے پست دیکھا، حالانکہ وہ بلند تھے، بہت بلند تھے۔

آپ نے پہچانا یہ استاذ کون تھا؟ شیخ کا نام نامی کیا تھا؟ میں بتاؤں۔ وہ مصلح الامت، عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ تھے، جو اصلاً تو ضلع مئو کے ایک گاؤں فتح پور تال نرجا کے رہنے والے تھے اور زندگی کا بڑا عرصہ وہیں بسر کیا تھا، مگر اخیر میں کچھ حالات ایسے آئے کہ پہلے گورکھپور، پھر اس کے بعد الہ آباد تشریف لے گئے۔ الہ آباد میں مدرسہ کا سامان ہوا، خانقاہ آباد ہوئی۔ ان کی وفات کے دس سال بعد ان کے مدرسے میں بسلسلہ تدریس میری حاضری ہوئی۔ خانقاہ میں حضرت سے تعلق رکھنے والے بکثرت علماء اور صلحاء تشریف لاتے رہتے تھے، ان سے میں اپنی بساط اور استعداد کے لحاظ سے ملتا رہتا۔ ان کا ایک خاص انداز ہوتا۔ خاص رنگ ہوتا۔ چہرہ پر ذکر کا نور، گفتگو میں نرمی، آنکھوں میں نمی، چال ڈھال میں تواضع و مسکنت، لباس کی ایک خاص تراش وخراش، جس سے دل کی صالحیت ٹپکتی، ان میں سے بعض لوگوں سے ایک ہی دو ملاقات رہی۔ بعضوں سے بار بار ملنا ہوا۔ بعض حضرات کے ساتھ مسلسل رہنا ہوا۔ حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب، مولانا عبد الرحمٰن صاحب جامیؔ، مولانا قاری حبیب احمد صاحب الہ آبادی، (۱) مولانا انوار احمد صاحب کوپاگنجی، محمد انیس صاحب ندوہ سرائے، جمیل بھائی جونپوری، انیس بھائی الہ آبادی، داروغہ مشتاق احمد صاحب کلھاپوری اور بہت سے دوسرے حضرات! کچھ مرحوم ہو چکے، کچھ کمر باندھے تیار بیٹھے ہیں۔ کچھ سلامت باکرامت ہیں۔ مولانا عبد الرحمٰن صاحب جامیؒ کا مفصل تذکرہ میں نے لکھا ہے، جو ''ذکر جامی'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اس میں دو تین بزرگوں کا اختصار سے ذکر کیا ہے۔ (قاری صاحب پر تفصیلی مضمون اس مضمون کے اختتام پر ملاحظہ فرمائیں)

انھیں بزرگوں میں، جن سے میں بہت متاثر ہوا۔ اور ان کی عظمت کو دل نے بے تکلف قبول کیا، ایک بزرگ حضرت مولانا محمد فاروق صاحب تھے، اتراؤں ضلع الہ آباد کے رہنے والے، بھاری بھرکم اور بہت ٹھوس بدن، رنگ سانولا، داڑھی سفید، ہاتھ میں موٹا سا عصا۔ رفتار میں قوت بھی اور تواضع بھی، نگاہیں۔ نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو، سر چھوٹا مگر حافظہ کی قوت بے نظیر، علوم کا ایک خزانہ! فضل وکمال میں بلند مرتبہ، مگر ملتے تو ساری بڑائیاں خاکساری کی چادر میں اس طرح سمیٹ دیتے کہ ملنے والے کو احساس بھی نہ ہوتا کہ اس خاک کے پردے میں کیا کیا جلوہ گری ہے۔

مجھے یاد نہیں ہے کہ میری پہلی ملاقات کب اور کس ماحول میں ہوئی! ہاں اتنا یاد ہے کہ جب

ان کی آمد خانقاہ میں ہوئی تو ہر طرف چرچا ہوا، مولوی فاروق صاحب آئے، یہ چرچا محبت کے ساتھ تھا، خوشی کے ساتھ تھا، جو دلچسپی اور دلی لگاؤ کا ترجمان تھا۔ میں بھی ملا، مگر وہی خاکساری کی چادر حائل رہی۔ مگر پھر بار بار ان کا آنا ہوتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ خانقاہ کے سب چھوٹے بڑے ان سے محبت رکھتے ہیں۔ ان کا احترام کرتے ہیں، میں بھی کچھ دیر ان کی خدمت میں بیٹھنے لگا، ان کی باتیں سننے لگا، مجھے محسوس ہوا کہ سادگی کے پیکر میں ذہانت وذکاوت، استحضار وقوت حفظ اور علم ومعلومات کا یہ ایک گنجینہ ہیں۔ میں بہ نیت استفادہ ان کی گفتگو سنتا، اور علم میں اضافہ ہوتا۔ ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ ان کا مطالعہ وسیع بھی ہے اور عمیق بھی! لیکن اس وسعت کے دائرے میں کوئی کتاب تیسرے درجے کی نہیں، وہ ہمیشہ معتبر اور بلند پایہ اصحابِ تصنیف کی کتابیں اپنے مطالعہ میں رکھتے، دوسرے درجہ کی بھی شاذ ونادر ہی کوئی کتاب ان کے حریمِ مطالعہ میں بار پاتی ہے، اور گہرائی کا یہ حال تھا کہ ہر بات کی تہ میں اتر جاتے، اور اس کی ہر تہ کے آثار ومضمرات کو اپنی گرفت میں لے لیتے، اس لئے ان کی ہلکی پھلکی گفتگو بھی عالمانہ ہوتی۔ پھر میں دیر دیر تک ان کی خدمت میں بیٹھنے لگا۔ اور وہ اپنے نطق وتکلم سے معلومات میں اضافہ اور دل میں جلا پیدا کرتے رہے۔

میں ان سامنے طفل مکتب تھا، علم وذہانت سے نہ اس وقت بہرہ ور تھا اور نہ اب تک اس کی بو پاسکا ہوں، لیکن ان کی گفتگو میں کبھی ان سے اختلاف بھی کر لیتا، بڑے غضب کا حوصلہ تھا ان کا! بہت غور سے اختلاف کو سنتے، پورے اطمینان سے اس کو سمجھتے، اگر اس میں واقعیت ہوتی، تو بے تکلف قبول کرتے، ان کے مرتبہ کی بلندی قبول حق سے کبھی مانع نہ ہوتی، اور اگر وہ محسوس کرتے کہ اختلاف کرنے والے کی فہم کا قصور ہے، تو بڑے اچھے انداز میں سمجھاتے، ایسا انداز، جس میں نہ مخاطب کی تحقیر ہوتی، نہ اس کی بدفہمی یا قصور فہم کی شکایت ہوتی، نہ اس میں جوش واشتعال ہوتا، نہ الزامی جواب کی ضرب ہوتی، ہلکے ہلکے بولتے اور دلائل کے موتی بکھیرتے اور بالآخر مخاطب کو مطمئن کر دیتے۔

مولانا کا شمار ان علمائے راسخین فی العلم میں ہے، جو کھرے کھوٹے کی پرکھ بخوبی رکھتے ہیں، جو کسی نظریے یا کسی شخص کی شہرت عام سے متاثر نہیں ہوتے، جب تک کہ تاثر کیلئے دلیل وبُرہان کی روشنی نہ ہو، نہ کسی حُبِّ مال وجاہ کے دباؤ میں وہ غلط کو صحیح کہہ سکتے تھے نہ کسی عمل کی صرف ظاہری افادیت کو دیکھ کر، یا اس لئے کہ بہت سے لوگ اس میں شامل ہیں، اسے قبول کرتے، بلکہ وہ یہ

دیکھتے کہ قرآن وسنت سے، یا قرآن سے مُستَنبَط اصول وقواعد صحیحہ سے، یا ائمہ وفقہاء کی تصریحات سے اس کا ثبوت ملتا ہے یا نہیں، اور اگر ملتا ہے تو اس عمل کا کیا درجہ ہے؟ ان سب باتوں پر وہ بہت گہری نگاہ رکھتے تھے، اسی لئے ہمارے دور میں جو دین وشریعت کے نام پر بھانت بھانت کی ٹولیاں بن رہی ہیں، مختلف نظریے ایجاد ہو رہے ہیں، اور ہر ٹولی اور ہر نظریہ اپنی پُشت پر وقت کی مصلحتوں اور زمانے کے تقاضوں کا ایک انبار رکھتا ہے، ظاہری نظر والے اس سے متاثر بھی ہوتے ہیں، مگر مولانا محمد فاروق صاحب ان کو شریعت اور اصولِ شریعت کے معیار پر پرکھتے تھے، اگر اس پر کوئی نظریہ وعمل پورا اترتا تو اعتراف میں بُخل نہیں کرتے تھے، اور اگر پورا نہیں اترتا تو اس کا شرعی حکم بلاخوفِ ملامت گراں، ظاہر کر دیتے تھے، اس سلسلے میں بعض اوقات انھیں بہت سی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑتا مگر جو کچھ انھوں نے حق جانا، اس کے اظہار میں کسی فرد یا کسی جماعت کا خوف نہیں کھایا۔

تبلیغی جماعت کے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں انھوں نے مفصل گفتگو کی، اور جو کچھ ان کی نگاہ میں حق تھا۔ اسے واضح کر دیا۔ گو کہ اس کے باعث وہ بہت سے عوام وخواص کا نشانۂ ملامت

---

(۱) حضرات صحابۂ کرام کا اپنے کو منافق فرمانا محض اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے تھا، کہ باوجود ایمان وعمل کے اپنے آپ کو قصوروار ہی سمجھتے تھے، چنانچہ ہر زمانہ میں صالحین کا یہی شعار رہا ہے کہ انھوں نے طاعت پر نظر نہیں کی، بلکہ ہمیشہ اپنے آپ کو وظائفِ عبودیت کی ادائیگی میں قاصر ہی سمجھا۔

عاصیاں از گناہ توبہ کنند　　　　عارفاں از عبادت استغفار

ابن ابی ملیکہ فرماتے ہیں کہ میں نے تیس صحابہ کرام کو پایا ہے، کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اوپر نفاق کا اندیشہ کرتا تھا۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ جو نفاق سے نہ ڈرتا ہو وہ منافق ہے۔ مشائخ نے فرمایا ہے کہ لایخافه إلا مومن ولا یامنه إلا منافق، یعنی نفاق سے مومن ہی ڈرتا ہے، اور اس سے مطمئن منافق ہی رہتا ہے۔ ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ عجب بات ہے کہ مومن منافق نہیں ہوتا، مگر نفاق کا اپنے اوپر اندیشہ کرتا ہے، اور منافق کے اندر نفاق بھرا رہتا ہے مگر اس کو اپنے متعلق اس کا کبھی خیال بھی نہیں ہوتا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ دوزخ میں منافق کو جانا ہے، مگر دنیا میں اس سے مومن ڈرتا ہے اور منافق کو کبھی بھول کر بھی دوزخ یاد نہیں آتی۔

بنے، مگر کوئی اندیشہ وہ خاطر میں نہ لائے، افسوس کہ علماء نے ان کے اس فتویٰ پر اثباتاً یا نفیاً کوئی توجہ نہ دی، اگر ان کی گفتگو حق ہے، تو اسے قبول کرنا چاہئے، اور اگر اس میں کوئی غلطی ہے، تو اسے واضح کرنا چاہئے۔ مولانا محمد فاروق صاحب بہت وسیع القلب انسان تھے، اگر دلائل سے ان کی غلطی واضح کی جاتی، تو اسے وہ بے تکلف قبول کر لیتے۔ بلکہ وہ اس کے منتظر رہا کرتے تھے، بات کی پچ جانتے ہی نہ تھے، ان کا فتویٰ آج بھی اہل علم کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔

مولانا محمد فاروق صاحب نے ۱۳۶۵ھ میں جامعہ مظاہر علوم سہارنپور میں تعلیم کی تکمیل کی تھی، ابتدائی اور متوسطات تک کی تعلیم الہ آباد میں حاصل کی تھی۔ حکیم الامت حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے خاص معتقد تھے، طالب علمی کے زمانے میں تھانہ بھون حضرتؒ کی خدمت میں حاضری بھی دی تھی، فراغت کے بعد حضرت تھانویؒ کے خلیفۂ اول حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادیؒ کا دامن تھاما، پھر ان کے وصال کے بعد کسی شیخِ کامل کی تلاش ہوئی تو طلب وجستجو نے مصلح الامت، عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں فتح پور پہونچایا، یہاں اپنی سلامتی طبع، اعتقادِ کامل اور رزانتِ عقل کی وجہ سے بہت جلد حضرت کی خدمت میں رُسوخ حاصل کرلیا، حضرت کو ان پر بہت اعتماد ہو گیا تھا۔ اہم امور میں حضرت ان سے مشورہ بھی لیتے تھے۔ وہ حضرت کے مزاج شناس تھے، حضرت کی منشا پہچان کر اس کے مطابق کام کرتے تھے۔

حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب جامیؒ جو حضرت مصلح الامت کے کاتب خاص تھے، اور حضرت کے علوم ومعارف کے امین اور ان کے مرتب اور شارح وترجمان تھے، سناتے ہیں کہ حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کی وفات کے بعد جو صاحب خانقاہ تھانہ بھون میں تعلیم وغیرہ کے ذمہ دار تھے، ان کی موجودگی میں کچھ انتشار کی کیفیت وہاں ہوئی، اور انھیں وہاں سے علیٰحدہ ہونا پڑا تو حضرت کے بھتیجے مولانا شبیر علی صاحب جو حضرت کی حیات میں مدرسہ اور خانقاہ کے منتظم رہ چکے تھے، اور اب کراچی منتقل ہو گئے تھے، انھوں نے لکھا کہ کسی معتمد اور مناسب آدمی کو وہاں مقرر کیا جائے، بہت سے لوگوں کی نگاہ حضرت مصلح الامت پر پڑی، اور ان سے وہ جگہ سنبھالنے کی درخواست کی گئی، حضرت نے تو معذرت کردی، البتہ لوگوں کی فرمائش پر اپنے معتمد خاص مولانا محمد فاروق صاحب کو تھانہ بھون بھیج دیا، بھیجتے وقت ان سے فرمایا کہ:

تم کو دو نصیحتیں کرتا ہوں، ان کا برابر خیال رکھنا، ایک تو یہ کہ وہ ہمارے شیخ کی جگہ ہے، وہاں ادب کے ساتھ رہنا، وہ جگہ پلکوں سے جھاڑو دینے کی ہے، دوسرے یہ کہ وہاں کسی سے نزاع مت کرنا، اور اختلاف نہ کرنا، لوگ موافق رہیں تو اخلاق کے ساتھ رہنا، اور کسی رویہ سے مخالفت کا اندازہ ہو تو خاموشی سے چلے آنا۔

چنانچہ مولانا محمد فاروق صاحب اسی طریقہ کار پر ثابت قدم رہے، اور بڑی مقبولیت حاصل کی، مگر کچھ دنوں کے بعد انھیں اندازہ ہوا کہ بات کچھ بگڑنے کا اندیشہ ہے، تو خاموشی سے چلے آئے، اور حضرت سے پوری صورتِ حال ذکر کر دی، حضرت نے اسے پسند کیا۔

مولانا محمد فاروق صاحب کو اپنے تلامذہ اور متعلقین کی تربیت کا بڑا ملکہ تھا۔ وہ بہت شفیق و مہربان تھے، ان کے طلبہ ان کی محبت میں اور ان کے رنگ میں اتنے پختہ ہوتے ہیں کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے، اپنے علاقہ اور گاؤں میں رہ کر انھوں نے جس محبت اور دلسوزی سے لوگوں کی تربیت کی ہے، اس کا اثر یہ ہے کہ اتراؤں کے لوگ نہایت مہذب اور شائستہ ہیں، علماء کے بڑے قدردان، ان کے سامنے ادب و تواضع کا بہترین ملکہ رکھتے ہیں، مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامی علیہ الرحمہ کی شہادت یہاں نقل کرتا چلوں، حضرت مصلح الامت قدس سرہٗ کے حالات کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

حضرت والا سے تعلق کے بعد ہی سے عموماً اور بالخصوص حضرت اقدسؒ کے الہ آباد میں قیام فرمانے کے بعد سے مولانا محمد فاروق صاحب کا جذبۂ اخلاص بھی ترقی کرتا رہا اور اسی کے بعد حضرت اقدس کے ساتھ ان کا تعلق بھی بڑھتا گیا، چنانچہ حضرت والا کبھی کبھی مولوی فاروق صاحب کے تعلق کے لحاظ سے اتراؤں بھی تشریف لے جانے لگے، کبھی خود مولوی فاروق صاحب بھی درخواست کرتے اور ہمراہ ہو جاتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حضرت اٹھتے اور مولوی عبدالمجید صاحب یا کسی اور کا ہاتھ پکڑتے اور فرماتے چلو اتراؤں چلیں، غرض حضرت اقدس کے اس طرح اچانک پہونچ جانے سے وہاں عید ہو جانے کا منظر مولوی صاحب اکثر بیان کرتے تھے، چونکہ یہاں کے عوام بھی مولوی صاحب کے تربیت یافتہ تھے اور طلبہ تو ماشاء اللہ بہت ہی مہذب اور فہیم تھے، اسلئے حضرت کو یہاں بہت آرام ملتا، پھر ماشاء اللہ ان سب پر مولوی صاحب کا حسن انتظام،

جسے مولوی صاحب موصوف نے حضرت تھانویؒ کے حالات وملفوظات اور خود اپنے حضرت کی تربیت سے سیکھا تھا، یہ اور حضرت کیلئے راحت رساں ثابت ہوتے، چنانچہ جانے کو تو حضرت متعدد جگہ تشریف لے گئے لیکن الہ آباد سے کہیں باہر جانے کا مقصد یہیں حاصل ہوتا تھا، اسی بنا پر کبھی کبھی یہ فرمادیا کرتے تھے کہ:

مولوی فاروق! میں نے الہ آباد میں گھر لے لیا ہے، اگر کہیں دیہات میں رہنے کا ارادہ ہوا تو یہیں اتراؤں میں گھر بنواؤں گا۔

غرض یہاں دیہات کے سکون کے علاوہ طلبہ کا مجمع اور متشرع صورت انسانوں کا اجتماع، مولوی فاروق صاحب کا حسنِ نظم، لوگوں کا ایثار، ان ساری چیزوں نے اس بستی کے قیام کو موزوں وراحت رساں بنادیا تھا۔ (حالات مصلح الامت ج:۲ص:۳۷۲)

ایک بار دار العلوم دیو بند کے مہتمم حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے حضرت مصلح الامت قدس سرہٗ سے ملاقات کرنی چاہی، تو حضرت نے ملاقات کا انتظام اتراؤں میں کیا، تاکہ الہ آباد کی بھیڑ بھاڑ سے الگ یکسوئی سے ملاقات ہوسکے، چنانچہ مولانا محمد فاروق صاحبؒ کے یہاں وہ تشریف لائے، اور وہاں کے حسنِ انتظام سے بہت متاثر ہوئے۔

اتراؤں اور آس پاس کی آبادیاں زیادہ تر اہلِ بدعت پر مشتمل ہیں۔ وہ بڑے سخت قسم کے اہلِ بدعت تھے۔ مولانا محمد فاروق صاحب نے انھیں کے درمیان رہ کر کام کیا، مناظرے کئے، تبلیغی دورے کئے، وعظ وتقریر کے ذریعے لوگوں کو بیدار کیا، بدعت سے دور اور سنت کے قریب کرنے کی انتھک جدوجہد کی اور بحمد اللہ اس میں کامیاب رہے، وہ اس علاقہ کے معتمد علیہ عالم تھے، انھوں نے اپنے دائرہ کو زیادہ وسیع نہیں کیا، ایک حلقے میں رہ کر کام کیا اور پُختہ کام کیا۔

الہ آباد میں سنا کرتے تھے کہ سید آباد اسٹیشن پر اگر کوئی مولوی یا مولوی صورت آدمی ٹرین سے اترتا ہے، تو فوراً کئی آدمی لپکے ہوئے آتے ہیں، اس کا استقبال کرتے ہیں، اگر اسے اتراؤں جانا ہوتا ہے تو اس کا انتظام کرتے ہیں یا اور کہیں جانا ہو تو اس کی مدد کرتے ہیں، ایک مرتبہ خانقاہِ وصی اللّٰہی کے کئی افراد نے جن میں حقیر بھی شامل تھا، اور سالارِ قافلہ مولانا عبد الرحمٰن صاحب جامی تھے، اچانک اتراؤں چلنے کا پروگرام بنایا، مولانا محمد فاروق صاحب کو کوئی ذریعہ نہ ہونے کی وجہ سے اطلاع نہ کرسکے، الہ آباد

سے ٹرین پر سوار ہوئی، اور جونہی سید آباد اسٹیشن پر ٹرین رُکی، ابھی ہم لوگ پلیٹ فارم پر قدم رکھ ہی رہے تھے کہ کئی لوگوں نے آ کر گھیر لیا، سامان ہاتھوں سے لے لیا۔ جامی صاحب کو تو یہ لوگ پہچانتے تھے، باقی اور کسی سے سناشائی نہ تھی، وضع قطع پر دینداری کے آثار بھی نہ تھے، مگر اس طرح بچھے جاتے تھے، جیسے انھیں کوئی نعمتِ غیر مترقبہ ہاتھ آ گئی ہو۔ ایک شیڈ کی چھت والی عمارت میں ٹھہرایا، جس میں سائیکلیں رکھی ہوئی تھیں، گرمی کا موسم تھا، چند ایک نے پنکھے جھلنے شروع کیے، پیاس لگی تھی، پانی پلایا، معلوم ہوا کہ یہ لوگ اتراؤں ہی کے ہیں۔ اسٹیشن پر سائیکل اسٹینڈ بنائے ہوئے ہیں۔ اطراف سے لوگ اسٹیشن پر سائیکلوں سے آتے ہیں اور سائیکل جمع کر دیتے ہیں، پھر ٹرین سے یا بس سے جہاں جانا ہوتا ہے چلے جاتے ہیں۔ پھر لوٹتے وقت واپس لے لیتے ہیں، اور کچھ رقم کرائے کی ادا کرتے ہیں، انھوں نے ہم لوگوں کے لئے یکّے کا انتظام کیا اور ہم لوگ آرام سے اتراؤں پہونچ گئے، وہاں لوگوں کے ملنے کا انداز سراپا ادب وتواضع کا تھا۔ مہمان کی راحت کا ہر انتظام تھا۔ مہمان کی مرضی اور راحت کے مطابق وہ خود کو ڈھالتے، مہمان کو اپنی مرضی پر بالکل نہ چلاتے، بہت جی لگا وہاں پر!

ان کی محنت اور کام کی برکت کا اندازہ کرنا ہو تو مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامیؒ کا بیان پڑھئے، جسے انھوں نے حالاتِ مصلح الامت کی تیسری جلد میں ص: ۷ پر مولانا محمد فاروق صاحب کے ہی حوالے سے تحریر فرمایا ہے، یہ اس وقت کی بات ہے جب مولانا محمد فاروق صاحب تھانہ بھون سے واپس آ چکے تھے، اور اب وہاں جانے کا ارادہ نہ تھا۔ مولانا جامی صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

> مکرمی مولوی فاروق صاحب بیان کرتے تھے کہ دوسری بار جب میں تھانہ بھون سے واپس آیا اور پھر حضرت کے پاس فتح پور حاضر ہوا تو حسن اتفاق سے انھیں دنوں میں سید ظہور الحسن صاحب کسولوی بھی تشریف لائے تھے، انھوں نے میرے متعلق حضرت سے کچھ کہا ہوگا، اور شاید یہ بھی خواہش ظاہر فرمائی کہ فاروق کی وہاں ضرورت ہے، ان سے وہاں کے لوگ خوش اور مطمئن ہیں، لوگوں کو نفع ہو رہا تھا، یہ تو معلوم نہیں کہ حضرت والا نے ان کو کیا جواب دیا، بہر حال میرا عندیہ چونکہ حضرت کو معلوم ہو چکا تھا، اسلئے حضرت نے اپنی خداداد بصیرت سے یہ سوچا کہ ایسی کوئی صورت پیدا ہو جائے کہ مجھے انکار نہ کرنا پڑے، بلکہ مولوی ظہور الحسن صاحب خود ہی

مولوی فاروق کو وہاں لے جانا مناسب نہ سمجھیں تو بہتر ہے، چنانچہ مولوی فاروق صاحب کو بلاکران سے فرمایا کہ تم مکان واپس جارہے ہو، مولوی ظہور صاحب کو بھی اپنے وطن الہ آباد لے جاؤ۔ پھر وہ ادھر ہی سے تھانہ بھون چلیں جائیں گے، میں نے اس وقت حضرت کے منشا کو قطعی نہیں سمجھا، لیکن حکم تھا، منظور کرلیا، اور مولوی صاحب موصوف سے اپنی جانب سے عرض کیا کہ واپسی پر غریب خانہ الہ آباد تشریف لے چلیں، تو آپ کی عنایت ہوگی، اسی طرف سے تھانہ بھون چلے جایئے گا، انھوں نے سنتے ہی کان پر ہاتھ دھرا، ارے توبہ توبہ! حضرت کے یہاں سے پتّہ کٹواؤگے کیا؟ حضرت کیا خیال فرمائیں گے کہ اس طرف لوگ سیر کرنے آتے ہیں، اگر فرصت تھی تو وہ ایام یہیں کیوں نہ گزارے؟ مولوی صاحب نے کہا کہ حضرت والا سے اجازت لینا ہمارے ذمہ ہے، بس چلنے کے لئے تیار ہوجایئے۔ چنانچہ مولانا ظہور صاحب کو اپنے ہمراہ اتراؤں لے گیا، قُرب وجوار میں اطلاع کرادی، بہت سے لوگ ملنے کے لئے آئے، میں نے وعظ کی فرمائش کی۔ فرمایا ارے میں وعظ کہاں کہتا ہوں، میں نے کہا دو چار منٹ کچھ فرمادیجئے، باقی وقت میں کچھ کہہ دوں گا، چنانچہ مولانا نے وعظ فرمایا، اور اچھا وعظ کہا، اور مجھ سے فرمایا ماشاءاللہ یہاں تو آپ نے بڑا ہی اچھا ماحول پیدا کررکھا ہے، پہلے میرا یہی خیال تھا کہ باصرار آپ کو تھانہ بھون بلاؤں گا، لیکن یہاں کا کام دیکھ کر اب آپ کو تکلیف دینا ظلم ہے اور ایک جگہ کو اجاڑ کر دوسری جگہ آباد کرنے کے مرادف ہے، آپ کو یہیں کام کرنا چاہئے، اور اتنا کام جو یہاں دیکھ رہا ہوں، شاید وہاں برسوں کے بعد بھی نہ ہوسکے۔

اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ حضرت اقدسؒ نے کیوں مولوی صاحب موصوف کو الہ آباد لواجانے کیلئے فرمایا تھا۔ اس واقعہ سے ناظرین کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ حضرت کو کس درجہ مولوی محمد فاروق صاحب پر اعتماد تھا، اور حضرت ان سے کس قدر مطمئن تھے۔ (حالات مصلح الامت ج:۳ص:۷)

حضرت مولانا محمد فاروق صاحب علم ومطالعہ کے بڑے شیدائی تھے، جو بھی اچھی اور معیاری

کتاب ملتی، از اول تا آخر غور سے پڑھتے، اس سلسلے میں انھیں محققین کی کتابوں سے زیادہ لگاؤ تھا۔ مالی حالت بہت بہتر نہ تھی، اسلئے بیش قیمت کتابیں خرید نہیں سکتے تھے، تو اس کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ جن کتابوں کا ہونا اپنے پاس وہ ضروری سمجھتے تھے، انھیں محنت کر کے پوری نقل کر لیتے تھے۔ امام شاطبی کی ''الاعتصام'' کی انھیں بڑی ضرورت تھی، اس وقت یہ کتاب عام نہیں ہوئی تھی۔ اس کی دو جلدیں ہیں، اور ہر جلد متوسط ضخامت کی ہے۔ ایک صاحب کے یہاں سے مطالعہ کیلئے عاریۃً مانگ کر لائے، اور وقت کچھ زیادہ متعین کرالیا، اور اسی فرصت میں اول سے آخر تک پوری کتاب نقل کر لی۔ مولانا کا خط بڑا پاکیزہ تھا، اور بڑا کمال یہ تھا کہ ان سے کتابت کی غلطی بالکل نہیں ہوتی تھی، کسی مشغولیت میں ہوں، حالات چاہے کتنا ہی خیال و دماغ کو منتشر کر رہے ہوں، مگر قلم ہاتھ میں لے لیتے تو بالکل یکسوئی ہو جاتی، اور بے تکلف لکھتے چلے جاتے، میں نے کئی ضخیم کتابیں ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی ہیں۔ بہت صحیح اور صاف تحریر! دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، طاش کبریٰ زادہ کی ضخیم کتاب جو کئی جلدوں میں ہے، ''مفتاح دار السعادہ'' اس کا مکمل ترجمہ کر کے خوش خط لکھ رکھا ہے۔

ان کی محنت اور استقامت قابلِ رشک ہے، اور حافظہ کی قوت کا یہ حال تھا کہ کتابوں کی عبارتوں کی عبارتیں ازبر تھیں، اور اس طرح بے تکان سناتے کہ کہیں تشابہ اور التباس کی نوبت نہ آتی۔ الہ آباد میں ایک صاحب بہت علم دوست تھے، ڈاکٹر اشتیاق احمد صاحب مرحوم، ان کے یہاں جمعہ کے روز شہر کے بعض اہل علم حضرات جمع ہوتے تھے، اور کسی علمی موضوع پر گفتگو ہوتی تھی، یہ بندہ بھی اس میں شرکت کرتا تھا، مولانا الہ آباد تشریف لاتے اور جمعہ کا دن ہوتا تو ڈاکٹر صاحب ان کو بھی دعوت دیتے، ایسے ہی ایک جمعہ کو کسی موضوع پر بات ہو رہی تھی، مولانا نے اپنی گفتگو کے لئے امام غزالیؒ کی ''احیاء علوم الدین'' کا حوالہ دیا اور ساتھ ساتھ اس کی عبارت پڑھنی شروع کی، اور پڑھتے چلے گئے۔ میرا اندازہ ہے کہ کم و بیش ایک صفحہ کی عبارت پڑھی اور پھر اس کی توضیح و تشریح کرنے لگے، میں ان کے حافظے کی قوت پر سخت حیرت زدہ ہوا۔

۱۹۸۰ء میں مرادآباد، میرٹھ، علی گڈھ اور الہ آباد میں بھیانک فساد ہوا۔ الہ آباد کی خانقاہ بھی اس سے متاثر ہوئی۔ جب ذرا سکون ہوا اور حالات درست ہوئے تو گو کہ امن ہو گیا تھا، مگر طبیعتیں بہت افسردہ اور شکستہ تھیں، مسلمانوں پر ایک طرح کا ہراس چھایا ہوا تھا۔ انھیں دنوں مولانا محمد فاروق صاحب

خانقاہ میں تشریف لائے، حضرت مولانا قاری شاہ محمد مبین صاحب کی مجلس ہو رہی تھی، مجلس ختم ہوئی تو قاری صاحب نے مولانا سے فرمایا کہ کچھ بیان فرما دیجئے، مولانا نے سورہ قصص کا پہلا رکوع پڑھا، جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور فرعون کے مظالم اور پھر موسیٰ علیہ السلام کی اسی کے محل میں پرورش کا تذکرہ ہے، پھر اس کی تشریح کرنے لگے، تسلی اور تقویت کا مضمون بیان فرما رہے تھے، اسی دوران انھوں نے مثنوی مولانا رومؒ کا کوئی شعر پڑھا، ایک شعر پڑھنا تھا کہ ان کے سامنے گویا مثنوی شریف کے تمام دفتر کھل گئے، پھر اسی مضمون کے اتنے اشعار انھوں نے پڑھے اور ان کی تشریح کی کہ سارا مجمع ششدر رہ گیا، اور دلوں میں ایمان تازہ ہو گیا۔

قاری صاحب نے اس تقریر کے خاتمہ پر فرمایا کہ کیا معلوم تھا کہ آج مولانا روم تشریف لائے ہیں، ورنہ ٹیپ ریکارڈ لگا دیا ہوتا، اب درمیان مجلس میں اس کا موقع نہ تھا۔

اس علمی بلندی اور کمال کے باوجود ملاحظہ فرمایئے کہ انھوں نے کبھی ایک منٹ کے لئے بڑائی اور شہرت کی طلب نہیں کی، زندگی اتراؤں جیسے گاؤں میں گزار دی، مگر ماشاء اللہ بہت کام کر گئے۔ وہ نہایت متواضع تھے، انھوں نے کبھی اپنی کوئی حیثیت نہیں سمجھی، کوئی علمی بات اپنے کسی بہت چھوٹے سے بھی سنتے، تو اس طرح سنتے جیسے یہ ان کو معلوم نہ رہی ہو، اور آج ان کی معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے۔

لیکن تواضع و خاکساری کے ساتھ غیرتِ حق کا مادہ بھی ان میں خوب تھا۔ کوئی ایسا طریقہ، کوئی ایسا فرقہ، کوئی ایسا نظریہ جو شریعتِ حقہ سے ٹکراتا ہو، یا شریعت کی کسی تعلیم کو مسخ کرتا ہو، یا اس سے شریعت کے تحفظ میں فرق پڑتا ہو، اسے ان کی غیرت گوارا نہیں کر سکتی تھی، اس باب میں وہ کسی مداہنت اور نرمی کے روادار نہ تھے، بریلویت اور رافضیت سے تو ان کا براہ راست مقابلہ تھا۔ اس موضوع پر ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا، ان کا ذہن بہت مرتب تھا۔ وہ دلائل کو بہت سلیقے سے منطقی انداز پر مرتب کرتے تھے، اور اپنے مخاطب سے بھی اسی کا مطالبہ کرتے تھے۔ وہ دلائل و شواہد، آثار و ثمرات اور نظائر کے فرق کو اچھی طرح سمجھتے تھے، اس لئے کوئی چلتی ہوئی بات کہہ کر ان کے سامنے پیش نہیں پا سکتا تھا۔

مولانا اپنے شیخ کے اور ان کے حکم کے بہت وفادار تھے، شیخ سے وفاداری تو کوئی خاص مشکل کام نہیں ہے، اگر مناسبت اور عقیدت ہے، تو وہ خود آدابِ وفاداری کا پابند رکھتی ہے، لیکن شیخ کی وفات کے بعد شیخ کے متعلقین و منتسبین سے چونکہ معاصرت کا تعلق ہوتا ہے، اور معاصرت کے نشیب و فراز ظاہر

ہے کہ آدمی کی رفتار کو اعتدال پر رہنے نہیں دیتے، ایسے وقت میں اپنے توازن اور اعتدال کو باقی رکھنا ایک دشوار کام ہے، بکثرت دیکھا گیا ہے کہ کسی بڑے کے دنیا سے گزر جانے کے بعد انھیں سے تعلق رکھنے والے کتنے لوگ کسی عنوان سے اور کسی غرض کو لے کر یا بجا طور پر سہی ان کے خاندان سے دوری اور انحراف اختیار کر لیتے ہیں۔

مولانا محمد فاروق صاحب نے اپنے شیخ و مرشد کے ہر حکم بلکہ ہر منشا کی تعمیل ان کی زندگی میں بھی کی اور ان کی وفات کے بعد بھی! حضرت مصلح الامتؒ کے بعد ان کی خانقاہ اور مدرسہ کا انتظام وانصرام ان کے خلیفہ اور داماد حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب دامت برکاتہم کے ذمہ آیا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے حضرت نے اپنی زندگی میں یہ انتظام فرما دیا تھا اور اپنے خاص خاص لوگوں کو اس کی اطلاع بھی کر دی تھی، اور ان کو ہدایت بھی دی تھی کہ قاری صاحب کی موافقت کریں گے۔

حضرت کی وفات کے بعد جیسا کہ عام دستور ہے کہ بڑے لوگوں کے گزر جانے کے بعد ان کے پسماندگان کے درمیان شیطان کبھی نزاع ڈال دیتا ہے، یہاں بھی کچھ دراڑ پڑی، اور متعدد حضرات قاری صاحب سے الگ ہو گئے، اور انھوں نے اپنی مستقل حیثیت بنالی، لیکن حضرت کے تربیت یافتہ بکثرت حضرات قاری صاحب سے وہی تعلق رکھتے رہے جو حضرت کی منشا تھی، ان میں بہت نمایاں چند حضرات تھے، خاص طور سے مولانا محمد فاروق صاحب نے اسے خوب نبھایا، پوری زندگی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں بنائی، قاری صاحب کے دامن فیض سے وابستہ رہے، اپنے طالب علموں کو تعلیم کے لئے قاری صاحب کے مدرسے میں بھیجتے کوئی بیعت وارادت کی درخواست کرتا، تو اسے حضرت قاری صاحب کی خدمت میں بھیج دیتے، نرم و گرم اوقات آتے رہے، مخالف ہوائیں چلتی رہیں، لوگ ٹوٹتے رہے، مگر مولانا محمد فاروق صاحب نے وفاداری کی جس زمین پر قدم جمایا تھا، کوئی آندھی انھیں ہلا نہ سکی، غلطی کس سے نہیں ہوتی، اور کس سے نہیں ہوسکتی، اپنے شیخ کے اہل تعلق سے بھی ہوسکتی ہے، اور ہوتی رہتی ہے، لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ شیخ کے واسطے سے جو محبت ان سے استوار ہوئی تھی وہ ختم ہو جائے، آخر شیخ کی محبت تو اب بھی باقی ہے، پھر اسی محبت کی سرزمین پر محبتوں کے اور جو پودے اُگے تھے، وہ سوکھ کیوں جائیں، محبت کی وہ زمین تو اب بھی موجود ہے، اپنی اور اپنی اولاد کی غلطی قابل درگزر ہوسکتی ہے، تو کیا اپنے مرکز محبت کی شاخوں میں کچھ غلطی اگر واقعی بھی دکھائی دے تو وہ لائق عفو و درگزر نہ ہوگی۔

یہ نکتہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، تو آدمی اعتدال سے ہٹ کر افراط وتفریط میں پڑ جاتا ہے۔ مولانا محمد فاروق صاحب ان نکتوں سے خوب واقف تھے، اور صرف واقف ہی نہ تھے، انھیں برتنا بھی خوب جانتے تھے۔ انشاء اللہ وہ اپنے شیخ کے حضور سرخرو ہوں گے، اور ان کے اخلاص اور حسن معرفت کا صلہ بارگاہِ الٰہی سے ملے گا۔

مولانا کی صحت ہمیشہ اچھی رہی، آخر میں شوگر کے مریض ہو گئے تھے، مگر ماشاء اللہ مشاغل ومعمولات میں کوئی فرق نہ تھا، البتہ جسم سے اضمحلال محسوس ہوتا تھا، وفات سے دو چار روز پہلے بخار رہنے لگا تھا، مگر بظاہر تشویش کی کوئی بات نہ تھی، ۱۴؍صفر ۱۴۲۱ھ کو شب میں ساڑھے بارہ بجے جان جانِ آفریں کے سپرد کی، زندگی کی اَسّی منزلیں یہ بوڑھا مسافر طے کر چکا تھا، اب تھک گیا تھا اسے نیند آ گئی، اسے خاکساری پسند تھی، زندگی بھر اسی کی مشق کی تھی، مٹی کا چھوٹا سا مکان بنا، مٹی کا بستر بچھا، مٹی کی چادر اوڑھی اور قیامت کی نیند سو گیا۔ اللہ تعالیٰ اس خاکی مکان پر اور اس کے خاکسار مکین پر اپنی رحمت کا سایہ کرے، اس کی مغفرت کرے، اس کے درجات کو بلند فرمائے، آمین

☆☆☆☆☆☆☆

(۱) حضرت قاری صاحب کی وفات ۶؍محرم ۱۴۲۲ھ مطابق یکم؍اپریل ۲۰۰۱ء کو ہوئی، اس موقع پر میں نے ماہنامہ ضیاء الاسلام میں ایک مفصل مضمون ان پر لکھا تھا وہ پیش ہے:

۲۲؍۲۳ سال کی مدت گزری، یہ حقیر ان حروف کا لکھنے والا، الہ آباد میں عارف باللہ مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے مدرسہ وصیۃ العلوم میں مدرس تھا، اس بابرکت ادارہ میں، مدرسہ اور خانقاہ پہلو بہ پہلو ہیں، اساتذہ اسباق میں مشغول ہوتے، اور شیخ خانقاہ سالکین وذاکرین کی مجلس میں تشریف فرما ہوتے، جمعہ کے روز عام مجلس ہوتی، اس میں مدرسہ کے اساتذہ بھی ہوتے، طلبہ بھی ہوتے، تمام سالکین وذاکرین بھی ہوتے۔

ایک جمعہ کو ایسی ہی مجلس ہو رہی تھی، اس وقت میر مجلس حضرت مولانا عبد الرحمٰن جامیؒ تھے، جو حضرت شاہ صاحبؒ کے معتمد خاص اور کاتب تھے، ابھی مجلس شروع ہی ہوئی تھی کہ ایک بزرگ آتے ہوئے دکھائی دیئے، پُر نور وپُر جمال! اتنے پُر نور کہ پوری مجلس روشن ہو گئی، ہر شخص کی نگاہ بے اختیار ان کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئی، بہت وجیہ اور نورانی چہرہ، سر پر پنچ کلیا ٹوپی، سر اور داڑھی کے بال سفید برق، خود بھی گورے چٹے، لباس بھی اُجلا اور روشن۔ لانبا قد، سر سے پاؤں تک تواضع کا اثر چھایا ہوا، ایسا

چل رہے تھے جیسے فروتنی سے زمین میں گڑے جا رہے ہوں، اور جمال صورت کے ساتھ جمال سیرت کا نور اس طرح رچا ہوا تھا کہ بس نورٌ علیٰ نورٌ کے ٹھیک ٹھیک مصداق!

میں تو کچھ دیر تک ششدر ہو کر انھیں دیکھتا ہی رہا، لیکن مجلس شروع ہو چکی تھی، دریافت کرنے کا موقع نہ تھا، وہ بھی بہت ادب اور خشوع وخضوع سے نگاہیں جھکائے ہوئے ایک گوشے میں بیٹھ گئے، میری نگاہ بار بار ان پر اٹھ رہی تھی، کبھی دوران مجلس کسی بات پر مسکراتے تو دانتوں کی چمک سے دل روشن ہوتا ہوا معلوم ہوتا، پوری مجلس وہ سراپا ادب رہے، اور میں مسلسل استفہام رہا۔

مجلس ختم ہوئی، وہ بڑے وقار اور تواضع سے اٹھے اور جامی صاحب سے ملاقات کی، وہ مسکراتے ہوئے ملے، میں نے بھی اٹھ کر مصافحہ کیا، جامی صاحب نے ان کا تعارف کرایا، ''یہ قاری حبیب صاحب ہیں، کٹرہ میں رہتے ہیں'' میں سمجھ گیا، نام سن رکھا تھا، حضرتؒ کے خلفاء میں ان کا شمار ہے، یہ معلوم تھا، زیارت آج ہوئی، اور ایسی زیارت ہوئی کہ دل میں ان کے سراپا کے ساتھ ان کی محبت بھی رچ بس گئی۔

یہ پہلی ملاقات تھی، عرصہ ہو گیا مگر کل کی بات معلوم ہوتی ہے، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ حضرت قاری صاحب کو بھی مجھ سے انس ہو گیا ہے، وہ ہفتہ میں ایک بار خانقاہ میں ضرور تشریف لاتے، میں اہتمام کر کے ان سے ملتا تھا، اور وہ بھی پوچھتے رہتے تھے، اس وقت مجھ پر یکسوئی کا غلبہ تھا، بغیر کسی شدید ضرورت کے مدرسہ سے قدم باہر نکالنا مشکل کام تھا۔ لوگوں سے ملنے ملانے سے وحشت تھی، لیکن حضرت قاری صاحب سے ملاقات میں دیر ہوتی تو بار بار تقاضا پیدا ہوتا کہ ان سے ملنے جاؤں، مگر وحشت کا ایسا غلبہ تھا کہ یہ تقاضا دب دب جاتا تھا، لیکن انس اور محبت میں ہر ملاقات اضافہ کرتی رہی اور تقاضا بڑھتا گیا، خانقاہ شریف سے حضرت قاری صاحب کی قیام گاہ کافی فاصلہ پر تھی، اور اس پر طرّہ یہ کہ شہر کے سب سے زیادہ ہجوم والے حصے سے گزر کر جانا تھا، مگر ہمت کر لی، حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامیؒ تشریف لے جا رہے تھے، میں بھی ردیف بن گیا، ان کے ساتھ حاضری ہوئی، ان سے ملاقات کیا ہوئی کرم اور تواضع کی ایک نئی دنیا روشن ہو گئی۔

ہمارے وہ اکابر جنھوں نے بزرگوں کی صحبت میں رہ کر اپنے نفوس کا تزکیہ کرا لیا ہے۔ آج کی دنیا سے ان کا رنگ مختلف نظر آتا ہے، آج ہر طرف خودی اور خود پسندی کی لپک محسوس ہوتی ہے، آدمی دوسرے کی تعظیم کرنے سے پہلے اپنی عزت نفس کا تحفظ کر لیتا ہے، اسی لئے اکرام وتعظیم میں بے ساختگی اور بے تکلفی کی دل آویزی عموماً نہیں محسوس ہوتی، جس کو اللہ تعالیٰ عوام میں شہرت اور کسی اعتبار سے

قدرے عظمت عطا فرماتے ہیں، وہ اپنا ایک خاص مقام سمجھ کر اس سے نیچے اترنے کو اپنی ہتک محسوس کرتا ہے، لیکن بزرگوں کے صحبت یافتہ حضرات کو دیکھا ہے اور بارہا دیکھا ہے کہ انھیں اپنے نفس اور اپنی خودی کا جیسے احساس ہی نہیں ہے۔ وہ بے تکلف چھوٹے بن کر ملتے ہیں، ان کے دل کا حال یہی ہوتا ہے کہ وہ سب سے چھوٹے ہیں، وہ کسی شخص میں چھوٹائی نہیں دیکھتے، ان کے نزدیک خود ان کے نفس سے زیادہ ذلیل اور حقیر کوئی شے کائنات میں نہیں ہوتی، حضرت قاری صاحبؒ سے جب بھی ملا ہوں، ہر دفعہ یہی احساس ہوا کہ ان کے نزدیک ان کی اپنی ذات سے زیادہ اور کوئی حقیر و کمتر نہیں ہے، وہ تواضع اس لئے نہیں کرتے تھے کہ ملنے والے کی تالیف قلب ہو، بلکہ اس لئے کرتے تھے کہ ان کا یہی حال تھا، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے: وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا، (رحمٰن کے خاص بندے وہ ہیں جو زمین پر تواضع اور نرمی سے چلتے ہیں) حضرت قاری صاحبؒ اس تعلیم کی مجسم تصویر تھے، ان کی رفتار، ان کی گفتگو، ان کی آواز، ان کا دیکھنا، ان کا متوجہ ہونا، ہر ایک ادا هَوْنًا کی دلکش تصویر تھی۔

حضرت قاری صاحبؒ کی یہ صفت اس قدر دلکش اور دل آویز تھی کہ ان کی صحبت میں بیٹھنے والا بھی اس سے سرشار ہو جاتا تھا، ان کے متعدد متوسلین و تلامذہ کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ بھی تواضع کی اس صفت میں ان کے نقش قدم پر ہیں۔

میں حضرت قاری صاحبؒ کی خدمت میں تنہا بھی اور متعدد لوگوں کے ساتھ بھی اتنی مرتبہ حاضر ہوا ہوں کہ اس کی گنتی بتانی مشکل ہے، مگر کبھی یہ نہیں دیکھا کہ انھوں نے اپنی خودی کو مقدم رکھا ہو، وہ سب کچھ ہوتے ہوئے، اپنے کو ایسا پیش کرتے کہ ہم جیسے نادانوں کو آگے بڑھ کر بولنے اور اظہار علم کا حوصلہ مل جاتا، مجھے چونکہ بزرگوں کے حالات بالخصوص اکابر دیوبند کے سوانح و تذکار سے خاص مناسبت ہے اور قاری صاحب خود بزرگ تھے۔ اور بزرگوں کے حالات سے بہت دلچسپی رکھتے تھے، میں حاضر خدمت ہوتا، اور وہ آہستگی سے کسی بزرگ کا ذکر چھیڑ کر خاموش ہو جاتے، اور پھر یہ دراز نفس اپنے رہوار گفتگو کو ڈھیلا چھوڑ دیتا، پھر جتنی دیر تک باتیں چلتی رہتیں حضرت قاری صاحبؒ کی محویت قابل دید ہوتی مسکراتے، ہلکے انداز میں تائید فرماتے، خوش ہوتے خوشی کا اظہار فرماتے، میں چونکتا اور اپنی درازنفسی کی معذرت کرتا تو اسے خوبصورتی سے ٹال جاتے اور کوئی ذکر چھیڑ کر مجھے پھر آمادۂ گفتگو کر دیتے۔

میں الہ آباد میں رہا، پھر غازی پور آ گیا، غازی پور سے گورینی، گورینی سے شیخوپور، جگہیں بدلتی رہیں، مگر جو تعلق حضرت قاری صاحبؒ سے استوار ہوا تھا، اور ملاقات و زیارت کا جو سلسلہ قائم ہوا

تھا وہ بدستور برقرار رہا، بلکہ اس میں اضافہ ہوتا رہا میں الہ آباد کا سفر حضرت قاری صاحبؒ کی خدمت میں حاضری کے لئے کرتا رہا، اور جب مل کر واپس آتا تو دوبارہ ملاقات کا شوق لے کر آتا۔

شیخوپور آنے کے بعد جب حضرت قاری صاحبؒ کی خدمت میں حاضری ہوئی تو دیر تک مدرسہ کے احوال، گاؤں والوں کے احوال، اساتذہ کے احوال پوچھتے رہے، میں نے یہاں کے ابتدائی حالات، یہاں کی بے سروسامانی، اساتذہ کا صبر واستقلال، طلبہ کے مجاہدوں اور تکلیفوں کا ذکر کیا، راستے کی صعوبت، آسائش زندگی کے فقدان کا تذکرہ کیا تو بہت دلسوزی کے ساتھ دعائیں کرتے رہے، اور ایک خاص کیفیت کے ساتھ فرمانے لگے کہ ''ان شاءاللہ ہتھورا ثانی بنے گا''

ہتھورا، حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب قدس سرہٗ کا وطن ہے، نہایت بے سروسامانی کے عالم میں حضرت باندوی قدس سرہٗ نے وہاں مدرسہ کا سامان کیا، حق تعالیٰ نے اسے اتنا عروج بخشا کہ وہ اس وقت پورے ملک کا مرکز نگاہ بن گیا تھا، حضرت باندوی نوراللہ مرقدہٗ سے کون واقف نہیں ہے، میں نے حضرت قاری صاحب کی زبان مبارک سے یہ جملہ سنا تو سناٹے میں آ گیا، ''کہاں راجہ بھوج کہاں بھجوا تیلی'' میں نے یہ جملہ سنا، شرم سے پانی پانی ہوگیا، اور اپنے اندر اتنا حوصلہ بھی نہیں پاتا کہ اس جملہ کے ظہور کا انتظار کروں۔

حضرت قاری صاحب نام ونمود سے بہت دور اور شہرت کی خواہش سے بہت نفور تھے، وہ کام کریں اور جس کے لئے وہ کام کرتے ہیں وہ جانے، بس ان کے لئے یہی بات بہت کافی تھی، اسی لئے انھوں نے کہیں بھی اور کبھی بھی اپنے نام کو یا اپنے کسی کام کو نمایاں کرنے یا تعارف کرانے کا قصد نہیں کیا، آج کی دنیا، کام کم کرتی ہے، مگر اشتہار زیادہ دیتی ہے، ہمارا تعارف ہوجائے، ہمارے کام کی شہرت ہوجائے، یہ خواہش دلوں میں چھپی رہتی ہے۔ مگر بار بار کی ملاقات کے بعد بھی کبھی اندازہ نہیں ہوا کہ ایسی کوئی ہوس دل کے کسی نہاں خانہ میں پوشیدہ ہے، عموماً بزرگوں کے احوال کا تذکرہ کرتے تھے، مگر خود اپنے کو اس لائق کبھی تصور نہیں کیا کہ کبھی اپنے حالات کچھ بیان کرتے۔

پاکستان کے کسی صاحب کو حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کے خانوادۂ بیعت کے حضرات کا قدرے تعارف لکھنے کا ارادہ ہوا، انھوں نے پتہ لگا لیا تھا کہ الہ آباد محلّہ کٹرہ کی ایک مسجد میں اس خانوادہ کی ایک کامل شخصیت اپنے آپ کو سمیٹے سنبھالے، شہرت سے بچائے تشریف فرما ہے، انھوں نے اصرار کیا حضرت اپنے کچھ احوال اپنے قلم سے لکھ دیں، حضرت نے بہت عذر کیا، مگر وہ صاحب بھی دھن کے پکے تھے، اصرار کرتے رہے، حضرت قاری صاحب نے بادل ناخواستہ کچھ کچھ لکھا اور پھر ادھورا

رہ گیا، یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ ادھورا بھی ان صاحب کے پاس بھیجا گیا، یا یہیں رہ گیا، وفات کے بعد میری حاضری ہوئی، تو حضرت کے بعض تلامذہ سے میں نے کچھ حالات معلوم کرنے چاہے، تو ان کے پاس مذکورہ ناتمام تحریر نظر آئی، جسے انھوں نے کسی طرح قاری صاحب سے حاصل کرلیا تھا، اور وہی تحریر ہے، جس سے ان کے کچھ حالات معلوم ہوسکتے ہیں۔ اس کی روشنی میں مختصر حالات لکھے جارہے ہیں۔

حضرت قاری صاحب کا آبائی وطن ضلع الہ آباد، موضع اوجھنی تحصیل چایل ہے، اوجھنی میں وہ ۶ /رجب ۱۳۳۲ھ مطابق یکم /جون ۱۹۱۴ء بروز دوشنبہ پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گاؤں کے ایک شخصی مکتب میں حاصل کی، ایک نیک مرد اپنے گھر حسبةً للہ گاؤں کے بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے، ان کے یہاں کافی بچے زیر تعلیم تھے، قرآن مجید ناظرہ وہیں پورا کیا، گاؤں میں ایک پرائمری اسکول بھی تھا، کچھ دنوں اس میں تعلیم حاصل کی، ناظرہ ختم ہونے کے بعد والد صاحب کو حفظ قرآن کی فکر ہوئی، گاؤں کے کچھ اور لوگوں نے اس کار خیر کی ترغیب دی، جب کئی بچے حفظ کے لئے تیار ہوگئے تو ایک حافظ صاحب کو بلایا، اور ان کی خدمت میں یہ حفظ کے لئے بیٹھا دئے گئے، ۱۲/۱۳/سال کی عمر میں حفظ مکمل کرلیا، دو سال کے بعد تراویح میں پہلی محراب سنائی، اسی اثنا میں والدہ صاحبہ کا انتقال ہوگیا، والد صاحب محلّہ کٹرہ میں اسی مسجد میں امامت کرتے تھے، جس میں قاری صاحب دم آخر تک قیام پذیر رہے، والد صاحب اپنے فرزند کو لے کر الہ آباد آگئے، اور وہاں کے مشہور مدرسہ سبحانیہ میں درجۂ قرأت میں داخل کردیا، اس مدرسہ میں اس وقت فن قرأت کے امام حضرت قاری محبّ الدین صاحبؒ استاذ تھے، انھیں سے حضرت قاری صاحب نے قرأت حفص کی تکمیل کی۔ مدرسہ سبحانیہ میں قرأت کے ساتھ عربی کی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے، عربی کی ابتدائی کتابیں مدرسہ سبحانیہ میں پڑھ کر تکمیل کے لئے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور جانے کا قصد کیا، حضرت قاری صاحب چونکہ اپنے والد کے اکلوتے صاحبزادے تھے، وہ اپنے سے جدا کرنے کیلئے کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے، مگر انھیں شوق علم دامن گیر تھا، بہت اصرار کے بعد راضی ہوئے، مظاہر علوم میں کافیہ کی جماعت میں داخلہ لیا، اور انہماک کے ساتھ تحصیل علم میں مشغول ہوگئے۔

حضرت تھانویؒ کی زیارت:

حضرت قاری صاحبؒ اپنے خودنواشت حالات میں لکھتے ہیں کہ:

”ذی الحجہ کی تعطیل میں کافی طلبہ اور مدرسین تھانہ بھون کی تیاری کرنے لگے، معلوم

(۱) حضرت کے خادم، بہت مضبوط اور توانا، فتح پور تال نرجا کے رہنے والے مخلص دیندار۔

ہوا کہ تھانہ بھوں یہاں سے قریب ہے، حضرت تھانویؒ کی زیارت کیلئے یہ سب جارہے ہیں، موقع کو غنیمت سمجھ کر میں نے بھی اجازت چاہی، مدرسہ نے بخوشی اجازت دے دی، تھانہ بھون حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہونچے، زیارت ہوئی، مجلس میں شرکت کی اجازت ملی، حضرت کی مجلس اور زیارت سراپا نور ہی نور تھی، بار بار دل میں یہی آتا تھا کہ علم جو مقدر میں ہوگا، حاصل ہوگا، لیکن اس زیارت کی سعادت سے بڑی دولت روحانی نصیب ہوگئی، **الحمد للہ ثم الحمد للہ علیٰ ذٰلک**

مظاہر علوم میں حضرت قاری صاحب کا قیام چھ سال رہا، اسی دوران والد صاحب کا انتقال ہوگیا، والد کے انتقال سے تنگی کا دور شروع ہوگیا، لیکن شوق علم نے ہمت ہارنے نہیں دیا، قاری صاحب کو سہارنپور محلّہ بنجاران کی ایک مسجد میں امامت مل گئی، وہاں نماز پڑھاتے، اور تعلیم کے لئے مدرسہ میں حاضر ہوتے، اس طرح طالب علمی کے مختصر اخراجات کی سبیل بن گئی۔

حضرت نے اپنی تحریر میں یہ نہیں ذکر کیا کہ فراغت کس سن میں ہوئی، اندازہ یہ ہے کہ ۱۳۵۵ھ کے لگ بھگ فراغت ہوئی ہوگی، فراغت کے بعد محلّہ کٹرہ میں اپنے والد صاحب کی جگہ پر کام کا آغاز کیا، اسی مسجد میں امامت کرتے، اس میں ایک مکتب قائم تھا، اس میں بچوں کو ناظرہ، حفظ اور فارسی وعربی کی تعلیم دیتے، اس کے ساتھ ساتھ وہیں ایک چھوٹی سی دوکان بھی پَرچون کی کھولی، مگر اسے جلد ہی بند کردیا۔ کچھ عرصہ تک الہ آباد ہی کے ایک محلّہ حسن منزل کے مدرسہ قرآنیہ میں وقت دیتے، دوسرے وقت کٹرہ کے مدرسہ میں! یہ سلسلہ آٹھ سال تک قائم رہا، اس کے بعد مدرسہ نعمانیہ کٹرہ کے لئے یکسو ہوگئے، اس کے کچھ ہی عرصہ بعد شہر میں ہندو مسلم فساد ہوگیا جس کا سلسلہ عرصہ تک چلتا رہا، اس کا اثر مدرسہ پر پڑا، طلبہ منتشر ہوگئے، مدرسہ کا نظام درہم برہم ہوگیا، مجبوراً حضرت قاری صاحب نے شہر فتحپور میں مدرسہ اسلامیہ میں عربی اور قرأت کی مدرسی اختیار کی، مگر وہاں جی نہیں لگا، اور الہ آباد کٹرہ کے لوگوں کا بہت اصرار رہا، اس لئے دو تین ماہ میں واپس آگئے، اور پھر نہایت استقامت اور یکسوئی کے ساتھ مدرسہ نعمانیہ اور مسجد مینا شاہ کی خدمت میں لگ گئے، اور دم آخر تک پھر قدم باہر نہیں نکالا اور اسی وقت نکالا جب قدرت الٰہی کی طرف سے دنیا ہی سے اذن رحیل مل گیا۔

حضرت قاری صاحب مدرسہ کا نظام نہایت خاموشی کے ساتھ چلاتے تھے، دھوم دھام، اشتہار، پمفلٹ اور شہرت کی خواہش سے بے نیاز علم دین کی خدمت کرتے رہے، ان کے یہاں کے

طلبہ واساتذہ میں تواضع، نرمی، اورخوش اخلاقی ودینداری کا اثر نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے۔

حضرت قاری صاحبؒ کی نشو ونما اللہ تعالیٰ کی محبت اور شریعت مطہرہ کی عظمت پر ہوئی تھی۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ جب مظاہرعلوم سہارنپور میں متعلم تھے، توایک قافلہ کے ساتھ بقرعید کی تعطیل میں تھانہ بھون حاضر ہوئے تھے، حضرت تھانوی قدس سرہٗ جہاں ایک زبردست عالم تھے وہیں ایک باکمال درویش، صاحب باطن اوراللہ کی محبت میں سرشار ایک عظیم سالک بھی تھے، وہاں حضرت کی مجلس میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، اس پر اس نوخیز طالب علم کا قلبی تاثر ملاحظہ فرمائیے، خودفرماتے ہیں:

> حضرت کی مجلس اور زیارت سراپا نور ہی نور تھی، بار بار دل میں یہی آتا تھا کہ علم جو مقدر میں ہوگا، حاصل ہوگا، لیکن اس زیارت کی سعادت سے بڑی دولت روحانی نصیب ہوگئی، **الحمد للہ ثم الحمد للہ علیٰ ذٰلک**

یہ تاثر دل کی گہرائیوں میں اسی وقت پیدا ہوگا، اور بار بار دل میں اسی وقت آئے گا جب کہ دل اللہ کی محبت کی لذت پا رہا ہوگا، نرا علمی ذوق اس تاثر کو پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ طالب علمی کا زمانہ تھا، ہمارے اکابر طلب علم کے دور میں بیعت کرنے سے معذرت فرمادیتے تھے کہ تحصیل علم کی یکسوئی میں اس سے خلل ہوگا، طلب علم، اور بیعت سلوک دونوں کامل یکسوئی کا تقاضا رکھتے ہیں۔ طالب علم کی توجہ کتاب سے، درسگاہ سے، استاذ سے، ذرا بھی ہٹے گی، تو علم کمزور ہوجائے گا اور فرصت کا بیش قیمت وقت ضائع ہوجائے گا۔ اس لئے ہمارے اکابر طالب علموں کو بیعت نہیں کرتے تھے، ورنہ عجب نہیں حضرت قاری صاحب کے دل میں بیعت کا شوق پیدا ہوا ہو۔

تعلیم سے فراغت کے بعد جب وطن واپس آئے اور والد کی جگہ پر کام شروع کیا تو اب یہ شوق ابھرا کہ کسی آستانہ پر جبینِ عقیدت خم کرنی چاہئے، اللہ نے پہلے ہی انتظام فرمادیا تھا، حضرت اقدس تھانویؒ کے اخص الخواص خلیفہ حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب جو کہ غایت عشق ومحبت کی بنا پر ٹھیک ٹھیک حضرت تھانویؒ کے نقش قدم پر تھے۔ وہ الہ آباد ہی کے رہنے والے تھے، حضرت قاری صاحب نے دیکھا کہ تھانہ بھون کے بحر معرفت وطریقت کی ایک نہر ان کے قریب بلکہ ان کے وطن میں موجیں مار رہی ہے، تو بغیر کسی تاخیر کے انھوں نے آستانہ عیسوی پر حاضری دی اوران کے دامن فیض سے وابستہ ہوئے، طلب صادق تھی، دل سراپا اخلاص ومحبت تھا، بہت جلد بارگاہ عیسوی میں تقرب واختصاص حاصل کرلیا۔

حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحبؒ اس وقت اپنے گاؤں محی الدین پور میں قیام پذیر تھے، گورنمنٹ سے ملازمتِ تعلیم کی پنشن پاتے تھے، اس لئے ہر ماہ الہ آباد شہر تشریف لایا کرتے تھے۔ مولانا کا قیام نئے

کٹرہ میں ہوتا، جو حضرت قاری صاحب کی قیام گاہ سے تھوڑے فاصلہ پر ہے، ان کی تشریف آوری جونہی ہوتی، فوراً قاری صاحب کو خبر دی جاتی اور قاری صاحب حاضر خدمت ہو جاتے۔ خود حضرت قاری صاحب لکھتے ہیں کہ:

خیریت پوچھنے کے معاً بعد فوراً اوقات نماز بالتفصیل وبالترتیب دریافت فرماتے، نئے کٹرہ سے پانچوں وقت جب تک طاقت تھی پیدل آتے، ضعف کا غلبہ ہو گیا تو سواری سے آتے جاتے، ایک دفعہ کرایہ دیتے وقت خوش ہو کر فرمایا ''اللہ نے دیا ہے اور اللہ ہی کی راہ میں جا رہا ہے''

یہ تو حضرت قاری صاحب نے تحریر فرمایا ہے، یہ واقعہ حضرت قاری صاحب نے بار بار مجھ سے ذکر کیا ہے، اس میں یہ بھی فرماتے تھے کہ حضرت مولانا کا دستور تھا کہ جن نمازوں سے پہلے سنت ہے ان میں جماعت کے وقت سے دس منٹ پہلے، اور جن نمازوں سے پہلے سنت نہیں ہے ان میں پانچ منٹ پہلے تشریف لایا کرتے تھے۔

حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحبؒ نے حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی وفات کے ایک ہی سال بعد وصال فرمایا۔

حضرت مولانا کی وفات کے بعد قاری صاحب تنہائی محسوس کرنے لگے، دل کی بیتابی اور روح کی تشنگی کسی طرح چین لینے نہیں دیتی تھی، کسی مرشد کی تلاش تھی،

جن دنوں حضرت قاری صاحب حسن منزل میں تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے، وہاں عارف باللہ مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کا تذکرہ سنا، حسن منزل کے رہنے والے بعض حضرات فتح پور حضرت کے پاس آتے جاتے تھے۔ ان لوگوں سے حضرت کے احوال اور حضرت کی باتیں سن کر طبیعت میں کشش پیدا ہوئی، ابتداءً ایک عریضہ حضرت کی خدمت میں تحریر کیا، جس میں اصلاح نفس کے لئے خط و کتابت کی اجازت مانگی، حضرت نے بخوشی اجازت مرحمت فرما دی۔ کچھ دنوں پابندی سے مراسلت جاری رہی۔ مگر کچھ دنوں کے بعد تعلیمی مشغولیت میں انہماک کے باعث یہ سلسلہ سست پڑ گیا، پھر حسن منزل کے لوگوں کے ساتھ حضرت کی خدمت میں حاضری کی توفیق ہوئی، اس حاضری میں حضرت قاری صاحب نے کیا پایا، ان کا تاثر کیا رہا۔ اور پہلی ملاقات کن برکات سے لبریز تھی۔ اس کا تذکرہ خود حضرت کے قلم سے پڑھئے، لکھتے ہیں:

حضرت اتنے سادہ اور بے تکلف تھے کہ اول اول کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا، حضرت ایک

چٹائی پر بیٹھے سنترہ کی قاشیں نوش فرما رہے تھے اور سب کو ایک دو قاشیں دیتے بھی جا رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے، جن کا پہلے سے تعارف نہیں تھا، حافظ صاحب نے تعارف کرایا، تعارف کے بعد حضرت نے احقر سے دریافت فرمایا، تمہارا خط آتا تھا بند کیوں کر دیا۔ میں نے صاف عرض کر دیا کہ حضرت! غفلت کی وجہ سے بند ہو گیا ۔حضرت خاموش رہے، کچھ نہیں بولے، کئی دن ہم لوگوں کا قیام رہا، حضرت حسب عادت کبھی کسی کو، کبھی کسی کو تنہائی میں بلاتے رہے، اور افہام و تفہیم فرماتے رہے، احقر کو ایک دفعہ بھی نہیں بلایا، میں رشک کرتا رہا اور دل ہی دل میں رنج کرتا رہا، حتیٰ کہ رخصت ہونے کا وقت آیا، سب لوگوں کے ساتھ احقر بھی مصافحہ کر کے رخصت ہوا، جب ہم لوگ کافی دور چلے آئے تو ایک صاحب کی پیچھے سے آواز آئی کہ پکارتے دوڑتے چلے آ رہے ہیں، ہم لوگ رک گئے، انھوں نے خادم سے کہا کہ ان کو حضرت بلا رہے ہیں، میں واپس گیا، سب لوگ میرا انتظار کرتے رہے، جس وقت میں خدمت میں پہونچا، حضرت ایک خاص کیفیت اور شان کے ساتھ بیٹھے تھے، جب میں پہونچا تو کچھ بولے نہیں، لیکن اسی کیفیت کے ساتھ اس کمترین سے مصافحہ فرمایا، اور یہ فرمایا کہ خط لکھتے رہنا، اور کچھ زیادہ نہیں کہا، اس مصافحہ کا احقر کے اوپر یہ اثر ہوا کہ دفعۃً گریہ طاری ہو گیا، روتا ہوا ان لوگوں کے پاس پہونچا ان لوگوں سے اپنے گریہ کو چھپایا، لیکن چہرہ سے وہ لوگ سمجھ گئے، واپس آ کر حسب امکان بہت جلد جلد عریضہ ارسال کرتا رہا، حضرت ہمت افزائی فرماتے رہے اور خوش خوش جواب عنایت فرماتے رہے۔

اس کے بعد تو دل میں ایک لگن سی لگ گئی، شیخ کی عنایات و توجہات سے دل ذکر الٰہی سے معمور اور منور ہوتا چلا گیا، اور اسی کے بقدر شوق فراواں کی دولت بڑھتی گئی، خطوط کی آمد و رفت کے ساتھ خدمت میں حاضری بھی بار بار ہونے لگی۔ ایک حاضری میں حضرت نے تنہائی میں فرمایا کہ لگ کر محنت کر ڈالو بار بار کا آنا جانا کہاں؟

اجازت بیعت:۔

ایک دفعہ الہ آباد کے چند مخصوص لوگ حاضر خدمت ہوئے، جن میں حضرت مولانا سراج الحق

صاحب مچھلی شہریؒ اور حضرت قاری صاحبؒ، حضرت ماسٹر ابراہیم صاحبؒ اور شہر کے دوسرے معززین تھے، حضرت قاری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

"واپسی کے دن مجھے اور مولانا سراج الحق صاحب کو طلب فرمایا: ایک خاص کیفیت کے ساتھ ہم لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر اجازت مرحمت فرمائی، جناب مولانا سراج الحق صاحب رونے لگے، اور عرض کرنے لگے میں اس لائق نہیں ہوں، فرمایا: اچھا اچھا ابھی کچھ کہوں گا، پھر نیچے تشریف لائے اور اہل خانقاہ اور الہ آبادی حضرات کو جمع کر کے اجازت سے متعلق مختصر تقریر فرمائی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ حصول نسبت کے بعد اجازت ہوتی ہے، کسی کو نسبت تامہ کے بعد کسی کو ابتدائی نسبت کے بعد ہی شیخ اعتماد کر کے اجازت دے دیتا ہے"

دوسرے روز یہ حضرات الہ آباد واپس ہوئے، روانگی سے پہلے الہ آباد کے دو سمجھدار آدمیوں کو جن میں ایک ماسٹر محمد ابراہیم صاحب تھے، ان سے فرمایا کہ میں نے ان لوگوں کو اجازت دی ہے، یہ شرم کی وجہ سے کسی پر ظاہر نہ کریں گے، آپ وہاں اطلاع کر دیجئے گا، چنانچہ ان لوگوں نے الہ آباد میں اس اجازت کی اطلاع کر دی اور اہل سعادت حسب توفیق حضرت قاری صاحبؒ کی طرف رجوع ہونے لگے۔

حضرت مصلح الامت نور اللہ مرقدہٗ جب تک فتح پور میں تشریف فرما رہے، حضرت قاری صاحبؒ وہاں حاضر خدمت ہوتے رہے، اور حضرت کی خدمت میں سلوک کی منزلیں طے کرتے رہے، نسبت کا رسوخ حاصل ہوتا رہا، اس دوران بعض اوقات حضرت پیر ومرشد نے ازراہ امتحان شدید مواخذے بھی فرمائے، جن میں حضرت قاری صاحبؒ پورے اترے اور بشارتوں سے سرفراز ہوئے۔

اخیر میں حضرت نے الہ آباد کو قیام کے لئے منتخب فرمایا، پھر تو حضرت قاری صاحبؒ کے لئے ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ قدر تھی، اللہ ہی جانتا ہے کہ باطنی ترقیات کس نقطۂ عروج پر پہونچی ہوں گی۔ ہاں تابناک اور روشن چہرہ شہادت دیتا تھا کہ قلب کتنا پُر نور ہوگا۔

حضرت کی وفات کے بعد نہایت خاموشی کے ساتھ مدرسہ، تعلیم اور ارشاد و اصلاح کا کام کرتے رہے، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ حضرت قاری صاحبؒ کے دل میں شہرت وحصولِ جاہ کا شائبہ تک نہ تھا، حاضر ہونے والے حاضر ہوتے، معتقدانہ حاضر ہوتے، مگر حضرت قاری صاحبؒ اپنے کسی کام کا ذرا بھی تذکرہ نہ کرتے، وہ بس اللہ کی یاد میں، ان کی رضا جوئی کی دھن میں غرق تھے، ان کا

سوال جو کچھ تھا اللہ سے تھا۔ حضرت مصلح الامت نوراللہ مرقدہٗ کی تربیت کا رنگ اس درجہ پختہ تھا کہ ہر ہر ادا سے اس کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔

اخیر کے چند سال سخت تکلیف اور بیماری میں گزرے، ڈاکٹروں کی تشخیص غالبًا یہ تھی کہ جسم کا پانی سوکھ گیا ہے، جس کا اثر جسم کے ہر حصے پر ہو گیا تھا، جوڑ جوڑ جام ہو گیا تھا۔ آواز بند ہو گئی تھی، الفاظ بولتے تھے مگر بغیر آواز کے۔ ایسی معذوری تھی کہ دیکھ کر دل بھر آتا تھا، مگر کمال صبر اور کمال استقامت کا یہ حال تھا کہ کسی ادا سے شکایت اور تکلیف کی شدت کا احساس نہ ہوتا تھا، بیماری کے دوران بار بار میری حاضری ہوئی۔ ایک حاضری کے موقع پر جب بے بسی اور بے چارگی کا منظر سامنے آیا تو میرا دل بھر آیا، میں نے اپنی نادانی سے خیال کیا کہ شاید حضرت قاری صاحبؒ کو بھی اپنی معذوری کا صدمہ ہو، یہ خیال آیا تو میں تسلی کی کچھ باتیں کرنے لگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو عروج روحانی اور اپنا قرب لازوال کن کن راستوں سے بخشتے ہیں، یہ ساری مجبوریاں درحقیقت قُرب الٰہی کے راستوں کی برق رفتار سواریاں ہیں۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ اس معذوری اور مجبوری کا ہر لمحہ حضرت کو کہاں سے کہاں پہونچا رہا ہے، پھر اس کی مناسبت سے کچھ آیتیں اور کچھ حدیثیں سنائیں، پہلے بھی زیادہ تر دستور یہی رہا کرتا تھا کہ میں جب حاضر خدمت ہوتا تو حضرت کا اشارہ پا کر اکثر گفتگو میں ہی کرتا تھا، درمیان میں حضرت کوئی ایک جملہ بول کر میری گفتگو کو مزید درازی کا حوصلہ بخش دیتے تھے، آج حضرت کچھ بول نہیں سکتے تھے، تو از خود میں نے لمبی گفتگو چھیڑ دی، میری گفتگو کا دائرہ پھیل رہا تھا اور حضرت کا نورانی چہرہ مزید دمکتا جا رہا تھا، خوب مسکرائے، کسی کسی وقت خوشی سے پورا جسم ہل جاتا، کسی کسی بات پر بے ساختہ آنکھیں ڈبڈبا جاتیں، میں خاموش ہوا تو مجھے محسوس ہوا کہ حضرت کا رُواں رُواں خوشی سے سرشار ہے، اور انھیں کسی مجبوری کا ذرا بھی شکوہ نہیں۔

آخری حاضری میں بھی حضرت اسی عالم میں تھے، سراپا صبر و رضا بنے ہوئے چہرۂ مبارک پر مرض کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا تھا، وہی رونق، وہی نورانیت، صرف اتنا فرق تھا کہ ضعف کی وجہ سے یا استغراق کی وجہ سے آنکھیں اکثر بند رہتی تھیں، آواز بالکل نہیں تھی، مگر کچھ کچھ فرماتے تھے، ہونٹوں کے اشاروں سے کوئی کوئی بات سمجھ میں آجاتی تھی، حضرت کے خدام اور صاحبزادۂ گرامی قدر مولانا مسعود صاحب اکثر باتیں سمجھ لیتے تھے۔ اس دن حضرت کا اصرار تھا کہ کھانا یہیں کھاؤ، مگر اس کا نظم ایک دوسری جگہ ہو چکا تھا، بڑی لجاجت کے ساتھ معذرت کی، حضرت مسکرائے، بالآخر اجازت دے دی، ہم کئی لوگ تھے، دیر تک ان کے پاس رہ کر واپس ہوئے۔

باب ۱۷

سفرحج اور وصال

گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے کہ حضرت والا فریضۂ حج کی ادائیگی سے حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی حیات میں فارغ ہو چکے تھے۔آخر دور میں حضرت کا کام جس انداز میں پھیل چکا تھا، اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ حضرت چند دنوں کے لئے ہی سہی ملک سے باہر بالکل تشریف نہ لے جائیں۔آپ اگر حج کا ارادہ فرماتے، تو وہ نفل ہوتا اور یہاں رہ کر حضرت جس کارِ منصبی میں مشغول تھے، یعنی خدا سے کٹی ہوئی مخلوق انسانیت کو خدا کے دروازے پر پہونچانا۔لوگوں کے نفوس کی اصلاح، ایمان واخلاق کی دعوت، یہ اس حج نفل سے اہم تھا، اس لئے حضرت نے کبھی کہیں آنے جانے کا ارادہ نہیں فرمایا، لیکن مشیت الٰہی کو منظور تھا کہ جس بندے نے محض اپنے مالک کی رضا کے لئے مدت العمر اپنے پاؤں میں اقامت کی بیڑی ڈال رکھی ہے اور اسی کی وجہ سے حج نفل نہیں کر سکا ہے، اس کے نامۂ اعمال میں قیامِ قیامت تک حج کا ثواب درج کیا جائے، چنانچہ ایسے اسباب پیدا ہوتے چلے گئے کہ آپ نے سفرحج کا ارادہ فرمالیا۔

مثلاً یہ کہ آپ نے اپنے محبوب داماد حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب سے متعدد بار فرمایا کہ تم لوگوں پر حج فرض ہے، جاؤ۔ میں تو اپنا فریضہ ادا کر ہی چکا ہوں، مجھے یہیں رہنے دو، کچھ کام کرلوں، لیکن ان کا اصرار تھا کہ حج آپ کی معیت میں ہو اور یہ اصرار معقول وجہ سے تھا، نیز حضرت کے کام اور ذات کی شہرت ومقبولیت

چونکہ صرف ہندوستان ہی میں محدود نہ تھی، بلکہ سعودی عرب وغیرہ میں بھی آپ کی آواز پہونچ چکی تھی، اس لئے وہاں کے بھی بہت سے دیدہ اور نادیدہ عاشقین دل سے چاہتے تھے کہ کسی طرح یہاں تشریف لاتے تو زیارت وفوائد سے متمتع ہوتے۔ وہاں سے اس مضمون کے خطوط برابر آرہے تھے، اس لئے حضرت نے حج کا قصد فرمالیا۔

آپ کی معیت اور ہمرکابی میں گھر کے لوگ یعنی دونوں صاحبزادیاں اور ان کے شوہر حضرت قاری محمد مبین صاحب اور مولانا ارشاد احمد صاحب اور ان کے بچے تو تھے ہی، ان کے علاوہ خدام ومتوسلین کی ایک بڑی تعداد کو بھی حضرت نے اپنے ساتھ لے لیا۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامؔی بھی ہمراہ تھے، اور خدام میں سے ذکی اللہ خاں صاحب اور بھائی ممتاز احمد خاں صاحب وغیرہ۔

سفر کی تیاریاں زور وشور سے ہو رہی تھیں۔ ۱۹/ شعبان ۱۳۸۷ھ مطابق ۲۲/ نومبر ۱۹۶۷ء بروز چہارشنبہ مظفری جہاز سے روانگی تھی، مجالس کا سلسلہ حسب معمول جاری تھا، حج کی بات چونکہ مشہور ہو چکی تھی، اس لئے لوگ پورے ملک سے کشاں کشاں بمبئی پہونچ رہے تھے، تاکہ آخری مجالس میں شرکت کی سعادت اور الوداعی دید وزیارت سے بہرہ مند ہوسکیں۔

۱۳/ شعبان تک آپ بنفس نفیس مجلس میں تشریف لاکر افادات فرماتے رہے، مگر اس دوران بعض ایسے واقعات پیش آئے جن سے حضرت کا انشراح ختم ہوگیا، اس لئے حضرت نے ۱۴/ شعبان سے مجلس میں آنا بند کردیا، مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامؔی یا کسی اور واسطہ سے اہل مجلس کو خطاب فرماتے، یہ خطابات محبت وشفقت کے جذبات سے پُر ہوئے، مگر بصورت مواخذہ وعتاب ان اسباب کے ذکر کرنے کی چنداں حاجت نہیں۔

آخری مجلس:

جی چاہتا ہے کہ آخری مجلس کی کیفیت من وعن ''معرفت حق'' سے نقل کر دی جائے، تاکہ ناظرین کے سامنے اس کا خاکہ آجائے۔

''آج مجلس کا آخری دن تھا، اس لئے کہ کل روانگی ہونی تھی، مجمع بہت زائد تھا، باہر کے مہمان بھی کافی آچکے تھے، اور اہل بمبئی بھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ حضرت والا باہر آج بھی تشریف نہیں لائے، راقم (مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامیؔ) کے توسط سے اہل مجلس سے یہ پیغام کہلایا، فرمایا کہ:

''کل شاید موقع گفتگو کا نہ ملے، اس لئے آج ہی آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ مجھ کو آپ کے یہاں رہتے ہوئے بہت دن ہوگئے، آپ لوگ برابر تشریف لاتے رہے، اور جب کوئی شخص کہیں رہتا ہے تو پھر ہر ایک کے دوسرے پر کچھ حقوق ہوجاتے ہیں، اس لئے کہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ اس درمیان میں میری کوئی بات آپ کو ناگوار ہوئی ہو، یا میرے کسی فعل سے آپ لوگوں کو کچھ ایذا پہونچی ہو، تو میں اس کی آپ لوگوں سے معافی چاہتا ہوں۔ میں نے کبھی کبھی کچھ سخت ضرور کہا ہے، مگر اس کا منشا محض اصلاح اور آپ حضرات کی شفقت وخیر خواہی تھی، تاہم بر بنائے بشریت اگر کسی صاحب کو کچھ تکلیف پہونچی ہو تو مجھ کو معاف فرمادیں۔

سبحان اللہ! حضرت والا نے اپنے اس عمل سے امت کو رسول اللہ ﷺ کے آخری وقت کی ایک خاص سنت کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔ حدیث شریف میں ہے حضرت فضل بن عباس سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی

خدمت میں آپ کے مرضِ وفات کی حالت میں حاضر ہوا۔ حضور اقدس ﷺ سر مبارک پر ایک زرد پٹی باندھے ہوئے تھے، میں نے سلام کیا، آپ نے جواب کے بعد ارشاد فرمایا کہ اے فضل! ذرا اس پٹی کو اور کس دو، میں نے تعمیل ارشاد کر دیا، پھر حضور بیٹھے اور میرے مونڈھے پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوئے اور مسجد کو تشریف لے گئے، اس کا حدیث میں ایک مفصل قصہ ہے۔ (شمائل ترمذی)

امام ترمذی نے جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ مجمع الزوائد میں مفصل مذکور ہے۔ اس میں ہے کہ حضور ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے، اور منبر پر بیٹھ کر مجھ سے (یعنی فضل بن عباس سے) فرمایا کہ آواز دے کر لوگوں کو جمع کر لو۔ فضل کہتے ہیں میں سب کو بلا لایا۔ اس کے بعد حضور نے اللہ کی حمد و ثناء کے بعد ارشاد فرمایا کہ:

”اے لوگو! میرا اب تمہارے رب کے پاس چلے جانے کا زمانہ قریب آ گیا ہے، اس لئے میں اعلان کرتا ہوں کہ میں نے جس کی کمر پر مارا ہو تو میری کمر موجود ہے، وہ مجھ سے بدلہ لے لے، اور میں نے جس کی آبرو پر حملہ کیا ہو تو میری آبرو سے بدلہ لے لے، اسی طرح سے جس کا مجھ پر کوئی مالی مطالبہ ہو تو مجھ سے وصول کر لے، اور کوئی شخص یہ شبہہ نہ کرے کہ بدلہ لینے سے رسول اللہ (ﷺ) کے دل میں بغض پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے، اس لئے کہ بغض رکھنا نہ میری طبیعت ہی ہے نہ میرے لئے زیب دیتا ہے کہ کسی مسلمان سے بغض رکھوں۔ خوب سمجھ لو کہ میں اس شخص سے بہت خوش ہوگا جو اپنا حق مجھ سے وصول کر لے یا معاف کر دے، تاکہ میں اللہ کے یہاں بشاشت نفس کے ساتھ جاؤں۔

میں اپنے اس اعلان کرنے پر اکتفا نہیں کروں گا، بلکہ پھر اس کا اعلان کروں گا، اس کے بعد آپ منبر پر سے اتر آئے اور ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد پھر منبر پر

تشریف لے گئے اور وہی اعلان فرمایا، اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اسی طرح سے جس کے ذمہ کوئی حق ہو وہ بھی ادا کردے، اور دنیا کی رُسوائی کا خیال نہ کرے کہ دنیا کی رسوائی آخرت کی رسوائی سے بہت کم ہے۔

یہ سن کر ایک صحابی کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! میرے تین درہم آپ کے ذمہ ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں کسی مطالبہ کرنے والے کی نہ تکذیب کرتا ہوں نہ اس کو قسم دینا چاہتا ہوں، لیکن صرف اتنا پوچھتا ہوں کہ وہ درہم کیسے ہیں (یعنی اس وقت مجھے یاد نہیں آرہے ہیں، کچھ اتا پتا بتلاؤ تو شاید یاد آجائے) انھوں نے عرض کیا کہ ایک دن آپ کے پاس ایک سائل آیا تھا تو آپ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اس کو تین درہم دیدو۔ حضور ﷺ نے حضرت فضل سے فرمایا کہ ان کے تین درہم ادا کردو۔

اس کے بعد ایک اور صحابی اٹھے اور عرض کیا یارسول اللہ! میرے ذمے تین درہم بیت المال کے ہیں، میں نے خیانت سے لے لئے تھے، حضور ﷺ نے حضرت فضل سے فرمایا کہ ان سے وصول کرلو۔

اس کے بعد حضور ﷺ نے پھر اعلان فرمایا کہ کسی کو اپنی کسی حالت کا اندیشہ ہوتو وہ بھی دعا کرالے، یہ سن کر ایک مخلص صحابی اٹھے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ میں جھوٹا منافق ہوں اور بہت سونے کا مریض ہوں، میرے لئے دعا فرمادیجئے، آپ نے دعا فرمادی یا اللہ ان کو سچائی عطا فرما، ایمان کامل نصیب فرما اور زیادتی نیند کے مرض سے صحت بخش۔

اس کے بعد ایک اور صحابی کھڑے ہوئے، اور عرض کیا یارسول اللہ! میں جھوٹا ہوں، منافق ہوں، کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جو میں نے نہ کیا ہو، میرے لئے دعاء

فرما دیجئے۔ اس پر حضرت عمر نے ان کو زجر کیا کہ اپنے گناہوں کا اظہار کرتے ہو، حضور ﷺ نے حضرت عمر سے فرمایا چپ رہو، دنیا کی رسوائی آخرت کی رسوائی سے بہت ہلکی ہے۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے دعا فرمائی کہ یا اللہ اس کو سچائی اور ایمان کامل نصیب فرما، اور اس کے احوال کو بہتر فرمادے، (۱)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایک اور صحابی اٹھے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں بزدل ہوں اور سونے کا مریض ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کیلئے بھی دعا فرمادی۔ حضرت فضل کہتے ہیں کہ اس کے بعد سے ہم دیکھتے تھے کہ ان کے برابر کوئی بہادر نہ تھا۔

اس کے بعد آپ حضرت عائشہ کے مکان پر تشریف لے گئے، اور اسی طرح عورتوں کے مجمع میں بھی اعلان فرمایا۔ ایک صحابیہ نے عرض کیا یا رسول اللہ میں اپنی زبان سے عاجز ہوں۔ آپ نے ان کے لئے دعا فرمائی۔ (فضائل نبوی، ص:۸۱)

بہر کیف! حضرت والا کے ان کلمات کو احقر نے جب اہل مجلس کے سامنے نقل کیا تو سارا مجمع بلبلا گیا، لوگ رونے لگے حتیٰ کہ بعضوں کی چیخ نکل پڑی۔ چند منٹ خاموشی کے بعد جب ذرا سکون ہوا تو لوگوں نے کہا کہ ہم لوگوں کی طرف سے حضرت والا سے بھی عرض کردیجئے کہ ہم لوگوں سے حضرت والا کو جو ایذا اور تکلیف پہونچی ہو اس کو حضرت والا دل سے معاف فرمادیں اور ہم لوگوں کیلئے دعا فرمائیں، اور حضرت والا نے جو کچھ فرمایا وہ حضرت والا کی عین شفقت ہے، اس سے ہمیں ناگواری تو کیا ہوتی بلکہ ہم خوش ہیں کہ الحمد للہ حضرت کو ہماری اصلاح کا اس درجہ خیال ہے۔ اس کے لئے بھی طالب دعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری اصلاح فرمادیں اور حضرت والا کی منشا کے مطابق ہم سب کو بنادیں۔

احقر نے حاضرین کی یہ درخواست حضرت والا سے آکر عرض کی۔ فرمایا کہ

ہاں سب کے لئے دعا کرتا ہوں، لوگوں سے کہہ دو کہ میرے لئے بھی دعا کریں، سفر طویل ہے، اللہ تعالیٰ صحت وعافیت کے ساتھ لے جائے اور وہاں کی دولتوں سے مالا مال فرمائے۔

راقم نے عرض کیا، آپ حضرات حضرت والا کی صحت کے لئے خصوصی طور سے دعا فرمائیں کہ صحت اچھی رہے، قوت میں اضافہ ہو اور نہایت خیر وخوبی کے ساتھ واپس تشریف لائیں۔

اس کے بعد حکیم اجمیری صاحب نے حضرت والا کے حکم سے یہ اعلان فرمایا کہ میں آپ حضرات سے نہایت لجاجت سے استدعا کرتا ہوں کہ آج بھی آپ حضرات مصافحہ نہ کریں، محض زیارت پر اکتفا فرمائیں، اس لئے کہ مجمع بے انتہا ہے حضرت کو کل سفر کرنا ہے، مصافحہ کرنے میں تعب بھی ہوگا اور وقت بھی بہت لگے گا۔ اسی طرح سے ایک گزارش یہ بھی ہے کہ حضرت والا جب باہر تشریف لے جاتے ہوتے ہیں یا باہر سے تشریف لاتے ہیں تو آپ حضرات موٹر کو گھیر لیتے ہیں، حضرت والا کے لئے یہ سخت تکلیف کا باعث ہوتا ہے، اس لئے کہ خلافِ سنت ہے، ایسی تعظیم جو اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے مساوی ہو شرک ہے۔ یہ اہل کتاب کا عمل ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں نکیر فرمائی ہے۔ اِتَّخَذُوٓا أَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ أَرۡبَاباً مِّنۡ دُوۡنِ اللهِ۔ (انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء ومشائخ کو رب بنا رکھا ہے)

لہٰذا ہم لوگوں کو اس سے بچنا چاہئے۔ حضرت والا نے آپ حضرات کو مکرر سلام فرمایا ہے، اور دعا کی درخواست کی ہے۔

اس گفتگو پر آج کی مجلس ختم ہوئی۔

افسوس کیا خبر تھی کہ یہ مجلس آخری مجلس تھی، اور حضرت والا کے مسند ارشاد سے

فیضان کا آخری دن تھا۔ ؎

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

روانگی:

دوسرے دن ۱۹ر شعبان ۱۳۸۷ھ کو روانگی تھی۔ صبح ہی سے حضرت کی قیامگاہ پر مشتاقانِ زیارت پروانوں کی طرح ٹوٹنے لگے۔ مجمع بڑھتا رہا، علان کیا گیا کہ صرف سلام وزیارت پر اکتفا کریں۔ حضرت والا کو بڑھاپے اور ضعف وعلالت کی وجہ سے اب اتنا تحمل نہیں ہے کہ فرداً فرداً ہر ہر شخص سے مصافحہ کریں۔ لمبا سفر ہے، خدانخواستہ اگر طبیعت علیل ہوگئی تو بہت پریشانی ہوگی۔ چنانچہ لوگ حضرت والا کے نکلنے سے پہلے ہی بندرگاہ کی طرف چل دئے۔ وہاں ایک طرف پانی کا سمندر لہریں لے رہا تھا اور دوسری طرف آدمیوں کا سمندر امنڈا پڑا تھا۔ بندرگاہ کھچاکھچ بھری ہوئی تھی، علماء وصالحین اور کرتا ٹوپی والوں کی نورانی صورتیں ہر طرف جگمگا رہی تھیں۔ اہل اللہ کا اتنا بڑا مجمع سمندر کے اس ساحل نے شاید بہت عرصہ کے بعد دیکھا ہو، جس وقت حضرت کی کار وہاں پہونچی ہے لوگ پروانوں کی طرح ٹوٹ کر گرنے لگے۔ حضرت پریشان ہوگئے کہ موٹر سے کیسے نکلا جائے، بڑی مشکلوں سے دو تین مضبوط نوجوانوں نے ہاتھ کا حلقہ بنا کر حضرت کو موٹر سے باہر نکالا۔ اسی حلقہ کی حفاظت میں جہاز تک پہونچایا گیا۔

جہاز پر سوار ہونے اور اس کے روانہ ہونے کا منظر بھی عجیب تھا۔ کوئی دل ایسا نہیں تھا جو تڑپا نہ ہو، اور کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو آنسوؤں سے نم نہ ہوئی ہو۔ سب کی زبانوں پر دعائیہ کلمات اور دلوں میں ہجر وفراق کی سوزش وبے تابی موجود تھی۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامیؔ جہاز میں حضرت کے ساتھ تھے، وہ اپنے ایک مکتوب میں

فرماتے ہیں:

تمنا اگرچہ محال کی بھی جائز ہے، تاہم اپنے حج کی تمنا کیا تصور میں بھی کبھی اس کا خیال نہیں کرسکا تھا، مگر بقول قائل ؎

بود مورے ہوسے داشت کہ بکعبہ رسد

دست بر پائے کبوتر زد و ناگاہ رسید

ایک چیونٹی کی یہ خواہش ہوئی کہ کعبہ شریف میں پہونچ جائے، تو اس نے ایک کبوتر کا پاؤں پکڑ لیا اور بیت اللہ تک پہونچ گئی۔

اللہ تعالیٰ کے فضل اور حضرت والا کے کرم سے وہ دن آیا کہ آپ لوگوں کو ساحل پر غرقِ حسرت کئے ہوئے ہم لوگ روانہ ہوئے، حاجیوں کے جہاز نے لنگر اٹھا دیا۔ عجب منظر تھا، حضرت والا کرسی پر باہر جلوہ افروز تھے اور سب لوگ ٹکٹکی باندھے حضرت کو دیکھ رہے تھے، حضرت بھی مغموم تو تھے، مگر محبین کے مجمع کے اور ان کی محبت کے مظاہرے سے مسرور بھی تھے۔ میں بھی محوِ حیرت بنا کرسی کے پاس کھڑا تھا کہ یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے، غم و سرور کا ایسا سخت مقابلہ تھا کہ دونوں ہی قسم کے آنسو خشک تھے۔

بہر حال ایک گوشہ میں آپ بھی نظر پڑے، ساکت وصامت! آپ کی بھی ہیئت کذائی بزبانِ حال کہہ رہی تھی کہ یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ؎

هواى مع الركب اليمانين مصعد

جنيب وجثماني بمكة موثق

میرا محبوب تو یمن کے قافلے کے ساتھ دور چلا جا رہا ہے اور میرا جسم مکہ میں بندھا پڑا ہے۔

عجبت لمسراها وانی تخلصت

إلــي وباب السجن دوني مغلق

تعجب ہے آخر وہ میرے پاس کیسے پہونچا (یعنی خیال میں) جبکہ قید خانہ کا دروازہ مجھ پر بند ہے۔

ألمت فحيت ثم قامت فودعت

فلما تولت كادت النفس تزهق

محبوب میرے پاس آیا، تھوڑی دیر ٹھہرا، سلام کیا پھر اٹھا اور رُخصت کیا، پس جب چلنے لگا تو ایسا معلوم ہوا کہ ابھی دم نکل جائے گا۔

جہاز چھوٹا یا حضرت چھوٹے، جہاز گھوما تو کمرہ کی کھڑکی سے پھر ساحل کا مجمع نظر آیا، آپ جس طرح دیکھتے تھے، حضرت بھی دیکھتے رہے۔ فرماتے تھے اب کیا نظر آتا ہوگا، اور یہاں بھی بھیڑ ہی نظر آرہی ہے، تشخصات تو غائب ہوگئے، اور ذرا آگے بڑھے تو بس اس کا مصداق تھا۔

مڑکر جو میں نے دیکھا امید مرچکی تھی

پٹری چمک رہی تھی گاڑی گذر چکی تھی

تھوڑی دیر میں ساحل پانی کی اوٹ میں تھا۔ (حالات وفات، ص:۳۰)

آگے لکھتے ہیں:

بھائی سلیمان صاحب امیر الحج مقرر ہوئے، کسی نے عصر کی اذان دی، چار چھ جگہ جماعتیں ہوئیں۔ ہم لوگوں نے ڈی لکس کے ہال میں حضرت والا کے ساتھ نماز پڑھی (حضرت نے اس کے بعد) مغرب پڑھی، عشا پڑھی۔ دوا تیل سب معمول پر آگئے، صبح حاضر ہوا یعنی پنجشنبہ کی صبح ۲۳ر نومبر کو فرمایا نیند خوب آئی طبیعت اچھی ہے۔

سمندر جو ملا تو اوپر ہی جہاں حضرت کرسی پر بیٹھے تھے کرسی رکھ کر ہاتھ میں تسبیح لے کر اکثر بیٹھا رہتا، کبھی وہیں تلاوت کرتا، حضرت نے لوگوں کو بلایا نہیں، دوا کیلئے جاتا تھا، ذرا دیر بیٹھ کر چلا آتا تھا، کبھی کبھی حاجی جی (حاجی الیاس صاحب بمبئی والے) سے فرماتے کہاں جارہے ہو حاجی جی؟ انھوں نے کہا کمرے میں جارہا ہوں۔ فرمایا نہیں، یہ نہیں کہہ رہا ہوں، کہاں چل رہے ہو، سمجھے؟ جی ہاں سمجھا۔ ہاں پنجشنبہ کو دوپہر کو مجھے بلوایا اور دو بات فرمائی، فرمایا کہ تم نے بمبئی میں کیا دیکھا، اور یہاں کیا دیکھ رہے ہو؟ ان سب باتوں کو لکھو شاید کسی اللہ کے بندے کو کچھ نفع ہو، تم کو اسی لئے ساتھ لایا ہوں۔ اس کے بعد فرمایا کہ لوگوں کے سامنے کتاب سے حج کے مسائل بیان کرو۔ کچھ وقت اس میں گذرے، لوگوں کو علم ہو جائے گا۔ میں نے عرض کیا بہت اچھا، کل سے اسی وقت بیان کروں گا۔

چند اوقات نماز ہونے کے بعد حضرت کا، اور جماعت ہونے کا پھر قاری صاحب کی قرأت کا جوں جوں علم ہوتا گیا، یہاں کی جماعت کا مجمع بہت بڑا ہو گیا۔

آج بھی حضرت اچھے رہے، شب جمعہ اچھی گذری، جمعہ کو ظہر سے ذرا پہلے مجھے بلوایا، فرمایا کہ احرام وغیرہ کا مسئلہ ذرا ٹھیک سے بیان کرنا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت معلم الحجاج سے سنانے کا خیال ہے، اول تو اس میں جدہ سے احرام کا مسئلہ ہے ہی نہیں، دوسرے ابتداء میں آداب وغیرہ کا ذکر ہے، اور میں نے سوچا ہے یوں کہہ دوں گا کہ مولانا شیر محمد صاحب کی یہ تحقیق ہے اور حضرت کو اس پر اطمینان ہے، باقی جس کو تردد ہو وہ شبہہ میں نہ پڑے، یلملم ہی سے باندھ لے، کیونکہ احرام کی تقدیم تو بہر حال جائز ہے اور جو آسانی چاہتا ہے اور ہم پر اعتماد کرتا ہے تو مسئلہ یہی صحیح ہے، چنانچہ ہم بھی احرام جدہ ہی سے باندھیں گے، فرمایا کہ ہاں ٹھیک ہے۔

بس اس کے علاوہ مجھ کو نہیں بلایا اور شاید کسی کو بھی نہیں بلایا۔ بس کھڑکی سے سمندر اور پانی ہی کو برابر دیکھتے رہے، کبھی کبھی ادھر سے کوئی آدمی گذرتا تو کھڑکی ہی سے مصافحہ کر لیتے۔

آخری بیعت:

جمعہ ۲۴/ نومبر کو عصر کے بعد حسب معمول دوا کھلانے آیا، اس وقت ایک صاحب وکیل نامی مولانا عبید الرحمٰن صاحب (الہ آباد کے نہایت خاموش لیکن باا ثر عالم، اللہ کو پیارے ہو چکے) کے شاگرد، حاضر ہوئے اور بیعت کی درخواست کی۔ میں نے سفارشاً عرض کیا، حضرت یہ بھی الہ آباد کے ہیں، مولوی عبید الرحمٰن صاحب نے آپ ہی کی بابت لکھا تھا، فرمایا اچھا۔ میں نے کہا کسی دن شام کو بیعت ہو جائیں گے، فرمایا ہاں یہ بیعت ہی ہیں۔ یہ فرما کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا تم کو سلسلہ میں داخل کر لیا۔ سبحان اللہ یہ جوان حضرت والا کے سب سے آخری مرید ہیں۔

(حالات وفات، ص: ۳۰/۴/۵/ بحذفِ یسیر)

وفات:

یہ دن حضرت کی حیات کا آخری دن تھا، آج کا دن گذرنے کے بعد سورج نے پھر آپ کا صرف جسد خاکی ہی دیکھا۔ طائر روح حریم قدس میں پرواز کر چکا تھا، وفات کی تفصیلات میرے بجائے حضرت کے جانشین حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب کے قلم سے ملاحظہ فرمایئے جو شروع سے آخر تک آپ کے ساتھ رہے۔ حضرت قاری صاحب کا یہ مکتوب صرف حالاتِ وفات ہی نہیں ان گہرے تاثرات پر بھی مشتمل ہے، جن سے حضرت قاری صاحب اور دوسرے اہل خاندان نیز رفقاء سفر دوچار ہو رہے تھے۔ اصلاً یہ ایک مکتوب ہے جو مدینہ منورہ سے حضرت قاری صاحب

نے اپنے دونوں ہمزلف مولانا قمر الزماں صاحب اور مولانا نور الہدیٰ صاحب کے نام تحریر فرمایا ہے، اس مکتوب کے ضروری حصے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

”عزیزم! اس سانحۂ عظیمہ کے متعلق کیا لکھوں، جتنا کچھ بھی لکھوں وہ کم ہے مگر لکھا نہیں جاتا، اور لکھوں تو کس دل سے لکھوں، نہ تو اب وہ دل رہا اور نہ وہ جذبات وولولے ہی رہے۔ دل شکستہ، ہمت وحوصلہ پست، دل ودماغ حیران وپریشان، آہ آہ! گھر سے چلے تھے تو کس شہنشاہی حالت میں چلے تھے، کیسا دل ودماغ لے کر چلے تھے، دل میں کیسے کیسے جذبات تھے وولولے کھیل رہے تھے، اچھل رہے تھے، دل کی کلی کھلی تھی، بہار ہی بہار تھی۔ یکا یک ایسی بادِ خزاں چلی کہ اپنا سارا گلستاں اجڑا ہی نہین بلکہ جل بھن گیا، نہ تو اس کے نشانات ہی رہے اور نہ کوئی علامت ہی باقی رہی۔

عزیزم! وہ بھی ایک وقت تھا اور یہ بھی ایک وقت ہے کہ اب اپنے آپ کو کس بیکسی اور کس مپرسی کی حالت میں پا رہا ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ہی ہوں یا کوئی اور ہوں۔ اللہ اللہ خواب میں اپنے آپ کو دیکھ رہا ہوں یا حالت بیداری میں، بھائی! جب گھر سے چلے تھے تو کیا دولت لے کر نکلے تھے، ایک محی السنۃ عالم ربّانی، محبوب عالم کی معیت میں سرکارِ دوعالم تاجدارِ مدینہ ﷺ کے روضۂ اطہر کی زیارت کیلئے نکلے تھے، عاشق نائب رسول کی گرویدگی کا کیا عالم تھا، جیسے شمع پر پروانے ٹوٹے پڑتے ہوں۔ نبی کریم ﷺ کی شانِ اقدس میں کسی نے خوب کہا ہے جس کو حضرت ہی سے سنا تھا۔

دشت یثرب میں تیرے ناقہ کے پیچھے پیچھے
دھجیاں جیب وگریباں کی اڑاتے جاتے

چونکہ حضرت والا کو حضور اکرم ﷺ سے نسبت کاملہ حاصل تھی اس لئے حضور کا پورا پرتو حضرت پر تھا۔ عوام وخواص کی ساری فدائیت اسی نسبت وتعلق کا ثمرہ تھا۔ اللہ

اللہ کیسے کیسے لوگ گرے پڑتے تھے، اور کس آن بان سے حضرت کی سواری بوری بندر سے چلی تھی اور کس حالت میں جہاز پر سوار ہوئے تھے۔

محبوب خوباں می رود گردش ہجوم عاشقاں
چابک سواراں یک طرف مسکیں گدایاں یک طرف

ہم لوگوں کو اپنی قسمت پر ناز تھا، اور حضرت والا کی معیت کی وجہ سے کامیابی اور کامرانی کا یقین تھا، نہ تو کسی قسم کا فکر وغم اور نہ سمندر کے تھپیڑوں کا خوف والم اور نہ حوادثات زمانہ کا وہم، جی جی میں بار بار گنگناتا تھا، بلکہ حضرت والا سے کہنے والا تھا، مگر ہمت وجرأت نہ ہوئی اور کہہ نہ سکا۔ وہ کیا ہے

چہ غم دیوارِ امت را کہ دارد چوں تو پشتیباں
چہ باک از موج بحر آنرا کہ باشد نوح کشتیباں

یہ سب کچھ تھا مگر اللہ کی مرضی ہی کچھ اور تھی جس کو ہم تم اور کوئی نہیں جانتا تھا ہے

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا، آہ آہ! جہاز پر سوار ہونے کے بعد چہارشنبہ، پنجشنبہ اور جمعہ صرف تین ہی دن حضرت والا کا ساتھ رہا۔ بھائی! کوئی بات نہ تھی، نہ تو کسی قسم کی نقاہت اور نہ کھانے پینے سونے میں کوئی فرق، جملہ معمولات اپنے اپنے وقت پر ادا فرماتے رہے۔ نماز پنج وقتی کچھ دور چل کر ادا فرماتے رہے۔ مشی (چہل قدمی) بھی جاری رہی۔ بہت ہی خوش وخرم! ہاں البتہ عورتوں سے بمبئی میں بھی اور جہاز پر بھی فرماتے تھے کہ بیٹی بہت مشکل وقت ہے، بہت سخت وقت ہے اور بہت ایمان کا وقت ہے، اور بہت گھبرا گھبرا کر پریشان ہو کر فرماتے تھے کہ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ آسان فرمائے، اور فرماتے بیٹی دیکھو جدہ میں کیا ہوتا ہے؟ اہلیہ کہتی ہیں کہ ابا فرماتے تھے کہ

بیٹی خوشی تو جاتی ہو مگر دیکھو کیا ہوتا ہے، ایمان کا وقت ہے۔ خدا کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور کہتی ہیں کہ یہ سب باتیں ایک خاص جذب و کیفیت کی حالت میں فرماتے تھے، جب یہ کیفیت جاتی رہتی تو پھر محبت کی اور دوسری قسم کی باتیں کرنے لگتے تھے، اور پہلے تو کھانا کھانے کے بعد فوراً ہم لوگوں کو ہٹا دیتے تھے کہ جاؤ جاؤ، کچھ دنوں سے ادھر یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ جب ہم لوگ دروازے تک چلے جاتے تو پھر بلا لیتے اور بیٹھا کر محبت و پیار کی باتیں کرتے، بمبئی میں بھی یہ فرماتے تھے کہ دیکھو بیٹی یہ سب کے سب میرے بدن پر ایسا گر رہے ہیں جیسے کسی مردے پر، اور یہ بھی فرماتے کہ بیٹی دیکھو یہ سب بے وقوف جانتے وانتے تو ہیں نہیں اور وہاں سے لکھ لکھ کر بھیجتے ہیں کہ یہاں ٹھہریئے گا، وہاں ٹھہریئے گا۔ یہ سب بے وقوف ہیں، جہاز میں بھی جمعہ کے دن اسی جذب و کیفیت میں فرمایا کہ بیٹی ایمان کا وقت ہے، سخت وقت ہے۔ پہلے جب میں حج کرنے حاضر ہوا تھا تو اتنا خوف نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اب اس مرتبہ تو بہت خوف معلوم ہوتا ہے، طبیعت گھبراتی ہے، دعا کرو اللہ تعالیٰ آسان فرمادے۔ یہ بھی فرمایا دیکھو جدہ میں کیا ہوتا، اہلیہ نے کہا ابا کیا فکر کرتے ہیں، ہوگا کیا؟ لوگ آرام سے لے جائیں گے، کھانے پینے کا عمدہ انتظام کریں گے۔ اس پر ناراض ہو کر فرمایا کہ بس تم کو تو ایک لے دے کر کھانا اور پینا ہی ہے، بس یہی رہ گیا ہے۔

حضرت والا تو باطنی نگاہوں سے کچھ اور ہی دیکھ رہے تھے، اور حضرت کے یہ تمام افعال واقوال اس کی طرف غمازی کرر ہے تھے، مگر ہم بدفہم لوگ سمجھ نہ سکے۔

جہاز میں سوار ہوا اور ذرا دیر میں جب کمرہ میں حضرت سے ملنے گیا تو حضرت مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے، اور میں پاسپورٹ وغیرہ کا جھولا گردن میں لٹکائے داخل ہوا تھا، یہ دیکھ کر کسی اور ہی انداز میں فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ میں نے فوراً

اسے گردن سے نکال کر رکھ دیا، اور عرض کیا کہ اس میں پاسپورٹ وغیرہ ہے، اسی اثناء میں چہرہ کی طرف میں نے اس خیال سے دیکھا کہ اس کی وجہ سے کچھ ناگواری تو نہیں ہے، تو دیکھتا ہوں کہ آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں جیسے آنسو نکل آئیں گے، آہ آہ! افسوس افسوس! حضرت کی اس محبت وشفقت پر قربان جاؤں، اور ان کی جدائی پر کیسا ماتم کروں اور کتنا کروں؟ خیر۔

اس وقت میں حیرت میں تھا کہ یہ بات یعنی اس حالت میں میری حاضری اس قدر متاثر کرنے والی کیوں بنی، پھر سوچا ممکن ہے کہ لوگوں اور بچوں کی جدائی اور فراق کا یہ اثر ہورہا ہو، لیکن اب خیال ہورہا ہے کہ شاید حضرت والا کو اس وقت خیال ہوا ہو کہ دیکھو کیسے خوشی خوشی اور ذوق وشوق سے جارہے ہیں، کہ اس شوق میں ہر ناگوار چیز خوشگوار اور آسان ہے، مگر آنے والے مراحل جو کہ صعب تر ہیں، جہاں کہ پیر پھسلنے کا خطرہ ہے، ثابت قدمی دشوار اور مشکل ہے، جہاں کہ صبر واستقلال کی آزمائش اور ایمان ویقین کی جانچ ہے، اس سے بے خبر ہیں۔ اور وہ وقت قریب تر ہے، اور وہ گھڑی وہ گھڑی ہوگی جبکہ نیچے پانی ہی پانی ہوگا اور اوپر آسمان ہوگا اور بے بسی کا عالم ہوگا اور وہی کٹھن اور مشکل وقت ان لوگوں سے جدائی کا اور اپنے محبوب حقیقی سے ملاقات کا وقت مقرر ہے، اس وقت یہ سب لوگ ہوں گے اور میں نہ رہوں گا۔ ان لوگوں کی میقات ابھی دور دراز ہے اور میری میقات قریب در قریب ہے، یہ لوگ **لبیک اللّٰھم لبیک** سات آٹھ دن بعد کہیں گے اور میں جمعہ کی شب گزار کر شب میں کہوں گا، ان لوگوں کی لبیک زبانی ہوگی اور میری لبیک حقیقی اور معنوی ہوگی، ان لوگوں کا احرام بیت الرب کی زیارت کے لئے ہوگا، اور میرا احرام رب البیت کی زیارت کے لئے ہوگا، میرا کچھ اور ڈھنگ کا احرام بندھے گا نیز اور ہی قسم کا میرا جانا

ہو گا۔اس وقت یہ لوگ کیا کریں گے؟ اور کیسے اور کس طرح اپنے کو سنبھالیں گے؟ الامان والحفیظ، جو بچیاں کہ زندگی میں کبھی بھی نظروں سے اوجھل نہ ہوئی تھیں ان کی نظروں سے اوجھل ہوں گا، اور ایسی پُر خطر جگہ اوجھل ہوں گا، عنقریب ہی ان سے جدا ہوں گا۔اس مختصر سی زندگی میں کتنے اور کیسے کیسے غموم کے ہجوم ان پر ہوئے، مگر میری وجہ سے سب غلط ہوتے گئے، ماں کا غم، پیاری بہنوں کا غم میں نے غلط کیا۔ان کی گود سے ان کے کتنے اور کیسے کیسے لختِ جگر دور ہوئے، ان تمام کا غم میری وجہ سے غلط ہوتا گیا، مگر جدائی کا جو بھیانک منظر ان لوگوں کے سامنے آنے والا ہے، ان لوگوں کے اس غم کو کون غلط کرے گا؟ کیسے برداشت کریں گی اور کیا کریں گی؟

جو ذات کہ ایسی رحم دل و نرم دل تھی، جس کا دل کسی کی مصیبت اور غم و الم، دکھ بیماری برداشت نہیں کرسکتا تھا، ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا تھا، تو پھر ایسے مشفق اور شفیق از صد باپ کے دل میں اپنے دو لختِ جگروں کے متعلق اگر ایسا خیال آیا تو پھر اس خیال کا آنا کوئی معمولی بات نہ تھی، مگر قربان جایئے حضرت بھی صبر و استقلال کے ایک پہاڑ تھے، امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو حد سے باہر نہیں آنے دیا، پلکوں نے انھیں ایسا چھپالیا جیسے صدف موتیوں کو، اور حضرت کے ایمان و یقین نے چہرہ پر اس کے بعد افسردگی کو بھی گوارا نہیں کیا۔

بھائی! دو روز نہیں بلکہ تینوں دن بڑے مزے سے گذرے، کوئی بات نہ تھی، ہاں اتنی بات تھی کہ حضرت نے کچھ خاموشی سی اختیار فرمائی تھی، جہاز کے لوگوں نے تقریر کی بھی فرمائش کی، مگر کچھ جواب دے کر ٹال دیا کرتے تھے۔ ایک روز غالباً جمعرات کو مولوی جامی صاحب اور ڈاکٹر صاحب اور اس خادم کو بلا کر فرمایا بھائی! سفرنامہ لکھتے ہو تو ایسا لکھو کہ جس سے لوگوں کو کچھ فائدہ پہونچے، اچھی طرح لکھو۔ یہ

بھی فرمایا کہ بھائی میں وہاں تقریر وغیرہ نہیں کروں گا، میں بڑا بن کر تھوڑے ہی جا رہا ہوں، ہاں البتہ جب اللہ کی طرف سے حکم ہوگا تو پھر کہوں گا، کچھ اسی قسم کی اور باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ اب جاؤ کام کرو، اور جس دن سے جہاز پر سوار ہوئے، اسی دن سے تنہائی میں زیادہ رہتے، اور ہاتھ میں تسبیح لئے پڑھا کرتے تھے اور بیٹھے بیٹھے کھڑکی سے بس سمندر ہی کی طرف مستقل نظر رہتی تھی۔ معلوم نہیں کیا دیکھتے تھے، اس میں کیا کشش تھی، نہ تو اس میں کسی قسم کے مناظر ہی تھے اور نہ مچھلیوں کا اچھلنا کودنا ہی تھا، اور نہ چڑیاں ہی اُڑتی بیٹھتی نظر آتی تھیں، اور نہ جہازوں ہی آمد ورفت تھی، صرف پانی ہی پانی تھا، اور لہریں اور موجیں کسی مردِ مومن کی منتظر اور ہنس کھیل رہی تھیں، موجیں مارتی رہتی تھیں اس لئے سمندر اور اس کی لہروں سے مناسبت تھی اور مزا آتا تھا، یا غالباً اس مردِ کامل اور مردِ دانا کی دوربین نگاہیں دنیاوی قانونی بندشوں سے گھبرا کر اور لوگوں کی غیر شرعی روشوں سے اکتا کر قیامت تک کے لئے ایک مناسب اور عمدہ خوابگاہ تلاش کر رہی تھیں۔ جمعہ کا دن تھا جو کہ ہم لوگوں کے لئے قیامت صغریٰ کا دن تھا۔ پورا دن ہنستے کھیلتے گذرا، بعد مغرب حضرت والا معمولات سے فارغ ہوکر استنجے کیلئے تشریف لے گئے، اور وہاں سے واپس تشریف لاکر سامنے ہی ایک شیشہ تھا اس میں اپنا چہرہ دیکھنے لگے اور ممتاز (۱) سے کہا دیکھو میری صحت کیسی ہے؟ ممتاز نے کہا کہ حضرت ماشاء اللہ بہت عمدہ صحت ہے، آپ ایسے ہیں اور آپ ایسے ہیں، اس پر فرمایا ہاں جی صحیح کہتے ہو۔ وہاں بمبئی میں ایک صاحب کہتے تھے کہ آپ کے چہرے پر کلال وملال کا اثر ہے وغیرہ وغیرہ، اس کے بعد پوری قوت سے ممتاز احمد کا سر ہلایا اور اچھی طرح ہلایا، اسی اثنا میں جہاز کے ایک آدمی عبد الحمید کاشمیری ملنے آگئے، ان سے ملاقات کی اور مصافحہ کیا، ان کو دعائیں دیں، جب تک کھانا بھی آگیا۔ عبد الحمید

صاحب جب مل کر کمرے سے باہر نکل آئے تو ممتاز احمد نے کہا حضرت کھانا رکھوں؟ حضرت والا نے فرمایا ہاں رکھو، یہ کہتے کہتے کچھ حالت بدل گئی اور عجیب وغریب ہوگئی، ان کا کہنا ہے کہ چہرہ سرخ، آنکھیں سرخ ہوگئیں اور چڑھ گئیں۔ ممتاز جس انداز سے گردن اور سینہ تان کر بتاتے ہیں وہ کیفیت نقوش میں بھلا کیسے آسکتی ہے، یوں سمجھئے گویا حضرت والا معشوقانہ انداز میں تن کر بیٹھ گئے، ممتاز نے یہ حالت دیکھ کر سمجھا کہ حضرت والا پر کوئی کیفیت طاری ہوئی ہے، وہ گھبرا کر کمرہ سے باہر نکلے، دروازہ پر عزیزم ارشاد احمد سے ملاقات ہوگئی، اس سے کہا بھائی آج کھانا تم کھلاؤ۔ حضرت کسی کیفیت میں ہیں مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے، ارشاد میاں نے دروازہ کھول کر دیکھا تو وہ بھی یہ حالت دیکھ کر ڈر گئے، سمجھا کہ بہت جلال میں ہیں، اس لئے ممتاز احمد صاحب سے کہا بھائی تمہیں کھلاؤ، خیر ممتاز اندر گئے اور حضرت والا کو پکڑ کر کہا، حضرت، حضرت، حضرت والا کچھ بولے نہیں، غالباً زبان بند ہوچکی تھی۔

عزیزم! کیا کہوں، جتنا بھی روؤں کم ہے اور جس قدر بھی لکھوں تھوڑا ہے۔

اس دن اتفاق سے آٹھ نو دن کے بعد خیال ہوا تھا کہ اتنے دنوں سے معمولات بعد مغرب کے ترک ہورہے ہیں، اب مقدس سرزمین پر پہونچنے کے دن بھی قریب آرہے ہین۔ تین دن ہوگئے، پانچ یا چھ روز اور باقی ہیں خدارا معمولات شروع کردوں۔ اطمینان وسکون بھی ہوگیا۔ یوں ہم سبھی لوگ کمرہ ہی کے اردگرد رہتے سہتے تھے، جن لوگوں کی مثلاً جامی صاحب وغیرہ کی سیٹیں نیچے درجہ کی تھیں وہ کھانا کھانے چلے گئے، اور میں پانچ چھ کمرے کے بعد ایک ہال تھا وہاں پڑھنے لگا۔ اللہ اللہ کی دو تسبیحوں کے بعد طبیعت گھبرانے لگی اور بار بار تقاضا ہوتا تھا کہ چلو چلو، مگر مجھے خیال ہوتا تھا کہ چونکہ اتنے دنوں سے پڑھ نہیں رہا ہوں اس لئے نفس کو شاق گذر رہا ہے،

لہٰذا اب تو اور پڑھنا چاہیئے۔ اسی کشمکش میں تھا کہ ممتاز احمد تیزی سے آئے اور کہا کہ حضرت کی طبیعت معلوم نہیں کیسی ہے، کچھ خراب معلوم ہوتی ہے۔ میں فوراً ہی اٹھا اور دوڑا ہوگیا اور دل ہی دل میں خیال کرتا جاتا تھا کہ ریاح وغیرہ کا کچھ غلبہ ہوگیا ہوگا، ٹھیک ہوجائیں گے۔ جب اندر داخل ہوا تو حضرت نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور لب پر لب ملے ہوئے تھے، بالکل خاموش! وہ نظر نہیں بھولتی، وہ نظر کیسی تھی؟ وہ نگاہ کیسی تھی؟ نہ اس کی مثال دے سکتا ہوں اور نہ اس کی تعبیر ہی تحریر میں لاسکتا ہوں، اور چہرہ دیکھا حضرت کا، سفید چمکدار پسینے پسینے اور بایاں ہاتھ اوپر بے اختیار حرکت میں! میں نے جاتے ہی اپنے ہاتھ سے حضرت کے ہاتھ کو گٹوں سے کہنیوں تک مس کیا۔ پسینہ سے تر پایا۔ دیکھ کر گھبرا گیا اور سمجھ گیا کہ یہ معاملہ صرف ریاحی نہیں بلکہ کچھ اور ہی ہے، اور ہماری خرابی کا وقت آ گیا ہے۔ میں فوراً کمرہ سے باہر نکلا کہ ڈاکٹر صاحب اور لوگوں کو بلا لاؤں اور تنہا ممتاز حضرت کو پکڑے ہوئے تھے، کاش کہ کوئی اپنا آدمی مل گیا ہوتا تو میں اس سے کہہ کر فوراً حضرت کے پاس چلا آتا، شاید کچھ بولے ہوتے، کچھ کہتے، مگر سب لوگ نیچے جاچکے تھے۔ میں نے محمودہ (حضرت مولانا کی نواسی، اور حضرت قاری صاحب کی چھوٹی صاحبزادی) کو لیا کہ بیٹی چلو نیچے جہاں لوگ رہتے ہیں، اس کا راستہ دکھاؤ، میں بھول جاؤں گا۔ وہ کبھی آگے ہوتی اور میں پیچھے رہتا اور کبھی وہ پیچھے رہ جاتی اور میں آگے نکل جاتا، خیر پہونچا۔ بیچارے جامی صاحب، ڈاکٹر صاحب وغیرہ کھانا لے کر بیٹھے تھے، کوئی ہاتھ دھورہا تھا اور کوئی دھو چکا تھا۔ صرف اتنا کہہ کر کہ بھائی جلدی چلو، حضرت کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، فوراً بھاگا ہوا آ گیا۔

عزیزم! اس واقعہ کے لکھنے اور پڑھنے میں دیر لگ رہی ہے، ورنہ یوں میرا آنا جانا پانچ چھ منٹ کے اندر اندر ہوگیا، اور جب وہاں سے واپس آیا ہوں تو وہ

کیفیت بھی بدل چکی تھی۔ حالت سرعت سے غیر ہوتی گئی، سب لوگ جمع ہو گئے، جہاز کے دو ڈاکٹر بلائے گئے، ان لوگوں نے انجکشن لگایا، قے پر قے ہو رہی تھی، لوگ کہہ رہے تھے کہ قے کا ہو جانا اچھا ہے، طبیعت ٹھیک ہو جائے گی، اور اس کے ساتھ تشویش کا اظہار بھی کرتے جاتے تھے۔ بھائی زکی (حضرت کے عزیز اور خادم) وغیرہ سے میں نے کہا کہ حضرت کو اب لٹا دو، زکی بھائی نے یہ کہہ کر کہ حضرت لیٹ جایئے، لٹا دیا، مگر حضرت والا اس عالم میں تھے ہی نہیں، کسی اور عالم میں تھے، وہ عالم کیا تھا، اس کو کیا لکھوں، وہ یہ تھا کہ ایک عالم ربانی اس دارِ فانی سے رحلت کر رہا تھا اور ہم لوگ مجبور و معذور صرف جہاز کے دو ڈاکٹروں پر اکتفا کئے ہوئے اپنی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، کس کے پاس جائیں اور دل کی بھڑاس کیسے مٹائیں، دوڑ کر کہاں جائیں، ایک محدود جگہ میں محبوس اور خدا پر بھروسہ تھا۔ انجکشن وغیرہ سے نبض کچھ قوی ہونے اور ہاتھ پیر کی رگیں کچھ پھڑ کنے لگیں، اس پر لوگوں نے کہا اب حالت بہتر ہے، خیر اطمینان کیا ہوتا، مگر انسانی فطرت ہی کچھ ایسی ہے کہ لوگوں کے بہلانے میں آ ہی جاتی ہے، پھر ساڑھے گیارہ پونے بارہ بجے شب میں ایک ہچکی لی، کلمہ پڑھا اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون

لبیک جو کہی وہ سچی کہی، اللہ نے قبول فرمائی، اس وقت فوراً ارشاد سے میں نے کہا کہ کمرہ سے باہر کھڑکی کی طرف عورتیں ہیں، اس طرف فوراً تم چلے جاؤ، حضرت کا وصال ہو گیا۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی بے خبری میں سمندر میں کود جائے، اس وقت اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو صبر واستقلال عطا فرمایا، اور سنبھالا، اور یہ بھی حضرت کی کرامت ہی ہے۔ دوسرے یہ کہ بیٹیاں بھی کس باپ کی ہیں اور ٹکڑے کس جگر کی ہیں۔ صبر و توکل کا سبق بھی حضرت نے ایسا پڑھایا ہے کہ ان لوگوں کے رگ وریشہ میں سرایت کئے

ہوئے ہے اور قضاوقدر پر رضا تو ان لوگوں کی خو بنا کر حضرت گئے ہیں۔

الغرض یہ متبرک سایہ ہمارے سروں سے اٹھ گیا، ہم لوگ یتیم ہو گئے، ہمارا ہمدرد اور ہمارا غم خوار ہم سے دیکھتے دیکھتے رُخصت ہو گیا، آن کی آن میں اپنے مشفق ومحسن کو ہم کھو بیٹھے، ہم بے بال و پر ہو گئے۔ اب بلندی پر پرواز کیا کریں، دین وایمان کو سلامت رکھ لیں یہی بہت ہے۔ آہ آہ! اپنے اس ایاز کو نوازنے والا محمود اس دارِ فانی سے دارِ بقا کی جانب کوچ کر گیا، اس ناکارہ کو شرف امامت اور گوناگوں نوازشوں سے نوازنے والا ہم سے جدا ہو گیا۔ بھائی! جس قدر بھی غم والم منایا جائے کم ہے، جس قدر بھی خون کے آنسو بہائیں تھوڑا ہے، بلکہ جان بھی دیدی جائے تو وہ بھی کم ہے۔

متاعِ جانِ جاناں جان دینے پر بھی سستی ہے
مگر حقیقت تو یہ ہے کہ سب بے سود ہے۔

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال　　　صدسال می تواں بہ تمنا گریستن

حضرت والا انگلیوں پر شمار فرماتے تھے کہ ابھی اتنے دن اور ہیں، جدہ پہونچنے کے لئے بے تاب تھے، جلدی پہونچنے کی یہی صورت تھی جو پیش آئی۔

اس کے بعد فکر ہوئی کہ اب کیا کیا جائے، واپسی ممکن نہیں اور نہ مناسب ہی ہے، اور ہم سب کے دلوں میں محبت کا شدید تقاضا ہوا کہ کاش حضرت والا کا کہیں مزار ہو جاتا اور ان کی کچھ نشانی قائم ہو جاتی، تو ہم لوگوں میں سے یا حضرت والا کے اور دیگر متوسلین و متعلقین میں سے کوئی بھی تو زندگی میں کبھی بھی اس علامت کے سامنے کھڑا ہو جایا کرتا۔ اس جذبہ کے ماتحت فکر ہوئی جسد مبارک کو مدینہ شریف یا مکہ شریف کسی صورت سے پہونچایا جائے۔

اسی جذبہ کے تحت امیر الحجاج حاجی سلیمان میمن اور زکی بھائی دونوں آدمی

پرسر (جو کہ جہاز کا ایک افسر ہوتا) اس کے پاس گئے، اور حضرت والا کے سانحہ کی خبر دی اور اس سے دریافت کیا کہ کیا کیا جائے۔ اس نے کہا کہ جہاز کے قاعدے کے مطابق لاش کو سمندر کے حوالے کر دینا ہوگا، پھر ان لوگوں نے اس سے کہا کہ اگر ہمارے ماں باپ ہوتے یا عزیز ہوتے تو ہم لوگوں کو اس پر عمل کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوتا، لیکن حضرت والا کی ذات اس سے کہیں ارفع واعلیٰ ہے، یہ لاش صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ سارے مسلم ممالک کی امانت ہے اور ہر جگہ ان کے ماننے والے ہیں، خواہ امریکہ ہو خواہ انگلینڈ، ایسی صورت میں وہ لوگ ہم لوگوں سے دریافت کریں گے کہ تم لوگوں نے یہ کیا کیا کہ حضرت کو سمندر کے حوالے کر دیا۔ کم از کم جدہ تک لانے کی کوشش کی ہوتی تا کہ ان کی نشانی ہو جاتی۔ اس گفتگو کا اس کے اوپر اثر ہوا۔ اس نے کہا کہ میں کپتان سے مل کر آتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آیا اور کہا کپتان راضی نہیں ہوتا۔ پھر ان لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ بمبئی اور جدہ تار کے ذریعہ اطلاع کرنی چاہئے، پھر ہم لوگوں کو بھی جمع کر کے مشورہ کیا، اور مشورہ میں یہ بات طے ہوئی کہ ضرور تار کے ذریعہ اطلاع دینی چاہئے، لہٰذا جدہ قدوائی صاحب سفیر ہند اور بمبئی عبد الستار صاحب کو تار دے دیا، پھر دوبارہ ۶/ بجے زکی بھائی اور حاجی سلیمان صاحب اور ایک عبد الحکیم صاحب کپتان سے ملنے گئے اور اس سے تفصیلی گفتگو کی، جو اس سے قبل جہاز کے دوسرے افسروں سے ہو چکی تھی۔ کپتان نے کہا میرے پاس برف کی کمی ہے اس کو معلوم کر لوں تو قطعی فیصلہ کروں۔ آپ لوگ ۷ یا ۸/ بجے ملئے، دوبارہ پھر وقت مقررہ پر میں بھی ان لوگوں کے ساتھ گیا۔ کپتان نے کہا برف تو کم ہے لیکن پھر بھی ہم کوشش کریں گے کہ جہاں تک لے جا سکتے ہیں لے جائیں، اور اس درمیان برف بنانے کی کوشش کریں گے۔ آپ لوگ حضرت کی لاش

تیار رکھئے تا کہ سامان سب ٹھیک ہوجانے کے بعد ان کو ایک مخصوص بکس میں رکھ دیا جائے۔ آہ آہ! جو ذات کہ کیسی کھلی فضا میں رہنے والی تھی اور کیسے اور کس طرح رہتی تھی، اس کو آج ایک مخصوص برفیلے بکس میں رکھنے کی تیاری کی جارہی ہے۔ لہٰذا ہم رفقاء اور عورتیں جمع تو تھے ہی، کرنا کیا تھا؟ جب لے جانے کا وقت قریب آ گیا تو میں نے عورتوں سے کہا کہ بھائی حضرت والا سے یہ آخری ملاقات ہے، اور اس چہرے کا آخری دیدار ہے۔ تم سب لوگ دیکھ لو، چنانچہ ہماری عورتوں نے بہت صبر واستقلال سے کام لیا، اور سبھوں نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر **السلام علیکم** اے ابا، **السلام علیکم** اے ابا، **السلام علیکم** اے نانا، **السلام علیکم** اے نانا، کہہ کر رخصت کیا۔ ہماری بیوہ ماں نے کہا کہ آپ ہی پر تو ہمیں تکیہ تھا، آج آپ نے بھی ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔

جہاز پر کنارے آخری حصہ میں اپنے کمرے کے سامنے ہی ایک اونچی جگہ تھی، الگ تھلگ اسی پر ایک لوہے کے بکس میں ساڑھے دس بجے برف کے ساتھ اسی کپڑے میں جو کہ پہلے سے حضرت والا پہنے ہوئے تھے، لٹا دیا گیا۔ حضرت والا کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بند تھیں، اور کلمہ شہادت کی انگلی کھلی کچھ کھڑی کچھ جھکی اور اس کے دوسرے پور پر انگوٹھا ٹکا ہوا، قریب قریب اس کیفیت میں تھی جو کیفیت کہ بعد تشہد ہوتی ہے، اور اوپر سے بادامی چادر سلک کی ڈال دی گئی۔ لٹانے کے بعد میں نے سوچا کہ اب معلوم نہیں کیا ہو اور کیسا وقت آوے، زندگی میں تو کبھی ہاتھ کو بھی بوسہ دینے کی جرأت وہمت نہ ہوئی تھی، اب یہ آخری ملاقات ہے، اس دارِ فانی سے چلتے چلاتے وقت تو حضرت کی پیشانی کو بوسہ دے لوں، لہٰذا چادر کے اوپر سے پیشانی کو بوسہ دینے کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت آرام سے بادامی چادر اوڑھے ہوئے سوتے رہے،

اس وقت حضرت امیر خسرؔو کا یہ شعر یاد آیا۔

گوری سوئے سیج پر مکھ پڑ دارے کیس
چل خسرؔو گھر اَپنے رین بھئی بدیس

برادرم! اسی اثنا میں ایک روز میں نے اپنی بچیوں اور عورتوں سے کہا کہ دیکھو بھائی جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا، یہ چیز سب کے ساتھ پیش آنے والی ہے۔

آنے والی کس سے ٹالی جائے گی — جان ٹھہری جانے والی جائے گی

حتیٰ کہ ہمارے نبی کریم ﷺ جو کہ رحمۃ للعالمین تھے، ان کے ساتھ بھی یہ چیز پیش آئی۔ اس کے علاوہ ایک بات اور سنو! یہ دنیا فانی ہے اور اس کی ہر چیز فانی ہے، اور اس دارِ فانی میں رہنے والوں کی نہ تو دوستی کا بھروسہ ہے اور نہ ان کی محبت اور ہمدردی کا اعتبار ہے، معلوم نہیں کب کیا ہوجائے۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت والا کے احسانات ہم پر بہت ہیں، بے شمار ہیں۔ ہم ان کے احسانات زندگی بھر بھول نہیں سکتے ،مگر دیکھو ہم سے جدا ہوئے تو کس جگہ جدا ہوئے، اور ہمارا ساتھ چھوڑا تو کہاں چھوڑا، اور سنو! جو کچھ ہوا منجانب اللہ ہوا ہے، اور ہم لوگوں کو اس سے عبرت حاصل کرنے کیلئے ہوا ہے، اور ہم کو اس واقعہ سے تنبیہ کی گئی ہے کہ رزق کی طرف سے، مرض وصحت کی جانب سے، اور آرام وتکلیف کی طرف سے سارا بھروسہ اور سارا اعتماد تم نے انھیں پر کرلیا تھا۔ اب بتاؤ اس وقت تم سمندر کی لہروں میں ہچکولے کھارہے ہو اور مدد اور امداد کے ہر قسم کے اسباب وذرائع تم سے منقطع ہوچکے ہیں، اور جن پر تم کو تکیہ تھا وہ دیکھو بغیر روح وجان کے مجبور الگ تھلگ وہاں سو رہا ہے، اب تم کیا کروگے، اب تم کو کون کھلائے پلائے گا؟ تمہاری کون مدد کرے گا، اور ساحل تک تم کو کون پہونچائے گا؟ بے شک اللہ تعالیٰ ہی ہمارا اور سب کا کارساز ہے اور وہی بندوں کی پرورش کرنے والا

ہے، اور اپنے بندوں کی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے، اور وہی ہمارا حامی و مددگار ہے، لہٰذا ہم کو اور تم سب لوگوں کو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا چاہئے، اور اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جانا چاہئے، اور اللہ تعالیٰ سے اپنا رشتہ مضبوط کرنا چاہئے۔

عزیزم! اکثر حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ میں توجح کر چکا ہوں، میرا فرض ادا ہو چکا ہے تم لوگ چلے جاؤ، مگر ہم لوگ کہتے تھے کہ نہیں حضرت آپ بھی ساتھ تشریف لے چلیں، آپ کو چھوڑ کر ہم لوگ نہیں جا سکتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا ہم لوگوں کو صرف پہونچانے ہی آئے تھے۔ ۲۴ر نومبر تک جسم و روح دونوں کے ساتھ ہم لوگوں کے ساتھ رہے، اس کے بعد جسم سے روح تو پرواز کر گئی، **ھٰذا فراق بینی وبینک** کہہ ہم سے رخصت ہوئے، راستہ پر لگا دیا کہ اب چلے جاؤ، چوتھے دن عدن پہونچ جاؤ گے، اور اس کے بعد جدہ دو دن کا راستہ ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسے اسباب پیدا فرما دئے کہ حضرت والا کے شفقت و محبت والے بے روح مجسمہ نے ۲۴ر تاریخ کے بعد ساحل جدہ تک پہونچایا، **الکریم إذا وعد وفیٰ**۔ اس جسم بے روح کی وجہ سے ایسی تقویت تھی کہ گویا حضرت والا ساتھ ہی ساتھ چل رہے ہیں اور وہاں موجود ہیں۔

روزانہ ڈاکٹر جسم کا معائنہ کرنے جاتا تھا اس سلسلہ میں ہم لوگوں کو بھی زیارت نصیب ہو جاتی تھی، اگر اسی دن تدفین ہو جاتی، تو ہم لوگ تو خیر برداشت کر جاتے مگر ممکن تھا کہ حضرت کی دو بچیوں کے ہاتھ سے صبر و استقلال کا دامن چھوٹ جاتا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی مصلحت تھی اور وہ جو کچھ کرتا ہے اپنے بندوں کے حق میں بہتر کرتا ہے۔

برادر! اکثر مجلس میں فرمایا کرتے تھے کہ نہیں مانو گے تو اٹھوں گا اور جوتا

پہنوں گا اور چل دوں گا، پھر تم لوگ مجھ کو پاؤ گے نہیں۔ بھائی ویسا ہی ہوا، اس طرح دنیا سے آناً فاناً گئے کہ گویا چپکے سے اٹھے ہوں اور کہیں چل دیئے ہوں، اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اور ان کا فضل ہے کہ ہم سب سے خوش خوش گئے ہیں، اب اللہ تعالیٰ حضرت والا کی تعلیمات پر عمل کی توفیق عطا فرمائے تاکہ حضرت کی روح بھی خوش رہے۔ آمین

اب اس کے بعد کیا ہوا، اس کو سنو! بمبئی سے ۶ ر بجے شام کو تار کا جواب آیا کہ آپ لوگ حضرت کی لاش کو جدہ تک لے جانے کی کوشش کریں، ہم مغل لائن کے منیجر سے کوشش کررہے ہیں کہ وہ جہاز کے کپتان کو تار دیں کہ وہ جدہ تک لے جائیں، اور جدہ سے دوسرے دن قدوائی صاحب کا تار آیا، ۲۶ ر نومبر ۶۷ء کو آپ لوگ حضرت والا کے جسد مبارک کو جدہ لائیں، میں سعودی حکومت سے کوشش کررہا ہوں کہ وہ مدینہ منورہ میں تدفین کی اجازت دیدے۔ دو دن گذرنے کے بعد ۲۸ ر نومبر کو ذکی بھائی نے دوبارہ تار دیا کہ سعودی حکومت نے اجازت دی یا نہیں؟ اس کا جواب دیں، ۲۹ ر نومبر کو کپتان نے بھی اسی مضمون کا تار قدوائی صاحب سفیر ہند کو دیا، لیکن مشیت الٰہی کچھ ایسی تھی کہ ۲۹ ر نومبر ۶۷ء کو دس بجے رات تک کوئی اطلاع جدہ سے نہیں آئی، تو اس نے ہم لوگوں کو بلایا اور کہا کہ اب تک کوئی اطلاع نہیں آئی، اور بغیر اجازت کے لاش کو گودی کے اندر لے جانا قانوناً جرم ہے، وہاں کی حکومت تمام مسافروں کا قرنطینہ کرسکتی ہے اور جہاز کے اوپر جرمانہ کرسکتی ہے۔ اب کیا کریں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا، تھوڑی دیر خاموشی رہی، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں رحم ڈال دیا اور اس نے کہا کہ ایک موقع اور ہے، اور وہ یہ ہے کہ صبح ۶ ر بجے کے قریب جہاز جدہ پہونچ جائے گا، اس وقت وہاں کا پائیلٹ آئے گا ممکن ہے اس کی معرفت کوئی اطلاع آئے، لہٰذا وہاں تک لے چلتے ہیں، لیکن آپ لوگ بالکل تیار رہیں، اگر اس کی معرفت کوئی اطلاع

نہیں آئی تو ہم جہاز کو واپس سمندر کی گہرائی کی جگہ لائیں اور آدھ گھنٹہ کا موقع مل سکتا ہے۔ اس درمیان آپ لوگ تجہیز و تکفین کرلیں، ہم لوگ مجبوراً اس پر راضی ہوگئے، اور شب ہی میں کفن وغیرہ سب تیار کرلیا گیا کہ دیکھئے صبح کیا ہوتا ہے، آخر صبح بھی ہوئی، پائیلٹ صاحب بھی تشریف لائے، ان سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ صرف اتنی خبر ہے کہ جہاز پر ایک لاش ہے، اب اس کے متعلق حکومت نے اجازت دی یا نہیں اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں۔

کپتان نے پھر ہم لوگوں کو بلوایا اور اس لاعلمی کے متعلق اطلاع دی اور کہا کہ ایک موقع اور دیتے ہیں، وہ یہ کہ جہاز کو کنارے تک ہم لے جاتے ہیں، ممکن ہے کہ وہاں اطلاع آگئی ہو تو لاش کو کنارے پر اتار دیا جائے گا اور اگر نہ آئی ہوگی تو پھر آپ سب لوگ اتر جائیں گے، پھر آپ لوگوں سے مطلب نہیں۔ اس کو سوچ لیجئے، اگر اس پر ان کے اعزا اور آپ لوگ راضی ہوں تو پھر جہاز لے چلوں، پھر ہم لوگوں نے کہا کہ ہم لوگ خود اپنے ہاتھوں غسل اور تجہیز و تکفین کردیں اور نمازِ جنازہ پڑھ لیں گے۔ اس کے بعد مجبوراً چھوڑ دیں گے، اس پر وہ راضی نہیں ہوا، پھر ہم لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے؟ اگر لوگ بندرگاہ پر ہوں گے تو خیر، اور اگر خدانخواستہ نہ ہوں تو پھر ہم لوگ حضرت کو جہاز کے عملے کے حوالے کیسے کردیں گے، اس پر طبیعت کسی طرح راضی ہی نہ ہوئی، بھلا کیسے اور کس دل سے حضرت والا کو جہاز کے عملہ کے حوالے کردیتے۔ لہٰذا مجبوراً حضرت والا کو خلوت سے جلوت میں لایا گیا، اور غسل وکفن سے حضرت آراستہ کئے گئے، اور کافور وعطر ملنے کے بعد وہاں سے نیچے اتار کر کشادہ جگہ لائے گئے، جہاز کے مسافر ایک پر ایک گرے جارہے تھے، اس درمیان میں جہاز بھی کچھ گہرائی میں واپس آیا، خیر میں نے نماز پڑھائی۔

برادرم! حضرت والا نے اس نالائق کو شرفِ امامت سے نوازا تھا، یہ جلیل القدر ہستی مجھ کو آگے بڑھاتی اور خود پیچھے ہو لیتی۔ اللہ اللہ کیا تواضع ومسکنت تھی۔

نسیم صبح تیری مہربانی ۔۔۔ کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل

مگر یہ آخری نماز ایسی تھی کہ حضرت والا آگے لیٹے تھے اور میں سینۂ مبارک کے سامنے کھڑا رہا اور چار تکبیریں کہیں۔ بعد نماز لوگ اس طرح لے گئے کہ پتہ نہ چلا کہ کہاں لے گئے، نفسی نفسی کا عالم تھا، کوئی کہیں، کوئی کہیں، پھر ہر شخص ایک دوسرے سے بے خبر اپنی اپنی فکر میں اور اپنے اپنے رنج وغم میں، پھر معلوم ہوا کہ جنازہ نیچے گیا، اور وہاں بدن کے تین حصے پر سیمنٹ کی خوب وزنی تین پٹیہ باندھی گئی اور ایک لکڑی کے بکس میں جسد مبارک کو رکھا گیا، اور میں اِدھر اُدھر دوڑتا رہا کہ کون سی جگہ جاؤں کہ تدفین کو دیکھ سکوں، خیر ایک شخص نے بتایا کہ وہاں جاؤ، وہاں سے دیکھ سکو گے۔ لہٰذا برخورداران احمد متین اور احمد مکین کو ساتھ لیا اور بمشکل تمام ایک جگہ کھڑا ہو سکا، پھر دیکھتا کیا ہوں کہ ایک لکڑی کا بکس آہستہ آہستہ لٹکایا جا رہا ہے، یہاں تک کہ پانی کی سطح تک پہونچ گیا۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ اس بکس کو ہلایا جا رہا ہے، چند منٹ کے بعد حضرت کا جسد مبارک زبانِ حال سے یہ کہتا ہوا ؎

دریں دریائے بے پایاں، دریں طوفانِ موج افزا
سرافگندیم بسم اللہ مجریٰھا ومرسٰھا

پانی پر آ گیا اور سمندر نے فوراً ہی اپنی گود میں لے لیا، اور کچھ دور تک چمکتا ہوا جاتا نظر آتا رہا۔

عزیزم! بہت تیزی سے معلوم نہیں حضرت کہاں جا رہے تھے اور چلے گئے، پھر نظر نہ آئے، وہ بھی تسلی کا ایک ذریعہ ختم ہو گیا۔

مسیحا بن کے بیماروں کو کس پر چھوڑے جاتے ہو
فقط اک دل کا ساغر تھا اسے بھی توڑے جاتے ہو

اور سب لوگ اپنی اپنی زبانِ حال سے کہہ رہے تھے۔

سرو سیمینا بہ صحرا می روی　　سخت بے مہری کہ بے ما میروی
اے تماشا گاہِ عالم روئے تو　　تو کجا بہرِ تماشا می روی

مفتی نظام الدین صاحب نے اپنے تعزیت نامے میں لکھا ہے کہ قیامِ فتح پور کے ابتدائی دور میں حضرت والا یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

ہوئے ہم جو مر کے رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

حضرت والا کی یہ آرزو اور تمنا آج پوری ہوگئی، وہی ہوا جو چاہتے تھے، پھر اس دور میں اکثر و بیشتر اپنی مجلسوں میں یہ شعر پڑھتے تھے۔

آنے والی کس سے ٹالی جائے گی　　جان ٹھہری جانے والی جائے گی
پھول کیا ڈالو گے تربت پر مری　　خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائیگی

جو کچھ حضرت فرماتے تھے، منجانب اللہ فرماتے تھے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　گرچہ از حلقومِ عبد اللہ بود

چنانچہ ویسا ہی ہوا، پھول کیا ایک مٹھی خاک بھی ڈالنے والے محروم رہے، اتنی تمنا تھی کہ کہیں مزار ہوتا، تو کبھی اس کے سامنے کھڑے ہوکر کچھ تسلی حاصل کر لیتے، افسوس کہ یہ اپنی ساری تمنا پانی میں مل گئی۔ حضرت والا نے اپنے آپ کو فنا کر دیا تھا، اور شروع ہی سے حضرت والا کو فنائیت محبوب تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے دو گز نشان کو بھی باقی رکھنا پسند نہ کیا۔ حضرت ہمیشہ کھلی فضا کو پسند فرماتے تھے، اس لئے ان کی تدفین

دوگز زمین میں کیسے ہوتی، لہٰذا سمندر کے وسیع گہوارے میں حضرت والا سلائے گئے۔

برادر! حضرت والا جماعت صوفیاء کے ایک انمول موتی تھے، چنانچہ حضرت کے لئے سمندر ہی صدف بن گیا، اور بحر محبت میں غرق ہوگئے۔ عزیز من! حضرت والا اکثر یہ شعر بھی پڑھتے تھے، اور ادھر دو برس سے تو یہ حال ہی ہوگیا تھا کہ کہیں طبیعت حضرت کی لگتی نہیں تھی، کہیں چین وسکون جیسے ان کو ملتا ہی نہ تھا۔ آخر کار ایک مرتبہ مجبور ہوکر بمبئی میں یا الہ آباد میں حضرت والا نے ہم لوگوں سے فرمایا کہ بھائی کیا کروں؟ میرا تو یہ حال ہے۔

باغ میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جاکے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنے مقبول بندے کی آواز کو سن لیا، اور آرزو کو پورا فرمادیا، اور ایک تیسری جگہ ان کے لئے منتخب فرمادی۔

حضرت والا کی پوری زندگی ہی مخلوق خدا کی خدمت کے لئے وقف تھی، قدرت نے اسی لئے بنایا ہی تھا، امت محمدیہ کی بھلائی کے لئے دن ورات ایک کئے رہتے تھے، اور ساری زندگی اس روئے زمین پر بسنے والی مخلوق مستفید ہوتی رہی۔ اس کے بعد اس کا یہ فیض عام بند کیوں ہوتا، ان کے تبلیغ اور لطف وکرم عام کا دسترخوان لپیٹ کیوں دیا جاتا، اور پانی میں رہنے والی مخلوق خدا کیوں نہ مستفید ہوتی، چنانچہ سمندر کی دعوت کو بھی شرفِ قبولیت سے نوازا گیا۔

بھائی یہ مربی ومحسن چلتے چلاتے اپنے اس حال سے ہم سب کو ایک سبق دے گئے کہ اگر واصل الی اللہ ہونا چاہتے ہو تو اپنے آپ کو کسی شیخ کے حوالے اس طرح کرو کرو جیسے مردہ غاسل کے حوالہ ہوتا ہے، اور مخلوق سے الگ تھلگ ایسے رہو جیسے کہ میں

رہا، اور اخلاقِ رذیلہ سے اس طرح نکل جاؤ جیسے میں نے اپنے بدن سے کپڑوں کو الگ کردیا، ورپھر اخلاص وطلب کی چادر میں اس طرح لپٹ جاؤ جس طرح میں کفن میں لپیٹا گیا، اور پھر اس کے بعد دریائے محبت میں اس طرح ڈوب جاؤ کہ نہ تو ساحل پر پہونچنے کی تمنا ہو اور نہ کسی کنارے لگنے کی آرزو!

عبث ہے آرزو بحر محبت کے کناروں کی
بس اس میں ڈوب مرنا ہی ہے اے دل پار ہو جانا

اور اپنے آپ کو ایسا فنا کردو کہ کوئی نشان ہی باقی نہ رہ جائے، اور نہ کوئی علامت ہی۔

جب تدفین سے فراغت ہوگئی، تو جہاز پھر آگے چلا اور کچھ دور آگے چل کر حسب دستور رک گیا، اس انتظار میں کہ جدہ کی گودی سے کوئی اسٹیمر آئے اور اسے کھینچ کر ساحل پر لگائے، اسی اثنا میں دیکھا گیا کہ ایک کشتی بہت تیزی سے آرہی ہے اور اس پر کچھ لوگ بیٹھے ہیں، دیکھتے دیکھتے وہ کشتی جہاز سے لگ گئی، اس پر قدوائی صاحب اور ان کے ایک رفیق اور کچھ مزدور قسم کے لوگ تھے۔ اس نوجوان شیروانی پوش نے کھڑے ہوکر زور زور سے آواز دی کہ نعش لاؤ، نعش لاؤ، نعش کہاں ہے؟ نعش کہاں ہے؟ جہاز پر سے لوگوں نے جواب دیا کہ اسے تو دفن کردیا گیا، یہ سنتے ہی وہ بیچارے بہت برہم ہوئے اور اپنا سر پیٹنے لگے کہ یہ کیا غضب ہوا؟ اس کے بعد زینہ جہاز سے لٹکایا گیا اور قدوائی صاحب اور ان کے رفیق زینہ سے جہاز پر سوار ہوئے اور کپتان سے ملاقات کی، اور اس سے کچھ تیز تیز گفتگو بھی ہوئی۔ کپتان نے سارے قصے سنائے اور اپنا عذر بیان کیا، اب سوائے صبر کے کر ہی کیا سکتے تھے، بس بار بار قدوائی صاحب اور ان کے رفیق اپنا سر پیٹتے تھے اور افسوس کرتے تھے کہ بنا بنایا کام

کیسے بگڑ گیا، ہم نے دو دو تار اجازت کے متعلق دیا ہے، پھر قدوائی صاحب نے کپتان سے پوچھا اچھا بتایئے کہ غوطہ خوروں کے ذریعہ یا بذریعہ جال لاش برآمد ہو سکتی ہے، اس نے جواب دیا کہ نہیں اب نہیں مل سکتی۔

پھر انھوں نے امیر الحج حاجی سلیمان صاحب کو بلایا اور ان سے حضرت والا کے متعلق دریافت کرنے لگے، اور پھر بعد میں ہم لوگوں کو بھی بلایا اور افسوس کرنے لگے کہ خدا کو جو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے، اسی سے صبر ہوتا ہے اور صبر کرنا پڑتا ہے، اور ان سے معلوم ہوا کہ کنارے پر کافی احباب مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ سے آئے ہوئے ہیں اور حضرت والا کے تدفین کا انتظام مکہ شریف میں ہو چکا ہے، ایمبولینس اور لاش لے جانے کیلئے صندوق اور متعدد گاڑیاں موجود ہیں۔

بہر حال ہم لوگ کنارے پہونچے، مولوی امجد اللہ صاحب پر نظر پڑی جو کہ زور زور سے چلا رہے تھے کہ احرام باندھ لو، باندھ لو، فوراً مکہ چلنا ہے، ہم لوگوں نے جواب دیا کہ اب جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اب اطمینان سے چلیں گے کیونکہ جس کی وجہ سے جلدی تھی وہ ہستی ہی نہ رہی، اس کو ہم لوگ سمندر کے حوالہ کر چکے ہیں۔ یہ خبر جب ان لوگوں کو معلوم ہوئی تو کافی احباب سر جھکائے افسوس کرتے ہوئے واپس ہو گئے۔ بعض احباب نے حضرت والا کو دیکھا تک نہیں تھا، ان کی تمنا تھی کہ زندگی میں نہیں دیکھا تھا تو بعد مرنے کے ہی سہی اس مقدس ذات کے دیدار سے مشرف ہو جائیں، لیکن بیچاروں کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔ قدوائی صاحب اور مولوی امجد اللہ صاحب سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے ہمارے دونوں تاروں کا جواب دیا تھا جو کسی وجہ سے ہم لوگوں کو نہیں مل سکا۔ اس کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آئی ہے کہ وہی دن عدن کی آزادی کا تھا اور وہاں پر لوگ اپنی آزادی کی مسرت میں بہ شکل خوشی ہمارے غم میں شریک تھے، اس

میں ان لوگوں سے لاپرواہی ہوئی اور تار کے جواب کو جہاز تک نہ بھیج سکے۔

مکہ شریف کے دورانِ قیام معلوم ہوا کہ بمبئی کے ایک رئیس زین العلی رضا جن کے تعلقات امیر فیصل سے خود ہیں، ان کا تار آیا تھا کہ حضرت والا کے تدفین کا انتظام مکہ مکرمہ میں ہو، اس پر امیر فیصل والی سعودی حکومت نے ریاض سے مکہ مکرمہ تار بھیجا کہ ایک شیخ ہندی کا جہاز پر انتقال ہوگیا ہے، ان کی تدفین کا انتظام جنت المعلیٰ میں کیا جائے، اس اطلاع پر جنت المعلیٰ میں حضرت حاجی صاحب مہاجر مکی کی قبر کھولی گئی تھی اور جب اپنے احباب متعلقہ حکام کے پاس جاتے تھے تو وہ تعجب سے دریافت کرتے تھے کہ یہ شیخ ہندی مولانا وصی اللہ صاحب کون ہیں، جن کے متعلق امیر فیصل کا تار آیا ہے، کیونکہ سعودی حکومت کی تاریخ میں غالباً یہ پہلا واقعہ ہے کہ خود والی حکومت کی طرف سے اس قسم کا تار آیا ہو، اور وہ بھی جنت المعلیٰ کے لئے، جس میں کہ دفن کرنا لوگوں کا بند کردیا گیا ہے۔ حضرت اقدسؒ کے اس **وصال فی السفر** اور **تدفین فی البحر** پر کسی محبؒ نے کیا خوب لکھا کہ ؎

دل اپنی طلب میں صادق تھا گھبرا کے سوئے مطلوب گیا
دریا سے جو موتی نکلا تھا دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

باب ۱

ذوق ومزاج اور خصوصیات

کسی اللہ والے بزرگ کے ظاہری احوال کو کما حقہ تحریر کرنا بھی گو کہ بے حد دشوار ہے، اگر کوئی سوانح نگار یہ ارادہ کر کے بیٹھے کہ وہ صاحب سوانح کے ظاہری خدوخال ہی پورے طور پر نمایاں کر دے کہ ناظرین کے سامنے ان کی زندگی چلتی پھرتی، متحرک اپنی اصل صورت میں آجائے، تو یہ بہت مشکل ہے۔ تاہم کوشش پوری کی جائے، الفاظ وعبارت پر اچھی گرفت ہو مشاہدہ واحساس صحیح اور گہرا ہو تو سوانح نگار کسی حد تک اس میں کامیاب ہو سکتا ہے لیکن اس کے ذوق ومزاج اور اس کی باطنی خصوصیات اور اس کے اندرونی حسن وجمال کو کسی بھی درجہ میں اگر واضح کرنا چاہے تو لوہے لگ جائیں گے۔ کوئی ایک خصوصیت بھی پورے طور پر شاید ظاہر نہ ہو سکے۔ ؎

لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

والا منظر ہوگا۔

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ کے حالات میں اب تک جو کچھ قلمبند کیا جا سکا ہے وہ آپ کی زندگی کا سرسری اور ظاہری خاکہ ہے آپ کا ذوق ومزاج، آپ کی باطنی خصوصیات آپ کا فضل وکمال گو کہ ان سطور میں کہیں کہیں اس کی جھلک ملتی ہے۔ مگر اس باطنی خوبی اور کمال کا حق یہ ہے کہ اسے مفصل اور مستقل بیان کی جائے، لیکن حیرانی یہ ہے کہ زمین پر بیٹھ کر آسمان کی تصویر کیسے بنائی جائے جس راہ پر آدمی کا قدم بھی نہیں پڑا ہے وہ اس مسافر کے احوال کیا بیان کر

سکتا ہے جس نے پوری عمر یہی راستہ طے کیا ہو اور بالآخر منزل پر کمر کھول کر آسودہ ہو، اندھے سے کہئے کہ چمن کے پھولوں کی رنگت، ان کا حسن وجمال اور مالی کے کمال فن کی داد دے تو یہ مطالبہ کہاں تک معقول ہوگا، یہی حال اس وقت سوانح نگار کا ہو رہا ہے اس کے سامنے حضرت والا کے اوصاف وکمالات کے ایک سے ایک درخشاں عنوان ہیں، اسے ان کا حسن وجمال بھی محسوس ہو رہا ہے مگر وہ ناظرین کو بھی محسوس کرادے اس کی مثال بس یہ ہے کہ ایک ننھا سا بچہ چاندنی رات میں نگاہیں پھاڑ پھاڑ کر بدر کامل کے خوبصورت اور حسین چہرے کو دیکھ رہا ہے۔ اس کی طبیعت متلذذ اور محظوظ بھی ہو رہی ہے وہ نگاہیں پھیر پھیر کر اپنے ماں باپ کو دیکھتا جا رہا ہے گویا وہ کہہ رہا ہے چاند کے جمال تاباں کی تاثیر میرے دل پر بھی ویسی ہی ہے جیسی آپ کو محسوس ہو رہی ہے لیکن خدا نے ابھی مجھے صرف آنکھ دی ہے کہ مشاہدہ کرسکوں، زبان نہیں دی کہ بیان کرسکوں۔ تاہم باوجود نارسائی کے جب کچھ پیش کرنے کا عزم باندھا گیا ہے تو قلم بھی مجبور ہے کہ کچھ نہ کچھ تصویر کشی کر ہی ڈالے اگر کوئی اچھی صورت بن گئی تو خدا کی جانب سے ہے ورنہ تو اپنی کوتاہی اور نارسائی کا اعتراف پہلے ہی کر چکا ہوں۔

والعذر عند کرام الناس مقبول۔

خلوت گزینی اور ذوق عبادت:

اللہ کے خاص بندے جنھیں انبیاء کرام اور اولیاء اللہ کے معزز لقب سے دنیا میں یاد کیا جاتا ہے ان کے اوراق زندگی الٹ کر دیکھئے تو سب سے پہلا عنوان ذوق خلوت گزینی کا ملے گا۔ کوئی نبی اور ولی آپ کو ایسا نہ ملے گا جس کو خلوت اور تنہائی محبوب نہ رہی ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام دس سال تک مدین کے جنگلوں میں خلوت کا لطف حاصل کرتے رہے نبوت ملنے کے بعد بھی طور کی تنہائی کے لئے بے قرار رہتے

تھے۔ خود ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خلوت ویکسوئی بہت محبوب تھی، نبوت سے پہلے آپ کا غار حرا کی تنہائی میں مہینوں گزار دینا معروف واقعہ ہے نبوت حاصل ہونے کے بعد بھی آپ شب کی خلوت کے منتظر رہا کرتے تھے خدا کے ذکر وفکر کے ساتھ کسی بندے کو خلوت کا ذوق میسر آجائے تو یہ سب سے بڑی نعمت ہے کسی بزرگ کا قول ہے کہ حکمت دس اجزاء میں منقسم ہے جن میں سے نو جزء خاموشی میں ہیں، اور ایک جزء عزلت (تنہائی) میں ہے (اسوۃ الصالحین)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہؓ نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ لوگوں میں بہترین شخص کون ہے۔ آپ نے فرمایا جس نے راہ خدا میں جہاد کیا ہو۔ صحابہؓ نے سوال کی اس کے بعد کون افضل ہے آپ نے فرمایا کہ وہ شخص جس نے کسی پہاڑ کے دامن میں گوشہ نشینی اختیار کی اور اپنے کو خدا کی عبادت میں لگائے رکھے اور مخلوق کو اپنے شر سے بچائے رکھے۔ حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو دوست رکھتے ہیں جو کہ متقی اور لوگوں کی آنکھ سے مخفی ہو۔

درحقیقت اس خلوت گزینی میں فوائد ومنافع بھی بہت ہیں سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ خلوت سے بڑھ کر ذکر وعبادت کیلئے فراغت قلبی حاصل ہونے کا اور کوئی ذریعہ نہیں، اس کی وجہ سے عبادت میں یکسوئی اور حضوری میسر آتی ہے، خدا کے ساتھ انس حاصل ہوتا ہے۔ لوگوں سے اختلاط میں یہ چیزیں مشکل سے حاصل ہوتی ہیں۔

حضرت والا کو ابتداء عمر ہی سے خلوت وعبادت کا ذوق تھا۔ آپ پڑھ چکے ہی کہ بچے عموماً جس قسم کے کھیل کود اور لایعنی مشاغل میں منہمک رہتے ہیں حضرت کو ان سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ آپ کا بچپن جن آنکھوں نے دیکھا ہے وہ شروع ہی سے دیکھ رہی تھیں کہ یہ بچہ مادرزاد ولی ہے حضرت کے ایک خادم حافظ مولوی محمد زکریا

صاحب فتح پوری جو کہ حضرت والا کے لوگوں میں سابقین اولین میں شمار کیے جاتے ہیں، لکھتے ہیں کہ

"ہمارے حضرت کو بچپن ہی سے دینی باتوں کا خیال تھا اور ان کے کرنے کا ایک جذبہ کارفرما تھا۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ پنج وقتہ نماز ہی کے ابتداء سے پابند تھے بلکہ لوگ بیان کرتے ہیں کہ آپ تہجد کے بھی اسی طرح پابند تھے۔ جیسے نماز پنجگانہ کے تھے۔ غلہ کی کٹائی کے وقت لوگ کھلیان میں ہی سویا کرتے تھے سب کی معیت میں حضرت والا سوتے تو وہیں تھے لیکن تہجد کے وقت خود بخود اٹھکر مسجد چلے جاتے تھے اور فجر کے بعد تک مسجد ہی میں رہتے، اس درمیان نوافل، ذکر، تلاوت سبھی کچھ ادا فرماتے۔" (حالات، ج:۱،ص:۱۲۹)

بچپن کے کچھ ایام آپ کے بھوپال میں گزرے ہیں، بعض جاننے والوں کا بیان ہے کہ بھوپال کے قریب کسی جنگل میں آپ تنہا تشریف لے جایا کرتے تھے۔ دیوبند کی طالب علمی اور تھانہ بھون کے قیام کے دوران آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ حضرت کس طرح لوگوں سے الگ تھلگ گوشۂ تنہائی میں رہتے تھے فرصت کے اوقات میں بھی جنگل ہی کا رخ کرنا پسند فرماتے تھے۔ طبیعت کا یہ رنگ اخیر عمر تک قائم رہا۔ بعد میں جب کہ آپ کے ساتھ خدمت خلق اور اصلاح امت کا فریضہ وابستہ ہوا اس وقت بھی لوگوں کے ہجوم میں خلوت وتنہائی کے مواقع نکال لیا کرتے تھے دیکھنے والے دیکھتے تھے کہ حضرت والا رکشے پر یا موٹر پر بیٹھ کر تفریح کے لئے تشریف لے جارہے ہیں اور ساتھ میں کوئی خادم بھی ہے لیکن کیا یہ تفریح ہوتی تھی؟ یہ درحقیقت وہی آپ کا قدیم ذوق تنہائی تھا جو مجبور کرتا تھا کہ لوگوں کے ہجوم سے الگ ہو کر کچھ وقت یکسوئی اور خلوت میں گزر جائے تفریح کے ان اوقات میں آپ گفتگو شاذ و نادر ہی کیا

کرتے تھے۔زیادہ تر تلاوت قرآن کریم فرماتے تھے۔راستہ کے مناظر اور عمارتوں پر بھی نظر بالکل نہیں پڑتی تھی، داروغہ مشتاق احمد صاحب جو حضرت کے خواص خدام میں سے ہیں ان کا بیان ہے کہ الہ آباد میں آنکھوں کے اسپتال تک حضرت کو ایک مریض کی عیادت کے لئے جانا تھا حضرت پوچھ بیٹھے کہ وہ کدھر ہے۔داروغہ جی کہنے لگے کہ حضرت آپ ادھر ہی تفریح میں تشریف لے جایا کرتے ہیں اسکے بعد راستہ کی علامات وغیرہ کا ذکر کر کے بتانا شروع کیا۔حضرت نے سن کر فرمایا اجی مجھے کیا معلوم کہ تم لوگ مجھے کہاں اور کدھر لے جاتے ہو داروغہ جی خاموش ہو گئے، سمجھ گئے کہ حضرت تفریح کے لئے کب جاتے ہیں؟ درحقیقت لوگوں کے ازدحام کی وجہ سے گھر پر خلوت میسر نہیں آتی اور تلاوت وغیرہ کا موقع نہیں ملتا تو باہر تشریف لے جاتے ہیں۔

عبادت الٰہی کا ذوق بھی آپ کو شروع ہی سے تھا۔مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی شہادت اس سلسلے میں آپ پڑھ چکے ہیں، مولانا مسیح اللہ صاحب کا قول بھی گزر چکا ہے کہ نماز عجیب کیفیت سے پڑھتے تھے۔باقی نماز وتلاوت میں قلبی کیفیات کیا ہوتی تھیں اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔حضرت نے نہ اس کا کبھی اظہار فرمایا اور نہ کسی کو دریافت کرنے کی جرأت ہوئی۔تاہم اندازہ ہے کہ حضرت والا دوسرے بزرگوں کی سیرت کے آئینے میں اپنے قلبی احوال کا عکس کبھی کبھی دکھاتے تھے۔حضرت نے بزرگوں کے قلبی احوال وکیفیات کا ذکر اپنی مجالس وتالیفات میں کیا ہے اگر ان کو بعینہٖ حضرت کا حال سمجھا جائے تو بعید نہ ہوگا۔

یہ ذوق عبادت اور خلوت ثمرہ تھا، اس محبت وعشق الٰہی کا جس کا امین آپ کا قلب مبارک تھا۔لیکن یہ حضرت کا کمال اخفا تھا کہ باوجودے کہ عشق ومحبت کے جوش میں ایک طرح کی شوریدگی اور خردش ہوتا ہے اور وہ بے اختیارانہ ظہور کرتا رہتا

ہے۔تاہم حضرت نے اس پر ہمیشہ خمول وسکوت یا پھر علم کا پردہ ڈالے رکھا۔یعنی اس کو علمی باتوں کی صورت میں ظاہر فرماتے ، چنانچہ اسی محبت الٰہی کے سلسلے میں حضرت کی مجالس ''محبة اللّٰه وهوى النفس '' کے عنوان سے شائع ہوچکی ہیں،ان میں حضرت نے اللہ کی محبت کو ایسے عنوان سے بیان کیا ہے کہ وجد آجاتا ہے اور بے اختیار دل میں عشق الٰہی کا شعلہ بھڑک اٹھتا ہے۔کون کہہ سکتا ہے کہ وہ محض علمی بیان ہے اوراس میں حضرت کے احوال باطنی کا عکس نظر نہیں آتا؟ حضرت نے اپنا کوئی حال شاید براہ راست کبھی ظاہر نہیں فرمایا لیکن آپ کی ہر حرکت وسکون اور ہر قول وعمل سے کیفیت قلبی کا ظہور ہوتا رہتا تھا۔

محبت الٰہی ،تعلق مع اللہ،نسبت باطنی کے سلسلے میں جو جو باتیں حضرت کی زبان فیض ترجمان سے صادر ہوئیں وہ درحقیقت خود حضرت کا حال تھا لیکن کون سمجھ سکتا تھا۔

حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب دامت برکاتہم نے صحیح لکھا ہے کہ

''حضرت والا کے سینۂ مبارک میں اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت ومحبت کا لبریز کاسہ رکھا تھا۔جس سے اللہ تعالیٰ کے بندوں کے مردہ قلوب زندہ ہوتے تھے،ایمان تروتازہ ہوتا تھا۔'' (حالات وفات،ص ۱۸)

خلوت وعبادت کا یہ ذوق حضرت والا اپنے خدام ومسترشدین میں بھی دیکھنا چاہتے تھے جس کو اس صفت کے ساتھ متصف دیکھتے اس کے بارے میں یہ خیال فرماتے کہ کام میں لگا ہوا ہے اسی ذوق کے پیش نظر آپ نے فتح پور کی خانقاہ مین بہت چھوٹے چھوٹے حجرے بنوائے تھے تاکہ لوگ اکٹھا ہوکر اپنے اوقات کو فضول باتوں اور گپ شپ میں ضائع نہ کردیں۔راہ مولیٰ کے طالب کو خلوت وتنہائی ناگزیر

ہے۔اس کے بغیر تعلق باللہ اور انس مع اللہ کی دولت ہاتھ آ ہی نہیں سکتی۔

خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوبؔ کے یہ اشعار حضرت اکثر پڑھا کرتے تھے۔

تجھے بھی پاس سے ہم اے خودی اب دور کرتے ہیں
وہ خلوت ہی میں عرض وصل اگر منظور کرتے ہیں

سب تمنا دل سے رخصت ہوگئی ۔۔۔ اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی
ایک تم سے کیا محبت ہوگئی ۔۔۔ ساری دنیا ہی سے نفرت ہوگئی
دل میں داغوں کی وہ کثرت ہوگئی ۔۔۔ رونما اک شان وحدت ہوگئی
آگئے پہلو میں راحت ہوگئی ۔۔۔ چلدئے اٹھ کر قیامت ہوگئی

ذات نبوی کے ساتھ شیفتگی:

شریعت مطہرہ جس کا موضوع بندہ کو اللہ تعالیٰ کی بندگی میں لگانا اور اس کو دنیا کی پستی سے اٹھا کر خدا کے قرب ورضا کے بلند آشیانہ پر پہونچانا ہے۔اس کو لانے والے حضور نبی کریم ﷺ ہیں۔اللہ کی بندگی،اس کی محبت،اس پر توکل واعتماد،تفویض وسپردگی اور اسکی جانب رجوع وانابت کیسی ہونی چاہئے س کا کامل ومکمل نمونہ حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی میں موجود ہے خدا کی رضا ڈھونڈنے والوں کو اتباع نبوی سے چارہ نہیں۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَحِيْمٌ.

تم کہہ دو کہ اگر تم کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے تو میری پیروی کرو پھر اللہ کو بھی تم پسند ہوگے اور وہ تمھارے گناہوں کو معاف کردے گا اور اللہ غفور رحیم ہے۔

اور

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ.

جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی۔

اس کی شاہد عدل ہیں۔حضرت مولانا کو ذات نبویؐ سے نہایت والہانہ اور عاشقانہ تعلق تھا۔آپ نے اپنی مجالس میں اتباع نبوی اور سنت رسولؐ کی عظمت واہمیت جس شدومد کے ساتھ بیان کی ہے اس سے آپ کے اس تعلق وشیفتگی کا پتہ چلتا ہے جو ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کو حاصل تھی۔سعدی علیہ الرحمۃ کے یہ اشعار اکثر مجلسوں میں نہایت ہی کیف وحال کے ساتھ پڑھا کرتے تھے جس سے سننے والوں پر بھی ایک کیف چھا جاتا تھا۔

مپندار سعدی کہ راہ صفا توان رفت جز برپئے مصطفےٰ

خلاف پیغمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

اے سعدی یہ نہ سمجھو کہ راہ صفا حضرت مصطفےٰ ﷺ کے نقش قدم کا اتباع کئے بغیر طے کی جاسکتی ہے۔پیغمبر ﷺ کے خلاف جو شخص راستہ اختیار کرے گا وہ ہرگز منزل پر نہیں پہونچ سکتا۔

حضرت کے قلب مبارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ جو محبت تھی اور جیسا تعلق تھا وہ تو آپ کے ملفوظات کی ہر سطر سے نمایاں ہے، بالخصوص ایک مجلس جو ''ذکر سید المرسلین'' کے عنوان سے معرفت حق شمارہ اگست وستمبر ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی ہے وہ سراپا بادۂ محبت نبوی سے لبریز ہے۔آپ کے تعلق ومحبت کا اندازہ ان خطوط سے بھی ہوتا ہے جو آپ نے مدینہ منورہ میں بعض علماء کو لکھوائے ہیں۔دو نمونے ملاحظہ ہوں۔یہ دونوں خط حضرت مولانا نے جامی صاحب لکھوائے ہیں۔

لکھتے ہیں کہ:

’’حضرت مولانا مدظلہ العالی نے مجھ سے فرمایا کہ میں جناب والا کی خدمت میں خصوصی طور پر حضرت والا کے لئے دعاء کی درخواست کردوں اصل یہ ہے کہ حضرت والا جب کسی کام کے لئے عزم جدید فرماتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دعاء اورتوجہ کی درخواست کی بھی تجدید ضرور فرماتے ہیں چنانچہ الہ آباد میں الحمدللہ کام خوب ہورہا ہے۔لوگ متوجہ ہیں اورحضرت کی دعوت کوتلقی بالقبول کررہے ہیں اس لئے کام اور بڑے پیانے پر کرنے کا خیال ہے حسن اتفاق کہ جناب والا وہاں ہی تشریف فرماہیں جو کہ ایک جانب اگر حضرت والا سے واقف ہیں تو دوسری جانب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے واصل ہیں۔اس لئے اس کام کے لئے آپ سے بڑھ کراور آپ سے بہتر کون سا واسطہ ہوسکتا ہے۔چنانچہ درخواست ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حضرت والا مدظلہ کا سلام عرض کرکے صحت قوت عافیت،فضا وماحول کی سازگاری وغیرہ کے لئے دعاء کی درخواست فرمادیں‘‘۔

والسلام خیرختام

دوسرا خط جناب حاجی عبدالغفار صاحب کے نام بھیجا گیا ہے لکھتے ہیں کہ:

’’آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہم لوگوں کا عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کا مرکز اس دنیا میں مدینۃ النبی علی صاحبہا السلام والتحیہ ہے اور حضرت والا کا اسی کے مطابق عمل بھی ہے۔چنانچہ جو کام بھی اب تک ہوا ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عنایت اور توجہ سے ہوا ہے اور آئندہ بھی جو کام ہوگا وہ انھیں کے فیض اثر کا صدقہ ہوگا۔

کیونکہ کام انھیں کا ہے اور مقام بھی انھیں کا ہے بقول قائل ع

زبان میری ہے بات ان کی

اس لئے حضرت والا کا معمول ہے کہ جب کام کا عزم جدید فرماتے ہیں تو اس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت اور دعاء کی تجدید بھی ضرور فرماتے ہیں''۔

ان دونوں مکاتیب سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت والا کو حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی سے کیسا خادمانہ اور محبانہ تعلق تھا۔ اپنے کاموں کو دربار رسالت میں پیش فرماتے تھے اور وہاں سے دعاء و توجہ کے طالب ہوتے تھے۔

بعض اوقات جب مخالفین آپ کے کاموں میں رکاوٹ ڈالتے یا بعض ناعاقبت اندیش آپ کے یا حضرات علماء دیوبند کے خلاف تکفیری مہم چلا کر عامۃ المسلمین کو حضرت سے دور کرنا چاہتے اور ان کی طرف سے مختلف ایذا رساں حرکات ظاہر ہوتیں تو ان حالات سے متأثر ہو کر بسا اوقات حضرت فرماتے کہ یہ لوگ مجھے پریشان کر رہے ہیں۔ یونہی پریشان کرتے رہیں گے تو میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں انکے خلاف نالش کردونگا کہ میں آپ ہی کا کام کر رہا ہوں اور یہ لوگ کرنے نہیں دیتے۔

اللہ اللہ اس جملے میں کیسا تعلق اور کیسی وارفتگی پائی جاتی ہے اور ایک طرح کا ناز بھی مترشح ہوتا ہے۔

حج کو جاتے ہوئے اپنے خدام و رفقاء سے فرمایا تھا کہ نیتوں کی تصحیح خوب کرلو ارادہ میں کوئی فتور اور نقص نہ ہو میں تم لوگوں کو حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ آپ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے جو آپ کے جذبۂ حب نبویؐ کا صحیح ترجمان ہے۔

اب نہ ڈھونڈیں گے ہرگز پتہ مل گیا　　　جب نبی مل گیا تو خدا مل گیا

ذات رسالت پناہ کے ساتھ اس والہانہ تعلق ومحبت کے نتیجے میں حضرت کو آپ کی ایک ایک سنت سے بے پناہ لگاؤ اور شیفتگی تھی۔ آپ کی نظر صرف ان چند ظاہری سنتوں پر محدود نہ تھی جن پر لے دے کے بعض حلقوں میں بہت زور دیا جاتا ہے، مثلاً داہنے پیر میں پہلے جوتا پہننا چاہئے، بائیں پاؤں سے پہلے نکالنا چاہئے بلاشبہ یہ بھی سنتیں ہیں لیکن انھیں پر اصرار اور باقی اہم سنن وفرائض مثلاً زہد وتوکل، قناعت وتفویض، رضا بالقضا اور رجوع وانابت سے تغافل واغماض، یہ طریقہ کچھ سنت کے مزاج کے مطابق نہیں معلوم ہوتا، حضرت کے یہاں ظاہر کا درجہ ضرور تھا مگر باطن کا رتبہ اس پر مقدم تھا، باطن درست ہونے کے بعد ظاہر کے صالح ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ لیکن اگر ظاہر کو تو پارسا بنالیا اور باطن گندگی میں ملوث ہے تو اسے بجز نفاق کے اور کیا نام دیا جاسکتا ہے، سنت کے اخذ واختیار اور ترتیب وتقدیم کے باب میں بھی حضرت کا طریق عین سنت کے مطابق تھا۔

حضرت مولانا نے اپنی مختلف مجالس میں عمل بالسنّت پر بہت شدومد کے ساتھ ترغیب دی ہے اس موضوع پر آپ کی مخصوص مجالس ''تمسک بالسنۃ اور فساد امت'' ''مژدۂ جانفزا'' وصیۃ السنۃ'' اور جلالۃ السنۃ'' کے عنوان سے معرفت حق اور وصیۃ العرفان میں شائع ہوچکی ہیں۔ یہاں حضرت والا کے اہتمام بالسنّت کو اجمالاً سمجھنے کے لئے ہم آپ کا ایک مکتوب گرامی درج کرتے ہیں یہ مکتوب مشہور لیڈر جناب سید محمود کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا گیا ہے۔ انھوں نے حضرت کے رسالہ ''تلاوت قرآن'' سے متاثر ہوکر ایک خط تحریر کیا تھا اور یہ ذکر کیا تھا کہ مجھے علماء سے شکایت ہے کہ وہ قرآن کی جانب کما حقہ توجہ نہیں دیتے، حضرت نے یہ کمی پوری فرمادی۔ نیز اس میں اپنے الہ آباد حاضر ہونے کی اطلاع دی تھی، حضرت نے قرآن کے متعلق موصوف

کے خیالات کی تائید فرماتے ہوئے تحریر فرمایا۔

قرآن شریف کے متعلق اپنے سے آپ کے مزاج کو متحد پاکر ایک خاص قسم کی مسرت ہوئی اور اس سلسلہ میں مزید کچھ کام کرنے کا شوق تازہ ہوگیا۔ اس قحط الرجال کے دور میں جب کسی اہل فہم سے کام کی کچھ تائید مل جاتی ہے تو بڑی ہمت بڑھ جاتی ہے، میری مراد اس سے آپ کے خط کا یہ مضمون ہے کہ

''مجھے بھی عرصہ سے یہ شکایت رہی ہے کہ قرآن پر زور نہیں دیا جاتا اور نہ مسلمانوں میں قرآن کی تعلیم عام کی جاتی ہے اور نہ قرآن سے وعظ و نصیحت کی جاتی''

میرا بھی یہی خیال ہے۔ باقی میں اس کے علاوہ اتنی بات اور کہتا ہوں کہ آج ہم لوگوں نے قرآن سے بھی غفلت برتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ سنت سے بھی بے اعتنائی برتے ہوئے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ یہ بھی قرآن ہی سے غفلت کا نتیجہ ہے اور اس کی فرع ہے کیونکہ کتاب وسنت باہم لازم وملزوم ہیں اس لئے کہ جس شخص کے پیش نظر کتاب اللہ کی یہ نصوص ہوں گی۔

مَاۤ اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا.

رسول جو کچھ تمھیں عطا فرمائیں اسے اختیار کرو اور جس سے روک دیں اس سے باز آجاؤ۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ محمد اللہ کے رسول ہیں۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ.

تمھارے واسطے اللہ کے رسول کی ذات میں بہترین نمونہ ہے۔

آخر اس کو اوامر ومناہی رسول، رسالات نبی اور اسوۂ پیغمبر کے علم سے صبر کس

طرح ہوگا اور ظاہر ہے کہ ان امور کی تفصیل سنت ہی سے دستیاب ہوسکتی ہے اسی طرح کتاب اللہ کے احکام معلوم کئے بغیر وہ شخص بھی نہیں رہ سکتا جس کے قلب میں اس کی قدر و قیمت کو ان احادیث نے راسخ کر دیا ہو، سنئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

اما بعد فان خیر الحدیث کتاب اللہ و خیر الهدی هدی محمد وشر الامور محدثاتها و کل بدعة ضلالة . (الابداع،ص:۹۴)

سب سے بہتر کلام اللہ کی کتاب ہے اور سب سے بہترین سیرت محمد ﷺ کی سیرت ہے، اور سب سے برے کام دین میں نئے امور ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

حضرت ابن مسعود سے موقوفاً اور مرفوعاً ہر دو طرح مروی ہے کہ

قال انما هی ثنتان الکلام والهدی فاحسن الکلام کلام اللہ واحسن الهدی هدی محمد صلی اللہ علیه وسلم الا وایاکم ومحدثات الامور فان شر الامور محدثاتها ان کل محدثة بدعة. (الابداع،ص:۹۴) فرمایا کہ یہ دو چیزیں ہیں، کلام اور سیرت، پس عمدہ ترین کلام تو کلام اللہ ہے اور خوب ترین سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے، اور دیکھو دین میں نئے ایجاد شدہ افعال سے بچو اس لئے کہ یہ بدترین چیزیں ہیں (دین میں) ہر نوایجاد چیز بدعت ہے۔

نیز حضرت حسن بصریؒ سے مروی ہے کہ:

قال ان احببت ان لا توقف علی الصراط طرفة عین حتی تدخل الجنة فلا تحدث فی دین اللہ حدثا برایک . (ایضاً)

فرمایا اگر تم چاہتے ہو کہ پل صراط پر پلک جھپکنے کی مقدار بھی نہ رکو اور فوراً جنت میں داخل ہو جاؤ تو دیکھو اللہ کے دین میں اپنی رائے سے کوئی نئی بات ایجاد نہ کرو۔

اور ظاہر ہے کہ اللہ کے دین میں احداث سے بچنا کتاب وسنت دونوں کے کامل علم کے بعد ہی ہوسکتا ہے اور آج لوگ ان دونوں ہی سے غافل ہیں چنانچہ اسی غفلت کا یہ نتیجہ ہے جو موجودہ بدحالی کی صورت میں ہمارے اور آپ کے سامنے ہے کہ آج معاصی کی کثرت کا یہ حال ہو رہا ہے کہ اسنے دور جہالت کا نقشہ ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے اور معصیت کی شدت نے کفر کی سرحد تک عوام کو گویا پہونچا دیا ہے حضرت امام بخاری نے اپنی صحیح کے کتاب الایمان میں یکے بعد دیگرے دو باب قائم فرمائے ہیں چنانچہ ایک میں تو یہ فرمایا کہ باب کفران العشیر وکفر دون کفر اس کی شرح فرماتے ہوئے صاحب فتح الباری نے قاضی ابوبکر بن العربی کا قول نقل فرمایا ہے کہ مراد اس سے بخاری کہ یہ ہے کہ یہ بتائیں کہ جس طرح طاعات کو ایمان کہا جاتا ہے، اسی طرح سے معاصی پر بھی کفر کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کفر سے مراد وہ کفر نہیں ہے جس کی وجہ سے آدمی ملت ہی سے خارج ہو جاتا ہے (العیاذ باللہ) پس کفر کے بھی درجہ ہوئے، بعض کفر بعض سے اشد ہوتا ہے، اور دوسرے باب میں فرماتے ہیں: **بالمعاصی من امر الجاهلیه**، یعنی جس قدر بھی معاصی ہیں وہ سب جاہلیت کے زمانے کے چیزیں ہیں اسلام سے ان کا کچھ جوڑ نہیں،،

اس مکتوب سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ حضرت کے نزدیک جہاں کتاب اللہ کی عظمت واہمیت کا ایک عظیم درجہ تھا وہیں سنت رسول کو بھی نہایت مہتم بالشان امر سمجھتے تھے اور دنیا میں جو کچھ بگاڑ پھیلا ہوا ہے، اور بدعات ومعاصی کا جس قدر ظہور ہے وہ انھیں دونوں چیزوں سے بے اعتنائی کا اثر ہے چنانچہ آپ نے اپنی زندگی انھیں چیزوں کے پھیلانے اور قلوب میں ان کی عظمت وحیثیت پیوست کرنے

کے لئے وقف کردی تھی۔

قرآن سے عشق و تعلق:

اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات سے تعلق ومحبت کا لازمی اور فطری نتیجہ اس کی کتاب سے عشق ومحبت ہے۔جس کو خدا سے جتنی نسبت حاصل ہوتی ہے اسی کے بقدر اسکی کتاب سے شغف ہوتا ہے۔عشاق کو جب محبوب کا وصال نصیب نہیں ہوتا تو اس کے کلام اور نام ہی سے تسلی اورلذت حاصل کرتے ہیں،حضرت مولانا تفسیر بیضاوی سے اتل مااوحی لیک کی تفسیر نقل کر کے فرماتے ہیں اور یہ درحقیقت مولانا کا حال تھا کہ

قاضی بیضاوی نے جو فرمایا ہے کہ تلاوت سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل ہوتا ہے اور جب تلاوت کی جائیگی تو الفاظ قرآن کے محفوظ رہیں گے یہ بالکل صحیح اور درست ہے لیکن یہاں اتنی بات اور کہتا ہوں کہ:

تلذذا بألفاظه وتسلّيا بالمعشوق الحقيقي من كلامه

اس کے الفاظ کے ساتھ تلذذ بھی مقصود ہے اور معشوق حقیقی کے کلام کے ساتھ تسلی حاصل کرنا بھی۔

یعنی تلاوت کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ قرآن کے الفاظ سے تلذذ حاصل کیا جائے اور معشوق حقیقی سے تسلی اس کے کلام کے ذریعہ حاصل کی جائے۔

قرآن شریف اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔عشاق کے لئے اس دار دنیا میں بجز کلام اللہ کے اور کوئی چیز تسلی کی نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ تو مخفی ہیں اس لئے وہ خود تو نظر آتے نہیں۔لہٰذا اب ان کے عشاق کے لئے اگر تسلی کا کوئی ذریعہ ہے تو یہی کلام اللہ ہے وہ اسی سے تلذذ حاصل کرتے ہیں۔

مثنوی میں مولانا روم نے ایک واقعہ لکھا ہے۔

دید مجنوں را یکے صحرا نورد ۔۔۔ در بیابان غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود وانگشتان قلم ۔۔۔ می نمودے بہر کس نامہ رقم
گفت اے مجنوں شیدا چیست ایں ۔۔۔ می نویسی نامہ بہر کیست ایں

یعنی ایک مسافر نے مجنوں کو اپنے غم کے بیابان میں تنہا بیٹھا ہوا دیکھا درآنحالیکہ ریت کاغذ تھی اور انگلیاں قلم یعنی وہ اپنی انگلیوں سے ریت پر کچھ لکھ رہا تھا تو اس نے کہا کہ اے عاشق مجنوں یہ کیا ہے؟ اور کس کے نام خط لکھ رہے ہو؟

گفت مشق نام لیلیٰ می کنم ۔۔۔ خاطر خودرا تسلی می دہم

اس نے کہا کہ لیلیٰ کے نام کی مشق کر رہا ہوں اور اپنے دل کو اسی سے تسلی دے رہا ہوں۔

اور حضرات تو اس واقعہ کو اس بات پر لاتے ہیں کہ جس طرح مجنوں لیلیٰ لیلیٰ لکھ کر اپنے دل کو تسلی دیتا تھا اسی طرح اللہ والے ذکر اللہ سے اور اللہ اللہ سے تسلی حاصل کرتے ہیں لیکن میں اس واقعہ کو اس پر لا رہا ہوں کہ معشوق حقیقی سے ان عشاق کو تسلی کلام اللہ کی تلاوت ہی سے ہوتی ہے اس لئے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تجلی ہے پس جتنی تجلی اور نشاط اور جس قدر لذت وحلاوت ان کو تلاوت سے حاصل ہوتی ہے کسی اور چیز سے نہیں۔ جب عارف تلاوت کرتا ہے تو اس کا رواں رواں اس سے لذت حاصل کرتا ہے۔ کان بھی سنتا ہے اور تمام بدن سننے لگتا ہے گویا تمام بدن ہی کان بن جاتا ہے اور تلاوت کلام اللہ اس کے رگ وریشہ میں سرایت کر جاتی ہے اور جب قرآن شریف کی لذت قلب میں آجاتی ہے تو دنیا کی کوئی لذت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی اس لئے کہ دنیاوی لذتیں جسمانی ہیں اور یہ لذت روحانی ہے جو خداوندی لذت ہے اس کے سامنے کوئی

لذت باقی نہیں رہتی جس طرح عمدہ اور میٹھی چیز کھانے سے زبان کو لذت ملتی ہے اسی طرح تلاوت سے زبان کو بھی ایک لذت وحلاوت ملتی ہے اور اس میں آدمی ایسا محو ہو جاتا ہے کہ تمام بدن ہی زبان بن جاتا ہے اور نعمائے جنت کی حلاوت سے بھی یہ حلاوت کہیں بڑھ کر ہے کیونکہ وہ حلاوت بھی جسمانی ہوگی اور یہ حلاوت روحانی ہے۔ (معرفت حق محرم وصفر ۱۳۸۰ھ ص ۷۳)

حضرت مولانا کے پاک قلب میں عشق الٰہی کی جو قندیل روشن تھی اس کا روغن آپ قرآن ہی سے حاصل فرماتے تھے۔ قاعدہ ہے کہ من احب شیئا اکثر ذکرہ جس کو کسی شے سے تعلق ہوتا ہے وہ اس کا ذکر بکثرت کرتا ہے، حضرت والا کا یہ حال تھا کہ کسی موضوع پر مجلس ہو رہی ہو کسی مضمون کا بیان چل رہا ہو، ادنیٰ مناسبت سے قرآن کا ذکر چھڑ جاتا تھا اور پورے شرح وبسط کے ساتھ کلام فرماتے تھے قرآن کا تذکرہ آتے ہی حضرت پر ایک وجد کی سی کیفیت چھا جاتی تھی اور اس لطف ولذت سے اس کا ذکر فرماتے کہ سننے والوں کا قلب بھی حلاوت سے معمور ہو جاتا۔ امام شافعی علیہ الرحمۃ کا شعر ہے

اعد ذکر نعمان لنا ان ذکرہ　　　ھو المسک ماکررتہ یتضوع

نعمان کا (یعنی امام ابوحنیفہ) کا تذکرہ بار بار کرتے رہو کیونکہ یہ مشک ہے کہ جتنا اس کو رگڑو گے خوشبو بڑھتی جائے گی۔

حضرت کا قرآن کے باب میں یہی حال تھا کوئی مجلس قرآن شریف کے ذکر سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ آج بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں پر حضرت کی نسبت کا پرتو پڑا ہے ان کا امتیازی وصف تلاوت کلام اللہ ہے خود حضرت نے تلاوت کا جو دائمی معمول بنا رکھا تھا اسے معلوم کر کے حیرت ہوتی ہے، دیکھنے والوں نے حضرت کو فارغ کب دیکھا ہے، شب وروز کے چوبیس گھنٹے معمولات میں جکڑے ہوئے

تھے روزانہ ایک گھنٹہ مجلس ہوتی، طالبین کی بیعت وتلقین کی مصروفیت الگ تھی، آنے جانے والوں سے ملنا ان کو گفتگو کے لئے وقت دینا۔ مہمانوں کی مدارات نیز بیماری وآزار کی مجبوریاں یہ سب کچھ تھا مگر اسی چوبیس گھنٹے میں پاس رہنے والوں کی شہادت ہے کہ روزانہ پورا کلام اللہ ایک ختم پڑھنے کا معمول تھا یہ محض اس عشق وتعلق کا کرشمہ اور خداوند تعالیٰ کا فضل عظیم تھا کہ اتنے مشاغل کے باوجود تیس پارے بھی پڑھ لئے جاتے تھے، حضرت صبح وشام رکشہ یا موٹر پر...... گذر چکا ہے کہ...... تفریح کے لئے تشریف لے جاتے تھے، تفریح کا موضوع یہی تلاوت کلام اللہ کا مشغلہ تھا خود تو جید حافظ تھے ہی، اہل تعلق میں بھی حفظ کا رواج عام ہو گیا تھا تلاوت ہی کے موضوع پر خاص طور سے آپ کی مجالس کا مجموعہ ''تلاوت قرآن'' اور ''وصیۃ التلاوۃ''...... کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

زہد وتقویٰ:

حضرات اہل اللہ کے تذکرۂ حیات کا سب سے جلی اور نمایاں عنوان زہد وتقویٰ ہے، زہد کا مطلب ہے دنیا کی چیزوں سے بے رغبتی اور اعراض، دنیا اور تمام تر حطام دنیا فانی وناپائیدار ہے اور اس کے مقابلے میں آخرت اور اس کے ثواب وعذاب دائمی اور ابدی ہیں۔ انبیاء کا موضوع دعوت ہی آخرت کی زندگی ہے۔ دنیا ان کے نزدیک مزرعۃ الآخرۃ (آخرت کی کھیتی) سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی جب کسی کے دل میں آخرت کی نعمتوں اور وہاں کے عذاب کا استحضار ہو جاتا ہے تو اسے دنیا کی تمام لذتیں اور یہاں کی تمام آسائشیں ہیچ محسوس ہونے لگتی ہیں قرآن کریم میں ہے:

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ فَھُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّہٖ ۔

بھلا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا ہو اس کی وجہ سے اسے اللہ کا

ایک نور حاصل ہو چکا ہو۔

صحابہ کرامؓ نے شرح صدر کا مطلب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔آپ نے فرمایا کہ اس کی چند علامتیں ہیں۔پہلی علامت **التجافی عن دار الغرور** دھوکے کے گھر یعنی دنیا سے بے تعلقی و بے رغبتی، دوسری علامت **والانابة الی دار الخلود** ہمیشگی کے گھر کی جانب توجہ اور رغبت اور تیسری علامت **والتھیأ للموت ولما بعدہ** موت اور بعد موت کی تیاری میں لگ جانا۔پہلی علامت جسے زبان رسالت نے **التجا فی عن الغرور** فرمایا یہی زہد ہے۔

حضرت والا زہد و استغنا کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔آپ کا ابتدائی دور بڑی عسرت کا رہا ہے۔طالب علمی کے دور میں گھر کے لوگوں کا رجحان چونکہ انگریزی تعلیم کی طرف تھا اور آپ سب کی مرضی کے خلاف دینی تعلیم کی جانب آئے تھے اس لئے آپ کی خبرگیری کی جانب لوگوں کی توجہ بہت کم تھی حضرت فرماتے تھے کہ میں جب دیوبند گیا تو میرے پاس کچھ نہیں تھا۔مولانا نور الہدیٰ صاحب داماد حضرت مولانا راوی ہیں کہ دیوبند میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ بدن پر موجود ایک کرتا، پاجامہ اور ٹوپی کے سوا حضرت کی ملکیت میں کوئی کپڑا نہ ہوتا تھا۔دھونے کے لئے حضرت یہ کرتے کہ کُرتے کو بجائے پاجامے کے باندھ لیتے تھے اور پاجامہ دھوتے پھر پاجامہ پہن کر کرتا دھوتے اور بدن پر کپڑا اسکھا لیتے۔اتنی عسرت میں خوش رہتے اور اللہ کا شکر ادا کرتے، اور کبھی اس کا خیال نہ فرماتے کہ مجھے اور بھی کچھ حاصل ہو، یہی حال تھانہ بھون میں بھی رہا، حضرت کے قلب کو ان امور سے کوئی تعلق نہ تھا۔آپ کو تو آخرت کی ،اللہ کی رضا کی ایک دھن تھی، بعد کے دور میں جب کہ حضرت کے یہاں فتوحات کا دروازہ کھلا، متعدد مکانات بن گئے، بڑی بڑی مسجدیں آپ کی ذات بابرکات کے طفیل

وجود میں آ گئیں ۔ ہر وقت رکشہ اور موٹریں آپ کی سواری کے لئے حاضر رہنے لگیں ۔اس وقت بھی آپ کی زاہدانہ طبیعت اپنے اسی رنگ اور طرز پر قائم رہی ۔

حضرت مولانا قاری حبیب احمد صاحب کٹرہ الہ آبادی ،مجاز حضرت والا راوی ہیں کہ:

حضرت کا معمول ایک وقت میں ہر جمعہ کو کٹرہ آنے کا تھا۔کٹرہ میرے یہاں کچھ دیر استراحت فرماتے اور جمعہ کی نماز پڑھ کر فوراً روشن باغ واپس ہو جاتے ساتھ میں عموماً قاری محمد مبین صاحب ہوتے اور کبھی کبھی مولوی عبدالمجید صاحب اسرار کریمی پریس والے بھی ہوتے ،روشن باغ سے کٹرہ کا فاصلہ تین میل کے قریب ہے،حضرت رکشے سے تشریف لے جاتے تھے ۔ایک بار حضرت والا مولوی عبدالمجید صاحب کو ساتھ لیکر کٹرہ تشریف لائے بستر لگا دیا گیا آپ استراحت فرمانے کے لئے لیٹ گئے ۔مولوی عبدالمجید صاحب کے پاس کچھ دنوں پہلے ایک چھوٹی سی کار تھی جو کبھی کبھی حضرت کے لئے بھی استعمال ہوتی تھی ۔میں نے وہیں جہاں حضرت لیٹے تھے مولوی عبدالمجید صاحب سے دریافت کیا کہ آپ کی کار کیا ہوئی ۔انھوں نے بتایا کہ فروخت ہوگئی ، میں نے کہا کہ حضرت کے لئے ایک کار ہوتی تو بہت اچھا تھا۔اتنی دور سے رکشہ سے تشریف لانا باعث تکان ہوتا ہے کار ہوتی تو جب اور جہاں منشا ہوتی تشریف لے جاتے ،حضرت نے سنا تو بولے

> ’’بھائی میں تو ایک طالب علم قسم کا آدمی ہوں ،میرے لئے تو مسجد کا ایک حجرہ بھی کافی ہے اگر بچیوں کا ساتھ نہ ہوتا تو یہ مکان وغیرہ بھی جو تم دیکھ رہے ہو، ہر گز میں نہ لیتا مگر ان کے حقوق کی ادائیگی کے خیال سے لے لیا ہے ۔تم لوگ کار وار کی کیا بات کر رہے ہو؟

قاری صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت نے اس کے بعد ہم لوگوں کی طرف سے رخ پھیر کر کروٹ بدل لی اور پھر ادھر رخ نہیں کیا۔ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حضرت کو یہ بات ناگوار گزری ہے۔

اسی زہد فی الدنیا کا اثر تھا کہ حضرت نے اپنے لئے کبھی عمدہ عمدہ کپڑوں اور کھانوں اور سامان آسائش کا اہتمام نہیں کیا۔آپ نے بیش قیمت کپڑے بھی زیب تن فرمائے ہیں اور کھانے بھی آپ کے دستر خوان پر عمدہ ہوا کئے ہیں لیکن کبھی ان کی طرف التفات نہیں کیا۔معمولی کپڑے بھی اسی طرح پہنے جیسے عمدہ کپڑے اور آلو کی ترکاری بھی اسی رغبت سے تناول فرمائی ہے جیسے عمدہ عمدہ کھانے۔

عمدہ سے عمدہ لباس اور خوش ذائقہ الوان طعام ممنوع نہیں ہیں۔یہ چیزیں کوئی استعمال کرتا ہے تو اس پر نکیر نہیں کی جاسکتی لیکن حضرات اہل اللہ انھیں ضرورت کی بناء پر استعمال فرماتے ہیں۔حضرت تھانویؒ کا ارشاد ہے کہ انسان کا بدن درحقیقت سرکاری مشین ہے اللہ تعالیٰ نے کچھ دنوں کے لئے انسان کے تصرف میں اسے دے رکھا ہے اس مشین کا حق ہے کہ جب اس سے کام لیا جائے تو اسے مناسب تیل پانی بھی دیا جائے۔حضرات اہل اللہ مخلوق کی ہدایت کے لئے جان وتن کھپاتے ہیں تو ان کے لئے ضروری ہے کہ بدن کو ضرورت کی چیزیں مہیا کرتے رہیں تاکہ اس کی قوت کارکردگی محفوظ رہے ورنہ کام پورا لیا جائے اور اس کی حفاظت کا بندوبست نہ کیا جائے تو گرفت کا اندیشہ ہے،یہی راز ہے کہ بزرگوں کے دستر خوان پر عمدہ عمدہ کھانے اور ان کے بدن پر اچھے لباس دیکھے جاتے ہیں۔

نیز یہ نعمتیں جنت کی نعمتوں کو یاد دلاتی ہیں۔اہل اللہ کیلئے یہ سامان آسائش تذکار جنت کا سبب بن کر داخل عبادت ہوجاتے ہیں۔

ایک اور لطیف نکتہ حضرت کی زبان سے اس کے مناسب سنتے چلئے۔ فرماتے ہیں۔

اہل اللہ اپنے نفس کو فنا کرتے ہیں اور اس سے اللہ تعالیٰ تک پہونچتے ہیں پھر جب نفس کو مار کر اس کو اللہ تعالیٰ کا مطیع بنا لیتے ہیں تو پھر انھیں اپنے نفس سے اس کے ترک مخالفت کی بناء پر بلکہ اپنے اعضاو جوارح سے ان کے اللہ کی اطاعت کرنے کی وجہ سے محبت ہو جاتی ہے۔

چنانچہ ایک عاشق کہتے ہیں

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است ۔۔۔ افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

یعنی یوں کہتے ہیں کہ میں اپنی آنکھ پر ناز کرتا ہوں اس لئے کہ اس نے تیرا جمال دیکھا ہے اور اپنے پاؤں پر گرتا ہوں اسلئے کہ اس نے مجھے تیری گلی میں پہونچایا ہے۔

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را ۔۔۔ کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

اور ہر وقت ہزاروں بوسے اپنے ہاتھ کو دیتا ہوں کہ جس نے تیرے دامن کو پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے

یہ جو فرمایا کہ میں ناز کرتا ہوں تو اس کے متعلق سمجھئے کہ یہ حضرات تو سراپا نیاز ہوتے ہیں ناز سے انھیں کیا کام۔ مگر جب یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے یہ اعضا جواب تک اللہ تعالیٰ کے غیر مطیع تھے۔ یہاں تک کہ ان کو مطیع بنانے کے لئے ہم نے بڑے بڑے مجاہدے کئے جس کے بعد اب یہ سب بالکل مطیع اور فرمانبردار ہو گئے ہیں اور انھوں نے اپنی سرکشی کو بالکل ختم کر دیا ہے یہ خیال کر کے بہت زیادہ مسرور ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا اس پر شکر ادا کرتے ہیں اسی کو انھوں نے ناز سے تعبیر کیا ہے۔ (معرفت حق جمادی الاخری ۱۳۸۷ھ ص ۳۲)

اسی زہد کے ثمرہ میں اہل اللہ کے قلوب سے دنیا اور اس کے مال ومتاع کی حرص ومحبت قطعاً نکل جاتی ہے ان کی نگاہوں میں ہفت اقلیم کی دولت وثروت گرد ہوجاتی ہے۔ تعلق مع اللہ اور نسبت باطنی کی جو عظیم دولت انھیں حاصل ہوتی ہے اس کے سامنے دولت دنیا کی حقیقت ان کی نگاہوں میں ٹھیکرے سے زیادہ باقی نہیں رہ جاتی۔

حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی ایک مرتبہ مجلس میں عشق الٰہی کا بیان نہایت جوش وخروش کے ساتھ کررہے تھے، طبیعت پر خوشی ونشاط کا اثر ظاہر ہورہا تھا، موقع پاکر ایک صاحب نے عرض کیا حضرت نواب صاحب رامپور فرمارہے تھے کہ ہمارے یہاں اس وقت کے تمام اہل فضل وکمال تشریف لاچکے ہیں، بس ایک حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب ابھی تک تشریف نہیں لائے ہیں اگر وہ کبھی قدم رنجہ فرمائیں تو انھیں ایک لاکھ روپیہ نذر میں پیش کرونگا۔ حضرت نے بڑی بے نیازی کے ساتھ فرمایا کہ خاک ڈالو لاکھ روپئے پر، اور داستان عشق ومحبت سنو۔

سبحان اللہ ان حضرات کے نزدیک نسبت مع اللہ، عشق ومحبت الٰہی کی دولت کے مقابلے میں لاکھ روپئے کی خطیر رقم بھی اس قابل ہے کہ اس پر خاک ڈالدی جائے ،اس بے نیازی اور استغنا کے بعد سخاوت وفیاضی، دادودہش کا بازار گرم ہوجاتا ہے۔

حضرت کی حیات طیبہ کا یہ رخ بھی نہایت تابناک اور روشن ہے، حضرت کے کتنے متعلقین ومتوسلین ایسے تھے جن کے لئے حضرت نے ماہانہ وظیفے باندھ رکھے تھے الہ آباد تشریف لانے کے بعد حضرت کا خوان کرم بچھا تو متعلقین کے علاوہ دوسرے حضرات اور یہاں کے دائروں والے بھی بہت مستفید ہوئے۔

مولوی محمد نعمان صاحب معروفی راوی ہیں کہ:

ایک مولوی صاحب جو حضرت تھانوی سے بیعت تھے اور اطراف فتحپور کے ایک

قصبہ (غالباً گھوسی) کے ایک مدرسہ میں مدرس تھے اور ہمارے حضرت کے زیر تربیت تھے ان کا واقعہ ایک صاحب نے نقل کیا کہ ایک مرتبہ مولانا مرحوم کے یہاں مہمانوں کی آمد کچھ زیادہ ہوئی اور تنگدستی کی حالت تھی۔ ایک صاحب فتحپور جارہے تھے ان کے توسط سے مولانا صاحب نے حضرت کی خدمت میں سلام کہلا بھیجا اور دعا کی درخواست کی کہ حضرت دعا فرمائیں اس وقت مہمانوں کی آمد زیادہ ہے گرمی کا زمانہ تھا مولوی صاحب مرحوم دوپہر کو اپنی جائے قیام آرام فرمارہے تھے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا مولوی صاحب مرحوم نے اندر سے آواز دی کون ہے؟ حضرت نے فرمایا دروازہ کھولو مولوی صاحب نے دروازہ کھولا تو ہکا بکا رہ گئے حضرت نے فرمایا کہ لو یہ گٹھری ہے اس میں کچھ غلہ ہے جب یہ ختم ہوجائے تو اطلاع کرنا، پریشانی کی کوئی وجہ نہیں اور بیٹھے بھی نہیں فوراً واپس تشریف لائے۔

انھیں مولوی نعمان صاحب کی روایت ہے کہ

ایک مولوی صاحب کا بیان ہے کہ اکثر مجھے پریشانی اور تنگدستی رہتی تھی جب فتحپور جاتا تو فوراً اطمینان ہوجاتا ایک مرتبہ کئی وقت کا فاقہ تھا تو حضرت نے بغیر کچھ کہے ہی دس کا نوٹ دیا اور فرمایا کہ ابھی گھر چلے جاؤ اور فوراً مجھے واپس فرمایا۔ (حالات، ص ۱۷۰)

اس طرح کے نہ جانے کتنے واقعات ہیں لیکن حضرت کے یہاں تو تمام احوال پر اخفاء و پوشیدگی کا پردہ پڑا رہتا تھا۔ بعض لوگوں کے بارے میں سنتے کہ کثرت مصارف کی وجہ سے کافی مقروض ہوگئے ہیں تو خلوت میں بلاتے اور تحقیق کر کے سارا قرض یکمشت ادا فرماتے۔

کبھی علماء کبار ملنے کے واسطے تشریف لاتے تو واپسی کے وقت کسی خادم کے ہاتھ ہدیہ بھیجواتے۔

غالباً صفر ۸۵ھ میں جس زمانہ میں حضرت کا قیام بمبئی میں تھا اور حضرت اقدس غالباً علیل تھے۔ مولانا مسیح اللہ صاحب مدظلہ کا اپنے طویل سفر کے سلسلے میں بمبئی بھی جانا ہوا۔ حضرت کے قیام کی خبر پا کر ملاقات کے لئے ایک دن حضرت کے پاس تشریف لے گے۔ اسی سلسلے میں ایک صاحب کو تحریر فرماتے ہیں کہ

''پھر تھوڑی دیر کے بعد میں مولانا سے رخصت ہو کر کار پر چلا آیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ دیکھا کہ پیچھے پیچھے حضرت مولانا کے بڑے داماد جناب قاری محمد مبین صاحب چلے آرہے ہیں انھوں نے ایک رقم پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت والا نے یہ ہدیہ جناب کو مرحمت فرمایا ہے۔ بندہ نے یہ کہتے ہوئے لے لیا کہ حضرت کا تبرک ہے،

دوسری ملاقات کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ

واپس آنے کے دوسرے دن خود مولانا نے ایک صاحب کو بندہ کے پاس بھیجا انھوں نے کہا کہ حضرت والا نے سلام فرمایا ہے اور یہ ہدیہ جناب کی خدمت میں بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ آپ کے جانے کے بعد فوراً ہی اسے بھیجا تھا مگر آپ کی کار روانہ ہو چکی تھی۔ بہر حال بندہ نے یہ خیال کر کے اس دفعہ بھی قبول کر لیا کہ یہ ناکارہ کے لئے خوش نصیبی ہے۔ (حالات۔۲ ص ۴۸۳)

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

میں بمبئی پہونچا، اترتے ہی حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کے مستقر پر ان کی زیارت کے لئے ہم سب گئے وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ مولانا آج ہی صبح

اس جگہ (کرلا) سے کسی دوسری جگہ (اہل مجلس سے) ناراض (اس واقعہ کی تفصیل پہلی جلد میں آچکی ہے) ہوکر منتقل ہوگئے ہیں (جس کی وجہ یہ ہوئی کہ الیکشن کا زمانہ تھا کسی صاحب نے اخبار میں چھاپ دیا کہ مولانا صاحب فلاں صاحب کے حامی ہیں۔فریق مخالف نے اس کی پرزور تردید کی مولانا صاحب کواس پر غصہ آیا کہ غلط طور پر الیکشن والے ان کے نام کو استعمال کررہے ہیں) اس لئے مولانا کے سابقہ مستقر سے دوسرے مستقر پر حاضر ہوئے،مولانا بہت ہی شفقت ومحبت سے ملے اور باصرار سو روپئے ہدیہ سنیہ کے طور پر مرحمت فرمائے۔(آپ بیتی ’’۴‘‘ص ۲۷۳)

حضرت کی یہ داد ودہش خواص کے ساتھ ہی نہ تھی بلکہ آپ کا فیضان کرم عام تھا،حضرت کے خدام ومتوسلین میں سے کم ایسے ہونگے جنھیں حضرت کے اس خوان کرم سے حصہ نہ ملا ہو۔

اسی سلسلہ کلام میں حضرت کے تقویٰ کے متعلق بھی چند معلوم باتیں سنتے چلئے مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامی تحریر فرماتے ہیں کہ:

عبدالباری بھائی جو حضرت کے بھتیجے ہیں کہتے کہ حضرت والا کبھی کبھی پورہ معروف جاتے وقت مجھے بھی ہمراہ لے لیتے تھے میں چھوٹا بچہ تھا۔وجہ یہ تھی کہ راستہ میں غیر مسلموں کی چھوٹی آبادی جس کو اس طرف پروا کہتے ہیں پڑتی تھی اور راستہ آبادی کے بیچ سے ہوکر جاتا تھا دیہات کی عورتوں میں بالخصوص غیر مسلموں کی نیچ قوم کی عورتوں میں خواہ بوڑھی ہوں،جوان ہوں کچھ حیا وشرم تو ہوتی نہیں۔سردیوں میں اپنے اپنے دروازوں کے باہر دھوپ میں نکل کر نیم عریاں سی بیٹھی رہتی تھیں اور باہم خوب ہنسی ٹھٹھا کرتی ہوتی تھیں،سر سینہ،بازو

حتی کہ ران تک ان کی کھلی رہتی تھی ، اب اس راستہ سے گزرنا حضرت کے لئے قیامت سے کم نہ تھا۔اس لئے حضرت یہ کرتے تھے کہ جب ایسا مقام قریب آتا تو مجھ فرماتے کہ عبدالباری تم آگے چلو اور میری لاٹھی پکڑلو اور اس کا پیچھے کا سرا خود حضرت پکڑ لیتے اور آنکھیں اپنی بند کر لیتے جس طرح نابینا لوگ چلا کرتے ہیں ۔یہی برابر حضرت کا معمول تھا جب اس جماعت کے پاس گزرتے تو وہ باہم ایک دوسرے سے کہتیں کہ ہے ہے دیکھو تو بابا کیسے اچھے ہاتھ پاؤں کے ہیں اور بیچارے اندھے ہوگئے ہیں حضرت آگے بڑھ کر مجھ سے فرماتے کہ عبدالباری تم نے سنا وہ سب کیا کہہ رہی تھیں ۔کم بخت میرے اندھے ہونے پر ترس کھارہی تھیں یہ نہیں جانتیں کہ اس کا سبب ہم ہی لوگ تو ہیں ۔

حضرت والا کی طبیعت تقویٰ کی ایسی خوگر تھی کہ مشتبہ اور غیر یقینی چیزوں سے ازخود غیب سے بھی حفاظت کے سامان ہوجاتے تھے ۔اللہ کا یہ بھی انعام اس کے خاص بندوں پر اکثر رہا ہے کہ جب وہ اپنے ارادہ واختیار سے تقویٰ کی بھٹی میں اپنے نفوس کو پگھلاتے ہیں تو پھر قدرت بھی ایسے انتظامات فرماتی رہتی ہے کہ ان کے پاس کوئی ناجائز امر گزر نہ سکے ۔حضرت مولانا کے ایک عمر رسیدہ عزیز تھے انھوں نے ایک مرتبہ حضرت کی دعوت کی ،حضرت نے اخلاقاً انکار نہیں فرمایا مگر ان کی آمدنی میں کچھ تردد تھا حضرت والدہ کے پاس آئے اور کہا اماں میں نے چچا کی ناراضگی کے خیال سے کچھ نہیں کہا اب آپ اس سے بچایئے انھوں نے کہا کہ اسی وقت ہم پڑ ا لدیتے میں خوش اسلوبی سے اس کو ٹال دیتی ، خیر کہو تو اب جاؤں ان کے یہاں ؟ حضرت نے بعض مصالح کی بنیاد پر روک دیا، کھانے کے وقت آدمی بلانے کے لئے آیا حضرت تشریف لے گئے کھانے پر بیٹھے اور چند ہی نوالے کھائے تھے کہ طبیعت مالش کرنے لگی ،

دسترخوان سے اٹھ گئے اور اپنے مکان تشریف لے گئے، قے ہوگئی اور جب تک سب کھایا ہوا گر نہیں گیا متلی تھمی نہیں اس کے بعد سے والدہ کسی کی دعوت منظور ہی نہیں کرتی تھیں اور مزید احتیاط یہ شروع کردی کہ اس کے بعد حضرت کے لئے غلہ مخصوص طریقہ سے الگ رکھنے لگیں، اور گھر کا کھانا بھی احتیاط کے ساتھ پکایا جانے لگا۔ (حالات)

ایسا ہی ایک واقعہ بالکل بچپن میں کانپور میں پیش آیا، حافظ محمد زکریا صاحب کہتے ہیں مولوی عبدالقیوم صاحب نے حضرت کے استاذ زادے حافظ حفیظ اللہ کے واسطے سے بیان کیا ہے کہ حضرت جب کانپور محلّہ ٹپکا پور میں پڑھتے تھے تو ایک دفعہ مدرسہ کے طلبہ کی دعوت ہوئی سب کے ہمراہ حضرت بھی دعوت میں چلے گئے مگر جیسے ہی پہلا لقمہ منھ میں ڈالا کہ طبیعت مالش کرنے لگی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قے ہوجائے گی، کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور کسی طرح وہاں سے واپس آئے اس کے بعد سے پھر اس قسم کی کسی دعوت میں کہیں بھی تشریف نہیں لے گئے وہ دعوت کسی میت کے ایصال ثواب کے سلسلہ کی تھی۔ (حالات، ج:۱،ص۶۲)

صدق وتوکل:

اللہ تعالیٰ اپنے مخلص اور خاص بندوں کو اس دنیا میں جن باطنی دولتوں سے نوازتے ہیں ان میں سے ایک عظیم ترین دولت توکل ہے۔ توکل کا مطلب یہ ہے کہ اسباب کی تاثیر سے قطع نظر کر کے آدمی ہر کام کو خدا کے حوالے اور سپرد کردے۔ توکل ترک اسباب کا نام نہیں، اسباب ووسائل اختیار کرنا منافی توکل نہیں ہے۔ درحقیقت توکل یہ ہے کہ ان اسباب ووسائل پر سے نظر اعتماد اٹھ جائے اور قلب کا ربط محض اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی سے ہوجائے۔ متوکل کی نگاہ میں اسباب ووسائل کا تماشہ ہوتا رہتا ہے مگر اس کے دل کی نگاہیں مسبب الاسباب پر جمی ہوتی ہیں، توکل، توحید

کے لوازم میں سے ہے، توکل کی بنیاد توحید ہے، جس کا قدم توحید میں جس قدر راسخ ہوگا توکل کا حلقہ اتنی ہی مضبوطی کے ساتھ اس کے ہاتھوں میں ہوگا۔توحید اسلام کا رکن اعظم ہے۔اسے ایمان کی خشت اول کہہ لیجئے اور یہی خشت آخر بھی ہے۔توحید وتوکل کے حاصل ہونے کے بعد ایمان کامل اور پختہ ہوجاتا ہے۔ایسا شخص حالات خواہ کتنے ہی بگڑے ہوں، ہوا کا رخ کتنا ہی ناموافق ہو ہرگز کسی چیز سے ہراساں نہیں ہوتا۔حضرت مولانا شیخ سعدی علیہ الرحمہ کے یہ اشعار اکثر اپنی مجالس میں پڑھا کرتے تھے۔

موحد چہ برپائے ریزی زرش　　چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید وہراسش نباشد زکس　　ہمین است بنیاد توحید وبس

حضرت مولانا کو توحید وتوکل کا یہ حال ابتداء عمر سے حاصل تھا۔عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ توکل کا تعلق صرف روزی کے ساتھ ہے۔آدمی روزی کے معاملے میں خدا پر بھروسہ اور اعتماد کرلے بس وہ متوکل ہوگیا۔بلاشبہ یہ بھی توکل ہی کا ایک شعبہ ہے مگر توکل اس سے بہت عام ہے، دنیا کے ہر معاملے میں خواہ اس کا تعلق رزق کے ساتھ ہو یا صحت وآرام کے ساتھ، اعوان وانصار کے قلت وکثرت کے ساتھ ہو یا تعلیم وتربیت کے نتائج کے ساتھ ہر جگہ خدا پر نگاہ جمی ہو اور اس سے ذہول بالکل نہ ہو۔یہ پورا توکل ہے

حضرت کا رزق کے بارے میں تو یہ حال تھا کہ تن تنہا گھر کی زمینداری سے حصہ لئے بغیر فتحپور کے کوردہ دیہات میں یہ کہہ کر بیٹھ گئے کہ مقدر روزی تو مل کر رہے گی۔مدت العمر تحصیل معاش کا کوئی ظاہری ذریعہ نہیں اختیار فرمایا اور ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ (جو اللہ پر توکل کرے اللہ اس کو کافی ہے) کے وعدے کی صداقت کا مشاہدہ فرماتے رہے رزق من حیث لا یحتسب آتا رہا، فتح پور میں

مکان تعمیر ہوا، عظیم الشان خانقاہ تعمیر ہوئی، عالیشان مسجد بنی، الہ آباد میں ایک بڑا سا مکان خریدا، اسٹیشن کی خوبصورت سنگ مرمر کی مسجد بنی خود اس مسجد کی جدید تعمیر ہوئی جس میں آپ نماز ادا کرتے تھے۔ یہ سب کام ہوئے مگر نہ فراہمی چندہ کی ہماہمی، نہ رسید اور سفراء کی گرم بازاری تمام ضروریات کی اللہ تعالیٰ خود کفالت فرماتے رہے۔

پھر ایک بڑا سا کنبہ آپ کے ہمراہ رہا، کتنے متوسلین و متعلقین اور ارباب مدارس وخوانق آپ کے یہاں سے وظیفہ پاتے رہے اور خزانۂ غیب سے سب پورا ہوتا رہا یہ سب آپ کے صدق توکل کی برکات کا ظہور تھا توکل کی یہ صورت تو ہر ایک کے سامنے تھی اور ہر شخص اسے توکل سمجھتا تھا مگر زندگی کے وہ ابواب جن میں لوگ توکل اور توحید کا تصور بھی نہیں کرتے حضرت کو ان میں بھی اعلیٰ درجہ کا توکل حاصل تھا، حضرت اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے جس سے آپ کے ذوق ووجدان کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

تکیہ بر تقویٰ و دانش در طریقت کافری است　　　راہرو گر صد ہنر دار د توکل بایدش

اپنی عقل اور تقویٰ پر تکیہ کرنا طریقت میں کفر ہے، سالک اگر سینکڑوں ہنر رکھتا ہو تب بھی اسے توکل کرنا چاہئے۔

یہ واقعہ ہے کہ بعض لوگ روزی کے باب میں تو متوکل ہونگے مگر اپنی فہم وفراست پر بے جا اعتماد سے ان کا قلب خالی نہیں ہوتا، یا تقویٰ وعبادت پر ان کی نظر رہا کرتی ہے مگر یہ بھی منافی توکل ہے حضرت مریدوں کی تربیت کے باب میں بھی اپنی سی محنت صرف کرنے کے بعد بھروسہ صرف خدا ہی پر رکھتے تھے، حضرت نے موحد کی شان میں ایک مجلس میں جو کچھ بیان فرمایا اسے نگاہ میں رکھئے اس سے مقام توحید اور توکل کا سمجھنا آسان ہوگا اور اسی سے حضرت کی شان توکل کا بھی کچھ سراغ ملے گا۔ فرماتے ہیں:

موحد ابتداء میں تنہا ہوتا ہے اور اس کا حال بالکل ایسا ہوتا ہے کہ وہ ہر جانب سے ہٹ کر اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی جانب کر لیتا ہے اور یہ پکار اٹھتا ہے کہ **یا احد من لااحد له یا سند من لا سند له** یعنی اے وہ ذات کہ جس کا کوئی نہیں ہے اس کے لئے آپ ہی ہیں اور جس کا کوئی سہارا نہیں اس کا سہارا آپ ہی ہیں۔ **انقطع الرجاء إلا منک** سب رجاء منقطع ہوگئی بجز آپ کے، موحد کا یہی حال ہوتا ہے کہ اس کی امید منقطع ہو جاتی ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ ہمارا کوئی نہیں ہے اور جب وہ اپنا رخ مخلوق کی طرف سے موڑ لیتا ہے تو پھر معلوم نہیں کتنے لوگ اس کے ماننے والے اور اس کے تابع ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایک کثیر جماعت سچے اور مخلص لوگوں کی بنا دیتے ہیں جو آخر تک اس کا ساتھ دیتے ہیں جب مخلوق سے انقطاع ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی نصرت اس کے ساتھ ہوتی ہے اور اصل توحید یہی ہے کہ سب سے انقطاع ہو جائے مگر یہ کہ یہ انقطاع چونکہ خدا کے لئے ہوتا ہے اس وجہ سے خدا تعالیٰ ان کو دوسری طرف جانے نہیں دیتے بلکہ سب کو اسی کی طرف جھکا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں سب کی پیشانی ہے وہی جس کے سامنے چاہتے ہیں جھکا دیتے ہیں کوئی دوسری طرف جا نہیں سکتا۔

چنانچہ یہی معاملہ حضرت کے ساتھ پیش آیا۔ ابتداء میں آپ بالکل تنہا تھے کوئی یار و مددگار بجز خدا کے نہ تھا۔ لیکن زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ مخلصین و محبین کی ایک بڑی تعداد قدموں پر نثار ہونے لگی اللہ پر سچا بھروسہ کیا تو اللہ نے دروازے کھول دیئے، پھر تو ایسے ایسے جانثار پیدا ہوئے کہ جہاں حضرت کا پسینہ بہتا وہاں یہ لوگ خون بہانے کے لئے تیار ہوئے۔

فتح پور میں جب مسجد کی تعمیر کا کام جاری تھا، مولانا عبدالباری صاحب ندوی ابھی کچھ مدت ہی قبل پرانی حالت میں دیکھ کر گئے تھے اب سنا کہ عالیشان مسجد بن کر تیار ہوگئی ہے تو انھوں نے خانقاہ میں مقیم مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامی کے پاس لکھا کہ:

ایک زحمت اور قبول فرمائیں ۔ مسجد تو اب غالباً مکمل ہوگئی ہوگی، پرانی مسجد میں تو کل ایک ہی درجہ تین دروں کا تھا نئی میں سنا ہے دو درجے اور سات در ہیں، اندر باہر گنجائش بھی غالباً دو چند ہوگئی ہوگی اس طرح مزدور بھی تیس چالیس ہونگے جو معلومات مختصراً آپ دے سکیں ایک مقصد سے مطلوب ہیں ۔ والسلام

جواب تو اس کا خاصا طویل ہے جو رسالہ معرفت حق دسمبر ۱۷ء میں شائع ہو چکا ہے حاصل اس کا یہ ہے کہ:

مسجد اب وسعت میں پہلے کی چار گنی ہوگئی ہے تین صفوں کا اگلا دالان ہے اور دو کا پچھلا اور گیارہ بارہ صفوں کا صحن ہے ہر صف میں تقریباً ۳۵، ۴۰ آدمی آتے ہیں ستون اور مینارے انتہائی سبک اور حسین ہیں روزانہ سو سوا سو روپیہ بلکہ اس سے بھی زائد مزدوری میں دئے جاتے ہیں اور مزدوروں سے زیادہ کام خود اہل بستی اور اہل خانقاہ نے جو کیا وہ الگ رہا۔

حضرت والا نے از خود خانقاہ بننے کی تحریک کی نہ مسجد کی توسیع کی لیکن جب ضرورت ہوئی تو بعض مخلصین نے حضرت والا سے اجازت لیکر تنہا اپنے کو اس خدمت میں پیش کیا ۔ چنانچہ خانقاہ کا اوپری حصہ اسی طرح بنا اس کے بعد دوسرے صاحب نے مسجد کی توسیع کی اجازت لی چنانچہ ایک ہی صاحب کا اس میں اتنا بڑا حصہ ہے کہ اگر کل ہی تعمیر کی ان کی جانب نسبت کی جائے تو غلط نہ

ہوگا۔ بایں ہمہ جن جن مخلصین پر اعتماد اور اعتبار ہوا ان کی پیش کردہ رقوم سے انکار بھی نہیں فرمایا گیا، باقی اب حضرت کو یاد بھی نہ ہوگا کہ کس نے کتنا دیا اور نہ اس کی ضرورت۔ (حالات، ج:۱،ص:۳۲)

یہ تو ایک مثال ہے اس نمونہ کی بے شمار مثالیں آپ کی زندگی کے مختلف دور میں جا بجا نظر آتی ہیں کہ نہ ان کے تفصیل کی اس کتاب میں گنجائش ہے اور نہ ضرورت!

محبت وشفقت:

قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے حضرت رسول کریم ﷺ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُفٌ رَّحِيْمٌO (سورہ توبہ:۱۲۸).

تمھارے پاس تمھیں میں سے ایک رسول آیا ہے جس پہ تمھاری تکلیف کی چیزیں گراں ہیں اور تمھارے اوپر وہ بڑا حریص ہے اور مومنین پر وہ بہت مہربان اور رحم وکرم کا مجسمہ ہے۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ج وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران:۱۵۹).

یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ تم ان کے واسطے بالکل نرم ہو اور اگر تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمھارے پاس سے منتشر ہو جاتے۔

رحمۃ اللعالمین ﷺ کی ذات گرامی میں اللہ تعالیٰ نے رحم ومروت اور شفقت ومحبت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ یہ آپ کا وصف خصوصی تھا آپ کی نیابت میں وارثین رسول بھی اپنے اپنے ظرف کے بقدر اس وصف عالی سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔

حضرت باوجود کسی قدر جذب وجلال کے سراپا رحمت وکرم تھے۔آپ کی خدمت میں حاضر ہونے والا ہر شخص خواہ کتنا ہی بے گانہ ہو حضرت کے لطف وکرم سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔رحمدلی کی یہ کیفیت تھی کہ جہاں کسی نے اپنی کسی تکلیف کا اظہار کیا حضرت بے چین ہو جاتے اور جس حد تک وہ دردمند ہوتا حضرت غالباً اس سے زیادہ ہی احساس فرماتے اس باب میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شہادت سنتے چلئے۔تحریر فرماتے ہیں

۱۹۶۴ء میں الہ آباد حاضری ہوئی تقریب حاضری یہ تھی کہ ۲۰/۲۱/جون کو دینی تعلیمی کونسل جس کی صدارت کا شرف شروع سے حاصل رہا کیا۔الہ آباد میں اس کی صوبائی کانفرنس تھی ،اس لئے پہلے سے قصد تھا کہ قیام مولانا ہی کے یہاں رہے گا غلطی سے مولانا کو اپنی آمد اور پہونچنے کی اطلاع دے دی،غلطی اس لئے کہ جب ۲۰/جون کو صبح الہ آباد کے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو معلوم ہوا کہ مولانا خود اسٹیشن تشریف لائے ہیں۔گاڑی ذرا تاخیر سے پہونچی تھی مولانا نے ملتے ہی فرمایا کہ اس خیال سے کہ وہ چائے اور ناشتہ کا وقت ہوگا،میں چائے اور ناشتہ اسٹیشن پر لایا ہوں کہ تاخیر نہ ہولیکن اب تو وقت زیادہ ہے اس لئے اب گھر ہی پر ناشتہ ہوجائے گا میں اس لطف وکرم اور اہتمام کو دیکھ کر پانی پانی ہوگیا اور اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا کہ پہونچنے کے وقت کی اطلاع کیوں دی۔

مولانا کے اس تعلق قلبی اور شفقت بزرگانہ کا پورا اظہار اس وقت ہوا جب میں اپنی آنکھ کی تکلیف کے سلسلہ میں ۶۷ء میں سیتاپور میں مقیم تھا اور یکے بعد دیگرے آپریشن ہورہے تھے کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا اس وقت مولانا کے نامہ وپیام

برابر آتے تھے الہ آباد سے مولانا کے اہل تعلق میں سے جو بھی آتا وہ بیان کرتا کہ مولانا بہت فکرمند اور بے چین ہیں۔ بعض اوقات لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ میں ان کی تکلیف میں کس طرح کمی کرسکتا ہوں یہاں کے قیام کے آخر زمانے میں مولانا کا گرامی نامہ آیا کہ ''میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ آپ کو وہاں کے علاج سے فائدہ نہ ہوگا آپ لکھنؤ جائیں اور ہومیو پیتھ علاج کریں'' میں اور میرے تیمار دار بھی اس قیام سے عاجز آ گئے تھے یہ ایک اشارۂ غیبی معلوم ہوا اور میں لکھنؤ آ گیا اور مجبور ہوکر ایک ہومیو پیتھ ڈاکٹر سے جو بہت زیادہ نامور نہ تھا رجوع کیا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جو تکلیف بار بار کے آپریشنوں سے بھی نہیں گئی تھی وہ باذن اللہ ایک خوراک سے جاتی رہی اور الحمد للہ پھر کبھی نہیں ہوئی، نام تو اس ڈاکٹر کا ہوگیا اور اس معرکۃ الآرا علاج سے خود اس کو بہت فائدہ ہوا لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس دوا سے زیادہ دعاء اور ایک مرد خدا کی اور بہت سے مخلصین کی سوز قلبی اور دردمندی کا ہاتھ تھا۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

اس تکلیف سے نجات پانے کے بعد میں نے الہ آباد کا مستقل سفر کیا جس کا محرک محض جذبہ تشکر اور مولانا کی مسرت قلبی کی توقع تھی۔

گرمی کا زمانہ تھا۔ مولانا نے نیچے کی منزل میں قیام کا انتظام فرمایا تاکید کی کہ گرمی میں اوپر آنے کی زحمت بالکل نہ کی جائے، اس کا بھی اہتمام کیا گیا کہ کسی ضرورت کے لئے باہر نکلنا نہ ہو کئی بار انار شیریں کے دانے اس پیغام کے ساتھ بھیجے گئے کہ یہ آنکھوں کے لئے مفید ہیں پھر شام کو بڑی شفقت سے ملاقات

فرمائی، کھانے کا اہتمام فرمایا، ان نوازشوں میں محض بزرگانہ نہیں بلکہ مادرانہ شفقت کی جھلک بھی نظر آتی تھی جو نائبین رسول کا امتیاز ہے۔ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ۔

مولانا منظور صاحب نعمانی تحریر فرماتے ہیں کہ:

قرآن مجید میں بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُفٌ رَّحِيمٌ رسول اللہ ﷺ کی صفت بیان فرمائی گئی ہے اس لئے اہل اللہ جو رسول اللہ ﷺ کے روحانی خلفاء اور نائبین ہوتے ہیں الوان کے اختلاف کے باوجود سب ہی اس صفت کے حامل ہوتے ہیں اس گنہگار کو اللہ تعالیٰ نے اپنے جن خاص بندوں کو دیکھنا نصیب فرمایا ان سب کو اس صفت سے بھرپور دیکھا لیکن حضرت مولانا شاہ وصی اللہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر خاص کر حیات کے اس آخری دور میں اس صفت کا انتہائی غلبہ تھا جو بھی حضرت سے قریب ہوتا محسوس کرتا کہ رگ وریشہ میں شفقت وعنایت بھری ہوئی ہے جو طالب بن کر آتا چاہتے کہ اس کے اعمال واخلاق کی پوری پوری اصلاح ہو جائے اور اس کو تعلق مع اللہ کی دولت نصیب ہو جائے اور اس کے ساتھ بہت سوں کی دنیوی ضروریات کی بھی فکر فرماتے اور ان کی تکلیفوں اور پریشانیوں سے سخت بے چین ہوتے۔

جی چاہتا ہے کہ اسی سلسلۂ بیان میں حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے مضمون ’’چار ہفتہ ایک کہف میں‘‘ کا بھی ایک اقتباس پیش کرتا چلوں لطف سے خالی نہیں ہے لکھتے ہیں کہ

ایک بظاہر انمل لیکن بہت کچھ تھانوی رنگ ہی سے ملتی جلتی بات، یعنی ایک طرف اخلاق واعمال کی خامیوں، کوتاہیوں پر معمولی وسرسری روک ٹوک ہی

نہیں خاصی لے دے، ناراضگی وناگواری بلکہ لہجہ کی حد تک درشتی وسختی لیکن دوسری طرف بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ والی شان رافت ورحمت اور شفقت کا یہ عالم کہ بعض وقت بے قرار ہوجاتے دیکھا، نجی سے نجی پریشانیوں، بیماریوں میں دعا ودوا دونوں کی فکر وتدبیر سے ایسی دستگیری کہ قریب سے قریب عزیز اور ہمدرد سے ہمدرد دوست ہی سے امید ہوسکتی ہے خود اپنی معمولی نزلہ زکام کی بیماری سے بعض سخت پریشانیوں تک میں تو اس کا تجربہ ہوا ہی۔ ایک اچھے رئیس زادے وعالم دین اپنے پورے گھر بیوی بچوں والدہ بھائی سب کے ساتھ اصلاحی تعلق سے مقیم تھے ماشاء اللہ بڑے سعید وصالح جوان، کسی کسی وقت میرے پاس بھی خصوصیت سے آبیٹھتے، بیچارے کچھ دماغی خلل کے مریض ہیں، کبھی کبھی دورہ سخت پڑتا ہے وطن ۵-۶ میل قریب ہی ایک قصبہ ہے، ایک دن دورہ جو پڑا تو روزہ رکھے لو دھوپ میں پیدل ہی سب گھر والوں کو چھوڑ چھاڑ بے تحاشہ بھاگ نکلے، ماں، بھائی، بیوی کی پریشانی تو ظاہر ہی ہے خود حضرت کو اتنا فکرمند اور متاثر دیکھا کہ جب تک ایک صاحب کو سائیکل پر بھیج کر ان کو واپس بلا نہیں لیا یکسو نہیں ہوئے اور پھر روزہ رکھنے سے حکماً روک دیا، دوا علاج کی فکر وتاکید فرمائی۔

اصلاح امت کی دھن:

اسی قلبی محبت وشفقت اور بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ کی شان نبوی کا پرتو تھا کہ آپ کے قلب مبارک میں اصلاح امت کا جذبہ نہایت لگن اور تڑپ کے ساتھ موجزن تھا آپ دیکھ رہے تھے کہ امت بداعمالیوں اور بداخلاقیوں میں مبتلا ہوکر اپنے مرکز سے ہٹتی چلی جارہی ہے بدعات ونفاق کی بیماری نے امت کے اجتماعی جسم کو

کھوکھلا کر دیا ہے، امت بحیثیت امت کے اپنا وزن کھوتی چلی جارہی ہے ، ارضی وسماوی آفات کے ساتھ خود ان کے آپسی اختلاف ، جھگڑوں اورلڑائیوں نے انھیں بالکل کمزور بنا کر رکھ دیا ہے ان حالات میں حضرت کی بے چینی شدید سے شدید تر ہو جاتی ۔ دنیاوی مصائب اپنا جو اثر دکھا رہے تھے وہ تو تھا ہی آخرت کے آنے والے شدائد نے اور بھی ہراساں بنا رکھا تھا آپ چاہتے تھے کہ امت اپنے جھگڑوں اور فساد کو ختم کر کے اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لے اعمال صالحہ، اخلاق حمیدہ اور اتباع سنت ہی میں دنیا اور آخرت کی فلاح ہے مجالس میں نہایت سوز اور درد کے ساتھ امت کو اس طرف متوجہ فرماتے اور جب لوگوں کو اس سے بے اعتنائی برتتے دیکھتے تو بے تاب ہو جاتے مجبوراً خفا ہوتے ، ڈانٹتے ، ناراض ہوتے ۔ درحقیقت یہ ناراضی نہ ہوتی ۔اس بات کا درد ہوتا کہ امت کیوں ہلاکت کے دہانے میں از خود گرتی چلی جارہی ہے آپ سنت نبوی کے اتباع میں لوگوں کی کمر پکڑ پکڑ کر بربادی کے گڑھے سے نکالنا چاہتے تھے اور لوگ اسی میں گرتے چلے جاتے تو بے چینی بے اختیارانہ جوش وخروش کی صورت اختیار کر لیتی ۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے اور بالکل درست لکھا ہے کہ:

''ایک اضطرابی اور سیمابی کیفیت تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی کل چین نہیں مسلمانوں کے حالات ، اخلاق ومعاملات کے بگاڑ ، صدق واخلاص کی کمی اور نفاق کے کھلی آنکھوں مشاہدے نے بے قرار ومضطرب بنا رکھا ہے ۔ اصلاح حال اور دعوت فرار الی اللہ کا جذبہ قلب ودماغ واعصاب پر مستولی ہو گیا ہے اور وہ حال ہے جو اس شعر میں بیان کیا گیا ہے

شعلہا آخر زہر مویم ومید — از رگ اندیشہ ام آتش چکید

مولانا کی اس بے قراری اور سیماب وشی کو دیکھ کر بے اختیار مولانا محمد الیاس صاحب یاد آ گئے، وہی نحیف جثہ، وہی گفتگو میں تکلفات اور انداز خطابت سے بے نیازی، وہی موسوی رنگ کہ زبان سینہ کے جوش اور دل کا ساتھ نہ دے سکے وہی فکر میں ڈوبا ہوا سکوت وہی اضطراب سے لبریز تکلم، دعوت کے موضوع کا ضرور فرق تھا لیکن اپنے موضوع سے عشق اور اپنے کام کی فکر کا وہی حال تھا۔ صبح وشام کی مجلسوں میں شرکت کا اتفاق ہوا، ایسے جذب کی کیفیت تھی جس پر عقل وسلوک کے پہرے بیٹھے ہوئے تھے کبھی کبھی بعض مخلص خادموں کے سر پکڑ کر ہلاتے اور ان کو کسی نکتہ یا ضرورت کی طرف متوجہ فرماتے‘‘

عمر کے آخر حصہ میں آپ پر اکثر امراض کا ہجوم رہا۔ کبھی فالج کا اثر ہوا کبھی رعاف کا سلسلہ شروع ہوگیا کبھی اور کسی مرض کی تکلیف پیش آ گئی اس سلسلے میں حضرت کبھی کبھی فرماتے ہیں کہ:

تم لوگ مجھ کو کلام کرنے سے منع کرتے ہو، مجھ کو علمی مضامین بیان کرنے سے زیادہ تعب نہیں ہوتا اور نہ دل پر کوئی برا اثر پڑتا۔ البتہ مسلمانوں کی بے اصولی اور تباہ حالی کو دیکھ کر ضرور رنج ہوتا ہے اگر آج ان کے حالات درست ہو جائیں تو میں اچھا ہو جاؤں اور خود بخود قوت آ جائے‘‘

حضرت والا کی دلی لگن تھی کہ مسلمانوں میں آپس میں اتحاد اور اتفاق کی صورت بن جائے اور سمجھتے تھے کہ ایسا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک امت سے اخلاقی بگاڑ کا خاتمہ نہ ہو جائے ایک تحریر میں ایک خاص جگہ کے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

’’میں اس وقت آپ حضرات سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں ممکن ہے کہ اس کے

نہ جاننے کی وجہ سے کسی کو غلط فہمی ہوتی ہو، وہ یہ کہ میں اس زمانہ میں سب سے زیادہ ضروری چیز جو مسلمانوں کے لئے سمجھتا ہوں وہ اخلاق ہے اور یہ سمجھتا ہوں کہ جب قوم سے اخلاق ہی ختم ہو جائے تو گویا قوم ہی معدوم ہوگئی اس لئے اپنے لوگوں سے برابر اخلاق ہی کے درست کرنے کا مطالبہ کرتا رہتا ہوں اس طرح پر کہ گویا میں نے اپنے کام کا دار و مدار اور مبنائے کار ہی اخلاق کی اصلاح پر رکھ دیا ہے اب اس کے بعد جب لوگوں کو کسی بداخلاقی کا شکار دیکھتا ہوں خواہ وہ شخصی اور خصوصی ہو یا عمومی طور پر ہو یعنی ایسی کہ اسکا مظاہرہ علی رؤس الاشھاد برسر بازار کھلم کھلا اور ڈنکے کی چوٹ پر کیا گیا ہو تو اس کی وجہ سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔

آگے تحریر فرماتے ہیں کہ:

میں مسلمانوں کو متفق اور متحد دیکھنا چاہتا ہوں اور اپنی تمام تر کوشش اسی میں صرف کرتا ہوں، بداخلاقی سے قوم کا شیرازہ ہی منتشر ہو جاتا ہے اس لئے ہر زمانہ میں مصلحین امت نے اسے ناپسند کیا ہے دین و مذہب قرآن وسنت اس کی شناعت کے بیان سے پر ہے اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ آخرت کی سعادت تو اخلاق سے وابستہ ہے ہی دور حاضر میں تو دنیا کی فلاح بلکہ قوم کی بقاء اور حیات بھی اسی اخلاق پر منحصر ہے اگر اخلاق درست نہ ہوئے تو قوم کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔

اسی دھن اور تڑپ نے آپ کو مدت العمر بے قرار رکھا، شب و روز کا کوئی لمحہ اصلاح امت کی فکر اور سوچ سے خالی نہیں رہتا تھا۔ مختلف عنوانات سے امت کو کام کی طرف متوجہ فرماتے کبھی کبھی تو بیتاب ہو کر یہ فرماتے کہ تم سے دین کا کام نہیں سپڑتا تو

دنیا ہی کما کر دکھلاؤ مسلمان نوجوانوں کو بے کار اور دین و دنیا ہر دو کے کام سے فارغ دیکھتے تو بے قرار ہو جاتے، ہر شخص جانتا ہے کہ بے کاری بڑے بڑے مفاسد کا سر چشمہ ہے، ہر مسلمان کسی کام میں مشغول رہے یہ آپ کو پسند تھا۔ اس سلسلے میں حضرت کا ایک ملفوظ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے اور اسکا مستحق ہے کہ ہر مسلمان اسے لوح دل پر کندہ کر لے۔ فرماتے ہیں کہ

بہت دنوں سے ایک بات لوگوں سے کہتا تھا اور سمجھتا تھا کہ صحیح کہہ رہا ہوں اور کام کی بات بتا رہا ہوں، لیکن یہ بھی خیال ہوتا تھا کہ اور علماء تو اس کو بیان نہیں کرتے، میں ہی کر رہا ہوں مگر اب تو شاہ اہل اللہ صاحب برادر خورد حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے کلام سے بھی اس کی تائید مل گئی جس سے مجھے بڑی ہی مسرت ہوئی، اور میں نے سمجھا کہ میں جو لوگوں سے اس قدر زور کے ساتھ یہ مضمون بیان کرتا تھا تو یہ ضروری تھا اور خدا ہی کی طرف سے قلب میں آیا تھا۔

حضرت شاہ صاحب اپنی کتاب ’’چہار باب‘‘ میں ارقام فرماتے ہیں کہ:

نصیحت: خود را معطل و مہمل نگزارند کار عقبیٰ بسازند و اگر نتوانند کار دنیا از دست ندہند۔ یعنی منجملہ نصائح کے ایک نصیحت یہ فرماتے ہیں کہ اپنے کو معطل و مہمل نہ چھوڑیں بلکہ آخرت کا اور دین کا کام کریں اور اگر عقبیٰ کا کام نہ کرسکیں تو دنیا ہی کا کام کریں یعنی کوئی ہنر یا پیشہ ہی سیکھیں تا کہ کم از کم دنیا ہی کی جانب سے مطمئن ہو جائیں۔ باقی یہ کہ آدمی نہ دین کا ہو نہ دنیا کا یہ شخص نکما، ناکارہ اور بطال ہے یہ وصف عند الشرع منکر ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انی لاکرہ ان اری احدکم سبھللاً لافی عمل دنیا ولافی عمل آخرۃ.

یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں تم میں سے کسی شخص کو سبہلل دیکھنا پسند نہیں کرتا اور سبہلل ہونا یہ ہے کہ آدمی نہ دین کا کام کرے نہ دنیا کا۔

یہی میں لوگوں سے کہتا تھا کہ بھائی تم سے اگر دین نہیں سپڑتا تو دنیا ہی کما لو، دنیا کی جانب سے جب مطمئن رہو گے تو دین بھی حاصل کرلو گے۔ ورنہ جب تمھارا ہوش، حواس اور عقل وفکر ہی درست نہ رہے گی تو تم دین بھی اختیار نہ کرسکو گے چنانچہ آج جن لوگوں کو دنیا کی طرف سے فارغ دیکھتا ہوں انھیں کو دین کے کام میں بھی لگا ہوا دیکھتا ہوں اور جس کی دنیا تباہ ہے اس کا دین اس سے زیادہ برباد ہے۔ یہ امر مشاہد ہے، اس لئے شاہ صاحب کی یہ نصیحت بہت پسند آئی۔ ضرورت ہے کہ لوگ اس کو پیش نظر رکھیں اور حرز جان بنائیں۔

رعب وجلال:

حضرت والا کو سنت نبوی کے اتباع میں رعب وجلال کا بھی خداداد حصہ ملا تھا۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ **نصرت بالرعب مسیرۃ شھر** میری مدد ایسے رعب کے ذریعے ہوئی ہے جس کے اثرات ایک مہینے کی مسافت پر پڑتے ہیں خادمان نبوت کو بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں یہ دولت ملا کرتی ہے چنانچہ حضرت والا کا رعب وجلال مشہور تھا آپ کے جلال کے آگے بڑے بڑوں کا زہرہ آب ہو جاتا تھا مجلس مبارک میں ہر طبقہ کے لوگ حاضر ہوتے بڑے بڑے علماء واہل دانش ایک سے ایک رئیس وکبیر، افسران وارکان حکومت، مگر جو آیا سرنگوں ہی رہا کسی کو تاب نہ تھی کہ نگاہ روبرو کرسکے، مجلس میں کوئی شخص نگاہ ملانے کی ہمت نہ کرسکتا تھا۔ یہ خدائی رعب وجلال تھا برسوں کے ساتھ رہنے والے جنھیں دن رات حضرت کی خدمت میں حاضر رہنے کا موقع ملتا تھا انھیں بھی کسی طرح کی بے تکلفی کی جرأت نہ ہوسکتی تھی۔

مجلس میں کبھی کبھی علماء کبار سے فرماتے کہ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے اسے ذرا لوگوں کو سمجھا دیجئے تو دیکھا جاتا کہ ایسے علماء کرام جو ہزاروں کے مجمع میں بے تکان بولتے رہتے ان کی زبانیں لڑکھڑا جاتیں اور چند منٹ سے زیادہ دماغ اور زبان میں ربط باقی نہ رہتا۔ بالآخر معذرت کر کے بیٹھ جاتے ہر آنیوالا خواہ وہ اپنی جگہ کتنا ہی عظیم الشان مرتبہ رکھتا یہاں آ کر اپنے کو بالکل معمولی اور عامی انسان محسوس کرتا تھا ایک صاحب نے لکھا ہے اور بجا لکھا ہے کہ:

حضرت شاہ وصی اللہ شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ ہمارے زمانہ میں بہت بزرگ صاحب حال گزرے ہیں جن کی بزرگانہ جلالت شان کے سامنے زمانے کے جید علماء وحکماء اور وزرائے دولت واہل ثروت متواضع اور جھکے رہتے تھے اور مارے ان کے رعب وجلال کے تھر تھر کانپنے لگتے تھے ایسے بزرگ اس ظلمت کے عہد میں بندہ نے کہیں نہیں دیکھا یوں تو بہت سے اللہ کے بندے اور اللہ والے ہیں لیکن میری بصیرت کے اعتبار سے نایاب ضرور ہیں۔

(آئینۂ نصیحت وعبرت، مرتبہ مولانا ریاض احمد رشیدی رحمانی)

اس رعب اور دبدبہ کا یہ اثر تھا کہ مخالفین بھی کھلم کھلا جرأت مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔ ہر شخص اپنی جگہ تھراتا تھا۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامی نے حضرت کی شان وشوکت وجلال کے سلسلے میں ایک واقعہ نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ افراد تو افراد پوری آبادی حضرت کے جلال حق کے سامنے سرنگوں رہتی تھی وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

راقم عرض کرتا ہے کہ حضرت اقدس کے دبدبۂ وشوکت سے متعلق ایک واقعہ میرے مشاہدے سے بھی گزرا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معتقدین اور

ماننے والوں کے علاوہ غیر معتقدین اور نہ ماننے والے بھی حضرت کا ظاہری احترام کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے، ہوا یہ کہ حضرت والا کے وطن کے قریب ایک دوسری بڑی بستی کے بہت سے لوگ بھی حضرت والا سے متعلق تھے ان متعلقین میں سے کسی شخص کا کسی اور شخص سے کوئی معاملہ الجھا تو وہ دوسرا شخص بازار کے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر کچھ لوگوں کے سامنے زور زور سے یوں کہنے لگا کہ فلاں کے ذمہ میرا یہ حق ہوتا ہے اور وہ مجھ کو نہیں دے رہا ہے اور فتحپور بھی جاتا ہے مطلب یہ تھا کہ حضرت مولانا کا مرید ہے یا حضرت سے اس کا تعلق ہے خیر یہاں تک تو کوئی بات نہ تھی اس کے بعد ظالم نے غصہ میں آکر یہ بھی کہہ دیا کہ فتحپور جاتا ہے تو وہاں تو یہی سب سکھایا ہی جاتا ہے یعنی یہ کہ کسی سے بدمعاملگی کرے، کسی کا مال ہڑپ کرے، کسی کو تکلیف پہونچائے وغیرہ وغیرہ، اس کی یہ بات حضرت کو بھی پہونچ گئی چونکہ اس نے مجمع عام میں بازار کے ہوٹل میں بیٹھ کر یہ بات کہی تھی جو سراسر غلط اور اس کے قلبی بغض وعناد کی ترجمان تھی، اس لئے حضرت کو ناگوار ہوئی کہ دیکھو تو اس شخص نے اپنے مقابل کے ساتھ ساتھ مجھے بھی بدنام کیا اور یہاں کی تعلیمات کو بھی بدنام کیا اگر اسی طرح لوگوں کے حوصلے بڑھتے رہے تو پھر غیبت اور بدگوئی کی گرم بازاری ہو جائے گی اور یہ جاہل عوام علماء کی شان میں منہ پھٹ ہو جائیں گے۔ جو شخص جس کے متعلق جو چاہے گا منھ سے نکال دے گا۔ اس طرح تو کسی عالم کی بھی عزت وحرمت محفوظ نہ رہے گی آج اس نے مجھے کہا ہے تو کل کسی دوسرے عالم کو بھی کہہ دے گا لہٰذا یہ سلسلہ بند ہونا چاہئے یہ خیال فرما کر حضرت والا نے تین چار آدمیوں کا ایک وفد جن میں ایک صاحب رئیس اعظم تھے ایک صاحب پروفیسر تھے اور یہ راقم

الحروف بھی تھا۔اس بستی کے ایک بڑے عربی مدرسہ میں بھیجا اور وفد سے فرمایا کہ وہاں جائیے اور فلاں فلاں اہل علم حضرات اور فلاں فلاں سیٹھ اور بااثر حضرات کو جمع کر کے کہئے کہ آپ کی اس بستی کے بازار کے ہوٹل میں بیٹھ کر فلاں شخص نے ایسی ایسی بات کہی ہے۔ پہلے تو آپ لوگ بتایئے کہ میرے یہاں بداخلاقیوں کی اصلاح کی جاتی ہے یا بداخلاقی اور بدمعاملگی سکھلائی جاتی ہے؟ اگر آپ لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ یہاں آنے جانے والوں کو حسن خلق اور حسن معاملہ کی تعلیم دی جاتی ہے تو اس شخص کو جہاں بھی ہو تلاش کر کے بلوایئے اور اپنے سامنے پوچھئے کہ تم نے ایسا کیوں کہا؟ حضرت والا فرماتے تھے کہ جاؤ مگر وہ اقرار نہیں کرے گا، انکار کردیگا۔ کیونکہ منافق کے لئے ضروری ہے کہ ایک بات کہے اور مکر جائے لیکن خیر اس کا نفع یہ ہوگا کہ آئندہ اس قسم کی باتوں کا انسداد ہوجائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا لوگوں نے بازار میں اسے تلاش کیا بڑی مشکل سے ملا اور مدرسہ میں لایا گیا۔ یہاں پوری جماعت موجود تھی اس میں جب اس کی پیشی ہوئی تو لب خشک تھے، چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں کیا ہوا جرم اس کے چہرے پر پڑھا جاسکتا تھا لیکن جب اس سے پوچھا گیا تو اس نے صاف انکار کردیا کہ میں نے نہیں کہا ہے اور کہنے لگا کہ بھلا میں ایسی بات کہہ سکتا ہوں میں تو مولانا صاحب کو مانتا ہوں مگر فتحپور نہیں جاتا لیکن مولانا صاحب کا دل سے احترام کرتا ہوں۔ بہرحال گو اس نے اقرار نہیں کیا لیکن اس مواخذہ کا فائدہ یہ دیکھا گیا کہ اس قسم کی باتیں چھپی تھوڑی ہی رہتی ہیں جس بستی کے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر کل اس نے یہ جملہ کہا تھا آج اسی کے ہر ہر ہوٹل میں یہ چرچا ہونے لگا کہ فلاں شخص نے مولانا کے متعلق یہ بات کہی تھی مولانا

صاحب کے یہاں سے لوگ آئے ہیں اور اس سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ غرض اس شخص کی جو سزا ہونی چاہئے تھی یعنی رسوائی وہ اس کو مل گئی اور عام طور پر ایسے لوگوں کسی عالم اور بزرگ کی شان میں زبان کھولنے سے رک گئے یہ تھی وہ شوکت حضرت کی اپنے ضلع میں جو بندہ نے خود مشاہدہ کیا اور ایک یہی نہیں بلکہ اس قسم کے بے شمار واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔

(حالات ج ۱ ص ۲۷۲)

حزم وتدبر:

حضرت والا گوکہ اپنی فطرت اور ساخت ومزاج کے لحاظ سے ہمیشہ لوگوں سے الگ تھلگ اور گوشہ نشین رہے۔ ابتداءً تو لوگوں سے اختلاط بالکل نہ تھا اس لئے عین ممکن تھا کہ بعد میں جب عوام الناس سے اصلاحی سابقہ پڑا ہے تو ابنائے زمانہ کی جلسازیوں اور حیلہ جوئیوں کی وجہ سے دھوکا کھا جاتے لیکن حق تعالیٰ جب اپنی جانب سے کسی کو کسی منصب پر فائز کرتے ہیں تو اس کے مطابق اسے دانائی وفراست بھی عطا فرماتے ہیں یہ قدیم حکمت الٰہی ہے یہی معاملہ حضرت فتحپوری نور اللہ مرقدہ کے ساتھ بھی ہوا خدا کو جب آپ سے کام لینا منظور ہوا تو اس کام کے تمام لوازم اور اسلحے آپ کو مرحمت فرمائے گئے۔ چنانچہ باوجود قلت اختلاط کے اس دور اندیشی اور حزم واحتیاط سے آپ نے اپنا منصب نبھایا ہے کہ حیرت ہوتی ہے، مولانا ابنائے زمانہ کی نبضیں خوب پہچانتے تھے ان کی خواہش ومیلان سے بخوبی واقف تھے اور ساتھ ہی ساتھ ہر بات کا صحیح مطلب اخذ کرنا جانتے تھے اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ خود بھی نقصان سے بچتے تھے اور حتی الامکان اپنے متعلقین ومتوسلین کو بھی بچانے کی کوشش کرتے تھے مولوی علیم اللہ صاحب کا واقعہ کہیں گزر چکا ہے اس سے حضرت کے تدبر وتیقظ کا

اندازہ لگائیے ایک واقعہ اصلاحی سلسلہ کا خود حضرت بیان فرماتے تھے کہ:

ایک لڑکا میرے پاس آتا تھا، اس کا باپ اس کی وجہ سے اس پر بہت ناراض ہوتا تھا مگر وہ چھپ چھپ کر میرے پاس آتا رہا اور آنے پر والد کا یہ حال بیان کیا کہ میرے یہاں آنے پر بہت خفا ہوتے ہیں ان کو میرا یہاں آنا پسند نہیں ۔میں نے اپنے دل میں سوچا کہ یا اللہ کیا بات ہے، میں تو کسی برائی کی تعلیم نہیں کرتا، کسی کا گھر نہیں بگاڑتا پھر آخر یہ لوگ کیوں خفا ہوتے ہیں۔ پھر خود ہی سمجھ میں آیا کہ اجی بات یہ ہے کہ یہ لوگ دنیادار ہیں خیال کرتے ہونگے کہ میرا لڑکا وہاں جائے گا تو نماز روزہ ہی میں لگا رہے گا ہمارے کام کا نہ رہ جائے گا جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو میں نے اس لڑکے سے کہا کہ دیکھو جی! اگر تم یہاں آنا چاہتے ہو تو تم کو دہری محنت اٹھانی پڑے گی۔ دین سیکھ کر اس پر عمل بھی کرو یعنی معمولات ادا کرو مگر اس کی وجہ سے دنیا کے کام میں بھی کمی نہ ہونے پائے ،اس نے اس کو منظور کر لیا چنانچہ یہی کرتا رہا کہ میرے پاس بھی آتا رہا اور اپنی کھیتی باڑی کا کام پہلے سے زیادہ مستعدی کے ساتھ انجام دینے لگا جب اس کے باپ نے اس کو ایسا کرتے دیکھا تو خوش ہو گیا۔ اور یا تو کبھی اس کا میرے یہاں آنا پسند نہ کرتا تھا یا پھر یہ حال ہو گیا کہ خود سے تقاضہ کر کے اسے میرے یہاں بھیجنے لگا اور کہتا تھا ارے بابوا تتنے دن ہو گئل اورتوں مولانا صاحب کے یہاں نا گئیلا) یعنی اتنے روز ہو گئے اور تم مولانا صاحب کے یہاں نہیں گئے ۔میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں بھی ان دنیاداروں کی رگ پہچانتا ہوں اصل یہ ہے کہ ان کو دین کے مقابلے میں دنیا محبوب ہے ان کی دنیا کا نقصان نہ ہو پھر ان کا لڑکا تہجد پڑھنے والا ہو جائے ان کا کیا نقصان یہ تو اس دینداری کے

مخالف ہیں جس سے ان کی دنیاداری پر اثر پڑے اور اس میں کمی واقع ہو۔

(حالات ج ۱ ص ۲۷۴)

حضرت والا دوسرے داعیان حق کی طرح مصائب وآلام کے ساتھ دشمنان حق وصداقت کی مخالفتوں سے بھی دوچار ہوئے ان کی مخالفتوں سے عہدہ برآ ہونا۔ اپنے لوگوں کو بچالینا اللہ کی کھلی مدد کے ساتھ بہت کچھ فہم وتدبر اور اصابت رائے پر منحصر تھا ایسے مواقع پر عقل وخرد کا جوہر کھلتا ہے۔حضرت والا نے اہل بستی کی مخالفت کو کس طرح نرم فرمایا، اسے آپ پڑھ چکے ہیں الہ آباد تشریف لانے کے بعد کام کا میدان جب وسیع ہوا، آپ کی شہرت ہندوستان گیر پیمانے پر ہوئی اور اطراف واکناف ہند سے اہل طلب آنے لگے اس وقت مخالفت کا سب سے زیادہ اندیشہ الہ آباد کے ان دائروں اور خانقاہوں کی طرف سے تھا جن کی آج بھی کمی نہیں ہے اور ہر دائرے کا ایک حلقہ بنا ہوا ہے، یہ دائرے اور خانقاہیں اپنے اپنے وقت کے اکابر اولیاء اللہ کے ساتھ منسوب ہیں اور ان کے سجادہ نشین انھیں کی اولاد واخلاف ہیں لیکن اب ان دائروں میں بجز چند متصوفانہ رسوم اور بدعات کے کچھ باقی نہیں ہے۔

حضرت کے نزدیک بزرگوں کی نسبت کا بڑا احترام تھا، دیکھا جاتا ہے کہ کسی قدیم وجدید بزرگ سے کوئی تعلق ونسبت رکھنے والا آدمی خواہ نسبت دور کی ہو آجاتا اور آپ کو علم ہوجاتا تو اس کا بہت اعزاز واکرام کرتے، بخشش ونوال سے نہال فرمادیتے اور یہ حضرات تو بزرگوں کی اولاد تھے، حضرت نے ان بزرگوں کی نسبت کی وجہ سے ان حضرات کا کما حقہ اکرام فرمایا، گوکہ راہ سے ہٹے ہوئے تھے لیکن بڑی نسبت کے حامل تھے عزمت وحرمت کی نگہداشت کے لئے اتنی وجہ بہت کافی تھی۔

حضرت والا نے قیام الہ آباد کی ابتدائی مجالس میں یہ واقعہ اکثر بیان فرمایا

ہے کہ حضرت زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ جب اپنے شیخ کے حکم سے ملتان تشریف لائے تو وہاں کے مشائخ نے باتفاق رائے آپ کی خدمت میں ایک پیالہ دودھ سے بھرا ہوا بھیجا، حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر ایک پھول رکھ کر واپس کر دیا، حاضرین کو اس معاملے سے تعجب ہوا، کسی نے ہمت کر کے پوچھا کہ حضرت یہ کیا قصہ ہے بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی، فرمایا یہاں کے مشائخ نے لسان اشارت میں یہ مجھ سے کہا تھا کہ یہاں کی اقلیم اہل اللہ اور مشائخ سے ایسی ہی پر ہے جیسے یہ پیالہ دودھ سے لبریز ہے تو میں نے بھی اس پر پھول رکھ کر اشارت میں ہی اس کا جواب دیا کہ جس طرح اس کٹورے میں پانی اور دودھ کی بے شک گنجائش نہیں ہے لیکن پھول کی گنجائش اب بھی ہے اسی طرح میں بھی یہاں آپ حضرات کے درمیان مانند پھول کے رہوں گا یعنی میرے یہاں کے قیام سے آپ کی عزت و احترام کو ذرا بھی ٹھیس نہ لگے گی۔

حضرت مولانا یہ واقعہ درحقیقت......ایسا معلوم ہوتا ہے کہ......اپنے ہی لئے سناتے تھے چنانچہ آپ کا عمل اسی کے مطابق رہا اور اس حکمت عملی سے اللہ تعالیٰ نے آپ کے کام اور مشن کو خوب ترقی دی۔ **الامر کلہ بید اللہ**

غیر معمولی تاثیر:

حضرت نے چونکہ دعوت الی اللہ کا کام محض رضاء الٰہی کیلئے اختیار فرمایا تھا۔ بلکہ یہ درحقیقت منجانب اللہ اس کی توفیق آپ کو حاصل تھی اور اس سے پہلے عرصہ تک ریاضت و مجاہدہ کر کے نفس و طبیعت کو نہایت صاف و ستھرا مجلی اور مزکی کر چکے تھے اس لئے جو کلمات آپ کی زبان فیض ترجمان سے صادر ہوتے نہایت موثر اور سریع النفوذ ہوتے کتنے گمراہوں اور معاصی کے پتلوں کی ہدایت محض ایک مجلس سے ہو جاتی

آپ کے مواعظ وملفوظات میں بجلی کی سی تاثیر ہوتی، انتہائی سخت دل آدمی بھی موم ہوجاتا جو آنکھیں آنسوؤں سے کبھی آشنا نہ ہوتیں وہ بھی آپ کے یہاں ''دریا گریستم'' کا نمونہ پیش کرتیں آپ کی خدمت میں بیٹھ کر قلوب کی اس طرح صفائی ہوجاتی جیسے گناہ کے داغ دھبے کا کوئی اثر ہی نہ ہو۔ بسا اوقات آپ کی صرف ایک نگاہ وہ اثر کرتی کہ بڑے بڑے مواعظ میں وہ تاثیر نہ ہوتی بعض سخت گمراہ اور بے دین قسم کے لوگ آئے اور صرف ایک مصافحہ اور معانقہ میں ان کے دل کی کایا پلٹ گئی۔

مولانا محمد منظور نعمانی تحریر فرماتے ہیں:

اس کے اظہار میں ہرگز کوئی بے ادبی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت کو ظاہری وجاہت والی شکل وصورت بالکل عطا نہیں فرمائی تھی اسی طرح آپ صاحب زبان وبیان مقرر بھی نہیں تھے آج کل کی اصطلاح کے مطابق صاحب قلم بھی نہیں تھے، اگرچہ مدت سے معمول تھا کہ روزانہ صبح کو ایک عام مجلس میں کچھ اصلاحی بیان فرماتے تھے جس کا طریقہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ اگلے علماء محققین مصلحین میں سے کسی کی کوئی کتاب ہاتھ میں لے کر اس کی کوئی عبارت پڑھتے اور اس پر کچھ فرماتے کبھی ماثورہ دعاؤں میں سے کوئی دعا پڑھتے اور اس کے مضمون کی وضاحت فرماتے لیکن اس بیان کی زبان اور اسکا انداز اکثر وبیشتر اس قدر علمی ہوتا تھا اور اس میں درسی اور فنی اصطلاحات کا اس قدر استعمال ہوتا تھا کہ خاص مناسبت رکھنے والے اہل علم ہی سمجھ سکتے تھے پھر آواز کبھی کبھی اتنی دھیمی ہوتی تھی کہ مائکروفون سامنے ہونے کے باوجود بہت سے حاضرین مجلس نہیں جانتے تھے کہ کیا فرمایا، لیکن تواتر کے طور پر لوگوں سے سنا اور خود بھی محسوس کیا کہ تاثر سے شاید کوئی بھی طالب خالی اور محروم نہیں رہتا تھا اور اثر بھی

ایسا جو اکثر و بیشتر کا یا پلٹ دیتا تھا۔

وفات سے تقریباً دو ہی مہینے پہلے آخر ستمبر میں جب ایک ہفتہ کے قریب حضرت کی خدمت میں رہنا نصیب ہوا تو ایک دن مجلس میں حضرت اپنی جگہ تشریف تو لے آئے لیکن کافی دیر خاموش بیٹھے رہے، مجھے وہ حدیث یاد آ رہی تھی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال بیان کیا گیا ہے کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طویل الصمت متواصل الاحزان یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ایک حال تھا کہ آپ بہت دیر تک خاموش رہتے اور محسوس ہوتا کہ مسلسل فکر و غم کی حالت میں ہیں پھر مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے حاضرین مجلس کی طرف مخاطب ہو کے فرمایا کہ آپ ضروری نہ سمجھیں کہ میں ضرور کچھ بیان کرونگا یہاں وہی لوگ آیا کریں جو بغیر کچھ سنے بیٹھنے میں بھی اپنا فائدہ محسوس کریں۔

بہر حال حضرت کی مجلس اس حقیقت کی روشن دلیل تھی کہ دینی فائدہ کا زیادہ تعلق زبان و بیان سے نہیں بلکہ قلب سے ہے حضرت کی مجلس کے حاضر باش لوگوں میں جو عظیم انقلاب آیا، ہر آنکھوں والا صرف ایک شہر بمبئی میں ہی دیکھ سکتا ہے۔

ایک مشاہد مگر نامعلوم کیفیت:

مولانا عبد الباری صاحب ندوی علیہ الرحمۃ نے اپنے مضمون ''چار ہفتہ ایک کہف میں'' میں لکھا ہے کہ ''ظاہری رنگ اس بوئے خدا کا ذرا جذب و جوش اور جلال کا ہے مگر باتیں ماشاء اللہ خوب ہوش و کمال کی، سالک مجذوب کی بڑی دلکش جامعیت وشخصیت'' جذب و جوش کی جس کیفیت کا مولانا نے ذکر کیا ہے، ہر آنے والا اس کا

مشاہدہ کرتا تھا حضرت والا پر ایک کیفیت طاری ہوتی تھی، کیا ہوتی تھی کوئی نہیں جانتا، مدت العمر کسی کو ہمت نہیں ہوئی کہ پوچھ ہی لیتا اور حضرت کیوں ظاہر کرتے؟ ہوتا یہ کہ اس کیفیت میں ہاتھ کانوں کے قریب جا پہونچتا کبھی دونوں ہاتھ اور کبھی ایک ہی اور زور زور سے رگڑنا اور ملنا شروع کر دیتے، آنکھیں اس وقت خاصی بڑی محسوس ہونے لگتی ان میں سرخی چھا جاتی اس حالت میں جب زیادہ جوش ہوتا تو چہرہ بھی بالکل سرخ ہو جاتا تھا۔ کبھی ہاتھ پر ہاتھ مارتے اور مارتے چلے جاتے ایک ایسے جذب وجلال کا رنگ ہوتا کہ سامنے رہنا دشوار ہو جاتا کون جانے کیا حالت ہوتی تھی جس کے ضبط کرنے کی کوشش میں یہ حال ہوتا تھا یا کیا بات تھی یہ حالت خلوت میں بھی ہوتی اس وقت بھی باہر تڑ تڑ ہاتھ پیٹنے کی آواز سنائی دیتی رہتی مجلس میں بھی یہ کیفیت طاری ہو جاتی تھی بسا اوقات مجلس میں ایسا بھی ہوتا کہ اس کیفیت میں اپنے سے قریب بیٹھے ہوئے مخلص خواص خدام کے سروں کو پکڑ کر زور سے ہلاتے بلکہ بعض اوقات جھنجھوڑ دیتے، اسے یہ حضرات انتہائی سعادت اور خوش بختی تصور فرماتے کہ قلب وزبان کے ساتھ حضرت کی توجہ کا فیض اس طور پر بھی پہونچ رہا ہے اور تھی بھی یہ بڑی خوش نصیبی، یہی کیفیت تھی جس کا ناواقفین اور غیر معتقدین نے مشاہدہ تو کیا لیکن چونکہ کچھ سمجھ نہیں سکے اس لئے کسی نے کہا بہت غصہ ور ہیں مارتے ہیں بہت سخت ہیں لیکن حضرت کیا تھے اس کو ناظرین کچھ تو سمجھ ہی گئے ہوں گے لیکن ؎

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

ہم کچھ نہیں بتا سکتے کہ یہ کیا بات تھی۔ تقریب فہم کیلئے اتنی بات سمجھ لیجئے کہ انسان کا قلب مختلف کیفیات وحالات سے دوچار ہوتا ہے کبھی اس کے سامنے تحیر خیز اور تعجب انگیز واقعہ گزرتا ہے کبھی حسرت وافسوس کا شکار ہوتا ہے یہ حالات وکیفیات

اصلاتو دل سے متعلق ہیں لیکن ان کے مخصوص اثرات جسم پر ظاہر ہوتے ہیں بہت زیادہ خوشی میں آدمی رقص کرنے لگتا ہے بہت زیادہ غم میں منہ نوچتا ہے، کپڑے پھاڑتا ہے، حسرت ویاس کی حالت میں منھ گرالیتا ہے حیرت وتعجب کے موقع پر ہاتھ پیٹتا ہے وغیرہ۔ حضرت کے یہاں باطنی کیفیات کا ورود نہایت تیزی اور شدت کے ساتھ ہوتا رہتا تھا اس وقت آپ کے قلب مبارک پر کیا گزرتی تھی بجز علام الغیوب کے کون جان سکتا ہے مگر دیکھنے والے ان صورتوں میں محسوس کرلیتے تھے کہ کسی کیفیت کا ورود ہورہا ہے۔

حضرت کے متوسلین اس کی مختلف توجیہیں کرتے ہیں لیکن قطعیت کے ساتھ کوئی توجیہہ نہیں کیجا سکتی، یہ کیفیت کبھی راہ چلتے ہوئے وارد ہوتی تو نہایت غیر معمولی رفتار سے چلنا شروع کردیتے کہ ساتھ والوں کو دوڑنا پڑتا جن لوگوں نے دیکھا نہیں ہے وہ تو شاید تصور بھی نہ کرسکیں لیکن جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ بھی کیا بتا سکتے ہیں۔

میان عاشق ومعشوق رمزیست ۔۔۔ کراما کاتبین را ہم خبر نیست

مقبولیت عامہ:

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس برگزیدہ بندے کو قبولیت عامہ اور محبوبیت خاصہ سے نوازا تھا۔ گزشتہ صفحات میں آپکی مقبولیت ومحبوبیت بہت کچھ نمایاں ہوچکی ہے۔ آپ کی خدمت میں ہر طبقہ کے افراد حاضر ہوئے، علماء بھی امراء بھی غریب اور مزدور عوام بھی اور سب میں آپ کی شخصیت یکسان محبوب رہی، علماء کے آپ کے ساتھ روابط کو ہم مستقل باب میں بیان کریں گے یہاں صرف ایک اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں جو مولانا عبدالباری صاحب کے مضمون ''چار ہفتہ ایک کہف میں'' سے لیا گیا ہے۔

یہ جگہ کوئی بڑا چھوٹا شہر یا قصبہ تک نہیں کہ آنے جانے والے ہی محفل کی رونق

بڑھا رہے ہوں بجز دیہات، کوردہ، نہ ریل نہ سڑک، نہ سواری، ڈاکخانہ ندارد، اگر خود اپنا اخبار نہ جاتا تو اخبار تک کی صورت نہ دکھائی پڑتی، گویا کہ بیسویں صدی کا کہف، لیکن مخلوق ہے کہ دور ونزدیک چھوٹی بڑی بستیوں ہی سے نہیں دوسرے صوبوں تک سے جوق در جوق اس کہف کی طرف بھوکی پیاسی روزہ رکھے مئی کی چلچلاتی دھوپ اور لو میں زیادہ تر پیدل یا سائیکلوں پر کھچی دوڑی چلی آرہی ہے، روزانہ رمضان بھر یہی تانتا بندھا دیکھتا رہا، عوام بھی خواص بھی، امیر بھی غریب بھی، جوان بھی بوڑھے بھی، نئے بھی پرانے بھی، ڈاکٹر بھی طبیب بھی، دس دس پندرہ تک اوسط تو خالی علماء کا ہی رہتا تھا اس دور افتادہ ویرانہ میں خلقت کی یہ کشش سوا اس کے اور کیا کہا جائے کہ

ہر کجا بوئے خدا می آید — خلق بیں بے سروپا می آید

چلا ہی جا رہا ہے گرتا پڑتا اس کی محفل تک
جہاں سے جس نے جس حالت میں اس دلبر کی بو پائی

اور یہ حال تو اس وقت کا ہے جبکہ آپ فتح پور میں مقیم تھے اور شہرت نے ابھی اپنے بازو نہیں پھیلائے تھے پھر وہاں سے نکلنے کے بعد گورکھپور، الہ آباد، بمبئی، علی گڑھ لکھنؤ میں مقبولیت ومحبوبیت کا جو سماں دیکھا گیا وہ قدرت خداوندی کا ایک شاہکار تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب ۲

ذوق علم

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عام شہرت اگرچہ ایک شیخ طریقت اور صاحب ارشاد مصلح ومربی کی حیثیت سے تھی لیکن علم میں بھی اتنا رسوخ اور استحضار تھا اور مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ اس دور کے اصحاب درس ومصنفین میں بھی اس کی مثالیں کم ملیں گی۔ (مولانا محمد منظور نعمانی)

پہلے گزر چکا ہے کہ حضرت والا نے دیوبند سے فراغت کے بعد جہاں تھانہ بھون رہ کر اصلاح نفس اور تربیت باطن حاصل کی وہیں مختلف مدارس میں تدریس کے فرائض بھی انجام دے چکے ہیں ذہین وذکی تو تھے ہی مطالعہ وتدریس سے علم میں رسوخ پیدا ہوتا چلا گیا، بعد میں جب وطن میں قیام ہوا اس وقت بھی مطالعہ ودرس کا سلسلہ جاری رہا۔ مولانا خود فرماتے ہیں کہ:

حضرت مولانا تھانویؒ کے وصال کے بعد جب گھر رہنے لگا تو مجھے خیال ہوا کہ اب لوگ مجھ سے مسائل بھی دریافت کریں گے اور یہاں میرے پاس ایک کتاب بھی نہیں ہے اس لئے خیال کیا کہ کم ازکم حضرت تھانوی کے فتاوے ہی منگالوں ایک مولوی صاحب جو میرے پاس رہتے تھے انھوں نے کہا کہ بے شک کتابوں کا آنا بہت ضروری ہے اس لئے کہ اور دوسرے لوگ چاہیں ہم سے مسئلہ نہ پوچھیں تاہم خود اپنے عمل کرنے کے لئے بھی تو مسائل جاننے کی ضرورت پڑے گی۔ مجھے ان کی یہ بات بہت پسند آئی۔ چنانچہ میں تقریباً سب ہی کتابیں فقہ اور فتاوے کی منگالیں (معرفت حق مارچ ۷۴ء)

ابتداءً جب کہ آپ کے پاس لوگوں کی آمد ورفت کم تھی معمولات سے فارغ ہونے کے بعد وقت خالی رہتا تھا آپ نے ان اوقات میں اپنے کو مطالعہ کتب کے لئے وقف کررکھا تھا۔ مطالعہ میں انہماک بہت رہتا تھا آپ کا مطالعہ سرسری نہ ہوتا بلکہ بغور وتعمق کتابیں دیکھتے، حافظہ اچھا تھا، باتیں اکثر محفوظ ہوجاتیں مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامی لکھتے ہیں کہ:

حضرت کا یہ طریقہ تھا کہ کتاب زیر مطالعہ کا جو مضمون بھی پسند ہوتا تو کہیں حاشیہ پر اس سطر کے سامنے (+) اس طرح کا نشان لگادیتے تھے اور اکثر وبیشتر کاغذ کی ایک چٹ وہاں رکھ دیتے تھے راقم جب فتح پور حاضر ہوا تھا تو دیکھا کہ حضرت کی تپائی کے پاس ایک لفافہ میں ایک انگل کی چٹ یعنی قرینے سے کٹے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے کافی تعداد میں رکھے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ حضرت نے کتابوں میں نشان رکھنے کے لئے رکھے ہیں کیونکہ بعض مرتبہ ضرورت پڑنے پر ذراسا کاغذ اگر نہیں ملتا تو وہ ذہنی تعب کا سبب ہوجاتا ہے اس لئے یہ نظم فرمایا تھا۔ (حالات ج ۱ ص ۲۲۸)

آگے لکھتے ہیں کہ

طریقہ مبارک یہ تھا کہ کوئی مضمون مفید اور پسند ہوا اس پر نشان لگادیا اور اس کے بعد جو بھی آنے والا آیا اگر کوئی باہر کا نہ ہوا تو بستی ہی کے کسی سمجھدار ذی استعداد کو بلا کر اسے سنایا۔ پھر کل کو کوئی اور آگیا تو وہی کتاب منگوا کر وہ مقام نکالا اور اس کو بھی سنایا پھر تیسرا کوئی اہل علم آگیا تو نہایت ذوق ونشاط کے ساتھ پھر اس کو سنایا، اس طرح سے دس دس بیس بیس بار یہی ایک مضمون سننے اور بیان فرمانے سے بھی حضرت والا گھبراتے نہ تھے چنانچہ آپ کا یہی انداز طبیعت ثانیہ

بن چکا تھا جس کی وجہ سے مضمون سامنے آنے پر نہ صرف کتاب ہی بلکہ اس کا صفحہ اور سطر بھی پیش نظر ہو جاتا تھا (حالات ج ا ص ۲۴۹)

قیام وطن کے دوران کچھ عرصہ تک درس و تدریس کا سلسلہ منقطع رہا لیکن بعد میں جب مولانا قاری محمد مبین صاحب کو مئو سے بلالیا تو ان کے اسباق پڑھانے شروع کردئے مولانا قمر الزماں صاحب بھی شریک درس رہے اس طرح درس نظامیہ کی تمام کتابیں از اول تا آخر آپ نے بالاستیعاب پڑھائیں اس دوران مدارس سے اہل علم حضرت تشریف لاتے تو انھیں بھی شریک درس فرمالیتے آپ کا درس نہایت محققانہ اور جامع ہوتا اور درس میں آپ صرف درس نظامیہ کی کتابوں میں محدود نہ رہتے۔ بلکہ اور بھی جن کتابوں کی ضرورت سمجھتے داخل درس فرمالیتے، مثلاً تاریخ الخلفاء آپ کے درس مین شامل تھی علماء کو فتح الباری شرح بخاری کا درس دیتے درس کا یہ سلسلہ پھر اخیر تک قائم رہا الہ آباد میں بھی اس تسلسل میں فرق نہیں آیا۔

مجلس میں جن کتابوں سے حضرت استفادہ فرماتے ان کا ذکر پہلے آچکا ہے جب کسی حوالے کی ضرورت پیش آتی، اپنے اہل علم خدام سے کتاب طلب فرماتے یہ حضرت بھی اس درجہ مشاق اور ماہر ہو چکے تھے کہ کتاب کا، یا مضمون کا نام سنتے ہیں کتاب کا مطلوبہ مقام کھول کر حضرت کے سامنے رکھ دیتے یہ خدمت مختلف اہل علم حضرت کے ذمے رہی، اخیر میں زیادہ تر مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامی یہ خدمت انجام دیتے تھے۔

مجلس میں حضرت نہایت عالمانہ اور محققانہ کلام فرماتے تھے اور اسمیں فنی اصطلاحات کا بکثرت استعمال ہوتا تھا۔ آپ کی مجالس جو معرفت حق اور وصیۃ العرفان میں شائع ہو چکی ہیں یا ہو رہی ہیں نیز تالیفات اس پر گواہ ہیں کہیں سے کوئی

مضمون اٹھا لیجئے، نہایت محققانہ علوم و معارف سے پر نظر آئے گا بالخصوص تفسیر و تصوف پر بہت گہری نظر تھی، کہیں کہیں کسی عالم یا کسی کتاب کے حوالے سے کوئی بات نقل کرتے ہوئے یہ فرماتے کہ انھیں بزرگ کی برکت سے ایک بات میں کہتا ہوں تو لطف آجاتا......اور وہاں کوئی نہایت نادر نکتہ ارشاد فرماتے۔

اخیر دور میں مشغولیات کی کثرت کے باعث مطالعہ کا سلسلہ قریب قریب ختم ہو گیا تھا لیکن جو کچھ پڑھ چکے تھے وہ خود اتنا کافی تھا کہ آپ کا مقصد اس سے بدرجہ اتم پورا ہوتا تھا البتہ مجلس میں کتابوں کے حوالجات کا سلسلہ ہر دور میں یکساں رہا۔

درس میں بعض مضامین پر ایسا محققانہ کلام فرماتے کہ اہل علم پھڑک اٹھتے۔ حضرت کے کاغذات میں ایک کاپی دستیاب ہوئی جس میں منطق کی مشہور کتاب سلم العلوم کا ایک نہایت محققانہ اور مبسوط درس کسی اہل علم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ملا، ملاحسن نے کہا ہے کہ تعدد واجب کے ابطال پر شرعی دلیلیں تو قائم ہیں نیز عقلی دلیلیں بھی، لیکن وہ ادلۂ عقلیہ افہام متوسطہ کے حیطہ قدرت سے خارج ہیں، عام عقول کے لئے ان کی فہم کے مطابق دلیل عقلی تعدد واجب کے ابطال کے لئے قائم نہیں، اس کے رد میں ایسا نفیس اور عمدہ کلام فرمایا ہے کہ ایمان تازہ ہو جاتا ہے، ضمیمہ میں یہ تقریر ہم من و عن نقل کریں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب ۳

استاذ شاگرد کے حلقۂ ارادت میں

حضرت والا کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ کل جن اساتذہ کے سامنے آپ نے طالب علمانہ زانوئے تلمذ تہ کیا تھا ایک دن وہ آیا کہ انھیں میں سے ایک جلیل القدر استاذ الاساتذہ جامع معقول ومنقول بزرگ دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی نوراللہ مرقدہ اپنے اس عظیم المرتبت شاگرد کی خدمت میں مسترشدانہ حاضر ہوئے۔

تاریخ اسلام میں ایسی مثالیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں، تاریخ کی یہ شہادت ہے کہ علامہ طیبی نے اپنے شاگرد عمر خطیب تبریزی سے مشکوٰۃ شریف تالیف کرا کے خود اس کی شرح لکھی۔ ماضی قریب میں حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، جنھوں نے مثنوی مولانا روم کا تکملہ تحریر فرمایا، زبردست عالم وفاضل حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دھلوی کے تلمیذ خاص اور مرید تھے۔ لیکن بعد میں اپنے چھوٹے بھائی، اپنے شاگرد جناب حاجی کمال الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے۔

تاریخ نے پھر ایک بار یہی داستان دہرائی جو لوگ حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب سے واقف ہیں انھیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں لیکن جو لوگ ناواقف ہیں ان کی خدمت میں تھوڑا سا تعارف ضروری ہے تاکہ واقعہ کی اہمیت ان کے ذہن میں آسکے۔

حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب

دیوبندی کے مخصوص تلامذہ میں تھے جملہ علوم وفنون ، بالخصوص معقولات میں امام تسلیم کیئے جاتے تھے، دارالعلوم دیوبند کے موجودہ اساتذہ اور ہندوستان میں پھیلے ہوئے بیشتر علماء آپکے شاگرد ہیں ، درس حدیث میں خاص امتیاز کے مالک تھے آپ کا درس مختصر مگر نہایت محققانہ ہوتا تھا، مدرسہ فتح پوری دہلی ، مدرسہ امدادیہ دربھنگہ، مدرسہ ہاٹ ہزاری چاٹ گام اور چند ماہ مدرسہ دارالعلوم مئو میں صدارت تدریس کے عہدے پر فائز رہے، آپ کے اساتذہ نے بالآخر آپ کو دارالعلوم دیوبند کے لئے انتخاب فرمایا ۷۷ ۱۳ھ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی کی وفات کے بعد آپ دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین ، ناظم تعلیمات اور شوریٰ کے ممبر بنائے گئے اور تادم حیات ان عہدوں پر متمکن رہے۔

ماہ وتاریخ تو محفوظ نہیں تاہم یہ معلوم ہے کہ حضرت علامہ الہ آباد میں حضرت مصلح الامت کے دراقدس پر ۱۳۸۳ھ میں تشریف لائے تھے، مہینہ غالباً ذیقعدہ کا تھا کیونکہ حضرت علامہ کے تشریف لے جانے کے بعد حضرت مصلح الامت نے پہلا خط یکم ذی الحجہ کو آپ کے نام تحریر فرمایا۔ دونوں بزرگوں کی ملاقات اور باہمی مکاتبت میں ایک عجیب کیف محسوس ہوتا ہے ایک طرف حضرت علامہ بایں جلالت شان اپنے کو حضرت والا کے سامنے مسترشدانہ اور مستفیدانہ پیش کرتے ہیں اور ادب واحترام کی وہی نگہداشت ملحوظ رکھتے ہیں جو ایک مرید کو اپنے شیخ کے ساتھ ملحوظ رکھنی چاہئے اور دوسری طرف حضرت مصلح الامت بالکل ایک تلمیذ اور شاگرد کی صف میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں جیسا کہ استاذ کا حق ہے اور حق یہ ہے کہ دونوں بزرگوں نے اپنی دونوں حیثیتیں کماحقہ نباہ دی ہیں۔

یہاں ہم حضرت علامہ مرحوم کے خطوط کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں

لکھتے ہیں کہ:

مخدوما! خانقاہ تھانہ بھون، ورائے پور اور گنگوہ کی ویرانی کے بعد طبیعت بہت افسردہ رہتی تھی، البتہ آپ کے احوال وکوائف سن کر مایوسی مبدل بہ توقعات ومسرت ہوجاتی تھی اور سمجھ میں آتا تھا کہ وقت کی عام مایوسیاں مستثنیات سے خالی نہیں ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے آپ سے ملاقات کے وسائل بہم پہونچائے اور میری دیرینہ آرزو پوری ہوئی آپ سے ملاقات کے بعد مسرت کی بے پایانی میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ملاقات کی مدت اگرچہ بہت مختصر تھی مگر اس ملاقات سے جو تاثر مرتب ہوئے وہ بہت دیرپا اور بے پایاں ثابت ہوئے اب تک اس ملاقات کی مسرتیں اور سرشاریاں میرے دل میں بحالہ باقی ہیں۔

آں محترم کو میں کمال صلاح واصلاح سے متصف پایا اور آپ کے طریق اصلاح کو اس آیت کا پورا نمونہ پایا:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔

خدا کے علاوہ جن کی یہ عبادت کرتے ہیں انھیں تم برا نہ کہو کہ یہ بھی اللہ کو جہالت سے برا کہنے لگیں۔

اس نفاق اور سلب کمال کے زمانے میں غیروں کو اپنانا اور اپنوں کو گلے لگانا وہ جنس گرانمایہ ہے جس کا کم از کم اس زمانہ میں ملنا دشوار ہے آپ کا انداز اصلاح مدعیان تصوف کو بلاکسی جنگ وجدل وحیلہ وتدبیر کے شکست فاش دے چکا ہے اور یہ شعر آپ کی اصلاحی مساعی پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

گرایں مدعی دوست بشناختے | بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

کیوں نہ ہو آپ نسبت محمدی کے مظہر کامل ہیں اس نسبت کے حاملین کی جو

خصوصیات ہوتی ہیں وہ آپ میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

مکتوب طویل ہے ہم نے صرف ضروری اقتباس لیا ہے۔ حضرت کی طرف سے اس کا جو جواب صادر ہوا ہے وہ اور طویل ہے مکمل خط و کتابت ''حالات مصلح الامت'' میں ملاحظہ فرمائیں، یہاں جواب کا وہ حصہ نقل کیا جارہا ہے جس سے باوجود شیخ ہونے کے اپنے استاذ گرامی کے حق میں حضرت والا کے حسن ادب کا ظہار ہورہا ہے۔ اسی خط میں حضرت نے علامہ مرحوم کو اجازت بیعت بھی مرحمت فرمائی۔ اجازت نامہ بتمام وکمال پیش کیا جارہا ہے۔ حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا۔

بجناب استاذ مدظلہ العالی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میرے متعلق جناب گرامی نے جو تحسین کلمات ارشاد فرمائے ہیں اس کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ع

ہر عیب کہ سلطان بہ پسند د ہنر است

اور یہ محبت پر بھی محمول ہوسکتا ہے کہ میں آپ ہی کا ہوں، اور اپنی اولاد کا کمال ہر شخص کو بالطبع پسند ہی ہوتا ہے بایں ہمہ جناب کی یہ تحریر میرے لئے طغرائے کمال ہے میں اس پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔

اجازت نامہ ملاحظہ ہو:

ابھی میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ ضرورت ہے کہ وہاں کوئی مقامی شخص ظاہری وباطنی نگرانی رکھے اسی سے کام ہوسکتا ہے، تو اس سلسلہ میں ابھی منجانب اللہ یہ بات قلب میں آئی کہ کیوں نہ آپ ہی کے سپرد کام کو کردوں۔ اس لئے کہ کام جب بھی ہوا ہے کسی مخلص ہی سے ہوا ہے اور میں نے آپ کے اندر جس قدر اخلاص پایا کسی دوسرے کے اندر نہیں پایا بلکہ خود اپنے اندر بھی ویسا نہیں پایا جو

دردمدرسہ (دارالعلوم دیوبند) کا آپ کو ہے میں نے کسی دوسرے کے اندر ویسا نہیں دیکھا نہ کسی مدرس میں نہ کسی اور میں، اس لئے وہاں کے کام کے لئے زیادہ اہل آپ ہی ہیں اب کام وجود میں آئے یا نہ آئے ہم اس کے مکلّف بھی نہیں ہیں۔ ہاں اس کے مکلّف ہیں کہ کوئی کام ہو اس کے اہل کے حوالے کیا جائے، اہلیت کی شرط اولیں اخلاص ہے جو کہ آپ کے اندر بدرجہ اتم موجود ہے۔

ہر کہ باخلاص قدم می زند　　　عیسی وقت است کہ دم می زند

چنانچہ منجانب اللہ آپ کو توکلاً علی اللہ بیعت وتلقین کی اجازت دیتا ہوں اور بصیرت سے کہہ رہا ہوں کہ آپ وہاں کام شروع کردیں یعنی لوگوں کو بیعت کریں اور ان کو تعلیم وتلقین فرمائیں اور حضرت کی تصانیف ومواعظ وملفوظات طلبہ ومدرسین کو سنایا کریں آپ کی اجازت گویا کہ حضرت مولانا تھانوی قدس سرہ کی جانب سے ہوگی الحمد للہ کہ آپ میں علماً وعملاً ہر طرح سے صلاحیت واہلیت موجود ہے جو بنیادی اجازت بنتی ہے آپ میری اس تحریر کو طلبہ ومدرسین کو سنا دیں امید ہے کہ مدرسہ کی کایا پلٹ جائیگی اور بزرگان دین کی ارواح خوش ہوں گی، اور اس باب میں چونکہ مجھے بہت مسرت ہوئی ہے، اس لئے آپ کی مٹھائی کے لئے ایک حقیری رقم مرسل ہے۔　**والسلام**

خویدمکم وصی اللہ عنہ عفی، الہ آباد

۲۷/ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ

اس مکتوب والا کے جواب میں حضرت علامہ مرحوم نے شکریہ کے بعد اپنے چند اعذار اور ضعف طبع کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

آں محترم کو یاد ہوگا کہ مولانا حبیب الرحمٰن اور حافظ احمد جیسے فاضلین وباہمت

حضرات بھی حضرت شیخ الہند کی رہنمائی کے محتاج تھے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد حضرت تھانوی گاہے گاہے تشریف لاکر ان حضرات کی پشت پناہی کرتے تھے، جب ایسے گرامی حضرات بھی ان اکابر کی توجہ ودعاء اور تشریف آوری سے تازہ دم اور مضبوط ہو جاتے تھے تو میں اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود حضرت گرامی سے بالکل ایسی ہی توقعات کیوں نہ رکھوں۔

جس حقیر ہدیہ کا ذکر فرمایا گیا ہے وہ آپ کی حیثیت سے یقیناً حقیر ہوگا مگر میری نسبت سے وہ خطیر وفراواں ہے۔

اس مکتوب کے جواب میں حضرت کی طویل تحریر کا صرف ایک کیف آور اور وجد آفریں حصہ پیش خدمت ہے تحریر فرمایا:

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ شے حقیر کو جو عظیم فرمایا، تو اس کے متعلق یہی کہہ سکتا ہوں کہ جناب والا نے اس کو شرف قبولیت بخشا یہی انتہائی کرم ہے، ورنہ میں کیا اور میری چیز کیا؟

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی		منت شناس از وکہ بخدمت بداشتت

ایک مکتوب میں حضرت علامہ تحریر فرماتے ہیں:

عریضہ کے ارسال کے ساتھ ہی بخار میں کمی ہوگئی اور الحمدللہ آپ کی دعا وتوجہ کی برکت سے بالکل تندرست ہو گیا ہوں میں حضرت والا سے صرف توجہ ودعا کا محتاج ہوں اور اسی کو اپنے لئے خیر دنیا وآخرت نیز سعادت ازلی کا سامان سمجھتا ہوں۔

گرانمایہ ہدیہ کے لئے گرانبار ہوں اس سے اظہار حالات میں خدانخواستہ حجاب نہ پیدا ہو جائے، بہرحال میں آپ کی مسرت وخوشنودی مقدم سمجھتا ہوں

جو بات قلب پر وارد ہوئی س کا اظہار کر دیا۔

جواب بھی ملاحظہ فرماتے چلیں لطف آئے گا

الحمدللہ بعافیت ہوں آپ کی صحت کی خبر سے بے حد مسرت ہوئی اللہ تعالیٰ مزید قوت کے ساتھ تندرست رکھے آمین ۔یہ دعا تو گویا اپنے وظیفہ ہی میں شامل ہے۔

میرے پیش نظر تو آپ سے تعلق وہی حیثیت تلمذ کا ہے اور آپ کو جو تعلق مجھ سے ہوا اس کو تو بس اللہ تعالیٰ کا فضل اور ان کی مہربانی ہی سمجھتا ہوں اور اپنے لئے باعث سعادت تصور کرتا ہوں اسی نسبت کے تقاضے پر کبھی کوئی عمل بھی ہو جاتا ہے باقی جناب والا کے قلب کی گرانباری اور حجاب کا ضرور خیال رکھوں گا اور اس کی صدق دل سے معافی مانگتا ہوں۔

حضرت علامہ کا ایک اور خط ملاحظہ فرمایئے۔

کل ہی ایک عریضہ ارسال خدمت کر چکا ہوں آج عزیزم حکیم صاحب سلمہ جا رہے ہیں ان کے ذریعہ یہ مختصر ہدیہ جو آپ کی عظمت اور دربار کی شوکت کے سامنے تو بالکل ہی بے حقیقت ہے۔مگر اس ضعیفہ کی حیثیت سے جو خریداران یوسف میں اپنے کو شمار کرانا چاہتی تھی جسے حضرت جامی نے یوں ذکر فرمایا ہے۔

ہمیں بس گرچہ کاسد قماشم ۔۔۔ کہ در سلک خریدار انش باشم

اس مختصر وحقیر چیز کو نذر کر رہا ہوں امید کہ قبول فرما کر مشرف وممنون فرمائیں گے۔

حضرت اقدس کے جواب کی حلاوت ولطافت سے بھی لطف ندوز ہویئے فرمایا:

الحمدللہ بخیریت ہوں ۔مولوی عزیز الرحمٰن سلّمہٗ آئے ،مرسلہ ہدیہ سے جو کہ میرے لئے بصد سعادت کا مظہر و مخبر ہوا بہرہ ور ہوا **فجزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء فی الدارین .**

جناب والا نے حضرت جامی رحمۃ اللہ علیہ کا جو شعر تحریر فرمایا ہے وہ تو آپ کی غایت تواضع ہے یہ خریداری اس کا تو نہیں البتہ اس کا مصداق ضرور ہو سکتی ہے ؎

میر ولایت شود بندہ کہ سلطان خرید
داغ غلامیت کرد پایۂ خسر وبلند

حضرت علامہ کے ایک اور مکتوب میں فنائیت کی معراج ملاحظہ ہو:

چونکہ بیس سال سے گونا گوں امور میں مبتلا ہونے کی وجہ سے امر آخرت مبہم ہو گیا ہے ۔بدیں وجہ بعض اوقات قلب کی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے ۔ضرورت ہے کہ آنجناب اس طرف پوری قوت سے متوجہ ہوں ورنہ آپ کا یہ کبیر السن بے مایہ استاذ تباہ ہو جائے گا۔

سلسلہ اقتباسات کی آخری کڑی ملاحظہ فرمایئے ،حضرت علامہ نے ایک طویل عرصے تک مراسلت کسی وجہ سے منقطع ہو جانے کے بعد تحریر فرمایا:

شکر ہے اچھا ہوں ،لیکن ضعف زیادہ ہے ہاتھ کی انگلیوں میں رعشہ بھی شروع ہو گیا ہے جس سے خود کتابت سے معذوری ہے مگر آج جی میں آیا کہ کچھ ہو خود ہی خدمت اقدس میں کچھ لکھوں۔

تعجب ہے کہ عرصہ سے آنجناب کی طرف سے نہ کوئی تحریر آئی ،کہ آنجناب کہاں ہیں اور نہ کوئی مٹھائی یا پھل آیا جسے کھا کر قلبی نور اور دلی انبساط حاصل ہو،حالانکہ اس عرصہ میں متعدد اشخاص بمبئی سے آئے اور الٰہ آباد سے بھی ۔کیا اس ضعیف کی طرف کچھ توجہ میں کمی تو نہیں آ گئی ہے ۔فکر ہے اور ضرور

ہونا چاہئے، زیادہ کیا عرض کروں لکھنے سے معذوری ہے

حضرت والا کا جواب بھی ملاحظہ ہو

الحمدللہ بخیریت ہوں آپ کی طرف پوری توجہ ہے برابر آپ کو یاد رکھتا ہوں بھولا نہیں ہوں لیکن آپ نے جو تحریر فرمایا ہے (یعنی یہ کہ تعجب ہے کہ عرصہ سے الخ) اس کا جواب تو صرف یہ ہے کہ معاف فرما دیجئے، خطا ہوئی، اب انشاء اللہ تعالیٰ ایسا نہ ہوگا باقی آپ کی جو عنایات اپنے خوردوں پر ہے اس سے خاص مسرت ہوئی۔

حضرت اقدس نے پھر اس کا تدارک یہ کیا کہ اپنے ایک خادم جناب سید حسین صاحب الہ آبادی کو جو اس وقت میرٹھ میں ایڈیشنل کمشنر تھے، حکم دیا کہ میرٹھ سے کچھ عمدہ عمدہ مٹھائیاں اور دیوبند سے کچھ شیرینی لے کر حضرت مولانا محمد ابراہیم کی خدمت میں میری جانب سے پیش کر دیں چنانچہ سید صاحب نے حضرت کا حکم پاتے ہی فوراً تعمیل ارشاد کی۔

ان مکاتیب سے استاذ و شاگرد اور مراد و مرید کے باہمی روابط و تعلقات کا جیسا کچھ اندازہ ہوتا ہے اگر تاریخ میں اس کی مثال آپ ڈھونڈھنی چاہیں تو شاید مشکل سے دو ایک دستیاب ہونگی، حضرت علامہ کا یہ کمال ہے کہ استاذ ہونے کے باوجود مسترشدانہ حیثیت ہی سامنے رکھتے ہیں اور کمال بالائے کمال حضرت والا کا ہے کہ باوجودیکہ شیخ و مصلح ہیں مگر اپنی تلمیذانہ حیثیت کو کہیں فراموش نہیں فرماتے۔ ایسا ادب و احترام کہ دل تڑپ اٹھتا ہے۔

حضرت والا کے ساتھ حضرت علامہ کو عشق و تعلق تھا دیکھنے والوں نے اس کے آثار اس وقت نمایاں طور پر دیکھے جب حضرت والا کے وصال کی خبر دیوبند

پہونچی۔ حضرت علامہ اس وقت وضو کررہے تھے جونہی یہ خبر صاعقہ اثر گوش زد ہوئی۔ لوٹا بے اختیار ہاتھوں سے چھوٹ گیا، اور اسی وقت فرش علالت پر جو گرے ہیں تو ایک ماہ بھی دنیائے فانی میں قیام نہیں فرمایا اور بہت جلد عالم برزخ میں اپنے شاگرد وشیخ سے جاملے۔ رحمہما اللہ تعالیٰ،

کوئی مزا مزا نہیں ،کوئی خوشی خوشی نہیں
تیرے بغیر زندگی موت ہے زندگی نہیں

(مجذوبؒ)

☆☆☆☆☆☆☆

باب ۴

علماءِ عصر سے روابط

کسی صاحب کمال کی شہادت اگر ایسے لوگ دیں جو عمر اور رتبہ میں اس سے فروتر ہوں یا خود اس کے تلمیذ وشاگرد ہوں تو گو کہ یہ شہادت بھی بے وزن نہیں ہوسکتی، تاہم جتنی وزن دار شہادت اس کے معاصرین، اس کے رفقاء درس اور اس کے خواجہ تاش حضرات کی ہوسکتی ہے، جن کی کسی وقت میں ہمسری اور ہمعصری کی رفاقت رہی ہو، اس کے مقابلے میں اول الذکر شہادت ہلکی ہی کہی جائے گی، عربی کا مقولہ ہے کہ **المعاصرة اصل المنافرة** ۔ہمعصری منافرت کی بنیاد ہے۔ چنانچہ ایک عالم اپنے ہمعصر عالم کے فضل وکمال کو مشکل سے تسلیم کرتا ہے اور اگر کسی کے کمال پر تمام معاصرین کا اتفاق ہوجائے تو اس کے باکمال ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔

حضرت مصلح الامت نور اللہ مرقدہ امت کے ان خوش نصیب بزرگوں میں سے ہیں جن کے فضل وکمال، ورع وتقویٰ، للٰہیت وخلوص اور شان ارشاد ومشیخت کا اعتراف نہ صرف معاصرین نے کیا بلکہ ان معتبر اور مقتدر حضرات نے بھی شہادت دی جو زمانہ کے لحاظ سے آپ سے مقدم تھے، چند نمونے اس سلسلے کے بھی پیش کیے جاتے ہیں۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ:

حضرت مدنی قدس سرہ عمر اور زمانے کے لحاظ سے حضرت والا سے سابق

ہیں، ہمارے سید الطائفہ شیخ المشائخ سیدنا حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ کے فیض یافتہ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کے خلیفہ راشد تھے علوم ومعارف اور کمالات باطن کے لحاظ سے آپ کا جو مقام تھا وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ حضرت کے بارے میں اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔

مولانا وصی اللہ صاحب منقطع الی اللہ ہیں، سب جھنجھٹوں کو چھوڑ کر صرف باطنی اشغال اور توجہ الی اللہ میں منہمک ہیں۔ حسب قاعدہ ایک کام کی مداومت اس میں کمال پیدا کر دیتی ہے۔ پھر ماشاء اللہ ان کو پیر و مرشد کے دربار میں مدتہائے دراز تک حاضر باشی اور ذکر و شغل کی نوبت نصیب ہوئی ہے۔ ذاتی حیثیت سے بھی کامل ہیں .... حضرت تھانوی قدس سرہ العزیز نے مولانا وصی اللہ صاحب کو اپنا خلیفہ اور مجاز بنایا ہے ان کی بارگاہ میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں کو فیض ہو رہا ہے اس لئے موقع مت گنوایئے اور ان سے استفادہ کیجئے۔

(مکتوبات شیخ الاسلام ج،۳ ص:)

شیخ وقت:

الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر میں ایک صاحب لکھتے ہیں کہ:

ضلع اعظم گڑھ کے ایک صاحب آئے، ان سے حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب مدظلہ خلیفہ حضرت تھانوی کی خیریت دریافت فرمائی۔ انھوں نے کہا میں وہاں نہیں جاتا حضرت (مدنی) نے تنبیہ فرمائی اور فرمایا کہ تم نہیں جانتے وہ شیخ وقت ہیں۔ (نقل کردہ مولانا عبدالسلام صاحب فیض آبادی)

ان سطور سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہ کے مبارک قلب میں حضرت مصلح الامت قدس سرہ کی کیسی عظمت و محبت تھی، خود حضرت والا کو

حضرت مدنی کے ساتھ جو محبت و تعلق تھا اس کا اندازہ سطور ذیل سے ہوتا ہے مولانا عبد الرحمٰن صاحب جامی لکھتے ہیں:

حضرت مصلح الامت کو حضرت مدنی کے ساتھ کیسا تعلق تھا اس کا پورا اندازہ کم ازکم مجھے تو اس وقت ہوا جب مکرمی جناب ڈاکٹر صلاح الدین احمد صاحب نے یہ واقعہ بیان فرمایا کہ حضرت والا کے ساتھ صبح وشام کی تفریح میں اکثر میں ہی رہا کرتا تھا ایک دن ہم دریائے جمنا کے اس نینی (الہ آباد) کی جانب جا نکلے۔ جمنا کا پل پار کر کے جب ذرا آگے بڑھے تو سامنے جیل کی طول طویل فصیل نظر آئی میں نے عرض کیا کہ حضرت وہ جو سامنے دیوار نظر آرہی ہے وہ نینی جیل ہے یہ سنتے ہی فرمایا کہ اچھا یہی نینی جیل ہے۔ اسی میں ہمارے مولانا مدنی کو انگریزوں نے قید کر رکھا تھا، اس جملہ کو حضرت والا نے نہایت ہی تاسف اور تاثر کے ساتھ کئی بار دہرایا۔

اسی طرح جب حضرت مدنی کا وصال ہوا حضرت کا قیام ان دنوں حسن منزل الہ آباد میں تھا، صبح کو عین مجلس کے وقت کسی نے یہ خبر حضرت والا کو سنائی، سن کر انا للہ وانا الیہ راجعون. پڑھا اور ہاتھوں پر ہاتھ مار کر سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھایا اور ایک آہ سرد کے ساتھ یہ شعر پڑھا ؎

لکھ کر ہمارا نام زمیں پر مٹا دیا　　　ان کا تو کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

فوری طور پر تو سمجھ میں نہ آسکا کہ آخر اس کا کیا مطلب ہے اور اس واقعہ فاجعہ میں اور ان الفاظ کے ساتھ اظہار تاثر میں آخر باہم ربط کیا ہے۔ لیکن بعد میں سمجھ میں آیا (واللہ اعلم) کہ ہمارے حضرت اقدس کے قلب مبارک میں حضرت مدنی کی شہرت اور ان کی عظیم الشان شخصیت کا تصور آگیا۔ یعنی یہ کہ اللہ

اللہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کی زیارت و دیدار سے مشرف ہونے والی ذات، حضرت گنگوہی کا مجاز اور خلیفہ، مدرسہ دیوبند کا شیخ الحدیث، ہند میں شیخ الہند کا جانشین اور شیخ الاسلام کے لقب سے معروف ومشہور شخصیت ! اللہ کی شان کہ آج دنیا سے وہ بھی رخصت ہوئی۔ اور اہل زمانہ چاہے ان کی کمی کی وجہ سے اپنے اندر نمایاں خلاء کیوں نہ محسوس کریں لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی ہی مستغنی اور نہایت ہی بے نیاز ہے ایک عالم اور ولی تو پھر عالم اور ولی ہے وقت جب پورا ہوگیا تو نبیوں اور رسولوں کو بھی واپس بلالیا گیا ہے۔ **لایستأخرون عنه ساعة ولایستقدمون** . اب اس کی وجہ سے مخلوق خواہ تڑپ ہی کیوں نہ جائے اور بلبلا ہی کیوں نہ اٹھے، مگر محبوب حقیقی جل جلالہ کے لئے یہ تو ایک معمولی سی بات ہے بلکہ روزمرہ کا کھیل ہے۔ **فسبحان الذی بیده ملكوت كل شئ واليه ترجعون.**

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت والا نے یہ خیال فرمایا ہو کہ عشاق کا اپنے محبوب کا نام ریگ اور زمین پر لکھنا اور اس سے خاطر خود کو تسلی دینا تو معروف چلا ہی آرہا ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود محبوب بھی محض اپنی تفریح اور ہماری چھیڑ کی خاطر ہمارا نام زمین پر لکھتا اور مٹاتا ہے چنانچہ حضرت خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ

مزا آتا ہے ان کو چھیڑنے میں اپنے عاشق کو ۔۔۔ کبھی رنجور کرتے ہیں کبھی مسرور کرتے ہیں

مسرور تو کرتے ہیں اپنے ہاتھ سے ہمارا نام لکھ کر اور رنجور کرتے ہیں پھر اسکو صفحۂ ہستی سے مٹا کر باقی اس میں شک نہیں کہ اہل اللہ اور ارباب سلوک کے لئے تو ایک جہت سے یہ جانب بھی سبب مسرت بلکہ جان ہی دیدینے کا مقام ہوتا ہے،

حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری:

حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری ضلع اعظم گڑھ کے ایک قصبہ پھول پور کے باشندے تھے۔عمر میں حضرت والا سے کافی بڑے تھے اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے لوگوں میں سابقین اولین کا درجہ رکھتے تھے، حضرت والا ان کا بے حد ادب واحترام فرماتے تھے بلکہ اپنی جماعت کا سرخیل تصور کرتے تھے مولانا جامی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

> خود راقم نے دیکھا ہے حضرت پھول پوری اپنے اخیر زمانہ میں ایک مرتبہ الہ آباد تشریف لائے حضرت پھولپوری کی صاحبزادی صاحبہ یہیں تشریف رکھتی تھیں وہیں حضرت کا قیام تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت پھولپوری نے کسی خادم سے ہمارے حضرت کے متعلق دریافت فرمایا ہوگا کہ مولانا وصی اللہ صاحب کہاں رہتے ہیں۔ان کے یہاں بھی چلنا ہے، کسی ذریعہ سے ہمارے حضرت کو حضرت پھولپوری کا الہ آباد تشریف لانا اور حضرت والا کے یہاں تشریف لانے کا ارادہ معلوم ہو گیا تو ہمارے حضرت نے اپنے بعض خدام سے فرمایا کہ اجی مولانا پھولپوری آئے ہوئے ہیں کوئی شخص ان کی جائے قیام سے واقف ہے مولانا کے یہاں ابھی چلنا ہے چنانچہ حضرت والا چند خدام کے ہمراہ مولانا پھولپوری سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے راقم السطور بھی ہمراہ تھا ،حضرت پھولپوری بڑے تپاک اور محبت سے ملے اور فرمایا مجھے تو آپ کا مکان دیکھنا ہی تھا اس لئے میں خود آنے والا تھا آپ نے کیوں تکلیف کی۔حضرت والا نے فرمایا کہ مکان تو حضرت ہی کا ہے جب مرضی ہو تشریف لے چلیں باقی

آنا تو مجھے ہی چاہئے تھا۔ یہ غالباً دو پہر یا قبل دو پہر کی بات ہے۔ بعد نماز حضرت پھولپوری تشریف لائے حضرت والا نے غالباً تادباً ہی حضرت کے لئے اپنے کمرہ کے علاوہ دوسرے کمرہ میں مستقل مسند بچھوائی اور خود بھی دوسرے اورلوگوں کی طرح حاضرین کے حلقہ میں ایک جانب خاموش بیٹھ گئے اس طرح سے حضرت کا کسی کے سامنے بیٹھنا اس سے قبل میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بہر حال اس کے بعد چائے لائی گئی حضرت والا نے قاری مبین صاحب مدظلہ سے فرمایا مبین وہ فنجان جو آیا ہوا ہے وہ لاؤ (مولوی حاجی عبد الغفار صاحب الہ آبادی ثم مکی نے مکہ شریف سے کچھ نئے فنجان حضرت والا کے لئے تحفۃً ارسال فرمائے تھے وہی حضرت کی مراد تھی) قاری صاحب مدظلہ نے لاکر دسترخوان پر رکھ دیا۔ حضرت پھولپوری کے سامنے بھی ان میں سے ایک رکھا گیا اسے دیکھ کر فرمایا اجی یہ کیا لائے، اتنی مختصر سی پیالی؟ ہم دیہاتی لوگ ہیں ہم لوگ چائے اتنے بڑے قدحے میں پیتے ہیں اور دونوں ہاتھ پھیلا کر اس سے اشارہ فرمایا، ہمارے حضرت نے جو قریب ہی بیٹھے تھے آہستہ سے حضرت عرض کیا کہ حضرت یہ فنجان مکہ شریف سے آیا ہے، اور آج ہی آیا ہے اس لئے میں نے چاہا کہ حضرت ہی سے اس کی ابتداء کروں۔ یہ سنتے ہی حضرت پھولپوری نے فوراً فنجان کو اٹھا کر چوم لیا۔ آنکھوں سے لگایا اور فرمایا کہ ارے نہیں پھر تو یہ بہت بڑا ہے، بہت بڑا ہے، سبحان اللہ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔

مولانا قاری حبیب احمد صاحب الہ آبادی بیان فرماتے ہیں کہ حضرت والا اپنے پیر بھائیوں میں حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادی اور حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری کا نام نہایت احترام وعقیدت سے لیا کرتے تھے۔ چنانچہ

بارہا یہ کہتے ہوئے سنا کہ سیدنا شاہ عبدالغنی صاحب۔

دوسری طرف حضرت پھولپوری کے قلب میں حضرت والا کی بھی غایت درجہ عظمت ووقعت تھی۔ قاری ولی اللہ صاحب فتح پوری کے برادر نسبتی محمد کبیر خاں کہتے تھے کہ ایک مرتبہ مولانا پھولپوری دیوگاؤں تشریف لے گئے وہ کہتے تھے کہ میری مولانا سے وہیں پہلی ملاقات ہوئی۔ مجھ سے دریافت فرمایا کہ تمھارا تعلق کس سے ہے؟ کبیر خاں کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ حضرت فتح پوری سے میرا تعلق ہے یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور حضرت مولانا کی تعریف وتوصیف کرتے ہوئے فرمایا کہ ہاں بھائی ہم دونوں پٹواری کے درجہ میں بھرتی ہوئے تھے لیکن وہ تو پٹواری سے قانون گو ہوگئے، پھر قانون گو سے تحصیل دار اور پھر تحصیلدار سے ڈپٹی کلکٹر پھر ڈپٹی کلکٹر سے کلکٹر اور پھر کلکٹر سے نہ معلوم کس درجہ پر پہونچ گئے اور ہم پٹواری کے پٹواری ہی رہے۔ (ج ۳ ص ۵۴۷)

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ زمانہ قیام تھانہ بھون میں خانقاہ کے تین ہی حضرات سے میرا زیادہ ربط رہا کرتا تھا۔ ایک خواجہ صاحب سے دوسرے مولانا محمد عیسیٰ صاحب سے اور تیسرے مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری سے اکثر حالات میں ہم چاروں ایک رائے اور خیال ہوتے تھے۔

ہر دو حضرات کو آپس میں مکاتبت کا اتفاق کم ہوا۔ ذخیرہ خطوط میں حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب کا ایک مکتوب دستیاب ہوا جو حضرت والا کی صاحب زادیوں کے وصال پر تعزیت میں لکھا گیا تھا یہاں مکتوب اور حضرت کا جواب درج کیا جاتا ہے۔

مشفقم سلمک اللہ تعالیٰ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ معلوم کرکے کہ دو صاحبزادیاں ہفتہ عشرہ کے اندر اس دارالفناء سے

دار البقاء کو تشریف لے گئیں (رحمہما اللہ تعالیٰ) بیحد رنج و قلق ہوا۔ اللہ تعالیٰ متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائیں اور صاجزادیوں کو جنت الفردوس عطا فرمائیں۔

دنیا سے رحلت ناگریز ہے اور مفارقت عزیزاں بھی یکے بعد دیگرے ضروری ہے سوائے صبر جمیل کے چارہ نہیں۔ دل سے دردمند

عبدالغنی

حضرت کا جواب ملاحظہ فرمائیے

حضرت مولانا دامت برکاتہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جب حضرت میرے دل سے دردمند ہیں جیسا کہ حضرت اقدس نے تحریر فرمایا تو مجھکو کیا کچھ درد ہوگا۔ بہر کیف اکابر کی تعزیت میرے لئے کیا کم ہے اس سے بہت کچھ تسلی ہو رہی ہے۔ دل سے دعا فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ بالکلیہ اپنی طرف متوجہ فرمالیں اور اپنا بنالیں۔ والسلام

وصی اللہ عفی عنہ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ:

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ ایک عرصہ تک دیوبند میں صدر مفتی کے عہدہ پر رہے۔ علم و عمل کے پیکر، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے اخص تلامذہ میں اور حضرت حکیم الامت کے ارشد خلفا میں آپ کا شمار ہے پاکستان کے مفتی اعظم۔ علم و عمل میں یکتا اور باکمال، مفتی صاحب جیسے علماء حقانی ہر زمانے میں معدودے چند ہوتے ہیں۔

ہمارے حضرت والا کے رفقاء درس میں ہیں خانقاہ تھانہ بھون میں اور

حضرات کے ساتھ حضرت مفتی صاحب موصوف سے بھی حضرت کے روابط تھے۔ تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے تھے، مراسلات کا سلسلہ کم ہی رہا تاہم مناسبت اور محبت قائم تھی حضرت والا مفتی صاحب کی بہت قدر فرماتے تھے، حضرت مفتی صاحب نے حضرت کے وصال پر ’البلاغ‘‘ میں جو تعزیتی کلمات تحریر فرمائے، اس کا کچھ اقتباس پہلے گزر چکا ہے یہاں ہم پورا متن نقل کردینا مناسب سمجھتے ہیں۔

آج سے چھپن سال پہلے ۱۳۳۱ھ میں جب احقر نے دارالعلوم دیوبند میں کافیہ قدوری وغیرہ کے اسباق میں داخلہ لیا تو ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے ایک ذہین وفطین مگر سیدھے سادے طالب علم سے ہم سبق ہونے کی حیثیت سے تعلق قائم ہوا اور دارالعلوم کے بہت سے اسباق میں ان کے ساتھ شرکت رہی۔ مگر دوران تعلیم ہی میں ان کو اصلاح اعمال کی فکر اور ذوق عبادت حق تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا۔ طالب علمانہ شوخیاں ان کے پاس سے ہوکر نہیں گزریں اجتماعات سے الگ تھلگ رہنے کے عادی تھے خوش نصیبی سے دوران تعلیم ہی میں ان کو سیدی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کی خدمت میں حاضری اور تربیت باطنی کا شرف حاصل ہوگیا۔ وہ اپنا نصاب تعلیم پورا کر کے خانقاہ تھانہ بھون کے ہو رہے، ان کی فطری قابلیت کو حق تعالیٰ نے حکیم الامت قدس سرہ کی تربیت سے چار چاند لگادئے اور بہت جلد وہ باطنی تربیت میں بھی ایک حد تک تکمیل کر کے حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے خلیفہ مجاز ہوگئے۔

یہ ہیں وہ بزرگ جن کو اب ہم حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کے نام سے یاد کرتے ہیں، ہماری فراغت درس نظامی کی تکمیل سے ۱۳۳۶ھ میں ہوئی

تھی، مولانا موصوف دیوبند سے فارغ ہوکر سیدھے تھانہ بھون پہونچے اور علم وعمل کے مقاصد میں کامیاب ہوئے۔

یہ ناکارہ درس نظامی سے فارغ ہوکر دارالعلوم ہی میں اپنے اساتذہ واکابر کے حکم سے درس وتدریس کی خدمت پر مامور ہوکر اس میں مشغول ہوگیا۔ اس عرصہ میں جب کبھی اس خوش نصیب ہم سبق کی یاد آتی تو بے ساختہ میری زبان سے یہ شعر نکل جاتا۔

ماو مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق او بصحرا رفت و ما در کوچہا رُسوا شدیم

یہاں تک کہ دس سال گزر جانے کے بعد ۱۳۴۶ھ میں احقر کو بھی یہ شوق دامن گیر ہوا کہ تھانہ بھون چلو اور اصلاح اعمال کے لئے حضرت سے استفادہ کی راہ نکالو۔ میرے والد ماجد مولانا محمد یٰسین صاحب حضرت حکیم الامت کے ہم سبق تھے اس لئے بچپن ہی سے حضرت سیدی حکیم الامت مجھ پر شفقت فرماتے تھے ۱۳۴۶ھ کی پہلی حاضری ہی میں مجھے محسوس ہوا کہ دارالعلوم دیوبند میں میری بیس سالہ محنت ومشقت اس وقت تک ناکام ہے جب تک اس مجدد وقت کی خدمت میں رہ کر اصلاح اعمال واخلاق کی فکر نہ کی جاوے۔

دس روزہ قیام کی نیت سے یہ حاضری ہوئی، روزانہ مجلس خاص وعام میں شرکت ہوتی تھی، ایک روز مجلس میں حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کا تذکرہ ایک خاص محبت وعنایت اور تحسین کے الفاظ میں مجھ سے فرما کر دریافت فرمایا کہ آپ ان کو جانتے ہیں، تھانہ بھون کے اس قیام نے اور بھی زیادہ میرے قلب میں اپنے اس ہم سبق کی سبقت کو قابل رشک اور اپنی تاخیر کو قابل حسرت وافسوس بنادیا تھا، اس سوال پر بے ساختہ حضرت کے سامنے بھی میری زبان

سے وہی شعر ہم سبق والا نکل گیا کہ ؎

ماو مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق　　او بصحرا رفت و مادر کو چہار سوا شدیم

حضرت اقدس نے ایک خاص لطف کے انداز میں ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ ہاں یہاں کا یہی دستور ہے کسی کو صحرا دیا جاتا ہے کسی سہرا دیا جاتا ہے ہر ایک کو جو کچھ عطا ہو اس پر راضی ہونا چاہئے۔

بات آئی گئی ہو لیکن اپنے اس صحرا نورد ہم سبق دوست کے کمالات کی عظمت ہمیشہ دل میں رہی اس وقت بھی میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں ایک خاصی تعداد ایسے حضرات کی ہے جو اپنی جگہ آفتاب و ماہتاب ہیں مگر ان کی روشنی اس آفتاب عالم تاب کے سامنے ظاہر نہیں ہوتی۔ حضرت کے بعد یہ حضرات ہی مرجع خلائق بنیں گے، ان میں خصوصیت سے مولانا شاہ وصی اللہ صاحب اور حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری ثم لاہوری پر نظر جاتی تھی اور حضرت قدس سرہ کی وفات کے بعد آنکھوں نے اس کا مشاہدہ کرلیا کہ ان دونوں بزرگوں کی مجلس ایک کیمیائی تاثیر رکھتی تھی ہزاروں مسلمانوں کی زندگیوں میں انکی صحبت و تعلیم سے عظیم دینی انقلاب آیا، ہزاروں بھکے ہوؤں کو راستہ پر لگادیا۔

پھر تقسیم ہند کے بعد احقر یہاں آگیا۔ مگر ہندوستان سے آنے والے دوستوں سے مولانا موصوف کے فیوض و برکات اور رجوع خلائق کا تذکرہ سنتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔ خط لکھنے کا اتفاق طرفین سے کم ہوتا تھا۔ مگر عجیب اتفاق ہے کہ اس آخر مرحلہ میں احقر نے ایک خط لکھا جس کا جواب موصوف نے بمبئی سے دیا یہ کیا معلوم تھا کہ مولانا موصوف کا یہ آخری خط ہے۔ یہ بھی بعد ہی کو معلوم ہوا کہ

بمبئی کا یہ سفر حرمین شریفین کے قصد سے تھا اور ایک بڑا قافلہ آپ کے ساتھ اس مبارک سفر میں شریک تھا۔ ۲۲؍نومبر کو بمبئی سے اپنے رفقاء کے ساتھ مظفری جہاز پر بارادۂ حج وزیارت سوار ہوئے۔

معلوم ہوا کہ یہ بیت اللہ کا مسافر رب البیت کے حضور پہونچ چکا ہے، سفر اور وہ بھی حج وزیارت کا سفر، وطن واعزاء سے دوری کتنے اسباب شہادت کے حق تعالیٰ نے جمع فرمادئے اس پر کوئی حسرت وافسوس کیا کرے یہی کہنے کو دل چاہتا ہے کہ ع

خدا یہ موت دے سب کو ہم اس مرنے پہ مرتے ہیں

البتہ بزرگوں کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ موت العالم موت العالم مولانا شاہ وصی اللہ صاحب بھی انھیں حضرات میں سے تھے جن کی موت تنہا ایک فرد کی موت نہیں ہوتی ایک قوم ایک جماعت کی موت ہوتی ہے۔

(البلاغ کراچی شمارہ شوال ۱۳۸۷ھ)

جس سال حضرت والا بارادۂ سفر حج وزیارت حرمین شریفین کے لئے تشریف لے جارہے تھے اور جہاز میں آپ کا وصال ہوگیا۔ اس سال حضرت مفتی صاحب بھی حج میں تشریف لے گئے تھے۔ حضرت کے قافلے سے جب ان کی ملاقات ہوئی تو دیر تک حضرت کا ذکر فرماتے رہے اسی سلسلہ میں انھوں نے فرمایا کہ:

بھائی ہمارے مولانا کا تو حال ابتداء ہی سے ایسا تھا کہ سب سے الگ تھلگ رہتے تھے، مجمع سے وحشت، تنہائی سے انس، مزاج میں سکوت غالب تھا، طبیعت انتہائی خمول پسند تھی اللہ تعالیٰ کی نسبت اور اس کی طلب کا ایک خاص اثر چہرہ پر نمایاں اور ان کے حال سے ظاہر تھا چنانچہ ہم لوگوں کو اسی وقت سے

برابر اندیشہ رہتا تھا کہ دیکھا جائے کہ اس ابتداء کی انتہا کہاں پر جا کر ہوتی ہے یہی وجہ تھی کہ میں نے جب ریڈیو پر آپ کی موت فی البحر (جہاز میں انتقال) اور تدفین فی الماء (سمندر ہی میں کفن ودفن) کی خبر سنی تو مجھے زیادہ کچھ حیرت نہیں ہوئی اس لئے کہ ہم تو ان سے اسی قسم کے حالات کی توقع رکھتے تھے جس کی زندگی گوشہ خمول میں گزری ہو اس کی موت کے مناسب یہی صورت حال تھی۔ اللہ تعالیٰ مولانا کو غریق رحمت فرمائے۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ:

مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی حضرت حکیم الامت کے نہ صرف مخصوص خلفاء وتلامذہ میں سے تھے بلکہ آپ کے عزیز وقریب خواہر زادہ بھی تھے۔ حضرت تھانوی کی خدمت مبارکہ میں عرصہ تک تھانہ بھون میں آپ کا قیام رہا۔ حضرت تھانوی کی سرپرستی میں تصنیف وتالیف اور فتاویٰ کی خدمت انجام دیتے تھے۔ فقہ حنفی کی تائید میں احادیث کا عظیم الشان ذخیرہ ''**اعلاء السنن**'' کے نام سے مرتب فرمایا، اور اس پر ایک محققانہ مقدمہ ''**انهاء السكن**'' کے نام سے تحریر فرمایا، جو حال میں شام کے مشہور محقق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ ''**القواعد فی علوم الحدیث**'' کے نام سے نہایت آب وتاب کے ساتھ شائع ہوا۔ مسلم لیگ کے سرگرم کارکن اور پاکستان کے ابتدائی معماروں میں آپ کا شمار ہے، حضرت سے خط وکتابت کا اتفاق کم ہوا، تاہم آپ کے مرتبہ ومقام سے پورے طور پر واقف تھے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

آپ سے اہل ہند کو جس قدر فیض پہونچ رہا ہے اس کی خبر سنکر دل کو خاص

مسرت ہے اللہ تعالیٰ اس فیض کو عام اور تام فرمائے۔

حضرت والا نے اس کا جواب جو عنایت فرمایا وہ بھی قابل ملاحظہ ہے، کمال ادب واحترام اور غایت درجہ منت شناسی کا آئینہ دار۔ لکھتے ہیں کہ:

جناب کے خط سے جو مسرت ہوئی وہ اندازہ سے باہر ہے اللہ تعالیٰ کی عنایات میں سے ایک یہ بھی عنایت ہے اور بزرگوں کے اشفاق میں سے یہ بھی ایک شفقت ہے۔ میں تو آپ کا پروردہ ہوں اور ہمیشہ عنایات کا موردرہا ہوں، اس نئی عنایت نے قلب کو دوسرے ڈھنگ کا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جناب کو بایں فیوض وبرکات مدت مدید تک قائم رکھے،

مولانا ظفر احمد صاحب نے حضرت کے وصال کی خبر ''صدق'' میں پڑھی، اپنے تعزیت نامہ میں تحریر فرمایا کہ:

یکم دسمبر کے صدق میں مولانا وصی اللہؒ کے انتقال کی خبر پڑھ کر سخت صدمہ ہوا، اناللہ وانا الیہ راجعون.

میں تو ارادہ ہی کر رہا تھا کہ ہندوستان کا ایک دورہ مولانا سے ملاقات کے لئے ضرور کروں کیونکہ مولانا عبدالغنی (خلیفہ حضرت تھانوی) فرماتے تھے کہ میں نے جب پاکستان آنے کا ارادہ کیا تو مولوی وصی اللہ صاحب سے کہہ دیا تھا کہ اب ہندوستان کو آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ اسی کے متعلق ان سے کچھ کہنا تھا اور پاکستان کے متعلق بھی مشورہ کرنا تھا، مگر افسوس

روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

اللہ تعالیٰ مرحوم کو درجات عالیہ سے نوازیں اور ہندوستان کو ان کا جانشین دیں، جو اپنی قوت ظاہری وباطنی سے وہاں اسلام کی حفاظت کا حق ادا کرتا رہے اور پاکستان کو بھی

ایسا ہی صاحب باطن عطا فرمائیں۔ انتہی

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہ:

مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی شخصیت سے ہندوستان کا کون مسلمان ناواقف ہوگا۔ حضرت مولانا نانوتوی کے پوتے، حضرت حکیم الامت کے مجاز، علوم قاسمی کے محافظ، ہندوستان کے نامور ترین واعظ وخطیب، اسرار ونکات کے ماہر اور راز ہر ہند دارالعلوم دیوبند کے سب سے طویل المدت مہتمم۔

پہلی بار حضرت والا سے ۱۳۸۱ھ میں الہ آباد میں ملاقات کے لئے تشریف لائے حضرت نے ملاقات کا نظم بعض مصالح سے بجائے شہر الہ آباد کے مضافات کے ایک گاؤں اتراؤں میں فرمایا، حضرت والا کے خاص مسترشد اور معتمد علیہ عالم مولانا محمد فاروق صاحب اسی جگہ کے رہنے والے ہیں، مہتمم صاحب نے واپسی پر جو مکتوب تحریر فرمایا اس میں لکھتے ہیں کہ:

> مولانا ظہور الحسن صاحب نے آنمحترم کا مفصل والا نامہ پہونچایا جو تالیفی صورت کا تھا اور نہایت ہی قیمتی اور ضروری نصائح پر مشتمل تھا۔ میں ان شاء اللہ اتباع کرونگا، دعا کی ہر وقت ضرورت ہے یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے اس نے آنمحترم کو غیبی توجیہ سے اس نالائق کی طرف متوجہ فرمادیا، اپنے حالات اور ماحول کے واقعات کے لحاظ سے جی چاہتا تھا کہ اپنا کوئی مرجع ہو جس کی طرف رجوع کیا جاتا رہے حق تعالیٰ کی غیبی امداد ہے کہ کنواں خود ہی پیاسے کے پاس آگیا اور پانی بھی اتنا اوپر آگیا کہ ڈول رسی کی بھی ضرورت نہ رہی۔ **فالحمد لله علی ذالک**.

مرض فالج سے حضرت کے صحت مند ہونے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ:

احتیاط اور پرہیز کی زیادہ ضرورت ہے، میرا ناقص اندازہ یہ ہے کہ اب بحمداللہ آں محترم کا فیضان زبان اور بیان کا محتاج نہیں رہا، فیض حضوری اور مسترشدین کی طالبانہ توجہ پر خموشی سے بھی وہی سب کچھ مرتب ہوگا جو زبان وبیان سے ہوتا اس لئے تا رفع ضعف اگر زیادہ تقریر وبیان سے لوجہ اللہ احتراز فرمایا جائے تو اس سے تقلیل فیضان کا ان شاء اللہ کوئی خطرہ نہیں بلکہ خموشی زبان سے زیادہ نفع بخش ثابت ہوگی۔ پھر موقع آئے گا کہ قلب کے ساتھ زبان بھی فیوض کی ترجمانی میں حسب معمول لگ جائے گی۔

مولانا مفتی نظام الدین صاحب جو حضرت کے مجاز ہیں، دارالعلوم دیوبند میں مفتی کے عہدے پر تشریف لے گئے وہاں سے اپنے مکتوب میں حضرت مہتمم صاحب کے تاثرات نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

حضرت مہتمم صاحب فرمارہے تھے کہ ہمارے حضرت بہت بڑے صاحب تصرف بھی ہیں۔ مدرسہ کے بہت سارے معاملات بہت الجھے ہوئے تھے اور الجھتے ہی چلے جارہے تھے۔ اور میں گھبراتا سا جارہا تھا۔ لیکن لکھنؤ میں زمانۂ علالت میں میں نے عرض کیا، حضرت نے دعا فرمائی اور تسلی دی اور بمبئی میں بھی میں نے عرض کیا اور اپنی کچھ پریشانیاں بھی ظاہر کیں تو حضرت نے بڑی قوت سے فرمایا کہ جاؤ کام کرو ان شاء اللہ تعالیٰ کچھ نہیں ہوگا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا تم اندر سے کام کرو اور میں باہر سے اور لوگ نہیں مانیں گے تو میں سرکار (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے یہاں عرض کردونگا، چنانچہ اس کے بعد ہی سے معاملات سلجھنا شروع ہوگئے اور سلجھتے ہی چلے جارہے ہیں اور اب میں مطمئن اور قلب میں ایک قوت سی محسوس کررہا ہوں۔

گو کہ حضرت مہتمم صاحب حضرت اقدس علیہ الرحمۃ کے خواجہ تاش اور ہم عصر ہیں تاہم حضرت کی جلالت شان، علو مرتبت اور قوت نسبت کے سامنے اپنے کو اس درجہ مٹایا اور جھکایا کہ معاصرین کی تاریخ میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم کے انتظامات کے سلسلے میں مشکلات سے دوچار ہوتے، تدبیروں کا دروازہ بند ہونے لگتا، حالات کا دھارا عزائم کے خلاف بہنے لگتا، عقل کے ناخن جب احوال وکوائف کی گتھیاں سلجھانے سے عاجز ہوجاتے تو خود اپنی دعاہائے شب وروز کے ساتھ ساتھ اپنے جلیل القدر معاصر کی جانب رجوع فرماتے اور وہاں سے دعائیں حاصل کرکے اپنے قلب ودماغ میں سکون واطمینان کی خنکی محسوس فرماتے اور بارہا ایسے مواقع آئے جب حضرت والا کی دعاؤں، تدبیروں اور مشوروں کا اعتماد پاکر مشکلات کے سیلاب پر بند لگایا گیا، حضرت والا اور مہتمم صاحب کے مابین طویل مکاتبت ومراسلت میں اس کے متعدد نمونے ہیں وہ مراسلات اپنے قیمتی مشتملات کے لحاظ سے اس بات کے مستحق ہیں کہ انھیں یکجا کتابی صورت میں شائع کردیا جائے، ارباب مدارس اور اساتذہ وطلبہ کے لئے بہترین رہنما ثابت ہوں گی یہاں اگر اس کے چند نمونے بھی پیش کئے جائیں تو کتاب طویل ہوجائے گی، ناظرین ان مکاتیب کو الگ کتابی صورت میں ملاحظہ فرمائیں گے ان شاء اللہ۔

جناب ڈاکٹر عبدالحئی صاحب مدظلہ: (۱)

حضرت تھانوی قدس سرہ کے بہت سے خلفاء ومجازین تقسیم ہند کے بعد پاکستان تشریف لے گئے اور وہاں وہ محفل ارشاد وہدایت کے صدر نشین بن کر سنت وشریعت کی ترویج واشاعت میں سرگرم رہے ان میں سے اکثر حضرات اپنی خدمات کا

---

(۱) حضرت ڈاکٹر صاحب بھی ۱۹۸۶ء میں جوارِ رحمت میں پہونچ گئے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

صلہ حاصل کرنے دربار خداوندی میں باریاب ہو چکے ہیں، جو چند حضرات نمونۂ سلف بن کر اب بھی حق و ہدایت کی تابانیاں بکھیر کر دنیا کو روشنی بخش رہے ہیں ان میں جناب ڈاکٹر عبدالحئی صاحب کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔

ڈاکٹر صاحب اصل باشندہ تو غالباً اٹاوہ کے ہیں۔ بعد میں جونپور میں قیام پذیر رہے ہومیو پیتھ مطب فرماتے تھے، تقسیم ہند کے بعد کراچی منتقل ہو گئے، اس کے بعد انتقال مکانی کے باوجود اپنے قدیم وطن اور اہل وطن کو بھولے نہیں، حضرت کے پاس بھی ان کے متعدد خطوط آئے ان سے دونوں حضرات کے باہمی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے، چند خطوط کے اقتباسات پیش نظر ہیں ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> آپ کی یاد اکثر آتی ہے اور ذکر ہو جایا کرتا ہے، بات یہ ہے کہ جب سے میں یہاں آیا ہوں مولوی اسلام اللہ صاحب (برادر خورد حضرت والا) سے ملاقات ہوگئی ہے، بڑی محبت فرماتے ہیں اور اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے آپ کے فیوض و برکات کا تذکرہ رہا کرتا ہے آج بھی بہت محبت کے ساتھ ذکر ہو رہا تھا بے ساختہ جی چاہا کہ عریضہ لکھوں دریافت خیریت مزاج کرلوں اور اپنے لئے آپ کی توجہات اور دعاؤں کا سرمایہ بھی حاصل کرلوں۔

ایک اور مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

> آپ کا غیر متوقع محبت نامہ دل مشتاق کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ دیر تک اس کا کیف و سرور دل میں رہا اور اب تک ہے اللہ تعالیٰ اس مخلصانہ یاد فرمائی کا اجر عظیم عطا فرمائیں۔
>
> میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ (حضرت تھانوی) سے مخصوص تعلق رکھنے والوں کے ساتھ اپنے دل میں بہت محبت کا احساس رکھتا ہوں، ایک مدت سے آپ

کے حالات فیض رسانی اور حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک وطریقۂ تربیت واصلاح کی اشاعت کے حالات معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ بہت دل خوش ہوتا ہے اور دل سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے فیوض وبرکات روحانی کو ہمیشہ قائم ودائم رکھیں اور خلق اللہ کی دینی تشنگی کی سیرابی کے لئے تادیر چشمۂ ہدایت بنائے رکھیں، آمین

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

محبت اور شفقت نامہ سے دل کو بڑی تسکین ومسرت ہوئی، بحمد اللہ تعالیٰ اب صحت وقوت بحال ہورہی ہے مزید بلکہ مستقل دعاؤں کے لئے بشرط یاد مستدعی ہوں آپ کی صحت وتندرستی اور تادیر فیوض وبرکات جاری رہنے کے لئے دل وجان سے دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔

آپ نے جو اس تعلق خصوصی کا اظہار فرمایا ہے میرا دل اس کیف سے معمور ہے، جزاک اللہ خیرا کثیرا

ادائے حق محبت عنایتے ست زدوست
وگرنہ بندۂ مسکین بہ ہیچ خرسنداست

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب علیہ الرحمۃ:

دور آخر کے بزرگوں میں سے مکمل ایک دور کا خاتم اگر حضرت شیخ الحدیث صاحب کو قرار دیا جائے تو بجا ہے۔ حضرت گنگوہی قدس سرہ کی گود میں کھیلے ہوئے، تمام اکابر کی منظور نظر اور معتمد علیہ شخصیت، حضرت والا کے ساتھ بھی انتہائی نیازمندانہ تعلقات رکھتے تھے مراسلت تو کم رہی لیکن جتنی رہی ایک ایک لفظ سے طرفین سے عقیدت ومحبت اور شفقت وعنایت کا دریا موجزن ہے ہم بطور نمونہ حضرت شیخ الحدیث صاحب کا ایک مکتوب اور حضرت والا کا جواب نقل کرتے ہیں۔ یہ مکتوب چونکہ طریق

کے ایک مسئلہ سے متعلق ہے اس لئے اس کی افادیت کے پیش نظر ہدیۂ ناظرین کرنا مناسب معلوم ہوا۔ تحریر فرماتے ہیں:

المخدوم المکرّم زیدت معالیکم

بعد سلام مسنون! امید ہے کہ مزاج عالی بخیر ہوں گے، ایک خاص ضرورت سے یہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔ جمعہ کے دن کچھ لوگ آجایا کرتے ہیں، ایک مولوی صاحب نے یہ دریافت کیا کہ وصول (وصول صوفیاء کا ایک اصطلاحی لفظ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ سالکِ راہِ طریقت راستہ کے مراحل طے کرتا ہوا قرب خداوندی سے سرفراز ہوجائے اور اسے وہ درجہ حاصل ہوجائے جس کی جانب حدیث میں اشارہ ہے کہ میں اسکا ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں۔) کے بعد بھی معصیت ہوسکتی ہے؟ میں نے جواب دیا ممکن ہے، عصمت تو انبیاء کے لئے ہے اس پر انھوں نے کہا کہ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ نے لکھا ہے کہ وصول کے بعد معصیت نہیں ہوسکتی۔ اس وقت تو میں نے ان کو ڈانٹ دیا کہ جب حضرت کا ارشاد معلوم تھا تو تم نے پوچھا کیوں؟ لیکن اسی وقت سے خیال آیا کہ جناب سے اس کے متعلق کچھ استفادہ کروں کہ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کا کوئی ارشاد اس سلسلے میں آپ کے علم میں ہے اگر وصول سے نسبت مراد ہے تو مشائخ کے یہاں تو اجازت کے بعد اس کا نسخ بھی منقول ہے۔ خود حضرت تھانوی قدس سرہ کے یہاں بھی اجازت کے بعد بعض خلفاء کی اجازت منسوخ کی گئی ہے اور اگر وصول سے مراد کوئی اوپر کا درجہ ہے تو وہ کیا ہے؟ معصیت کا صدور تو صحابہ سے بھی ہوا ہے اور قدماء مشائخ میں سے بھی بعض حضرات سے اس قسم کی لغزشیں منقول ہیں۔ شیخ ابوعبداللہ اندلسی کا واقعہ تو بہت مشہور و معروف ہے اور اس نوع کے واقعات مشائخ سلوک کے واقعات میں بھی ملتے ہیں دعاؤں کا یہ ناکارہ

بہت محتاج ہے امید ہے کہ دعاء سے مدد فرمائیں گے۔ فقط

محمد زکریا

حضرت اقدس نے جواب تحریر فرمایا:

عنایت فرمائے بندہ جناب مولانا صاحب **دام عنایتکم وفضلکم**

الحمدللہ بخیریت ہوں۔ گرامی نامہ ملا، آپ نے اس مسئلہ کو مجھ سے دریافت فرمایا حالانکہ آپ ماشاءاللہ خود بھی عالم ہیں۔ کتاب وسنت پر آپ کی نظر ہے۔ طریق کا کوئی مسئلہ کتاب وسنت کے خلاف تھوڑا ہی ہے اگر خدانخواستہ اس کے خلاف کسی نے کوئی بات کہی بھی ہو تو وہ قبول کب کی جائے گی۔ حضرت مولانا تھانوی نے معلوم نہیں کس موقع پر کیا فرمایا، حضرت کے الفاظ سامنے ہوتے تو اس کے متعلق کچھ عرض کرتا تاہم آپ نے جو فرمایا ہے صحیح فرمایا ہے۔ میں نے حضرت سے اس کے بالکل خلاف سنا جو وہ صاحب فرما رہے ہیں۔ حضرت نے حضرت جنید قدس سرہ کا ارشاد نقل فرمایا کہ **سئل الجنید هل العارف یزنی فاطرق راسه ملیاثم رفع فقال وکان امر اللہ قدرا مقدورا** (حضرت جنید سے سوال کیا گیا کہ کیا عارف زنا میں مبتلا ہوسکتا ہے؟ تو انھوں نے کافی دیر سر جھکانے کے بعد ارشاد فرمایا کہ اللہ کا فیصلہ ہوکر رہتا ہے) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ احیانا معصیت کا صادر ہوجانا ولایت کے منافی نہیں ہے اس لئے کہ ولی معصوم نہیں ہوتا، رسالہ قشیریہ کے حاشیہ میں اس کے متعلق بہت عمدہ بحث فرمائی ہے لکھتے ہیں کہ:

ولاینبغی للمریدان یعتقد فی المشائخ العصمة وان کانوامحفوظین لا ن ذلک یخالف الواقع ولانه یودی الی نفرته

منهم وعدم انتفاعه بهم اذاصدر منهم ذنب والفرق بين العصمة والحفظ ان العصمة تمنع جوازوقوع الذنب والحفظ لايمنع عنه ولا ن اللّٰه تعالیٰ يحفظ من يشاء ويترک من يشاء لان الاولياء لايقدح زللهم قواعد الدين بخلاف الانبياء فان المعجزة دلت علی عصمتهم فيما يخبرون به من اللّٰه تعالیٰ وفيمايفعلونه بيانالتكليف فعلم انه ليس للمريدان يعتقد العصمة فی المشائخ ،ص۲۰۱ (مشائخ کے متعلق مریدوں کو معصوم ہونے کا اعتقادنہیں رکھنا چاہئے اگر چہ وہ گناہوں سے محفوظ ہیں۔اس لئے کہ اس اعتقاد کے بعد اگر وہ ان سے کسی گناہ کا صدور دیکھ پائیں گے تو دل میں ایک نفرت سی ہوجائیگی اور پھر ان سے نفع حاصل نہیں کرسکیں گے معصوم اور محفوظ ہونے میں فرق یہ ہے کہ معصوم سے گناہ صادر ہونا ممکن ہی نہیں ۔اس کے برخلاف محفوظ سے گناہ ہوجانا ممکن ہے ۔اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں محفوظ رکھتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں نہیں رکھتے ، کیونکہ اولیاء اللہ کی خطاؤں سے دین کی بنیاد میں کوئی خلل نہیں آتا اس کے برخلاف اگر نبی سے گناہ صادر ہوتو دین کی بنیاد ہی ہل جائے ،انبیاء کے معجزات اس بات پر دلیل ہیں کہ وہ جو کچھ اللہ کی جانب سے بیان کرتے ہیں اور جو کچھ احکام کو ظاہر کرنے کے لئے عمل کرتے ہیں اس میں معصوم ہیں اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مشائخ کے سلسلے میں عصمت کا اعتماد جائز نہیں ۔

البتہ ایک اور مسئلہ اسی کے قریب قریب صوفیاء بیان کرتے ہیں وہ یہ کہ الفانی لایرد ۔یعنی فناء اور وصول کے بعد پھر کوئی شخص اپنے پچھلے حالات کی

جانب راجع نہیں ہوتا جس طرح سے کہ پھل پکنے کے بعد خام نہیں ہوا کرتا۔ تو اس کے متعلق قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی ارشاد الطالبین میں لکھتے ہیں کہ:

مسئلہ: صوفیہ را بعد فنا رجوع نیست ہر کہ رجوع کردہ است پیش از فنا کردہ است، فقیر برایں مسئلہ استدلال می کند بقولہ تعالیٰ "**وما کان اللہ لیضیع ایمانکم ان اللہ بالناس لرؤف رحیم**" ورسول فرمودہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ حق تعالیٰ باز نمی ستاند از بندگان لیکن علم را قبض خواہد کرد بقبض علماء ازیں معلوم می شود کہ حق تعالیٰ ایمان حقیقی وعلم باطنی را قبض نخواہد کرد (ص ۲)

ترجمہ: فنا کے بعد صوفیہ اپنے پچھلے حالات کی جانب نہیں لوٹتے، اور جس کو یہ رجوع پیش آیا ہے فنا سے پہلے پیش آیا ہے فقیر اس مسئلہ میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ وہ تمھارے ایمان کو ضائع کردے۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان اور رحم فرمانے والے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے کچھ واپس نہیں لیتے مگر علماء کی موت سے علم کا خاتمہ فرمائیں گے اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ ایمان حقیقی اور علم باطنی کو نہیں چھینتے۔

میں کہتا ہوں کہ **وکذلک الایمان حین تخالط بشاشته القلوب، جواب هرقل بسوال ابی سفیان وسئلتک ایرتد احد سخطة لدینه بعد ان یدخل فیه فذکرت لا ففیه دلیل صریح لهذه المسئلة.** (یعنی ہرقل نے ابوسفیان سے گفتگو کے دوران جو یہ کہا تھا کہ میں نے تم سے پوچھا کہ کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں داخل ہونے کے بعد

کوئی نالاں ہوکر اسے چھوڑ بھی دیتا ہے تو تم نے جواب دیا کہ نہیں۔تو ایمان ایسی ہی چیز ہے۔اس کی بشاشت جب قلوب میں جاگزیں ہوتی ہے تو پھر نکلتی نہیں ہے اس میں بھی اس مسئلہ کی صریح دلیل ہے)

اس تائید سے امید ہے کہ آپ کی مزید تشفی ہوگئی ہوگی۔فقط آپ کے لئے دعا کرتا ہوں اور اپنے لئے آپ سے دعا کا طالب ہوں۔

والسلام خیر ختام

وصی اللہ عنہ ۸۶/۶/۵ھ

ان حضرات اکابر کے علاوہ ہندوستان کے اور بے شمار علماء نے حضرت اقدس کے آستانہ کی جبیں سائی کو اپنے لئے باعث صد افتخار سمجھا۔نامور بزرگوں اور علماء میں خاص طور پر قابل ذکر مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی ہیں ان حضرات کو حضرت کے یہاں اختصاصی درجہ حاصل تھا۔اور ان بزرگوں نے بھی جس نیازمندی اور عقیدت ومحبت کا ثبوت دیا وہ تواضع وللّٰہیت کا ایک نادر مرقع ہے۔مولانا علی میاں سے مراسلت کا تو ایک دفتر ہے جس میں جانبین سے انس ومحبت اور عقیدت ونیازمندی کے ایک سے بڑھ کر ایک روح پرور مناظر ہیں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کے خطوط کے بھی کچھ اقتباسات گزر چکے ہیں مولانا عبدالباری صاحب ندوی کا مضمون ''چار ہفتہ ایک کہف میں'' کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں یہاں ہم صرف مولانا ابوالحسن علی ندوی کا ایک مکتوب اور حضرت اقدس کا جواب پیش کرتے ہیں۔لکھتے ہیں:

مخدومی ومعظمی دامت برکاتہ والطافہ ومکارمہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آداب خادمانہ کے بعد گزارش ہے کہ یہ ناچیز ونا کارہ حضرت والا سے رخصت ہو کر بعافیت اپنے مستقر پر پہونچا۔ حضرت والا کی شفقتیں اور ذرہ نوازی برابر یاد آتی رہی۔ حضرت والا نے جس اہم ومبارک موضوع (غالبًا جنت ودوزخ کے بیان پر متوجہ فرمایا تھا) کی طرف توجہ دلائی وہ میری اصلاح وتعلیم کے لئے بہت مفید تھی۔ ہم لوگوں نے اس موضوع ومضمون کو بالکل فراموش ونظر انداز کردیا ہے۔ جناب والا کے ارشاد سے اس کی اہمیت وعظمت تازہ ہوئی اور اس موضوع پر اپنی بے بضاعتی کا احساس ہوا اب جی چاہتا ہے کہ خاص طور پر اس کا مطالعہ کرے اور اگر خدا توفیق دے تو حافظ ابن قیم کی کتاب ''حادی الارواح'' کے طرز پر اردو میں اس کا ذوق بڑھانے کے اور عام کرنے کے لئے بھی ایک کتاب لکھے جو مستند ومنتخب آثار واخبار پر مشتمل ہو۔

سفر الہ آباد اپنی صعوبت وموسم کی سختی کے باوجود اس لئے قیمتی تھا کہ حضرت والا کی زیارت ہوگئی اور کچھ دیر صحبت بابرکت میں بیٹھنے کا موقع ملا اور ارشادات سے مستفید ہوا۔ امید ہے کہ حضرت کا مزاج بالکل بعافیت ہوگا۔

والسلام مع الاکرام

ابوالحسن علی ندوی

۲۵ر شوال المکرّم ۷۷ھ

حضرت اقدس کا جواب ملاحظہ فرمائیں:

حبی ومحبی سلمہ اللہ تعالیٰ   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مکرمت نامہ نے شرف صدور بخشا، باعث ازیاد محبت وخلوص ہوا جو حضرات اہل علم میرے پاس آمدورفت فرماتے ہین ان میں غالبًا سب سے زیادہ قلب کا

رجحان جناب کی طرف ہوتا ہے ارقام فرمایا کہ ''جس اہم ومبارک موضوع کی طرف توجہ دلائی ہے وہ میری اصلاح وتعلیم کے لئے بہت مفید تھی ہم لوگوں نے اس موضوع ومضمون کو بالکل فراموش ونظر انداز کردیا ہے'' اس کوسن کر بے ساختہ یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ۔

لگ چلا تھا دل قفس میں پھر پریشاں کردیا
ہم صفیرو! تم نے پھر ذکر گلستاں کردیا

اب میں جناب سے اجازت چاہتا ہوں کچھ عرض کرنے کی ، بعد آنے اجازت نامہ کے قدرے تفصیل سے عرض کروں گا۔ والسلام

وصی اللہ عفی عنہ

یہ چند مثالیں علماء کے حلقے سے پیش کردی گئیں ورنہ اس وقت کون ایسا قابل ذکر عالم وفاضل تھا جس نے اس خوان کرم سے فائدہ حاصل نہیں کیا اگر ہم ان کی فہرست بنانا چاہیں تو مشکل ہوگی ، محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کو حضرت کے حلقے کے لوگ نہ بھولے ہوں گے کہ کس نیاز مندی کے ساتھ حاضری دیتے تھے اور اس حاضری کو اپنے لئے سرمایۂ سعادت تصور فرماتے تھے۔ مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی ، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ، مولانا ابرارالحق صاحب ہردوئی اور دوسرے حضرات کی آمد ورفت سے حضرت کے حلقہ کے تمام لوگ واقف ہیں ۔اللہ تعالیٰ نے حضرت اقدس کو حلقۂ علماء میں ایسی مقبولیت عطا فرمائی تھی کہ باید شاید! **اعلی اللہ مقامہٗ**

☆☆☆☆☆☆☆

باب ۵

کرامات وقبولیت دعا

اہل اللہ کو ان کی طاعت وعبادات، تفویض وتوکل اور زہد وتقویٰ کے نتیجے میں کچھ خصوصی احوال باری تعالیٰ کی جانب سے عطا ہوتے ہیں ان میں سے ایک بڑا عطیہ قبولیت دعا اور کشف وکرامت ہے۔ یہ حضرات خود کو مٹا کر اور اپنی خواہشات کی دیواریں منہدم کر کے جب اپنا سب کچھ اس بارگاہ عالم پناہ کے سپرد کر دیتے ہیں تو پھر ادھر سے قبولیت ومحبوبیت کی نوازش ہوتی ہے اور انھیں بارگاہ قدس میں داخلہ حاصل ہو جاتا ہے۔ پھر جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

فکنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصر به ویده التی یبطش بها ورجله التی یمشی بها۔

میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔

پھر ان کے دل میں جو خواہش ابھرتی ہے۔ آمیزش نفس سے پاک ہوتی ہے اس کا ورود خدا کی طرف سے ہوتا ہے حدیث شریف میں آتا ہے

من کان للہ کان اللہ له۔ جو اللہ کا ہو گیا اللہ اس کا ہو گیا۔

بندہ جب اس مقام پہنچتا ہے اور نفس کی آلودگیوں سے یکسر پاک ہو لیتا ہے تو اس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ کی قدرت ظہور کرنے لگتی ہے۔ اب وہ اسباب کا پابند اس لئے رہ جاتا ہے کہ عالم اسباب میں رہتا ہے ورنہ اسباب .... جو درحقیقت ارادۂ

خداوندی کے تابع ہیں اس کے خادم کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اس کا وجود قدرت الٰہی کا مظہر بن جاتا ہے عام اسباب سے ہٹ کر بہت سے کام اس کے واسطے سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ انھیں خلاف عادت اور خلاف اسباب امور کا نام اصطلاح میں ''کرامت'' ہے۔ کرامتیں دو طرح کی ہوتی ہیں، حسی اور معنوی۔ حسی کرامت تو ہر شخص دیکھتے ہی معلوم کر لیتا ہے مثلاً پانی کے اوپر بلا کشتی اور بغیر تیرے ہوئے چلنا، ہوا میں اڑنا، کھانے میں برکت کا ظاہر ہو جانا، مریض کو ہاتھ لگاتے ہی اس کا شفایاب ہو جانا۔

لیکن معنوی کرامت کا ہر شخص ادراک نہیں کر سکتا۔ اس کا تعلق باطن سے ہوتا ہے، مثلاً شریعت کی ایسی پابندی کہ اس میں کبھی فرق نہ پڑے اسے ''استقامت'' کہتے ہیں، شریعت میں دونوں کرامتوں کا اہم مقام ہے، مشہور ہے کہ حضرت جنید بغدادی قدس سرہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرصہ تک آپ کی صحبت میں رہ کر جب جانے لگا تو اس نے افسوس کے ساتھ کہا کہ اتنے عرصہ تک آپ کی خدمت کرتا رہا مگر کوئی کرامت نہیں دیکھی، حضرت نے خیال کیا کہ صرف اتنی بات کی وجہ سے یہ فائدہ سے محروم جا رہا ہے حضرت کی دلی شفقت نے گوارا نہیں کیا کہ یہ محروم اور بے فیض چلا جائے۔ ارشاد فرمایا اچھا! تم یہ بتاؤ کہ اتنے عرصے میں تم نے مجھے کسی گناہ میں مبتلا پایا۔ اس نے عرض کی کہ نہیں ارشاد فرمایا۔ اب اس سے بڑھ کر تم کیا کرامت چاہتے ہو کہ جنید نے اتنے عرصہ میں ایک مرتبہ بھی اپنے مالک کو ناراض نہیں کیا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی، پھر وہ وہیں رہ پڑا۔

ہر دو کرامات میں اعلیٰ مرتبہ اور مقام تو کرامت معنوی ہی کا ہے کیونکہ رضائے الٰہی اور تقرب خداوندی میں اس کا خاص دخل ہے تاہم کرامت حسی کی عظمت

واہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ استقامت حاصل ہونے کے بعد یہ کرامات بطور انعام کے خداوند عالم کی جانب سے عطا ہوتی ہیں۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ معجزات عطا فرماتے ہیں اور ان کی حقیقی اتباع اور کامل اطاعت کے طفیل میں اولیاء مقبولین کو کرامات سے نوازا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے طبائع انسانی کا کوئی ایک متعین سانچہ نہیں بنایا ہے کہ کسی ایک ہی خصوصیت کی بنا پر داعی حق کے پیچھے دنیا چل پڑے بعض طبیعتیں اعلیٰ درجہ کی ذکی و ذہین اور بالغ نظر ہوتی ہیں۔ انھیں تو عام اخلاق واوصاف ہی سے حق وہدایت کی روشنی محسوس ہو جاتی ہے اور وہ رسول یا نائب رسول کے اتباع میں سرگرم ہو جاتی ہیں مگر بعض طبیعتیں غبی اور بلید ہوتی ہیں انھیں جب تک کچھ ظاہری چیزیں ایسی نظر نہ آجائیں جن سے ان کا خدا کے ساتھ قوی تعلق محسوس ہوتا ہو اس وقت تک ان میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی، انبیاء اور ان کے کامل متبعین کو چونکہ ہر ایک سے واسطہ پڑتا ہے اس لئے خداوند عالم کی حکمت ومصلحت انھیں تمام اوصاف وکمالات سے نوازتی ہے، تاکہ جہاں جس وصف کی ضرورت ہو، مصلح اور داعی اس سے تہی دامن نہ ہو، ایک حکمت یہ بھی ہے جس کی وجہ سے......واللہ اعلم......انبیاء کو معجزات عطا ہوتے ہیں، اور اولیاء کو کرامات۔ چنانچہ ہمارے سامنے جتنے انبیاء کی تاریخ موجود ہے کوئی ایسا نہیں ہے جس کی زندگی میں معجزات کا نور جگمگا نہ رہا ہو۔ تاہم جیسے نبی کی نبوت قطعی اور یقینی ہے اس کے معجزات بھی یقیناً برحق اور خدا کی طرف سے ہوتے ہیں۔ لیکن اولیاء کی ولایت چونکہ ایسی قطعی نہیں ہوتی کہ اس پر ایمان لانا ضروری ہو۔ اس لئے کرامات بھی قطعی اور یقینی نہیں کہی جا سکتی۔ ہاں ولایت کا ظن غالب ہوتا ہے۔ اس لئے ان سے جو خارق عادات امور ظاہر ہوتے ہیں ان کے کرامت ہونے کا بھی ظن غالب حاصل ہوتا ہے اس فرق کے باوجود معجزہ اور کرامت

میں اتنا اشتراک ہوتا ہے کہ معجزہ میں نبی کی قوت اور کرامت میں ولی کی طاقت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ دونوں چیزیں خالص اللہ کی قدرت سے ظہور میں آتی ہیں۔ انبیاء کا اور اولیاء کا وجود صرف ان کے صدور وظہور کا واسطہ بنتا ہے۔اس مختصر تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ معجزات وکرامات نہ تو اسباب ونتائج کی قبیل سے ہیں اور نہ ہی ان میں انسانی طاقت کا دخل ہوتا ہے۔اگر سیرت نبوی کی کتابوں میں معجزات کا عنوان قائم کیا جاتا ہے تو ان کے نائبین ووارثین کی سیرت اگر کرامات کے عنوان سے خالی رہ جائے تو اسے نقص اور خامی کہا جائے گا۔

تاہم یہ ضرور خیال رکھنا چاہئے کہ کرامات ولایت کے لئے معیار نہیں ہیں یعنی اگر کسی اللہ والے صاحب نسبت بزرگ سے کرامت کا ظہور نہ ہو تو یہ فیصلہ ہرگز نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی بزرگی یا ولایت میں کوئی نقص یا خامی ہے۔اوپر بتایا جاچکا ہے کہ کرامت درحقیقت طاعت وعبادت کے اوپر بطور انعام واکرام حاصل ہوتی ہے۔ پھر ضروری نہیں کہ یہ انعام واکرام اسی دنیا میں حاصل ہوجائے ۔اصل محل انعام واکرام کا آخرت ہے، وہاں یہ حضرات بھرپور نوازے جائیں گے۔ یہ کرامات دراصل اخروی انعامات کے کچھ نمونے ہیں ان نمونوں کی ضرورت ہر ایک کو نہیں ہوتی کہ لازماً ہر صاحب نسبت کو یہ نمونے عطا ہونے ضروری ہوں، البتہ جن لوگوں سے متعلق مخلوق کی ارشاد وہدایت کی ذمہ داری کردی جاتی ہے انھیں ان وسائل کی حاجت پیش آتی ہے چنانچہ اولیاء کی سوانح عمریوں میں انھیں اکابر کے متعلق کرامات کی روایتیں زیادہ ملتی ہیں جو مخلوق کی ہدایت وفیض رسانی مین سرگرم رہے ہیں اور جو خدا کی جانب سے دعوت الی اللہ کے منصب عظیم پر مامور رہے ہیں موضوع سے دور ہوجانے کا اندیشہ ہے ورنہ اس مسئلہ کی وضاحت تاریخی واقعات کی روشنی میں کی جاتی۔

ناظرین کے علم میں یہ بات آچکی ہے کہ مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ کو اللہ تعالیٰ نے ارشاد و ہدایت کا منصب عطا فرمایا تھا، آپ کی ذات والا صفات کو حق تعالیٰ نے ایسا سرچشمہ شیریں بنادیا تھا کہ ہر چہار جانب سے تشنہ کامان ہدایت آتے تھے اور سیراب ہوکر جاتے تھے پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت کاملہ اور حکمت بالغہ نے حضرت والا کو ان کمالات سے بھی بطور خاص حصہ عنایت فرمایا تھا، جنھیں ہم اوپر ذکر کرآئے، یعنی قبولیت دعا اور کشف وکرامت! دیکھنے والوں کی شہادت ہے کہ ادھر حضرت کے منھ سے کوئی دعا نکلی اور ادھر بارگاہ قبولیت میں جا پہونچی، مولانا عبدالباری صاحب اپنے مضمون ''چار ہفتہ ایک کہف میں'' تحریر فرماتے ہیں:

> دعا کا خاص اہتمام تو جہاں تک اندازہ ہوا خاص معمولات میں داخل ہے، بعض علماء وصلحاء نے خود احقر کو دوران قیام خط میں دعا کی درخواست کے لئے تحریر فرمایا تو درخواست کا جواب ایسے الفاظ اور انداز میں ملا جس سے معلوم ہوا کہ خاص وقت ہی میں نہیں خاص اوقات میں اور بار بار ہوگی اپنے پرائے دیکھے سنے متعدد تجربات سے شہادت ملی کہ ماشاء اللہ مستجاب الدعوات بھی بڑے ہیں بعض واقعات تو نہایت حیرتناک اور بالکل ہی کرامت کے! مگر کیا کیا عرض کیا جائے۔ صدق کی محدود گنجائش سے بات یوں ہی بہت بڑھ گئی۔ (حالات: ج۱ص۱۳)

حضرت والا نے دعاؤں کی اہمیت و برکت اور اس کی عظمت کی جانب جس شد و مد کے ساتھ امت کو توجہ دلائی ہے اسکے بیان کی اصل جگہ تو حضرت کی تعلیمات ہے۔ یہاں اتنا سنتے چلئے کہ حضرت نے ایمان وعمل بلکہ زندگی کے ہر ہر رخ کے لئے دعاؤں کو اختیار کرنے پر جتنا زور دیا ہے اسے اگر آپ کا تجدیدی کارنامہ کہہ لیجئے تو

مضائقہ نہیں اور خود اس پر حضرت کا عمل تھا چھوٹے بڑے تمام امور کو بارگاہ خداوندی میں پیش کرنا آپ کا شب و روز کا وظیفہ تھا، حق تعالیٰ نے اس کا صلہ یہ عطا فرمایا کہ کم دعائیں استجابت سے خالی جاتی تھیں۔

مشہور صاحب علم وقلم حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی اپنے آخری ایام میں مستقل فریش فرش علالت ہو کر رہ گئے تھے۔ حضرت کا تعارف انھیں حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے مضمون ''چار ہفتہ ایک کہف میں'' سے ہوا، اس سے متاثر ہو کر مولانا گیلانی نے حضرت کو ایک عریضہ لکھا جو پورا قابل ملاحظہ ہے۔ آداب وسلام کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے واسطے سے دیکھ رہا ہوں کہ قلب کا غیر معمولی رجحان جناب والا کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ حکیم الامت قدس اللہ سرہ کی صحبت کا لطف اب بھی میسر آسکتا ہے۔ دل میں اس کی امید پیدا ہوگئی ہے کاش اس فقیر کی جسمانی حالت اس قابل ہوتی کہ خدمت والا تک پہونچنے کے لئے سفر کی زحمت برداشت کرسکتا تو اب تک شاید نیازمندی سے محروم نہ رہتا، لیکن ڈاکٹروں جسے تقریباً دو سال سے پلنگ کے ساتھ باندھ رکھا ہو مسجد تک کی حاضری سے محروم ہو، وہ کیا کرے کہاں جائے کس سے اپنے دل کی لگی بیان کرے، حضرت والا برگزیدہ گان حق میں ہیں، کچھ نہیں تو دو سال پہلے تک جن چیزوں کی اجازت تھی ان کی اجازت بارگاہ صمدیت سے اس فقیر کے لئے مانگ لی جائے۔ الخ

حضرت نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ:

آپ کی علالت سے بہت رنج ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے توجہ دلی کے ساتھ دعاؤں

میں مشغول ہوں اللہ تعالیٰ آپ کو جلد صحت عطا فرمائے اور آپ کی جملہ تمناؤں کو پوری فرمائیں۔

سننے کی چیز اس کے بعد کا مکتوب ہے جو مولانا گیلانی کی طرف سے صادر ہوا لکھتے ہیں کہ:

حضرت والا کی دعاؤں اور توجہ کی برکات عیاناً محسوس کر رہا ہوں۔ ڈیڑھ دو سال سے فریش فرش علالت ہوں، علاج کی عام تدبیری طریقوں کا تجربہ بھی بتا رہا تھا کہ مرض اپنا لا علاج ہو چکا ہے لیکن ادھر ہفتہ عشرہ سے بحمد اللہ غیر معمولی انقلاب اپنی علالت کے سلسلے میں پا رہا ہوں کوئی وجہ وجیہ اسکے سوا نظر نہیں آتی کہ سننے والے نے اپنے مخلص وصدیق بندے کی دعائیں سن لی ہیں، یہ عریضہ خدمت والا میں اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ دعاء اور توجہ کے اس سلسلہ کو باقی رکھا جائے۔

دوسرے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

الحمد للہ کہ آپ کی دعاء وہمت کے آثار کا تسلسل جاری ہے پہلے کے حساب سے بہت کچھ طبیعت رو بہ اصلاح ہے۔

ایک اور عریضہ میں تحریر فرمایا کہ:

ارحم الراحمین کی رحمت واسعہ کے ظہور کی ایک عجیب اور غریب شکل یہ بھی ہے کہ بیمار سے زیادہ اس کی فکر ان بزرگوں کے قلوب میں ڈالی گئی ہے جن کے چھوٹوں میں بھی وہ شمار ہونے کا مستحق نہیں ہے حضرت والا کا کرم نامہ جب کبھی ملتا ہے تو دل کی مرجھائی ہوئی کلی کھل جاتی ہے، دوا کی تاثیر میں خواہ جتنی بھی تاخیر ہو دعا کی استجابت کا تجربہ مسلسل ہو رہا ہے جب حضرت والا کی توجہ خاص

ہوتی ہے قلب بھی اس کو محسوس کرتا ہے اور قالب پر بھی اسکے اثر کو پاتا ہوں۔

مکتوبات کے اقتباسات کا سلسلہ قدرے طویل ہو گیا مگر یہ شہادت اس درجہ وقیع ہے کہ اس سے زیادہ اختصار پر طبیعت آمادہ نہیں ہوئی۔

اسی سلسلے کا ایک اور حیرت انگیز واقعہ سنتے چلئے، راوی مولانا حکیم بشیر الدین صاحب کوپا گنج والے ہیں، انھوں نے راقم الحروف سے براہ راست یہ واقعہ نقل کیا ہے ان کا بیان ہے کہ میرا چھوٹا بچہ حفیظ الرحمٰن جب اس کی عمر تقریباً تین برس کی تھی، جاڑے کا موسم تھا، میں فتح پور خانقاہ میں حاضر تھا یہاں گھر میں کوئی عورت لحاف میں ٹانکے لگا رہی تھی اور دو تین بڑی بڑی سوئیاں پاس میں رکھے ہوئی تھیں بچہ کھیلتا ہوا قریب آیا اور ایک سوئی منھ میں رکھ کر نگل گیا اس کی بہن ہائیں ہائیں کرتی رہ گئی اتنی دیر میں سوئی حلق کے نیچے اتر گئی گھر میں پریشانی شروع ہو گئی لیکن بچے کو ابھی کسی تکلیف کا احساس نہیں ہوا فوراً ایک آدمی فتح پور دوڑا گیا حکیم صاحب شام تک گھر آ گئے ابھی تک بچہ کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی رات ہونے کو آئی تو تکلیف کا احساس ہوا بچہ ایک پہلو پر اکڑ گیا کسی دوسری جانب حرکت دینے سے بے اختیارانہ چیخ اس کے منھ سے نکل پڑتی تھی حکیم صاحب کہتے ہیں کہ رات بھر میں اور اس کی والدہ باری باری اسی پہلو پر اسے گود میں لئے رہے۔ طبیعت مضطرب تھی کہ کیا کیا جائے، تکلیف حد سے بڑھتی جارہی تھی، حکیم صاحب نے صبح فتح پور حضرت کے پاس بوتل میں پانی دے کر آدمی بھیجا کہ حضرت سے اس پر دم کرا لاؤ، نیز حضرت سے عرض کرو کہ آپریشن کے بغیر معاملہ بنتا ہوا نظر نہیں آتا پٹنہ یا لکھنؤ بچہ کو لے کر جانے کا خیال ہے آپریشن سے سوئی نکلوائی جائے گی حضرت نے پانی پر دم کر دیا اور فرمایا کہ اسے پلاؤ اور میں دعا کرتا ہوں، بچہ کو کہیں لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ حکیم صاحب فرماتے ہیں

کہ حضرت کے معمول کے خلاف یہ بات تھی، ظاہری علاج ومعالجے کی ضرورت پر ہمیشہ ترغیب دیتے تھے کبھی روکتے نہ تھے، اب جو روکا ہے تو کوئی خاص بات ہے چنانچہ حکیم صاحب نے اپنا ارادہ بدل دیا دن بھر وہ پانی پلاتے رہے تکلیف اسی حال میں باقی رہی رات آئی تو پھر وہی منظر تھا۔ باری باری ایک پہلو میں گود میں لئے رہتے، تقریباً آدھی رات گزری تھی کہ حکیم صاحب کو محسوس ہوا کہ بچے کو نیند آگئی ہے حکیم صاحب نے رضائی لپیٹ کر اسے مسند کی طرح بنالیا اور اس پر بچے کو اسی کروٹ پر لٹادیا جس پہلو پر اسے کچھ سکون رہتا تھا بچہ آرام سے سوگیا، رات بھر سوتا رہا صبح اسے بھوک لگی دو دن سے کوئی چیز منہ میں نہیں گئی تھی۔ حکیم صاحب نے گرم گرم دودھ پلادیا دودھ کا پینا تھا کہ پاخانہ کی حاجت محسوس ہوئی لیکن پھر ڈرتا بھی رہا کہ تکلیف ہوگی، تھوڑی دیر کے بعد جب پاخانہ کا تقاضہ زیادہ ہوا تو حکیم صاحب نے گھر کے آنگن ہی میں اسے بیٹھا دیا، بیٹھنا تھا کہ پہلے وہی سوئی باہر نکل آئی گھر والوں کی مسرت کی انتہا نہ رہی حکیم صاحب نے سوئی دھوکر ساتھ لی اور فتح پور حاضر ہوگئے اور حضرت کو دکھایا، حضرت کو تعجب ہوا کہ اتنی بڑی سوئی صحیح سالم باہر نکل آئی اور شکم میں کوئی زخم نہیں پیدا کیا، عصر کی نماز کے بعد تنہائی میں حضرت نے فرمایا کہ جانتے ہو میں نے کیا دعا کی تھی، عرض کیا کہ حضرت فرمائیں فرمایا میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ:

> ''یا اللہ چھوٹا بچہ ہے سوئی نگل گیا ہے، ڈاکٹر ایک جگہ کاٹینگے وہاں نہ ملے گی دوسری جگہ پھاڑیں گے اس طرح بچہ کا تو قیمہ بن جائیگا آپ کی قدرت بہت بڑی ہے آپ اگر چاہیں تو بغیر کسی زحمت کے سوئی باہر نکل جائے گی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی''

حضرت کے بسلسلہ تدریس قیام کانپور کا ایک واقعہ حاجی سلام الدین

صاحب بیان کرتے تھے کہ کانپور میں فساد ہوگیا تھا کرفیو لگ گیا لوٹ مار شروع ہوگئی، مخالفین نے آگ لگا دی ہم لوگوں کے مکان کے قریب سب لوگ بے حد پریشان ہوئے، حضرت سے آکر عرض کیا حضرت نے کچھ پڑھ کر ہر چہار طرف دم کرنا شروع کیا اور فرمایا کہ گھبراؤ نہیں ادھر آگ کا اثر نہ ہوگا، چنانچہ واقعی دیکھا گیا کہ آس پاس شعلے اٹھ رہے تھے اور ہمارا خطہ مامون ومحفوظ رہا۔ (حالات ج ۱ ص ۱۶۸)

مولانا محمد نعمان صاحب معروفی راوی ہیں کہ پورہ معروف میں ایک عورت کو بہت شدید دورہ پڑتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب ختم تب ختم اس کے شوہر سے ایک صاحب نے جو حضرت کے عاشق زار تھے کہا کہ مولانا کے یہاں جا کے دعا وغیرہ کرالے تو بہت دن سے پریشان ہے چنانچہ وہ فتح پور حاضر ہوا اور عرض کیا کہ دعا کیلئے حاضر ہوا ہوں حضرت نے پانی پڑھ کر دیا اور دعا فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ وہ اس مرض میں انشاء اللہ مرے گی نہیں چنانچہ پھر اس پر وہ دورہ نہیں پڑا۔ (ایضاً)

مولانا محمد نعمان صاحب ہی ایک اور حکایت سناتے ہیں کہ ایک مرتبہ ان کے دادا مرحوم کو...... جو حضرت کے شیدائیوں میں سے تھے۔ پتھری کی تکلیف ہوگئی اور اکثر درد گردہ ہوتا تھا دوا علاج سے کوئی خاص نفع نہیں ہوا تو ایک دن حضرت کی خدمت میں عرض کیا، حضرت نے سر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ جاؤ ان شاء اللہ ٹھیک ہو جاؤ گے اور یہ بھی فرمایا کہ یار محمد دعا تو وہی ہے جو دل سے نکلتی ہے ویسے تو دعا کرتا ہی رہتا ہوں، چنانچہ تہجد کے وقت دادا مرحوم اٹھے اور استنجاء کے لئے بیٹھے تو پیشاب کے ساتھ ہی وہ پتھری نکل گئی ہے اور پھر کبھی درد نہیں ہوا (حالات ج ۱ ص ۱۷۲)

اب تک جو واقعات آپ کے سامنے لائے گئے ہیں ان میں استجابت دعا کی شان واضح نظر آتی ہے اب کچھ ایسی چیزیں بھی سنتے چلئے جن کی حقیقت تو اللہ ہی کو

بہتر معلوم ہے مگر ان میں کرامت اور تصرف کی شان پوری طرح جلوہ گر ہے۔

چودھری حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم جو اپنی عرفیت حبن بھائی سے مشہور تھے، الہ آباد سے تین میل کے فاصلے پر ایک بستی بمرولی نامی ہے، وہیں کے رہنے والے تھے حضرت کے بڑے عاشق اور مخلص خادم تھے کبھی کبھی حضرت بمرولی ان کے یہاں تشریف لے جاتے اور کئی کئی روز قیام فرماتے۔ایک بار کا واقعہ بیان کرتے ہیں، یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ حضرت والا نے الہ آباد میں اپنا ذاتی مکان نہیں خریدا تھا حسن منزل میں آپ کا قیام تھا ایک شخص کی کسی بے عنوانی پر حضرت کو کبیدگی ہوئی اور آپ بمرولی تشریف لے گئے ایک بجے رات کو حضرت نے حبن بھائی کو بلایا اور فرمایا کہ میرا یہ خط لیکر اسی وقت شہر چلے جاؤ اور فلاں صاحب کو دیکر فوراً جواب لیکر آؤ حضرت نے استفسار فرمایا کہ اسی وقت جا سکتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا کہ ضرور، حضرت نے ایک اور صاحب سے بھی فرمایا کہ تم بھی ساتھ میں چلے جاؤ، گاؤں سے باہر نکل کر ان صاحب سے حبن بھائی نے کہا کہ آپ کہاں تکلیف کریں گے آپ یہیں رہئے میں اکیلا چلا جاؤں گا، باہر سڑک پر آئے ایک بجے کا عالم ہر طرف سناٹا چھایا تھا، شہر جانے کے لئے اس گئی رات میں سواری کا تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا، پیدل ہی چل کھڑے ہوئے ابھی چند قدم چلے تھے کہ نصرت غیبی آپہونچی، پیچھے سے ایک جیپ کی آواز سنی جیپ ان کے پاس آکر ٹھہر گئی، اس میں ایک فوجی افسر بیٹھا ہوا تھا اس نے ان سے پوچھا کہ مولانا کہاں جارہے ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ شہر جارہا ہوں اس نے انھیں گاڑی پر باصرار بیٹھالیا حبن بھائی اسے پہچانتے نہیں تھے شہر پہونچ کر خلد آباد تھانہ کے قریب حبن بھائی نے اترنا چاہا، اس نے کہا آپ کو الہ آباد میں کس جگہ پہونچنا ہے، چودھری صاحب نے حسن منزل بتایا اس نے کہا چلئے میں آپ کو وہیں چھوڑوں گا

چنانچہ اس نے ان کو بالکل دروازہ پر لاکر اتار دیا، جن صاحب کو خط دینا تھا انھیں خط دیکر زبانی جواب حاصل کر کے فوراً پلٹے اب سوچ رہے تھے کہ یہاں سے کوئی سواری ملنی مشکل ہے پیدل ہی لوٹنا ہوگا یہی سوچتے ہوئے بازار نخاس کہنہ تک پہونچے وہاں دیکھتے ہیں کہ ایک تانگہ والا یکہ وتنہا بازار میں آواز لگائے جارہا ہے بمرولی، بمرولی، انھیں بڑی حیرت ہوئی اس وقت اور بمرولی کی سواری موجود، تانگہ پر بیٹھ گئے اور اس نے ہوا کی رفتار سے انھیں بمرولی پہونچا دیا، انھوں نے کرایہ دینا چاہا اس نے انکار کر دیا کہنے لگا مجھے تو یہاں تک آنا ہی تھا میں سوچ رہا تھا کہ کوئی شخص مل جائے تو لیتا جاؤں، آپ مل گئے کرایہ کی کوئی ضرورت نہیں یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا، یہ سارا کام ایک گھنٹہ میں ہو گیا۔

چودھری حبن صاحب ہی ایک اور واقعہ بیان کر رہے تھے کہ ایک بار حضرت ٹہلنے کے لئے کمپنی باغ تشریف لے گئے، چودھری صاحب اور ایک صاحب اور حضرت کے ساتھ تھے۔ عصر کی نماز کمپنی باغ کی مسجد میں پڑھی نماز کے بعد حضرت نے فرمایا کہ چودھری صاحب کچھ بھوک محسوس ہو رہی ہے، چودھری صاحب بھاگ کر فوراً کسی دکان میں پہونچے، وہاں سے کھانے کی کوئی چیز پھل وغیرہ خرید کر لائے، مسجد کے قریب پہونچے تو ایک لنگور نے راستہ روک لیا، وہ بار بار جھپٹ رہا تھا چودھری صاحب جتنا اس کو دفع کرنے کی کوشش کرتے وہ اور لپکتا، کسی طرح مسجد میں جانے کی گنجائش ہی نہیں مل رہی تھی، حضرت کی نگاہ یکایک جو اس منظر پر پڑی حضرت نے بڑی آہستگی سے جوتا اٹھا کر بندر کو دکھایا، وہ حضرت کے ہاتھ میں جوتا دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہوا اور پھر پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

مولانا عبدالرحمٰن صاحب جامی بیان کرتے ہیں کہ حضرت والا کا قیام جب فتح پور میں تھا تو مجلس بعد نماز ظہر ہوتی تھی، اطراف کے لوگ مجلس میں آیا کرتے تھے،

مئو سے قاری ریاست علی صاحب مرحوم اوران کے رفقاء بھی ساتھ ہوا کرتے تھے مجلس کے بعد عصر کی نماز پڑھ کر یہ لوگ فورا لپکے ہوئے تیزی سے کوپا گنج کی جانب روانہ ہوجاتے، وہاں سے فورا مئو کے لئے ٹرین مل جاتی تھی اور یہ حضرات مغرب بعد مئو پہونچ جاتے اس وقت کوپا سے مئو تک سواریوں کی سہولت نہ تھی ٹرین نہ ملنے کی صورت میں آدمی کو یکہ کی سواری اختیار کرنی پڑتی جو تکلیف دہ بھی ہوتی تھی اور وقت بھی اس میں بہت لگتا ایک دن عصر کی نماز پڑھ کر حضرت والا نے قاری ریاست علی صاحب کا ہاتھ پکڑا اور گفتگو کرتے ہوئے اپنے کمرے میں لے گئے اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے قاری صاحب کے رفقاء گھبرا رہے تھے کہ ٹرین نہیں ملے گی اور رات ہوجانے پر کوپا سے مئو تک کے لئے یکے بھی نہ مل سکیں گے، بہت پریشانی ہوگی اور حضرت کو کوئی ضروری بات کرنی تھی وقت گزرتا جارہا تھا یہ یقین ہوگیا کہ اب تو گاڑی ملنے کا کوئی سوال ہی نہیں خاص طریقے پر کوئی یکہ وغیرہ طے کرنا پڑے گا اس شش وپنج میں آدھ گھنٹہ سے زیادہ گزر گیا، پھر حضرت والا قاری صاحب کو لئے ہوئے نیچے آئے اور شبلی موذن سے...... جو قاری صاحب کے رفقاء میں تھے...... فرمایا کہ قاری صاحب کولیکر جاؤ اور تیز تیز جاؤ ورنہ گاڑی چھوٹ جائیگی، انھوں نے اپنے دل میں کہا کہ گاڑی تو چھوٹ چکی تاہم حضرت کا ارشاد تھا بہت تیزی سے لپکے ہوئے کوپا گنج پہونچے تو معلوم ہوا کہ گاڑی اب سے کوئی آدھ گھنٹہ پہلے اپنے وقت پر پلیٹ فارم سے چھوٹ چکی ہے، لیکن چند ہی قدم چل کر رک گئی اور ابھی تک رکی ہوئی ہے یہ لوگ جلدی جلدی ٹکٹ لے کر اس پر سوار ہوگئے، سوار ہونا تھا کہ ٹرین چل پڑی۔

حضرت والا کے چھوٹے داماد جناب مولانا ارشاد احمد صاحب کی روایت ہے کہ جن دنوں حضرت کو نکسیر کی شکایت تھی الہ آباد ہی میں قیام پذیر تھے، حکیم مسعود

صاحب اجمیری مرحوم اور دوسرے اطباء کا علاج چل رہا تھا صورت حال یہ تھی کہ ہر تھوڑی دیر کے بعد نکسیر کا دورہ ہوتا اور بہت زیادہ خون ناک کی راہ سے نکل جاتا، اطباء عاجز تھے حضرت کو گفتگو اور ہر طرح کی حرکت سے منع کردیا گیا تھا۔ اسی دوران کبھی کبھی وقفہ طویل ہوتا تو حضرت والا ضروری باتیں فرمادیتے کبھی مواخذہ اور عتاب کا سلسلہ بھی چل پڑتا۔ ایک دن حکیم اجمیری مرحوم صاحب نے حضرت سے عرض کیا کہ جب تک صحت نہ ہوجائے تعلیمی واصلاحی مواخذوں سے بھی پرہیز فرمایا جائے ورنہ خون کا آنا بند نہ ہوگا انھوں نے کہنے کا انداز ایسا اختیار کیا تھا جو حضرت کو پسند خاطر نہ ہوا، حضرت نے فرمایا کہ اچھا اگر میں یہ سلسلہ جاری رکھوں اور خون نہ آئے تو؟ انھوں نے عرض کیا کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا، حرکت ہوگی تو خون آئے گا۔ انھوں نے سوال وجواب کی صورت اختیار کرلی حضرت نے فرمایا کہ اچھا دیکھئے کیسے خون آتا ہے، حکیم صاحب تو وہاں سے چلے گئے اور ادھر خون کا آنا بالکل بند ہوگیا، اور پھر نکسیر نام کو بھی نہیں ٹوٹی دوسرے دن حکیم صاحب نے دستہ بستہ معافی چاہی اور عرض کیا کہ میں اولیاء کی کرامت کا منکر نہیں ہوں، میری گفتگو تو طبی اصول کی بنیاد پر تھی یہ تو آپ کی کھلی ہوئی کرامت ہے۔

ایسے ہی حضرت کے قیام فتح پور کے ابتدائی دور کا واقعہ ہے کہ حضرت کے خادموں میں سے ایک صاحب جوراجگیری کا کام کیا کرتے تھے ایک بار ایک دیوار پر سے نیچے گر پڑے اور پنڈلی کی ہڈی پھٹ گئی، تکلیف حد سے زیادہ تھی لوگ دوڑے ہوئے حضرت کے پاس لائے آپ نے جہاں درد تھا وہاں ہاتھ پھیر کر کچھ دم کیا اور فوراً مئو لے جانے کا حکم دیا، حکیم سعید مرحوم ہڈیوں کے مشہور معالج تھے انھیں دکھایا گیا، انھوں نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا کہ ہڈی بالکل صحیح وسالم ہے کہیں سے بھی

ٹوٹی پھٹی نہیں ہے ادھران کا درد بھی کم ہوگیا تھا تاہم لوگوں کو یقین نہیں آیا، ایکسرے کرانے پر معلوم ہوا کہ ہڈی پھٹی یقیناً تھی، چنانچہ ہڈی پر اس کی علامت موجود ہے مگراب بالکل صحیح وسالم ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ایک صاحب سنا رہے تھے، غالباً بمبئی کا ذکر ہے کہ ایک لڑکے کے شکم میں اندر ایک خطرناک پھوڑا ہوگیا، ڈاکٹروں نے آپریشن تجویز کیا، اورلڑکا ہسپتال میں داخل ہوگیا آپریشن کی مقررہ تاریخ سے ایک روز پہلے لڑکے کے والد حضرت والا کی خدمت میں دعاء کے لئے حاضر ہوئے اور ایک گلاس میں پانی پیش کیا کہ حضرت دم کردیں تاکہ بچے کو پلا دیا جائے، حضرت نے دم کردیا وہ پانی بچے کو پلا دیا گیا دوسرے دن آپریشن سے پہلے ایکسرے لیا گیا ایکسرے میں پھوڑا غائب! ڈاکٹروں کو حیرت ہوئی، دوبارہ ایکسرے ہوا لیکن پھوڑے کا نام ونشان نہیں، ہسپتال کے سبھی ڈاکٹر جمع ہوگئے سب حیرت زدہ رہ گئے کہ کل تک شکم میں ایسا پھوڑا تھا کہ بغیر آپریشن کے اس کے تحلیل ہونے کا تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا آج وہ کہاں غائب ہوگیا، بچے کے والد سے پوچھا کہ کل سے آج تک تم نے بچے کو کوئی دوا ہم لوگوں کے لاعلمی میں کھلائی ہے اس نے انکار کیا پھر جب اس کے سامنے صورت حال آئی تو اس نے بتایا کہ دوا تو نہیں البتہ ایک بزرگ سے پانی پڑھوا کر پلایا تھا، ڈاکٹروں نے کہا بس یہی بات ہے پھر غالباً وہ ڈاکٹر صاحبان حضرت والا کی قیام گاہ پر آپ کی زیارت کے لئے حاضر بھی ہوئے۔

ہمارے ایک دوست ضلع بھاگلپور بہار کے رہنے والے اپنا ایک واقعہ بیان کررہے تھے کہ جب وہ دارالعلوم مئو میں طالب علم تھے اس وقت حضرت والا الہ آباد میں تشریف فرما تھے، گھر سے خط آیا کہ ان کی بھابی کے سر میں شدید درد ہفتوں سے

ہے چھوٹے بڑے تمام ڈاکٹر اور طبیب عاجز آچکے ہیں کسی طرح کم نہیں ہوتا، خط میں تھا کہ تم فوراً الہ آباد حضرت کی خدمت میں چلے جاؤ اور حضرت سے دعا کراؤ وہ فوراً الہ آباد کے لئے چل پڑے، طبیعت میں آزادی اور بے باکی بہت تھی بغیر ٹکٹ ہی ٹرین پر سوار ہوگئے صبح سویرے الہ آباد پہونچے ان کا بیان ہے کہ جب میں حضرت کے در اقدس پر پہونچا تو مجلس ہورہی تھی میں بھی چپکے سے ایک گوشہ میں جا بیٹھا، میرے بیٹھتے ہی حضرت فرمانے لگے کہ لوگ مدرسوں میں پڑھتے ہیں اور بزرگوں کی مجلس میں بھی جاتے ہیں، لیکن معاملات سے لاپروائی کا یہ حال ہے کہ بغیر ٹکٹ ریل پر سوار ہوجاتے ہیں، پھر اسی موضوع پر دیر تک سلسلۂ بیان جاری رہا مولوی صاحب کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں ۔آخر انھیں کس نے بتادیا؟ بہر کیف جب مجلس ختم ہوگئی تو انھیں خیال ستانے لگا کہ اب حضرت کے روبرو جاؤں تو کیونکر جاؤں، تاہم جانا ضروری تھا ،جی کڑا کر کے خدمت میں حاضر ہوا، حضرت بہت عنایت وشفقت سے میری جانب متوجہ ہوئے میں نے عرض مدعا کیا حضرت نے فوراً دعا کی اور جب میں رخصت ہونے لگا تو نہایت آہستگی سے دس روپیہ کا نوٹ نکال کر مجھے دیدیا اور فرمانے لگے کہ ٹکٹ لے لینا میں نہایت شرمندہ ہوا اور حضرت کا مبارک عطیہ لے کر فوراً باہر آگیا میرے پاس پہلے سے رقم موجود تھی اب جو حضرت کی عطا فرمودہ رقم بھی مل گئی تو گھر تک جانے کا کرایہ مہیا ہوگیا۔ میں براہ راست گھر چلا گیا وہاں پہونچا تو بھابی ٹھیک ہو چکی تھیں میں نے دریافت کیا کہ درد کب سے موقوف ہے انھوں نے ٹھیک وہی وقت بتایا جس وقت حضرت دعا فرما رہے تھے۔

ہمارے دوست جناب حافظ قاری شبیر احمد صاحب دربھنگوی راوی ہیں کہ دربھنگہ ہی کے ایک صاحب عبدالمنان نامی بہت ذہین اور ذکی شخص تھے، مشکوٰۃ تک

عربی پڑھ کر انگریزیت کا رخ اختیار کرلیا تھا اس ماحول میں بدلے اور ایسا بدلے کہ الحاد کے جہنم میں جا گرے، خدا کا انکار، رسالت کا انکار، اسی حالت میں عمر کا ایک بڑا حصہ گزر گیا بمبئی میں رہتے تھے بہت خوشحال تھے بیٹے دوسرے ممالک میں ملازمت کرتے تھے دولت کی کمی نہ تھی جن دنوں حضرت بمبئی میں مقیم تھے ان کا ایک نواسہ سخت بیمار تھا۔دوا علاج سے عاجز آچکے تھے کسی نے مشورہ دیا کہ مولانا مستجاب الدعوات ہیں ان سے دعا کراؤ، وہ خدا ہی کے قائل نہ تھے، دعا کے کیا قائل ہوتے انکار کر دیا، مگر مجبوری سب کچھ کراتی ہے مجبوراً دعا کیلئے حاضر خدمت ہوئے حضرت کی خدمت میں پہونچے تو حضرت کمرے میں تنہا ٹہل رہے تھے انھیں دیکھتے ہی جھپٹے اور فرمایا کہ میں دیر سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں آیئے، حضرت نے معانقہ فرمایا اور ایک بار نہیں پانچ بار معانقہ فرمایا، حضرت کے ہر معانقہ پر ان کی کیفیت بدلتی جارہی تھی آخری معانقہ کے بعد حضرت والا نے ان کا ہاتھ جو پکڑا ہے تو وہ دھاڑیں مار کر رونے لگے اور دل میں دین حق کے خلاف جتنی ظلمتیں تھیں یکا یک سب دور ہوگئیں اور خدا کا نور سینے میں بھر گیا، کہنے لگے حضرت اب یہ ہاتھ نہیں چھوڑ سکتا اس کے بعد ان کی زندگی قابل رشک حد تک پاکیزہ ہوگئی تھی۔حافظ شبیر احمد صاحب کا بیان ہے کہ میں ان سے ملا ہوں اکثر وہ اپنے حجرے میں رویا کرتے تھے انھیں نے یہ واقعہ حافظ صاحب کو سنایا تھا سناتے وقت بھی ان کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں اب ان کا انتقال ہوگیا، **رحمه الله رحمة واسعة .**

کہاں تک بیان کیجئے، ایک دو واقعہ ہو تو بیان بھی کیا جاسکے یہاں تو سلسلہ دراز ہے ماسٹر محمد ابراہیم صاحب الہ آبادی بیان فرماتے ہیں کہ ہم چند لوگ الہ آباد سے حضرت کی خدمت میں فتح پور حاضری کے ارادے سے چلے مئو پہونچ کر بھوک لگی،

تازہ تازہ مچھلیاں بک رہی تھیں میں نے کہا کہ ایک مچھلی خرید لی جائے اور کسی درخت کے سائے میں بھون کر اسے کھالیں مجھے مچھلی بہت پسند تھی بے تکلف دوستوں کی جماعت تھی انھیں بھوننے پکانے میں تکلف ہوا میری بات کو ہنسی میں ٹال دیا کچھ اور چیزیں کھا کھلا کر ہم لوگ فتح پور حاضر ہوئے ہم لوگ چار آدمی تھے حضرت سے باتیں ہوتی رہیں یہاں تک کہ کھانے کا وقت ہوگیا، حضرت نے حکم دیا کہ یہیں کھانا کھالو۔ ہم لوگ بیٹھے رہے حضرت خود تشریف لے گئے اور پانچ پلیٹوں میں بھنی ہوئی مچھلی لے کر آئے ہم نے کچھ خیال نہیں کیا حضرت نے ہم چاروں کے آگے ایک ایک پلیٹ کردی اور آخر میں پانچویں پلیٹ میرے سامنے رکھ کر فرمایا کہ آپ کو مچھلی بہت پسند ہے اس لئے آپ کے لئے دو پلیٹ لایا ہوں اب ہمیں سمجھ میں آیا کہ راستے والا معاملہ شاید یہاں کشف کے آئینہ میں دیکھا جاچکا ہے۔

حضرت کے پاس حاضر ہونے والوں کی متواتر شہادت ہے کہ مکشوفات وکرامات کا ظہور حضرت کے یہاں اس درجہ ہوتا تھا کہ وہ روزمرہ کی چیزوں میں داخل ہوچکی تھیں ۔حضرت کے یہاں اخفاء کا بھی بہت اہتمام تھا مریض دعا کے لئے حاضر ہوتے تو حضرت کسی حکیم کی طرف رجوع فرمادیتے اور دعاء کا وعدہ کرلیتے ۔مریض کا کام تو حضرت کی دعاء سے ہوتا اور نام حکیم کا ہوجاتا۔

حضرت کی تعلیمات میں اصل زور اتباع سنت پر تھا اور اس کے اہتمام میں اپنے لوگوں کو اتنا فکر مند بنادیتے کہ کسی جانب توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ رہ جاتی تاہم حضرت کے لوگوں میں سے کسی کے سامنے حضرت کا ذکر چھیڑ دیجئے، وہ اپنے مشاہدات کی روشنی میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور بتاجائے گا جس کا تعلق کشف، کرامت، تصرف یا استجابت دعا سے ہوگا، یہی وہ ادائیں تھیں جن کی وجہ سے ہر شخص

آپ کا والہ وشیدا تھا اور سچ پوچھئے تو حضرت والا کی سب سے بڑی کرامت یہ تھی کہ جس جگہ پہونچے قلوب کی کایا پلٹ گئی، ماحول میں انقلاب آ گیا، یا تو مسجدیں ویران تھیں یا یکایک آباد ہونے لگیں، مردہ قلوب میں دین وایمان کی نئی زندگی دوڑ گئی۔ الہ آباد میں تو دین کا وہ زور وشور ہوا کہ آج تک لوگ مزے لے کر اس وقت کو یاد کرتے ہیں بمبئی جیسا کاروباری اور مصروف ومنہمک شہر جس کے انہماک میں کوئی بڑی سے بڑی تحریک اثر انداز نہیں ہوسکتی تھی حضرت والا کی اصلاحی سرگرمیوں نے دیکھتے ہی دیکھتے اس میں ایک عظیم ہلچل ڈال دی اور دنیا پرستی کے اس بڑے سمندر سے ایمان ویقین کے بیش قیمت موتی ابھر ابھر کر ظاہر ہونے لگے۔اہل بمبئی کی اصلاح اس بڑے پیمانے پر کسی سے نہ ہوسکی، یہ کرامت درحقیقت سب کراموں سے بڑھ کر ہے۔اللہ تعالیٰ حضرت کو اعلی علیین میں خوش وخرم رکھے۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب ٦

طریقۂ تربیت واصلاح

گزشتہ اوراق میں حضرت کے اندازِ تربیت اور طریقۂ اصلاح کے بہت سے نمونے جا بجا بیان کئے جا چکے ہیں اندازہ کرنے والوں نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ حضرت کا اس باب میں اصل ذوق کیا تھا تاہم اس کا یہاں مستقلاً بیان کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے، اس سے ایک نظر میں حضرت کا پورا طریقہ سامنے آجائے گا، یہی طریقۂ کار اب بھی آپ کے متوسلین بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے دستورالعمل ہے۔

حضرت کا طریقہ سمجھنے کے لئے ایک طالب کا خط اور حضرت والا کا اس پر جواب نقل کرتے ہیں اس میں اجمالاً حضرت کی تعلیمات کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے، لکھتے ہیں کہ:

> تقریباً دو دن حاضر خدمت رہا، بحمد اللہ پاس انفاس جاری رہا اور برابر رہا، ذکر قلبی بھی اثر کرتا رہا، موقع حاصل کرتا رہا کہ آپ کی دعائیں اور توجہ حاصل کروں مگر محروم رہا ذکر میں لذت ملتی ہے مگر دوام نہیں رہتا آپ کی خدمت میں چندروزہ کر ذکر و مذکور کی لذت حاصل کرنے کو چاہتا ہے۔

اس کے جواب میں حضرت اقدس نے یہ تحریر فرمایا کہ:

> آپ پہلے تو میرے رسالے دیکھئے جس سے آپ کو اندازہ ہوجائیگا کہ مجھ سے اور میرے طریق سے آپ کو مناسبت بھی ہے یا نہیں کیونکہ کسی شیخ کے پاس نفع باطنی کے لئے پہلے اس چیز کا دیکھنا ضروری ہے اور یہ اس لئے کہ ہر شیخ کا

طرز تعلیم اور طریقہ اصلاح جدا ہوتا ہے، چنانچہ دیکھتا اور سنتا ہوں کہ لوگوں کی زبانوں پر مراقبہ، مشاہدہ، پاس انفاس وغیرہ یہ سب چیزیں بہت ہیں اور میری مجلس میں آپ کو ان کا ذکر نہیں ملے گا بلکہ ازالۂ نفاق، تحصیل اخلاق اور اتباع سنت وغیرہ یہ سب باتیں آپ یہاں سنئے گا اسلئے کسی کی صحبت سے قبل ہی مناسبت کا معلوم کر لینا ضروری ہے امید ہے کہ آں عزیز میرا مطلب سمجھ گئے ہونگے (رجسٹر خطوط ۱۹، ص ۳۶۳)

اس مختصر تحریر سے حضرت کے طریقۂ کار پر روشنی پڑتی ہے حضرت والا کے یہاں صوفیہ کی مروجہ اصطلاحات کا ذکر نہیں تھا، ٹھیٹ دینی اور شرعی اصطلاحیں ملتی ہیں۔ اصل زور ذکر الٰہی، تلاوت قرآن، اتباع سنت، تزکیہ نفس، اصلاح اخلاق، تحصیل اخلاق اور ازالۂ نفاق پر تھا انھیں چیزوں پر آپ کامیابی اور تقرب خداوندی کا مدار سمجھتے تھے آپ کے انداز تربیت کا محور یہی چیزیں تھیں ان امور سے غافل ہو کر ہزار کوئی مشاہدہ و مراقبہ رٹتا رہے کامیابی کا دروازہ اس پر بند رہتا ہے اس بات کو اور مختصر انداز میں حضرت نے ایک جگہ یوں تحریر فرمایا۔ لکھتے ہیں کہ:

میری طرف رجوع ہونے کے لئے یہ شرائط ہیں:

(۱) قصد تدین بدین الاسلام (یعنی یہ نیت ہو کہ کامل طور پر دین اسلام اور اس کی تعلیمات میرے اندر رچ بس جائیں)

(۲) خلوص فیما بینہ وبین اللہ تعالیٰ (یعنی سچائی اور اخلاص کے ساتھ طریق میں قدم رکھنا)

(۳) اعتقاد اور اعتماد رہبر تمام امور اصلاحیہ میں (یعنی اصلاح نفس سے متعلق جو باتیں ہوں ان میں اپنے شیخ پر اعتماد ہو اور اس سے کامل اعتقاد ہو)

(۴) رسوم آباء واجداد کا ترک بالکلیہ اور اتباع سنت سنیہ (یعنی اس کی ہمت ہو کہ داخل سلسلہ ہوکر باپ دادا کا خلاف شرع طریقہ بالکلیہ چھوڑ دے گا اور پوری طرح اتباع سنت کرے گا اور سب سے پہلے اپنی اصلاح کی فکر کرے گا)

ان شرطوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مصلح الامت کا پسندیدہ طریقۂ کار وہی تھا جو قرآن وسنت کے عین مطابق ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت کی تصانیف اور مجالس میں تلاوت قرآن، اتباع سنت، مسنون دعاؤں اور ذکر اللہ پر زیادہ زور نظر آتا ہے ان سب امور کو اصلاح نفس کے لئے معین فرمایا کرتے تھے اور نفس کے رذائل کے علم کو فرض عین اور اصلاح نفس کو ضروری قرار دیتے تھے۔ ظاہر وباطن کا تضاد جسے شریعت کی زبان میں نفاق کہتے ہیں آپ کی بصیرت دیکھ رہی تھی کہ اس زمانہ کا سب سے بڑا مرض یہی ہے اس کو دور کرنے اور اخلاص وصداقت حاصل کرنے پر انتہائی شدومد سے زور دیتے تھے اس کو کبھی کبھی ان لفظوں میں فرماتے کہ:

''یہی اخلاص ونفاق کی بحث میری ساری عمر کی کمائی ہے''

اور یوں بھی فرماتے تھے کہ

میں یہ نہیں دیکھتا کہ آپ نے تہجد میں کتنی رکعتیں پڑھیں بلکہ یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ رذائل نفس سے کس قدر نکلے اور لوگ ہیں کہ اپنے فضائل ہی کی اطلاع مجھے دیتے ہیں رذائل کے سلسلے میں ان کا یہ خیال ہے کہ ع

جو الگ باندھ کے رکھا ہے وہ مال اچھا ہے

یعنی نفس کے خبائث، نفاق اور بے اعتقادی ان سب باتوں اور ان حالات کا ذکر نہیں کرتے حالانکہ لوگوں سے یہی حال مجھ کو مطلوب ہے اس لئے کہ مجھ سے تعلق تو آپ کا اصلاحی ہے اور اصلاح ہوتی ہے رذائل کی لہٰذا اس کو بیان

کرنا مفید ہے، باقی آپ کے اندر اگر کچھ فضائل ہیں تو ماشاء اللہ، بارک اللہ بہت اچھی بات ہے ان کو اگر مجھ سے آپ نہ بھی بیان کریں تو آپ کا نقصان ہی کیا ہے، ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اچھے حالات سنوں گا تو خوش ہوں گا اور دعا نکلے گی، مگر یہ ایک ضمنی کام ہے، اصل مقصود تو کچھ اور ہے''

یہ تحریریں حضرت والا کے اندازِ تربیت پر اجمالاً روشنی ڈالنے کے لئے بہت کافی ہیں، تاہم حضرت نے اپنے متوسلین کے لئے ایک مفصل دستور العمل بھی تحریر فرمایا ہے۔ ہم اسے بھی یہاں پیش کر دینا ضروری سمجھتے ہیں، گو کہ وہ ''تالیفات مصلح الامت حصہ سوم'' کا جز بن کر شائع بھی ہو چکا ہے تاہم اس رسالہ کا حق ہے کہ اسے جزوِ سوانح بھی بنایا جائے، اس لئے بتمام وکمال اسے نقل کیا جاتا ہے اس کے بعد مولف کو خامہ فرسائی کی چنداں ضرورت باقی نہ رہے گی، رسالہ کا نام ''وصیۃ السالکین'' ہے وہو ہٰذا

بیعت کا سلسلہ:

اما بعد! میں باجازت بزرگان دین بیعت بھی لیا کرتا ہوں جب کہ طالبین اس کی درخواست کرتے ہیں۔ لہٰذا عرض پرداز ہوں کہ آپ حضرات کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ میں چاروں سلسلوں میں بیعت لیتا ہوں یعنی چشتیہ، نقشبندیہ، قادریہ اور سہروردیہ میں، کیونکہ یہ سب حضرات اہل حق، اکابر اولیاء اللہ صاحب سلسلہ نیز اکابر علماء میں سے ہیں، ان اکابر کی خصوصیات میں سے طریقت اور شریعت کی جامعیت ہے۔ چنانچہ اتباع سنت اور عمل بالشریعہ میں ان حضرات کا قدم راسخ رہا ہے اس لئے حالات زمانہ کو دیکھتے ہوئے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ان بزرگوں کی خصوصیات کو سمجھا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت باطنی کو ان حضرات کے توسل سے حاصل

کیا جائے اور ان کی عقیدت ومحبت کو حرز جاں بنایا جائے اس لئے کہ یہ حضرات مقبولان حق ہیں اور مقبول اسی لئے ہیں کہ انھوں نے اتباع سنت میں خود کو فنا کر دیا تھا لہٰذا ہم کو جب ان سے عقیدت ہے تو ان کے سارے اقوال واعمال اور احوال سے بھی محبت ہونی چاہیے اور ان کے حالات کا سب سے نمایاں حال جو ان حضرات کا طغرائے امتیاز تھا یہی **اعتصام بالسنة** (سنت کو مضبوطی سے تھامنا) اور اتباع شریعت تھا، شیخ عبدالقدوس گنگوہی فرماتے ہیں:

ہر یکے از اولیاء برقدر علو درجۂ خویش در متابعت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم دمے وقدمے دارد کہ یکے بدیگرے نہ رسد وفہم آں اورا نہ بود

یعنی اولیاء اللہ میں سے ہر ایک اپنے اپنے درجہ کے بقدر جو اس کو رسول اللہ ﷺ کی متابعت کے سلسلہ میں حاصل ہے ایک خاص دم اور قدم رکھتا ہے ایسا کہ دوسرے شخص کا وہاں پہونچنا تو الگ رہا وہ اس کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔

اتباع سنت کی وصیت:

چنانچہ میں ان لوگوں کو جنھوں نے مجھ سے بیعت کی ہے خصوصاً اور ہر آمد وشد رکھنے والے کو عموماً یہ وصیت کرتا ہوں کہ ان مشائخ کے طریق کو لازم پکڑیں اور اتباع سنت نیز دیگر اعمال میں ان حضرات کی سیرت کو پیش نظر رکھیں اور جملہ صالحین کے حالات وملفوظات کو عموما اور سلاسل اربعہ کے مشائخ کے ملفوظات کو خصوصا نقل مجلس (مجلس کا مرکزی مضمون) بنائیں تاکہ صحیح علم ہوتا رہے۔ اور ان سب حضرات کی جانب سے ہماری طرف سلسلۂ فیض جاری رہے

میرا شجرہ:

حضرات مشائخ کا دستور ہے کہ وہ اپنے مریدوں کو شجرہ مرحمت فرمایا کرتے

ہیں پس جو لوگ مجھ سے محبت رکھتے ہیں وہ میری اس وصیت کو بمنزلہ شجرہ کے تصور کریں وراس کو (یعنی رسالہ وصیۃ السالکین کو) کبھی کبھی پڑھ لیا کریں تا کہ مشائخ سے عقیدت ومحبت تازہ ہو کر ان سے استجلاب فیض (حصول فیض) کا ذریعہ بنے۔

دستورالعمل:

جو لوگ مجھ سے بیعت ہوتے ہیں اور سلسلہ میں داخل ہوتے ہیں ان کی خواہش ہوتی ہے انھیں دستورالعمل یا نظام کار بتا دیا جائے، تا کہ آئندہ وہ اسی کے مطابق کام کریں تو اس کے لئے یہ سمجھنا چاہئے کہ ہمارے لئے دستورالعمل تو یہی شریعت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ذریعے دنیا میں بھیجا ہے اسی کا اتباع پہلے بھی ضروری تھا اور اب بیعت ہونے کے بعد بھی لازم ہے جب کہ بیعت کی غرض ہی اپنے کو شریعت کے مطابق بنانا ہے شریعت کا اتباع تو ہر مسلمان پر فرض ہے مگر بیعت سے اس کا نیا اہتمام مقصود ہوتا ہے اور یہ سنت سے ثابت ہے۔

بیعت کا حاصل:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ:

سنت اللہ یوں جاری ہے کہ امور مخفیہ جو نفوس میں پوشیدہ ہیں ان کا ضبط افعال اور اقوال ظاہری سے ہو اور افعال واقوال ان امور قلبیہ کے قائم مقام ہوں چنانچہ اللہ، اس کے رسول اور قیامت وغیرہ کی تصدیق امر مخفی ہے تو اقرار ایمان کو تصدیق قلبی کے قائم مقام کیا گیا اور جس طرح سے رضامندی بائع (بیچنے والا) ومشتری (خریدنے والا) کی، قیمت اور مبیع (سامان جو بیچا گیا ہے) کے دینے میں امر مخفی ہے تو ایجاب وقبول کو قائم

مقام رضا مخفی کے کر دیا گیا، **فکذالک التوبة والعزیمة علی ترک المعاصی والتمسک بحبل التقویٰ خفی مضمر فاقیمت البیعة مقامها** یعنی اسی طرح سے توبہ، اور عزم کرنا معاصی کا، اور تقویٰ کی رسی کو مضبوط پکڑنا امر مخفی اور پوشیدہ ہے، تو بیعت کو اس کے قائم مقام کر دیا۔ (شفاء العلیل، ص:۱۶)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیعت کا حاصل اپنے سابقہ گناہوں سے توبہ کرنا اور آئندہ کے لئے ترک معاصی کا عزم کرنا اور تقویٰ کی رسی کو مضبوط پکڑنا ہے۔

بیعت کی ضرورت:

اور اصل تو اس میں یہی ہے کہ انسان خود ہی اپنے کو امر و نہی کرے اور خود ہی نیکیاں کرے اور برائیوں سے بچے، لیکن عادت یوں جاری ہے کہ خود انسان کا نفس اس کے حکم پر نہیں چلتا۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ کسی مرد صالح، عاقل، عالم باعمل کو جو کہ واقف طریق ہو، اپنے اوپر حاکم بنائے، اور خود کو اس کے امر و نہی کے تحت داخل کر لے، اس کو اپنے اوپر مسلط کرے، اور اصلاح کے باب میں اس کی ہدایت کا پابند ہو جائے، چنانچہ اگر اس سے اس کو اعتقاد ہوا، اور اس کی باتوں اور تعلیمات پر اعتماد کیا، اور اپنے حالات کی اس کو اطلاع دیتا رہا، اور اس کی ہدایات اور تعلیمات پر عمل کرتا رہا، تو پھر ان شاء اللہ کامیابی یقینی ہے۔

اصلاح کی ابتداء:

کام کی ابتداء یوں کرے کہ فرض کی ادائیگی کا خاص اہتمام کرے خواہ وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد، اسی اہتمام میں یہ بھی داخل ہے کہ ان دونوں کے فوت

شدہ حقوق کی قضا کرے یعنی بلوغ کے بعد سے لے کر اب تک جو نمازیں (فرض و واجب) قضا ہوگئی ہیں اسی طرح سے جو روزے رہ گئے ہیں ان کو ادا کرے اور حقوق العباد خواہ وہ حق عرضی ہو (یعنی آبرو کا حق) یا مالی، ان کو ادا کرے اور فرائض کے بعد اگر شوق اور موقع ہو تو نوافل کا اہتمام کرے کیونکہ یہ سب اعمال انسانوں ہی کے کرنے کے لئے ہیں فرشتے ان کو کرنے کے لئے نہیں آئیں گے۔

سب سے زیادہ مفید اور بابرکت وظیفہ تلاوت قرآن ہے لیکن شرط یہ ہے کہ یہ تلاوت محض لسانی نہ ہو، قلب کی شرکت کے ساتھ ہو اور قلب کی شرکت سے یہاں مراد فہم معنیٰ (معنی کا سمجھنا) نہیں ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ قلب سے غافل نہ ہو بلکہ تلاوت کے وقت یہ امر مستحضر ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہماری ہی ہدایت کے لئے بھیجا ہے اور یہ کہ بندہ جس وقت تلاوت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی تلاوت کی طرف کان لگاتے ہیں۔

تلاوت کے وقت یا فرصت کے وقت میں ایک منزل مناجات مقبول (۱) کی پڑھی جائے اور اس میں بھی یہ استحضار رکھا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ مقبول دعائیں ہیں۔ جس میں آپ نے دینی اور دنیوی، ظاہری اور باطنی، حالی اور مآلی (یعنی آئندہ اور موجودہ) تمام چیزوں کیلئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی ہے۔ اور ہر قسم کی مضر چیزوں سے استعاذہ (پناہ مانگنا) فرمایا ہے۔ ان دعاؤں کو ذوق کے ساتھ پڑھنے کیلئے میرا مضمون ''وصیۃ السنۃ'' دیکھ لیا جائے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ دعاؤں کا ذوق پیدا ہو جائے گا، اور پھر ان دعاؤں کو انسان ایک خاص کیف اور ذوق کے ساتھ پڑھے گا، جو کہ اس کی اصل روح ہے۔

---

(۱) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کا جمع کیا ہوا قرآنی اور حدیثی دعاؤں کا مجموعہ، جو ہفتہ کے سات دنوں کے حساب سے سات منزلوں پر تقسیم ہے۔

نفل نمازوں میں سے اشراق، چاشت، اوابین وغیرہ سب ہی کی پابندی ہونی چاہیئے۔اس لئے کہ ہر ایک کی خاص برکات اور مخصوص آثار ہیں۔ مالا یدرک کلہ لایترک کلہٗ اگر سب نہیں حاصل کر سکتا تو سب کو چھوڑ بھی نہ دے، نماز تہجد کے متعلق حدیث شریف میں آیا ہے کہ یہ ہر زمانہ میں صالحین کا شعار رہا ہے، اس لئے اس سے محرومی ایک بڑے خیر سے محرومی ہے۔اس کے متعلق میں نے کسی قدر مفصل کلام اپنے ایک مضمون ''تہجد'' میں کیا ہے اگر مل جائے تو اس میں دیکھ لیا جائے۔

قلب کی غفلت کا دور کرنا ضروری ہے۔ بزرگوں کے تجربہ میں اس کے لئے ذکر سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ اس کے لئے تریاق ہے۔ پہلے ذکر مفرد پھر مرکب بھی کراتے ہیں۔ ذکر مفرد کو مبتدی کے لئے زیادہ نافع بتلاتے ہیں اس راہ میں ان کا اتباع ازبس ضروی ہے۔ یہ لوگ اطباءِ قلوب (یعنی دلوں کے حکیم) ہیں۔

مقصود باطن کی درستگی ہے:

رسالہ قشیریہ میں امام ابوالقاسم قشیری فرماتے ہیں۔ مریدین کے آداب میں سے اورادِ ظاہرہ کی کثرت نہیں ہے۔اس لئے کہ قوم صوفیہ صرف تین چیزوں کے درپے ہے۔ خاطر ردیہ (برے خیالات) کو اپنے قلب سے دور کرنا۔ اپنے اخلاق کی اصلاح کرنا۔ اور اپنے قلب سے غفلت کا دور کرنا۔ رہی اعمال خیر کی کثرت تو یہ ان کا وظیفہ نہیں۔ ہاں ان کیلئے جو چیز ضروری ہے وہ فرائض کی ادائیگی اور سنن موکدہ کا ادا کرنا ہے۔ رہیں اور نوافل تو ذکر قلبی پر مداومت ان کے لئے نوافل سے کہیں زیادہ نافع اور مفید ہوگی۔

اسی طرح شیخ العرب والعجم حضرت حاجی صاحب (امداد اللہ صاحب

مہاجر مکی) قدس سرہ فرماتے ہیں:

واوقات خودرا بعد ادائے فرض وواجبات وسنن در شغل باطن گزارد و بزیادتی نوافل نہ پردازد بلکہ مشغولیٔ باطن رافرض داند وگاہے غافل نہ شود۔

(ترجمہ: اور اپنے اوقات کو فرائض دواجبات اور سنن موکدہ کی ادائیگی کے بعد شغل باطن میں گزارے اور نوافل کی زیادتی کی فکر میں نہ پڑے بلکہ مشغولیٔ باطن کو فرض جانے اس سے غافل نہ ہو)

میں کہتا ہوں اسی مشغولیٔ باطن کی (جس کو فرض فرما رہے ہیں) تحصیل کے لئے یہ ذکر مفرد ومرکب ضروری ہے، چنانچہ یہ حضرات اس ذکر کو نوافل وغیرہ سے اس بارہ میں زیادہ نافع سمجھتے ہیں۔

ہر شخص کے حالات کے لحاظ سے اوراد ووظائف:

لہٰذا اپنی دنیوی مشغولیتوں کے باجود کچھ وقت اس کے لئے بھی نکالنا چاہئے۔ اس سلسلے میں لوگوں کی فرصت اور مشاغل کو دیکھتے ہوئے کسی کو دوازدہ (یعنی بارہ) تسبیح بتاتا ہوں اور کسی کو سبحان اللہ والحمدللہ و لا الہ الا اللہ واللہ اکبر۔ دو دو تسبیح صبح وشام بتادیتا ہوں اور کبھی صرف لاالہ الااللہ کی دو یا چار تسبیح تجویز کرتا ہوں۔ اس طرح پر کہ نو یا دس بار لا الہ الااللہ کہنے کے بعد دسویں یا گیارہویں بار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ملا دیا جائے اور مقصد یہ ہے کہ گاہے گاہے پورا کلمہ پڑھ لیا جائے اسی طرح بزرگوں سے منقول چلا آرہا ہے۔

(طریقۂ دوازدہ تسبیح)

اَللّٰھُمَّ طَھِّرْ قَلْبِیْ عَنْ غَیْرِکَ وَنَوِّرْ قَلْبِیْ بِنُوْرِ مَعْرِفَتِکَ.

اس دعاء کو چند بار کہے تا آنکہ قلب ذکر کی طرف متوجہ ہو جائے۔ بعدہٗ استغفار ۱۱ بار، درود شریف ۱۱ بار، لاالٰہ الا اللہ دوسو بار۔ اس طرح کہ دس بار کہنے کے بعد گیارہویں مرتبہ محمد رسول اللہ ﷺ بھی ملا دیا جائے الا اللہ چار سو بار اللہُ اللہُ چھ سو بار اللہ سو بار، درود شریف ۱۱ بار، استغفار گیارہ بار (دعاء مانگ کر ختم کرے)

مطالعۂ کتب کی ضرورت:

منجملہ دیگر ضروریات کے اس زمانہ میں ایک ضروری عمل اسے سمجھتا ہوں کہ حضرت مولانا (اشرف علی صاحب تھانوی) کے مواعظ اور ملفوظات اور تصانیف کے مطالعہ کا اہتمام رکھیں اور میری کتابوں کو بھی برابر مطالعہ میں رکھیں۔ بالخصوص حیوٰۃ المسلمین، جزاء الاعمال، تعلیم الدین، فروع الایمان، قصد السبیل اور بہشتی زیور۔ اسی طرح وصیۃ الاخلاق، وصیۃ الاحسان، وصیۃ الاخلاص، وصیۃ التلاوۃ، وصیۃ السنۃ، عاقبۃ الانکار، تلاوت قرآن اور نسبت صوفیہ کا مطالعہ ضرور کریں۔ ان شاء اللہ اس سے دین وطریق سے خاصی مناسبت بھی ہو جائے گی اور معتد بہ علم بھی حاصل ہو جائے گا۔

مشائخ کی کتابیں:

اس سلسلہ میں اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ علماء نے لکھا ہے کہ مشائخ کی کتابیں ان کی غیر موجودگی کی حالت میں نائب اور خلیفہ ہوا کرتی ہیں۔ لہذا ان کتابوں کے پڑھنے اور سننے سنانے کا سلسلہ ضرور ہونا چاہئے اپنے لوگوں کو اس پر زور دیتا ہوں اور یہ اس لئے کہ بہت سے لوگوں نے مجھے لکھا ہے کہ آپ کے رسالہ کے مضامین سن کر دین اور اصلاح کی فکر پیدا ہوگئی ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذلک

اصلاح اخلاق:

اصلاح کے سلسلہ میں یہ سمجھ لیجئے کہ سب سے زیادہ ضروری اور اہم اخلاق کی اصلاح ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ انسان اپنے سوءِ خلق (بداخلاقی) کی بنا پر جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں جائے گا۔ حالانکہ وہ دنیا میں عابد ہوگا۔ اسی طرح سے وہ اپنے حسن خلق کی بنا پر جنت کے اعلیٰ طبقہ میں ڈاخل ہوگا۔ حالانکہ اس کی عبادات کچھ زیادہ نہ ہوں گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اخلاق کی شریعت میں خاص اہمیت ہے۔ اس لئے بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ انسان دوسروں کے درپے ہونے کے بجائے خود اپنے نفس کے درپے ہو۔ بلکہ یہ سمجھتا ہوں کہ دوسروں پر نظر ہوتی ہی اس وقت ہے جب کہ اپنے سے آنکھ بند رہتی ہے۔ اکبر مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

اوروں پہ معترض تھے لیکن جب آنکھ کھولی　　اپنے ہی دل کو ہم نے گنجِ عیوب دیکھا

اس لئے اپنے اندر صدق واخلاص وتواضع پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور کبر ونفاق کے شائبہ سے بھی بچنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں میری کتاب وصیۃ الاحسان اور تحذیر العلماء کا مطالعہ مفید ہوگا۔

ادب واحترام شیخ:

اصلاح نفس کیلئے ضروری ہے کہ انسان اپنے اندر شوق یا خوف پیدا کرے۔ اصلاح کا ظاہری ذریعہ چونکہ شیخ ہوتا ہے، اس لئے اس کا ادب واحترام، اس سے محبت اور اس کے مواخذہ اور عتاب کا خوف سالک کے اندر ہونا چاہئے۔ اس لئے وقتاً فوقتاً شیخ کی خدمت میں حاضری دیتا رہے تاکہ تعلق بڑھتا رہے اور اس میں اگر تاخیر ہو تو بذریعہ خط وکتابت تعلق قائم رکھے، ورنہ دیکھا تو یہ جاتا ہے کہ اوروں کی دیکھا

دیکھی لوگ بیعت تو ہو جاتے ہیں، اور پھر برسہا برس تک خبر نہیں لیتے، ایسا تعلق نہ تو چنداں مفید ہی ہے اور نہ اس کا طریق میں کوئی درجہ ہے۔ مجھے کسی کا یہ شعر بہت پسند آیا:

ابدأ بنفسک فانهها عن غیها فاذا انتهت عنه فانت حکیم

اصلاح کی ابتداء اپنے نفس سے کرو یعنی اس کو برائیوں سے روکو جب وہ رذائل سے نکل جائے تو تم حکیم کہلاؤ گے۔

اس لئے میرے نزدیک اصلاح کا طریق کار یہی ہے کہ انسان کام کی ابتداء اپنے نفس سے کرے اس کے بعد بھوائے۔

اہل وعیال کی اصلاح:

آیت قوا انفسکم و اهلیکم ناراً (اے ایمان والو اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ) اپنے گھر اور خاندان اور متعلقین کی اصلاح کی جانب متوجہ ہو، اسی طرح ہر شخص اگر کرنے لگ جائے تو دین عام ہو کر ایک صالح ماحول پیدا ہو جائے۔ جس کا ہونا دینی بقا اور دینی ترقی کے لئے ضروری ہے ایسا ماحول اگر کسی کو نصیب ہو جائے یا کوئی خود بنالے تو دنیا اس کے لئے جنت کا نمونہ بن جائے گی میری اس نصیحت کے مناسب قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کا یہ مضمون بھی ہے جسے انھوں نے ارشاد الطالبین میں خاتمہ کے عنوان سے بیان فرمایا ہے، طالبین کے فائدے کے لئے اس کو بعینہ نقل کرتا ہوں...... فرماتے ہیں:

تمام مسلمانوں کو عموماً اور طریقہ نقشبندیہ کے صوفیوں کو خصوصاً جن کے طریق کی بنا ہی اتباع سنت پر ہے، لازم ہے کہ فقہ اور حدیث کی خدمت کریں تاکہ لوگ فرائض وواجبات، محرمات ومکروہات، مشتبہات، عبادات اور عادات میں پیغمبر ﷺ کی سنت معلوم کریں اور جہاں تک ہو سکے اتباع سنت کی کوشش کریں،

خصوصاً فرائض وواجبات کے اتباع میں اور مکروہات ومشتبہات سے بچنے میں سنت کی رعایت کو محکم پکڑیں۔ بدن، کپڑے، جائے نماز کی طہارت اور تمام شرائط کی نماز میں پوری رعایت کریں۔لیکن ظاہری طہارت میں وسواس کی حد تک اپنے کو نہ پہونچائیں۔ کیونکہ یہ مذموم ہے اور پنجگانہ نماز مسجدوں میں جماعت کے ساتھ پڑھیں۔اس طرح کہ تکبیر تحریمہ اول فوت نہ ہواور جماعت کی تعداد بڑھائیں اور اچھے آدمی کو امام بنانے کی کوشش کریں۔حدیث شریف میں آیا ہے **الامام ضامن** یعنی مقتدی کی نماز امام کی نماز کی ضمانت میں ہے۔ پس جس قدر امام کامل ہوگا اسی قدر نماز کامل ہوگی۔ جمعہ کی نماز ہاتھ سے نہ جانے دیں اور تمام آداب وسنن کی اچھی طرح رعایت کریں۔نماز پورے اطمینان سے ادا کریں اور قرآن شریف کو صحت وصفائی اور اچھی آواز سے گانے کے طرز کے بغیر پڑھیں۔نماز مستحب وقتوں میں پڑھیں اور سنن راتبہ (موکدہ) کو جو بارہ رکعت ہیں اور تہجد کو جو سنت موکدہ ہے ہاتھ سے جانے نہ دیں ماہ رمضان کے روزے احتیاط سے ادا کریں۔لغویات یا گناہ، غیبت سے، روزے کا ثواب ضائع نہ کریں۔ اور نماز تراویح اور ختم قرآن شریف اور اعتکاف عشرۂ اخیرہ رمضان لازم پکڑیں۔لیلۃ القدر کی تلاش کریں۔ذکر سے اوقات کو معمور رکھیں۔اگر نصاب نامی کے مالک ہوں تو زکوٰۃ کا ادا کرنا فرض ہے۔لیکن اس بارے میں سنت یہ ہے کہ حاجت ضروری سے زیادہ مال قبضہ میں نہ رکھے۔رسول کریم رضی اللہ عنہ فتح خیبر کے بعد اپنی ازواج مطہرات میں سے ہر ایک کو چھ سو سیر سالانہ جو اور خرما دیتے تھے۔اور اپنی ملکیت میں ایک درم بھی نہیں رکھتے تھے۔اور کسب حلال سے کھاتے رہیں۔خرید وفروخت وغیرہ

معاملات میں مسائل فقہ کی رعایت رکھیں۔مشتبہات سے پرہیز رکھیں۔حقوق الناس ادا کرنے میں سعی بلیغ کریں۔اگر حقوق اللہ کی ادائیگی میں کوتاہی ہوگئی ہوتو رسول اللہ ﷺ اور پیران عظام کی شفاعت سے مغفرت کی امید ہے۔لیکن حقوق العباد نہیں بخشے جاتے۔نکاح پیغمبروں کی سنت ہے لیکن اگر اس کے حقوق نہ ادا کرسکے اس خوف سے کہ اس سے فرائض اور واجبات فوت ہوجائیں گے تو اس سے باز رہنا بہتر ہوگا۔اس بارے میں مختصراً حکم دیا گیا ہے ،اس کی تفصیل کتب فقہ وحدیث میں تلاش کرنی چاہئے۔۔

فرائض وواجبات کی ادائیگی کے بعد صوفی پر لازم ہے کہ اپنے اوقات کو ذکر الٰہی سے معمور رکھیں۔اور بیہودگی میں وقت ضائع نہ کریں۔حدیث شریف میں آیا ہے کہ اہل جنت کو جنت میں کوئی حسرت نہ ہوگی۔بجز دنیا کی اس گھڑی کے جس میں انہوں نے خدا کا ذکر نہ کیا ہو۔

فنائے نفس سے پہلے کثرت نوافل اور تلاوت قرآن سے قرب الٰہی میں ترقی نہیں (۱) ہوتی۔دیکھو حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: **لا یمسه الا المطهرون** (یعنی قرآن کو لوگ بغیر طہارت نہ چھوئیں) تو جس طرح سے کہ ظاہری طہارت نماز کیلئے شرط ہے اسی طرح سے رذائل نفس سے پاک ہوئے بغیر نماز وتلاوت کی برکات حاصل نہ ہوں گی۔

تجدید ایمان:

اور جس طرح سے کہ ظاہری کفر کا ازالہ **لا الٰه الا اللّٰه** سے ہوجاتا ہے۔اسی

---

(۱) یہ نفی ایک خاص ترقی کی ہے، باقی اس سے عام نفع کی نفی لازم نہیں، یعنی اور دوسرے قسم کا فائدہ تلاوت سے ہوتا ہے، یعنی ان سے مقصود قربِ الٰہی ہے، اور بسا اوقات فناءِ نفس سے پہلے یہ چیزیں عجب وکبر کا سبب بن جاتی ہیں۔

طرح کفر باطنی کا ازالہ بھی اسی کلمہ سے ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جددوا ایمانکم، یعنی اپنے ایمان کو تازہ کرتے رہا کرو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ ایمان کو کیسے تازہ کیا کریں۔ فرمایا کہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے تکرار سے چنانچہ تمام سلاسل کے مشائخ نے مریدوں کیلئے اسی کلمہ کا ذکر تجویز کیا ہے۔ بعض حضرات جہر سے پڑھنے کو کہتے ہیں اور اس طرح سے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں اور حضرات نقشبندیہ ذکر جہر کو (۱) بدعت قرار دیتے ہیں اور ذکر خفی پر اکتفا کرتے ہیں۔ پس فناء قلب وغیرہ کیلئے لا الٰہ الا اللہ کے ذکر کو حبس نفس کے ساتھ مفید جانا ہے اور بوقت ذکر اس معنیٰ کا لحاظ رکھتے ہیں کہ اس ذات پاک کے سوا کوئی مقصد نہیں۔ یہ ذکر طاق عدد کی رعایت سے کرتے ہیں۔ نفس کے فناء کیلئے کلمہ طیبہ کی تکرار زبان سے، جس کے ساتھ معنیٰ کا بھی پورا خیال ہو مفید ہے۔ کیونکہ نفس عالم خلق سے ہے۔ اور فناء نفس کے بعد کمالات نبوت کے مقام میں اس سے اوپر تلاوت قرآن اور کثرت نماز سے ترقی حاصل ہوتی ہے۔ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے التجا کی کہ مجھ کو بہشت میں آپ کی ہمسائیگی نصیب ہو۔ آپ نے فرمایا کہ کچھ اور مانگو اس نے کہا مجھے تو بس یہی چاہئے۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا تو پھر کثرت سجود سے میری مدد کرو۔

صلحاء کی صحبت:

پھر چند سطروں کے بعد قاضی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ:

ذکر وفکر اور فرائض ونوافل سے فارغ ہوکر اگر علماء ومفتیان اور صلحاء کی

---

(۱) بدعت وہ حضرات اپنے طرق کے لحاظ سے کہتے ہیں، یعنی سلسلۂ نقشبندیہ میں ذکر جہر مشائخ سے منقول نہیں۔ اس سلسلے میں رہتے ہوئے کوئی ذکر جہر کرے تو اس سلسلے کے لحاظ سے یہ بدعت ہے۔

مصاحبت اور مکالمت میسر ہوتو غنیمت سمجھو بشرطیکہ علماء دنیا داروں کی صحبت سے باز رہنے والے ہوں اور اگر علماء وصلحاء کی صحبت میں اثر نہ ہوتو تنہا بیٹھنا یا سو رہنا بہتر ہے۔

العزلة خير من الجليس السوء : گوشہ نشینی برے ہم نشین سے بہتر ہے، **والجليس الصالح خير من العزلة** : اور نیک ہم نشیں گوشہ نشینی سے بہتر ہے۔ جاہلوں، فاسقوں اور ان لوگوں کی صحبت اور ہم نشینی جو دنیا میں مستغرق رہتے ہیں، کارخانۂ باطن کو خراب کر دیتی ہے۔ خصوصاً مبتدی صوفیوں کے حق میں سخت مضر ہے۔ جیسا کہ تھوڑے پانی کو نجاست پلید کر دیتی ہے۔ صوفیوں، صاحب دلوں، ولیوں کی ہم نشینی اور صحبت اللہ کے ذکر اور عبادت سے بھی زیادہ مفید ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم باہم کہا کرتے تھے کہ **اجلس بنا نومن ساعة** ۔ یعنی ہمارے پاس بیٹھو تا کہ ہم آپس میں ایمان تازہ کریں۔ مولانا روم فرماتے ہیں:

یک زماں ہم صحبت با اولیا بہتر از صد سال بودن در تقا

یعنی اولیاء اللہ کی صحبت میں تمہارا تھوڑی دیر بیٹھنا سو سال تقویٰ میں گزارنے سے بہتر ہے

حضرت خواجہ احرار فرماتے ہیں:

نماز را بحقیقت قضا بود لیکن نماز صحبت ما را قضا نہ خواہد بود

یعنی نماز اگر رہ جائے تو اس کی قضا کی جا سکتی ہے لیکن ہماری صحبت کی نماز ایسی ہے کہ اس کی کوئی قضا نہیں۔

ایک شخص نے کسی سے کہا کہ حضرت بایزید کی صحبت میں رہا کرو۔ اس نے جواب دیا کہ میں خدا کی صحبت میں رہتا ہوں۔ اس شخص نے کہا کہ بایزید کی

صحبت میں رہنا خدا کی صحبت میں رہنے سے بہتر ہے۔ مطلب یہ تھا کہ تو بمقدور اپنی نسبت اور حوصلے کے جناب الٰہی سے فیض حاصل کر سکتا ہے اور حضرت بایزید کی صحبت میں تجھ کو ان کے علو مرتبہ کے مطابق فیض حاصل ہوگا۔ مولانا روم مثنوی میں فرماتے ہیں:

دور شو از اختلاط یار بد — یار بد بدتر بود از مار بد
مار بد تنہا ہمی بر جاں زند — یار بد بر جان و بر ایماں زند

☆ یعنی برے لوگوں کی صحبت سے دور رہو کیونکہ برا دوست سانپ سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ ☆ سانپ تو صرف جان کو نقصان پہونچاتا ہے مگر برا دوست جان کے ساتھ ایمان کو بھی تباہ کر دیتا ہے۔

حضرت اقدس کی اس تحریر گرامی سے دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ حضرت کیا چاہتے تھے۔ آپ کا منشا یہ تھا کہ ایک مومن سچا مومن بن کر رہے۔ زندگی کا ہر لمحہ شریعت کے ساتھ مربوط ہو۔ انہیں اصولوں پر آپ نے اصلاح و تعلیم کی بنیاد رکھی تھی۔

حضرت شیخ محی الدین بن عربی قدس سرہ نے اپنی ایک تصنیف میں لکھا ہے کہ شیخ و مرشد میں انبیاء جیسا دین، اطباء جیسی تدبیر اور بادشاہوں جیسی سیاست ہونی چاہئے۔ گزشتہ اوراق کے مطالعہ سے ناظرین نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ حضرت والا میں یہ تینوں اوصاف بدرجۂ کمال موجود تھے۔ آپ کی دینداری، تقویٰ اور خوف خدا نیز اتباع سنت تو آپ کی ہر حرکت و سکون سے ظاہر ہے۔ اطباء جیسی تدبیر کے نمونے بھی آپ پڑھ چکے ہیں۔ کن کن تدبیروں سے مریدین کی تربیت فرماتے تھے۔ اس کا احاطہ کرنا تو مشکل ہے۔ البتہ اس کی کچھ مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

حضرت والا کا انداز تربیت بالکل اس شعر کا مصداق تھا کہ ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش — تا دمے آخر دمے فارغ مباش

اس راہ میں تراش وخراش آخردم تک جاری رہنی چاہئے۔اسی اصول کے مطابق حضرت اقدس اپنے متعلقین کو کبھی غافل اور مغفل نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔آنے جانے والوں سے مختلف سوالات فرماتے رہتے تھے،کبھی تمام اہل مجلس سے کوئی سوال فرمالیا۔اس طرح ان کے فکر وخیال کو کسی ضروری امر کی جانب متوجہ فرمادیتے۔یہ سوالات کبھی براہ راست بھی فرماتے اور کبھی واسطوں کے ذریعے بھی پھر حضرت کو جواب دینا آسان نہ ہوتا۔بہت غور وتامل کے بعد جواب بن پڑتا۔لیکن بسا اوقات حضرت کا ایک سوال،راہ کو بہت دور تک صاف کردیتا۔کبھی ایسا انداز اختیار فرماتے کہ ایک ہی سوال میں کئی کئی آدمیوں کی اصلاح ہوجاتی۔مولانا افتخار الحق صاحب گورکھپوری سے ایک واقعہ سنا کہ وہ ایک بارالہ آباد حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ان دنوں حضرت کے یہاں ہندوستان کے ایک بہت بڑے عالم اور محدث بھی مقیم تھے۔جس وقت مولانا افتخار الحق حضرت کی خدمت میں پہونچے ایک اور عالم سے حضرت کا سوال وجواب چل رہا تھا۔حضرت نے فرمایا لے جاؤ ان کو ذرا سمجھاؤ۔مولانا افتخار الحق صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا حضرت اجازت ہوتو میں آپ کے سامنے ہی ان سے کچھ بات کروں۔اگر کچھ مجھ سے غلطی ہوگی تو اس کی بھی اصلاح ہوجائے گی،حضرت نے اجازت دیدی۔میں ان سے بات کرنے لگا تھوڑی دیر حضرت سنتے رہے پھر فرمایا میں بھی ایک بات کہوں۔اس کو غور سے سنو!

کوئی شخص خواہ دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ ہو یا اپنے زمانہ کا علامۃ الدہر ہو۔کسی بزرگ اور اللہ والے کے پاس جاکر اپنے کو سب سے کمتر اور بالکل جاہل نہ سمجھے گا تو اس کے اوپر فیض کا دروازہ ہرگز نہیں کھل سکتا۔

اتنا فرماکر مجھ سے فرمایا کہ میری یہ بات بالکل سچ ہے۔اگر تم کو یقین نہ ہوتو

فلاں عالم تشریف لائے ہوئے ہیں ان سے جا کر تصدیق کرالو۔ پھر فرمایا جاؤ ان سے پوچھو۔ میں ان عالم و محدث کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت کی بات نقل کی ۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئے اور بڑے تاثر کے ساتھ فرمایا کہ حضرت نے بالکل سچ فرمایا۔

اس واقعہ کو غور سے دیکھئے تو ایک ہی جملہ میں تین علماء کو ایک بنیادی اور ضروری امر کی جانب متوجہ فرمادیا۔ اسی ایک جملہ کو اگر کوئی سمجھ لے تو تمام فیوض و برکات کا دروازہ کھل جائے گا۔ آخر کوئی تو بات تھی کہ حضرت مولانا اسمٰعیل شہید جیسا متبحر اور یکتائے روزگار عالم اپنے شیخ و مرشد حضرت سید احمد شہید کے سامنے اس طرح مٹا ہوا تھا کہ دیکھنے والا عالم تو درکنار کوئی پڑھا لکھا آدمی بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ ہمارے حضرات اکابر علماء دیو بند کا اپنے مشائخ کے سامنے یہی حال تھا۔ بات تو دور جا پڑے گی لیکن جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا حال پیش کردوں جوان کو اپنے پیرو مرشد شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے تعلق میں حاصل تھا۔ حضرت نانوتوی کی سب سے زیادہ مایۂ ناز اور علم سے معمور کتاب آب حیات جب لکھی گئی تو طباعت سے پہلے حضرت نے حج کا سفر کیا اور مکہ مکرمہ پہونچ کر حضرت حاجی صاحب کی قدم بوسی کی۔ اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

بوجہ تہی دستی دین و دنیا اور کچھ پیش نہ کرسکا۔ اوراق سیاہ کے مسودہ مذکور کو پیش کر کے رسم پیشکش بجالایا۔ مگر شکر عنایت کس زبان سے کیجئے کہ اس ہدیۂ مختصرہ کو قبول فرما کر صلہ و انعام میں دعائیں دیں۔ علاوہ بریں تصحیح وجدانی اور تحسین زبانی سے اس ہیچمدان کی اطمینان فرمائی۔ اپنی کم مائیگی اور ہیچمدانی کے سبب جو تحریر مذکور کے صحت میں تردد تھا رفع ہوگیا۔ پھر یہ کوئی سمجھے تو اور متعجب ہو کہ قاسم ناداں کی تحقیق و تنقیح اور ایسی مستحسن اور صحیح زبان گنگ و چنیں نغمہ خوش آئندہ

میں کہاں اور یہ مضامین عالی کہاں ۔ یہ سب اس شمس العارفین کی نور افشانی ہے،
آگے لکھتے ہیں : بہر حال اپنا حال تو معلوم ہے ۔ اس سامان پر یہ نعمت ہاں
حضرت مسطور الصفات کی عنایت کے نام جو کچھ لگائیں بجا ہے ۔ اور ان کی
توجہات کی نسبت جو کچھ بتائیں زیبا ہے ۔ اسلئے یہ ہیچمداں بدترین گنہگاراں
زبان ودل سے اس بات کا معترف ہے کہ میرے کلام پریشاں میں اگر کوئی سخن
دل نشیں اہل دل اور کوئی تحقیق لائق تصدیق اہل حق ہے تو وہ حضرت مرشد ادام
اللہ فیوضہ کے انتساب وتوسل کا پھل ہے ۔ اور اگر اختلاط اغلاط اور آمیزش
خرافات ہو تو یہ تیرہ دروں خود قائل ہے کہ اپنی عقل نارسا ہے اور اپنے دماغ میں
خلل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت پیرومرشد ادام اللہ فیوضہ کے سنانے کی
ضرورت ہوئی مگر جب زبان فیض ترجمان سے آفرین وتحسین سن لی تو اصل
مضامین کی حقیقت تو اپنے نزدیک محقق ہوگئی ۔ (آب حیات)

اندازہ کیجئے حضرت مولانا نانوتوی جیسا بلند پایہ عالم اور آب حیات جیسی ادق ترین اور علوم لدنیہ سے لبریز کتاب، لیکن حضرت حاجی صاحب قدس سرہ ...... جو اصطلاحی اور درسی اعتبار سے باقاعدہ فارغ التحصیل نہ تھے ...... کے سامنے کیسی ہیچمدانی اور بے مائیگی کا اقرار واعلان ہے یہی تواضع تھی ۔ جس نے حضرت نانوتوی کو پورے ایک طبقہ کا امام بنادیا۔

بہر کیف حضرت والا نے علماء کو جنہیں علم کا پندار بہت کچھ تحصیل کمالات سے مانع بنتا ہے ۔ اس بات کی جانب متوجہ فرمایا ہے کہ خداوند فیاض کے یہاں سے فیوض وبرکات کا دروازہ کھلوانا ہے ۔ تو جن پر اس کی دھاریں پڑ رہی ہیں ۔ خود کو ان کے نیچے کردو ۔ اپنے آپ نہا جاؤ گے ۔ اور اگر الگ کھڑے تماشا دیکھتے رہے تو وہی

مثل ہوگی کہ کنواں کی جگت پر کھڑے پیاس سے جان چلی گئی۔

اسی نوع کا ایک اور واقعہ سنئے۔ایک دفعہ بعض وقتی حالات کی بنا پر حضرت والا نے دو تین ماہ تک بمرولی میں قیام فرمایا۔قیام طویل ہونے کی وجہ سے باہر سے آنے والے مہمان اور ذاکرین وشاغلین وہیں پہونچتے۔انھیں دنوں مئو سے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی بھی تشریف لائے اور غالباً تین دن بمرولی میں قیام فرمایا۔حضرت نے چودھری حبیب الرحمٰن صاحب کو بلا کر فرمایا کہ آپ کے ہم نام ایک مولانا صاحب اعظم گڈھ سے تشریف لائے ہیں، آپ انہیں پہچانتے ہیں۔ چودھری صاحب نے عرض کیا جی ہاں۔فرمایا ان کے پاس جایئے اور میری طرف سے ان سے دریافت کیجئے کہ اخلاص کسے کہتے ہیں۔چودھری صاحب کہتے ہیں کہ میں گیا تو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لیٹے ہوئے تھے۔میں نے جا کر حضرت کا پیغام پہونچا دیا۔میرے منہ سے حضرت کا سوال ہی سنتے ہی مولانا اٹھ کر بیٹھ گئے۔اور دونوں ہاتھ سے اپنا سر پکڑ لیا اور ایک دو منٹ تک سر جھکائے کچھ سوچتے رہے۔غالباً مولانا پر حضرت کا اصل منشا مکشوف ہوا۔اور مولانا نے سمجھا کہ حضرت والا اس سوال کے ذریعے کوئی اہم علم عطا فرمانا چاہتے ہیں۔یا کسی ضروری امر کی جانب توجہ دلانی مقصود ہے۔ورنہ اخلاص کے لفظی معنیٰ کون نہیں جانتا۔اس لئے قدرے تامل کے بعد فرمایا کہ حضرت سے جا کر عرض کر دیجئے کہ اخلاص اس کو کہتے ہیں کہ آدمی جس کا ہو جائے بس اسی کا ہو رہے۔چودھری صاحب کہتے تھے کہ میں نے حضرت والا سے جا کر مولانا کا یہ جواب نقل کر دیا۔حضرت جواب سن کر مسکرائے۔جس سے میں نے اندازہ کر لیا کہ حضرت نے اس جواب کو پسند فرمایا۔

مجلس میں عمومی انداز اصلاح کا تو پہلے کہیں ذکر کیا جا چکا ہے۔اس کے علاوہ

خاص طور پر ہر ہر فرد پر بھی حضرت کی نگاہ رہتی تھی۔ قلبی احوال کی درستگی اور صفائی کا آپ کو بہت اہتمام تھا۔ عجب اور کبر کا شائبہ تک دیکھنا پسند نہیں فرماتے تھے، ظاہر وباطن کی دورنگی سے سخت نفرت تھی۔ انتہائی شفیق اور ماں سے زیادہ مہربان ہونے کے باوجود اصلاحات کے معاملہ میں ضروری مواقع پر دارو گیر۔ محاسبہ اور ڈانٹ ڈپٹ کا طریقہ بھی چلتا رہتا، کبھی کبھی بطور تنبیہ کے بعض لوگوں کو مجلس سے نکال بھی دیتے۔ تاہم قلبی توجہ برابر قائم رہتی۔ اس ساری کشاکش کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ سالک خدا کی جانب یکسوئی کے ساتھ متوجہ ہوکر کام میں لگ جائے۔ نہ خدانخواستہ کسی کو نکالنا مقصود ہوتا اور نہ ذلیل کرنا۔ ایک صاحب بیان کرتے تھے کہ میں حضرت کے یہاں فتح پور میں رہتا تھا۔ بعض اصلاحی امور پر حضرت والا کی جانب سے مواخذہ اور احتساب کا سلسلہ شروع ہوا اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ مجھے مجلس میں آنے سے منع فرما دیا، میں سخت شش وپنج میں مبتلا ہوگیا۔ یہاں پر شیطان کو رہزنی کا موقع مل سکتا تھا کہ ہٹاؤ جب انھوں نے منع ہی کر دیا تو چلو یہاں سے نکل چلو، میں اخلاص کا مدعی تھا اب میرے اخلاص کا بھی امتحان تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت کی دارو گیر محض اصلاح کے واسطے تھی، وہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں فتح پور سے تھوڑے فاصلے پر ایک گاؤں میں بچوں کو پڑھاتا تھا۔ حضرت کی عجب شان تھی، اپنائیت اور دلی تعلق کا اظہار بھی تھا، اور ساتھ ہی ساتھ امتحان کی بھی صورت تھی۔ میں نماز فجر کے بعد مسجد میں بیٹھا تلاوت کر رہا تھا کہ حضرت کے ایک خادم بہت سویرے فتح پور سے حضرت کے بھیجے ہوئے آئے اور حضرت کا پیغام سنایا کہ اس معاملہ کے بعد

اگر تم نے میرے پاس آنا ترک کر دیا تو سمجھوں گا کہ مخلص نہیں تھے اور اگر آئے تو نکال دوں گا۔

اس جملے میں جیسی کشش اور محبت کا ظہور ہے اسے کچھ اہل محبت ہی سمجھ سکتے ہیں۔ عاشق کی آزمائش اور محبوب کی بے نیازی اور پھر لگاوٹ کا ایک نرالا انداز! کسی نے خوب کہا ہے ؎

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے   بے نیازی تری عادت ہی سہی

یہ محبوبانہ ادائیں ہیں۔ ان کی قدر و قیمت کسی محبّ سے پوچھئے۔ ان صاحب کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا کہ میں تو اپنی اصلاح کے لئے حاضر ہوا ہوں، حضرت ایک بار نکالیں گے تو میں سو بار حاضری دوں گا، چنانچہ میں روزانہ مجلس کے وقت حاضری دیتا اور حضرت ڈانٹ کر نکل جانے کا حکم دیتے۔ ایک عرصہ تک یہ معاملہ چلتا رہا۔ پھر حضرت نے مجلس میں بیٹھنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

حضرت کا یہ محاسبہ درحقیقت کسی باطنی رذیلہ پر تھا۔ ڈانٹ ڈپٹ کر اس رذیلہ کو نکالنا چاہتے تھے، جب وہ نکل گیا، اور حضرت کو اطمینان ہو گیا تو وہی لطف و محبت۔ درحقیقت شیخ کامل کی یہی شان ہوتی ہے۔ مولانا روم نے مثنوی میں مشائخ کے اس معاملہ کو متعدد مثالوں سے سمجھایا ہے۔ ایک قصہ سناتے ہیں کہ ایک درخت کے نیچے ایک شخص محوخواب تھا۔ سونے کی حالت میں اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ چھوٹی جسامت کا ایک سانپ آیا اور اس کے منہ میں داخل ہو کر اس کے پیٹ میں چلا گیا۔ وہ بھی نیند میں کچھ ایسا مست تھا کہ بیدار نہ ہوا ایک شخص گھوڑے پر سوار ادھر جا رہا تھا اس نے جو یہ منظر دیکھا تو کانپ گیا، وہ سوچنے لگا کہ کس تدبیر سے اسے نکالوں۔ پھر ایک تدبیر اس کے ذہن میں آگئی، اس نے قریب پہونچ کر اسے چابک رسید کرنا شروع کر دیا۔ بدن پر تڑاتڑ کوڑے پڑے تو اس کی آنکھ کھل گئی، یہ بلاء ناگہانی جو سامنے دیکھی تو بھاگ کھڑا ہوا، لیکن وہ پیدل تھا اور یہ سوار، اس نے اس کا پیچھا کیا اور مارتا رہا، وہ برا بھلا

کرتا رہا اور بھاگتے ہوئے مار کھاتا بھی رہا، تھوڑے فاصلے پر سیب کا ایک باغ تھا یہ شخص اس میں گھس گیا، سوار نے بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا، باغ میں پہونچ کر سوار نے اسے رک جانے کا حکم دیا، اور کہا کہ زمین پر جتنے سیب پڑے ہیں سب کھاؤ، وہ کھانے، جب شکم سیر کھا چکا تو اس نے اور کھانے کا حکم دیا، اس شخص نے معذرت کرنی چاہی کہ کوڑا پھر برسنے لگا، پھر مجبوراً اس نے اتنا کھایا کہ قے ہونے لگی، قے کے ساتھ وہ سانپ بھی نکل گیا۔ اب سوار نے ہاتھ جوڑ کر معافی چاہی، کہ میں نے تمہیں بہت تکلیف پہونچائی، معاف کرنا۔ یہ سانپ تمہارے پیٹ میں گھس گیا تھا، میرے ذہن میں بجز اس کے اور کوئی تدبیر نہیں آئی، اگر تمہیں بتا دیتا تو خوف کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے۔ بہر حال اب سانپ نکل گیا مجھے معاف کرو۔ ادھر اس کا یہ حال کہ سو سو جان سے فدا ہو رہا ہے کہ آپ کا بڑا احسان ہے، آپ نے بڑا اکرم کیا، میری گستاخیوں کو معاف فرمایئے۔ مشائخ بھی انسانی رذیلوں کو جو قلب میں گھسے رہتے ہیں پہچانتے ہیں۔ انھیں نکالنے کیلئے بھی مواخذہ و عتاب اور زجر و توبیخ فرماتے ہیں۔ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ باطنی عیوب جو غضب خداوندی کے مورد و مرکز ہیں قلب سے نکل جائیں۔

دوسری مثال لیجئے! کمبل میں گرد بیٹھ جاتی ہے تو اول دھوپ میں سکھاتے ہیں، پھر ڈنڈے مار مار کر اس کی گرد جھاڑتے ہیں۔ بظاہر ڈنڈا کمبل میں پر پڑ رہا ہے۔ لیکن حقیقۃً گرد کو نکالنا مقصود ہوتا ہے، نہ گرد ہوتی اور نہ ڈنڈے رسید کئے جاتے۔ یہی مثال سمجھ لیجئے کہ سالکین کے قلوب میں طرح طرح کے باطنی عیوب بھرے رہتے ہیں۔ صاحب نظر شیخ ان عیوب کو مختلف تدابیر سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں میں جتنے کم عیوب ہوتے ہیں اتنا ہی ان پر دار و گیر اور احتساب کم ہوتا ہے۔ حضرت والا چونکہ مصلح تھے اس لئے ہر امکانی سعی اس بات کی فرماتے کہ سالک

طریق کا قلب ہر قسم کی نجاست اور آلودگی سے پاک ہو جائے، اس سلسلے میں بڑی دل سوزی، جانفشانی اور توجہ دلی سے کام لیتے۔ اہل علم کی جانب خاص طور سے آپ کی توجہ ہوتی۔ آپ کی خواہش عموماً یہ رہا کرتی کہ مجلس میں آپ کے قریب اہل علم حضرات بیٹھیں، تاکہ خود بھی سمجھیں اور دوسروں کو بھی سمجھا سکیں۔ ان کی اصلاح و تربیت میں عوام کے مقابلے میں زیادہ سرگرمی کو کام میں لاتے اور اس کے ساتھ ان کی شان علم کی تعظیم میں بھی کمی نہ کرتے۔

مولانا وقاری حبیب احمد صاحب الہ آبادی کا بیان ہے کہ میں مجلس میں حضرت والا کے قریب ہی بیٹھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس تمنا میں کہ مخصوص جذبہ کی حالت میں لوگوں کے سر پر حضرت کا جو ہاتھ (۱) پڑا کرتا ہے۔ کاش وہ سعادت مجھے بھی حاصل ہوتی۔ چنانچہ ہونے لگی۔ اس کے بعد سے تو یہ حال ہو گیا کہ اگر کسی دن مجھے ذرا دیر ہو جاتی اور کچھ دور بیٹھتا تو کبھی تو حضرت ہی اشارہ سے مجھے قریب بلا لیتے اور کبھی خفگی سے فرماتے اور دور بیٹھو کہیں چھینٹ نہ پڑ جائے۔ لیکن شفقت و اکرام کا یہ عالم تھا کہ حضرت کے ہاتھ میں انگوٹھی تھی۔ اس کی وجہ سے جب کبھی زور کا ہاتھ سر پر پڑ جاتا تو چوٹ لگ جاتی، مگر یہ دیکھا اور اس میں تخلف نہیں ہوا کہ بعد اختتام مجلس میں جب جانے کیلئے ملتا اور مصافحہ کرتا، تو حضرت کا ایک ہاتھ میرے ہاتھوں میں ہوتا اور دوسرے ہاتھ سے میرا سر پکڑ کر اس کو اپنے سینے سے قریب کر کے میرے کان میں آہستہ سے فرماتے کہ قاری صاحب آپ کی بے ادبی ہوئی معاف کیجئے گا۔ قاری

(۱) حضرت پر بعض اوقات کچھ ایسی کیفیات کا ورود ہوتا تھا، جس کا ادراک کسی کو نہ ہو سکا، جذب و جلال کی ایک خاص شان ہوتی۔ یہ کیفیت مجلس میں بھی طاری ہوتی، تو حضرت کے قریب جو لوگ ہوتے حضرت والا کا ہاتھ ان کے سروں اور کندھوں پر پڑنے لگتا، ناواقف سمجھتے کہ مار رہے ہیں، واقفین سمجھتے کہ فیضانِ باطنی کی ایک راہ یہ بھی ہے۔

صاحب فرماتے ہیں کہ میں اس جملہ کو سن کر بس ذبح ہی تو ہو جاتا تھا۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت کی دار و گیر اور غصہ و غضب جو کچھ تھا محض اصلاح کے لئے تھا، اس دار و گیر میں محبت کی ہزاروں شانیں اور غصہ و غضب میں رحمت و مہربانی کی بے شمار لہریں ہوا کرتیں۔ محبت و پیار پر پیار تو سب کو آتا ہے لیکن غصہ پر پیار کرنا محبّ صادق اور عاشق مخلص ہی کی شان ہے۔ عشاق سے کوئی پوچھے۔

ان کو آتا ہے پیار پر غصہ　　　مجھ کو غصہ پہ پیار آتا ہے

حضرت کا یہ غضب وجلال چونکہ محض خدا کے واسطے ہوتا تھا اس لئے غصہ کی آنچ کے ساتھ نور وسرور کی فراوانی بھی ہوتی۔ مولانا جامی صاحب لکھتے ہیں کہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور بے شمار حضرات سے بھی سنا کہ جس دن مجلس کی ابتدا کسی پر مواخذہ اور عتاب کی حالت میں فرماتے، اس دن مجلس میں نور ہی نور برستا اور ایسی ایسی باتیں بیان ہوتیں کہ جی خوش ہو جاتا۔ بس یہی فرق ہے۔ نفسانی غصہ اور رحمانی غصہ میں کہ اول ظلمت وفساد کا سبب بنتا ہے۔ اور ثانی میں نورانیت اور صلاح پیدا ہوتی ہے۔ مگر اس نور اور ظلمت کا ادراک ہر ایک کے لئے آسان نہیں۔

(حالات ج:اص:۲۷۵)

حضرت کے منجملہ معمولات کے ایک دستور یہ بھی تھا کہ سالکین اپنے حالات کی اطلاع کرتے رہا کریں اور یہ اطلاع بھی قدرے جلد جلد، بہت تاخیر ہونے کی صورت میں مواخذہ ہو جاتا، اس کی وجہ سے ہر ہر شخص کو اپنی اصلاح حال کا مسلسل خیال قائم رہتا۔ ناممکن تھا کہ کوئی غافل رہ جائے۔ دین کے راستے میں یہی فکرمندی کشودِ کار کا ذریعہ ہے۔ آدمی پر غفلت مسلط ہو تو کھلے ہوئے دروازے بھی بند ہو جائیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

باب ۷

اولادو اَحفاد

حضرت والا کو اللہ تعالیٰ نے چار اولادیں عطا فرمائیں۔ اولادِ نرینہ کوئی نہ تھی، چار صاحبزادیاں ہوئیں۔ پیرانی صاحبہ نے ایک طویل عرصہ علالت میں گزارا، اس لئے پرورش اور تربیت کا سارا بوجھ حضرت کو خود اٹھانا پڑا۔ ماشاء اللہ ہر ایک کو تعلیم وتربیت سے مزین فرمایا، بعد میں تو مشغولیات زیادہ ہوگئیں۔ ابتداء میں جب وقت کافی رہتا تھا، بڑی صاحبزادی کو تعلیم دینے کا زیادہ موقع ملا، چنانچہ انھوں نے حفظِ قرآن کی بھی سعادت حاصل کی اور فارسی تعلیم کی بھی تکمیل کی۔ دینی تربیت کے لحاظ سے ہر ایک ماشاءاللہ وسبحان اللہ۔

بڑی صاحبزادی کا نکاح حضرت اقدس مولانا قاری شاہ محمد مبین صاحب دامت برکاتہم کے ساتھ ہوا، یہ عقد حضرت پیرانی صاحبہ کی حیات ہی میں ہوگیا تھا، بہت نیک اور فیاض خاتون ہیں۔ حضرت اقدس کی خاص شفقت وعنایت کی مورد تھیں۔ سفرِ حج .... جس میں حضرت کا وصال ہوا.......... میں آپ کے ہمراہ تھیں، آپ کی چھ اولادیں ہیں۔ تین صاحبزادیاں اور تین صاحبزادے۔

بڑی صاحبزادی جناب مولانا عرفان احمد صاحب کے نکاح میں ہیں، ماشاءاللہ صاحب اولاد ہیں۔ صاحبزادوں میں بڑے مولوی احمد متین صاحب ہیں، ۱۳۸۰ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، اللہ تعالیٰ علم وعمل میں برکت عطا فرمائے۔

دوسرے صاحبزادے مولوی احمد مکین سلّمہٗ، اس سال مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں دورۂ حدیث میں داخل ہیں۔ (فارغ ہو چکے) تیسرے صاحبزادے محمد امین سلّمہٗ حفظِ قرآن میں مشغول ہیں۔

حضرت کی دوسری صاحبزادی کا نکاح حضرت اقدس قاری صاحب کے ماموں زاد بھائی جناب مولانا قمر الزماں صاحب کے ساتھ ہوا۔ یہ عقد حضرت پیرانی صاحبہ کی وفات کے بعد ہوا تھا۔ آپ کی چار اولادیں ہیں۔

(۱) مولوی مقبول احمد، دار العلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہیں۔

(۲) مولوی سعید احمد، دار العلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فراغت حاصل کی، پھر مدینہ یونیورسٹی سے بھی فارغ ہوئے۔

(۳) مولوی عزیز احمد، دار العلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔

(۴) مولوی محبوب احمد، ندوۃ العلماء سے لکھنؤ سے فارغ التحصیل ہیں۔

تیسری صاحبزادی کا عقد بھی حضرت پیرانی صاحبہ کی وفات کے بعد حضرت قاری صاحب کے چچازاد بھائی جناب مولانا نور الہدیٰ صاحب کے ساتھ ہوا۔ آپ کے ایک صاحبزادے ہیں، مولوی کمال احمد، دار العلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فراغت کے بعد ندوہ میں مدرس ہیں۔

حضرت کی یہ دونوں صاحبزادیاں، حضرت کی حیات ہی میں رمضان ۱۳۷۹ھ میں دو ہفتہ کے وقفہ سے چیچک کی وبا میں مبتلا ہو کر داغِ مفارقت دے گئیں۔ پہلے چھوٹی صاحبزادی، ان کے بعد ان سے بڑی صاحبزادی۔ حضرت کو بڑھاپے میں یہ صدمہ بھی سہنا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہر دو کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

چوتھی صاحبزادی...... جو چاروں میں سب سے چھوٹی ہیں...... حضرت قاری

صاحب کے چھوٹے بھائی جناب مولانا ارشاد احمد صاحب کے حبالۂ عقد میں ہیں۔ ان سے چار اولادیں ہیں، تین صاحبزادیاں اور ایک صاحبزادے محمود کریم سلّمہٗ، ایک صاحبزادے احمد عظیم دس بارہ سال کی عمر میں قضا کر گئے۔

حضرت اقدس کی بڑی صاحبزادی صاحبہ یعنی حضرت قاری صاحب کی اہلیہ چونکہ اپنی سب بہنوں سے عمر میں بڑی تھیں، اس لئے حضرت پیرانی صاحبہ کی وفات کے بعد اپنی دوسری چھوٹی بہنوں کی پرورش اور نگرانی کرنے میں حضرتؒ کی بہت مددگار بنی رہیں۔ ظاہر ہے کہ بہت سی ضروریات اور حوائج ایسی بھی ہوتی ہیں جس کو عورتیں ہی انجام دے سکتی ہیں، چنانچہ ان کی اسی محنت و جانفشانی کو ملاحظہ فرما کر حضرت اکثر ان سے فرمایا کرتے تھے کہ بیٹی! تمہارا احسان مند ہوں کہ تم نے میری بچیوں کی پرورش کی اور گھر کو سنبھال لیا۔ اللہ تعالیٰ کا کچھ کرنا ایسا ہوا کہ حضرت اقدس کی حیات ہی میں جب درمیانی دونوں صاحبزادیوں کا وصال ہوگیا تو پھر ان کے بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال انھیں (بڑی صاحبزادی) سے متعلق رہی، بلکہ حضرت اقدس کے وصال کے بعد بھی ایک خاصی مدت تک ان کی کفالت کا تعلق حضرت قاری صاحب مدظلہٗ سے رہا۔

حضرت کی بڑی (۱) اور چھوٹی صاحبزادی بفضلہٖ تعالیٰ حضرت کی صلبی یادگار موجود ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی عمر، اولاد اور اعمال میں برکت عطا فرمائے۔

☆☆☆☆☆☆☆

(۱) جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ میں ان کا وصال ہوگیا، ان کی وفات پر میں نے ایک مضمون لکھا تھا، ملاحظہ ہو:

یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ مطابق ۱۳؍جولائی ۲۰۰۲ء بروز ہفتہ علی الصباح فون کی گھنٹی بجی، فون اٹھایا تو جامع مسجد گورکھپور کے امام وخطیب جناب مولانا قاری عبدالجلیل صاحب بول رہے تھے،

انھوں نے کہا کہ الہ آباد حضرت آپا صاحبہ کا...... اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئے اور میری زبان سے بے ساختہ نکلا کہ انتقال ہو گیا، بولے جی ہاں! تین بجے شب میں خبر آئی، إنا للہ وإنا إليه راجعون ، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں، جنت الفردوس عطا فرمائیں۔

یہ حضرت آپا صاحبہ بلکہ میری زبان میں خالہ صاحبہ، حضرت صفیہ خاتون ہیں، مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی بڑی صاحبزادی، حضرت مولانا قاری شاہ محمد مبین صاحب مدظلہ کی اہلیہ مکرمہ، عزیزان گرامی مولانا احمد متین و مولانا احمد مکین و مولانا محمد امین سلّمہم کی والدہ محترمہ! حافظِ قرآن، عابد وزاہد، شفیق ومہربان، پورے خاندان پر رحمتِ الٰہی کا سایہ، حضرت مصلح الامت کی شانِ تربیت کا ایک دلآویز نمونہ! یہ خاکسار بندہ، ان کے سایۂ عاطفت میں چار سال رہا، میں بھی رہا، میرے اہل وعیال بھی رہے، میں بھی میرے بال بچے بھی ان کی محبت وشفقت کے مسلسل مورد رہے، حضرت مصلح الامتؒ نے جو مکان وراثت میں اپنی صاحبزادیوں کیلئے چھوڑا تھا، وہ بہت وسیع تھا، اس کے ایک گوشے میں، میں اپنے چھوٹے سے خاندان سمیت مقیم تھا۔ مدرسہ میں پڑھاتا تھا، میری رہائش گاہ کا ایک دروازہ اس مکان کے صحن میں کھلتا تھا جس میں خالہ صاحبہ کی سکونت تھی، میں درسگاہ میں چلا جاتا، تو میرے بچے اور میری اہلیہ سب کی دلجوئی اور خبر گیری کرتیں، اور اولاد کی طرح معاملہ کرتیں، ہر دکھ درد کی خبر رکھتیں، ہماری خوشی سے خوش ہوتیں، اور ہماری تکلیف سے دل گیر ہوتیں، تکلیف کو دور کرنے کی تدبیریں کرتیں، میرے گھر والوں کے ساتھ، میری صحت وعافیت کا بہت اہتمام کرتیں، ان کی مہربانی وشفقت کا انداز میرے دل سے کبھی محو نہیں ہو سکتا، عجیب وغریب انداز! حضرت مصلح الامت قدس سرہٗ کے انداز شفقت کی یاد دلانے والا۔

یہ ۱۳۹۸ھ یا ۹۹ھ کی بات ہے، انگریزی ۱۹۷۸ء یا ۷۹ء رہا ہوگا، میری صحت الحمد للہ اچھی تھی، البتہ میں دبلا پتلا تھا، جسم ہڈی اور چمڑے کا ایک پنجر تھا، عمر یہی کوئی ۲۷، ۲۸ سال تھی، ایک مرتبہ حضرت مولانا قاری شاہ محمد مبین صاحب مدظلہ نے اہتمام سے اپنی بارگاہ میں طلب فرمایا، میں سمجھ گیا کہ کوئی خاص بات ضرور ہے، ورنہ حضرت عموماً طلب نہیں فرمایا کرتے تھے، بلکہ کسی وقت حاضری ہوتی تو ارشاد فرماتے یا جلدی کا کام ہوتا تو خود تکلیف فرماتے، آج طلب فرمایا تو میں ڈرتے ڈرتے حاضر ہوا!

مجھ سے مواخذہ کے انداز میں قدرے سخت لہجہ میں فرمایا کہ آپ اتنے دبلے کیوں ہیں؟ میں چکرا گیا، کوئی معقول جواب نہ بن پڑا، پھر خود ہی فرمانے لگے کہ آپ تنخواہ کی رقم طلبہ میں تقسیم کردیتے ہیں، اپنے کھانے پینے کا اہتمام نہیں کرتے، گھر والوں کا بھی خیال نہیں رکھتے، میں معذرت کررہا تھا، فرمایا کوئی معذرت نہیں، اب سے تنخواہ آپ کو نہیں دی جائے گی، ہمارے گھر میں اب آپ کی تنخواہ ملے گی، وہ اپنی منشاء کے مطابق آپ کے کھانے پینے کا انتظام کریں گی۔ آپ کو ہلکا پھلکا جیب خرچ مل جایا کرے گا، میں خوشی میں ڈوب گیا، اور محبت کے تاثر نے آنکھوں میں آنسو چھلکا دیا، میں خوشی خوشی آیا، اور اپنے گھر والوں کو بشارت سنادی، وہاں معلوم ہوا کہ خالہ کئی روز سے اس کا تذکرہ کررہی تھیں کہ فلاں کی صحت اچھی نہیں رہتی۔ تنخواہ جو ملتی ہے، اِدھر اُدھر خرچ ہوجاتی ہے، کھانے پینے کا اہتمام نہیں ہوتا۔ اب اندازہ ہوا کہ یہ کارروائی پسِ پردہ سے منصۂ شہود پر آئی تھی، چنانچہ اس پر عمل شروع ہوگیا، جو کچھ ابھی تک میں نے کبھی نہیں چکھا تھا، وہ سب کچھ ملنے لگا، صبح کے ناشتہ کا خاص اہتمام تھا، تنخواہ میری بہت کم تھی، اس میں یہ اہتمام کبھی ہو ہی نہیں سکتا تھا، اس کا بڑا حصہ حضرت خالہ صاحبہ اپنی جیب سے پورا کرتی تھیں، یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا، اور میرے جسم کا حلیہ اسی وقت سے بدلنے لگا، تھوڑے ہی دنوں میں میرے بدن پر فربہی چھا گئی، میری صحت کی طرف سے اطمینان ہوگیا تو پانچ چھ ماہ کے بعد میری تنخواہ پھر میرے ہاتھ میں آنے لگی، اس وقت سے اب تک جسم پر لاغری کا تسلط کبھی نہیں ہوا۔

وہ دور میرے اوپر تنگی کا تھا، کھانے پینے کا تو وہ حال تھا، جو ذکر ہوا، کپڑے اور لباس کا بھی ایسا ہی حال تھا کہ نہایت معمولی اور سستا کپڑا ہم لوگوں کے بدن پر ہوتا۔ ایک دن انھوں نے ارشاد فرمایا کہ عائشہ کی ماں کے پاس، کوئی اچھا کپڑا نہیں ہے، اب عید کا کپڑا میں منگواؤں گی، چنانچہ انھوں نے دو جوڑے بہت عمدہ کپڑوں کے تیار کرائے، اور چھوٹی خالہ صاحبہ نے اعلیٰ قسم کی چوڑیاں پہنائیں، اور یہ سب شعبان کی تعطیل سے پہلے انتظام کردیا، تعطیل میں نہایت خوشی خوشی گھر کیلئے رُخصت کیا، یہ دونوں جوڑے بہت بابرکت ثابت ہوئے، بہت عرصہ تک رہے، وہ انھیں پہنے دیکھتیں تو بہت دعائیں دیتیں اور خوش ہوتیں، ان کی دعاؤں اور توجہ کا اثر یہ ہوا کہ گو ویسے عمدہ جوڑے تو اب تک نصیب نہ ہوسکے اور نہ اتنی مدت تک کوئی کپڑا استعمال میں رہا، لیکن بہرحال اچھے کپڑوں کا تسلسل آج تک قائم ہے۔

جب بمبئی کا سفر ہوتا، تو میرے لئے میرے گھر والوں کیلئے ضرور تحفے لاتیں، اللہ تعالیٰ نے بڑا دل عطا فرمایا تھا، حافظ قرآن تھیں، خانقاہ میں صبح کے وقت موسم کے لحاظ سے آٹھ نو بجے سے حضرت قاری صاحب مدظلہٗ کی مجلس ہوتی تھی، اس میں پردے کا انتظام ہوتا، ایک گھنٹہ مجلس ہوتی، اس کے بعد تلاوت میں مشغول ہوجاتیں اور دیر تک یہ سلسلہ جاری رہتا، بہت پارسا اور عبادت گزار خاتون تھیں، مغرب کی نماز کے بعد دیر تک تقریباً عشاء کی نماز تک اوراد واذکار میں مشغول رہتیں۔

عرصہ سے صاحب فراش تھیں، کچھ دن پہلے غالباً ان کے فرزند مولانا احمد متین سلّمہٗ سے فون پر بات ہوئی تھی، اس وقت بے ہوشی کے عالم میں تھیں، بالآخر وقت موعود آپہونچا، جس سے دنیا میں کسی آنے والے کو مفر نہیں، روح عالم بالا کی مخلوق تھی، جسم کو چھوڑ کر حضور حق میں پہونچ گئی، اور جسم کو اس کی اصل یعنی خاک میں چھپادیا گیا۔

اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائیں، حسن ظن تو یہی ہے کہ برگزیدہ اور صاحب نسبت والد گرامی علیہ الرحمہ کی روح اپنی صاحبزادی کو پاکر بہت خوش ہوئی ہوگی۔ حضرت مصلح الامت نور اللہ مرقدہٗ کی چار صاحبزادیاں تھیں، ان میں پہلی صاحبزادی یہی بزرگ خاتون تھیں، ان کے بعد کی دو صاحبزادیاں حضرت کی حیات ہی میں وفات پاگئیں، چوتھی اور چھوٹی صاحبزادی ماشاء اللہ سلامت باکرامت ہیں، ان کی شفقتیں بھی اس خاکسار اور اس کے اہل خاندان پر بہت تھیں، سب صاحبزادیاں بہت چھوٹی تھیں کہ ان کی والدہ مکرمہ، اہلیہ حضرت شاہ صاحبؒ کا انتقال ہوگیا تھا، حضرت شاہ صاحبؒ نے بنفس نفیس سب کی پرورش کی، اور اس باب میں ان کی دست وبازو یہی بڑی صاحبزادی رہیں، حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ ممنونیت کے ساتھ اس کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ اب گھر کا یہ سایۂ رحمت اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ اس گھرانے کو ہمیشہ رحمت وکرم کے سایہ میں رکھے۔ آمین

☆☆☆☆☆☆☆☆

باب ۸

تالیفات

حضرت اقدس کا تالیفی طریقہ عام مصنفین جیسا نہ تھا، آپ نے بطور خود کوئی کتاب تحریر نہیں فرمائی۔ حضرت کے یہاں مجلس میں وعظ کا دستور تھا، کبھی کبھی ایک ہی عنوان پر مسلسل مواعظ ہوتے۔ ابتداءً آپ کا وعظ قلمبند نہیں ہوتا تھا، بعض لوگوں نے درخواست بھی کی، مگر آپ نے اجازت نہیں دی۔ فرماتے کہ حضرت تھانوی کے ملفوظات اور آپ کی تصانیف بہت کافی ہیں، انھیں کا مطالعہ کرنا چاہئے، یہ بھی فرماتے کہ میں کیا اور میری باتیں کیا کہ انھیں لکھا جائے، لیکن آپ کی مجالس میں جو نکتے، اثر انگیز باتیں اور دل ہلا دینے والے مضامین بکثرت بیان ہوتے، اہل علم حضرات کی دلی خواہش رہتی کہ ان جواہر پاروں کو صرف یہیں تک محدود نہیں رہنا چاہئے، انھیں عام کیا جائے تو ایک دنیا مستفید ہو، لیکن باوجود بار بار درخواست کرنے کے حضرت نے لکھنے کی اجازت نہیں دی۔ ایک بار مولانا ظہور الحسن صاحب سہارن پوری علیہ الرحمہ نے کسی ایسے عنوان سے درخواست کی کہ مجبوراً حضرت کو اجازت دینی پڑی، پھر تو ملفوظات کے لکھے جانے کا ایک سلسلہ چل پڑا۔

یہی مجلسی مواعظ کبھی کبھی کسی ایک ہی موضوع پر مسلسل ہوتے اور انھیں قلمبند کر کے کتابی صورت میں شائع کر دیا جاتا۔ یہ مضامین لکھ کر حضرت کو دکھائے جاتے، حضرت ان کی اصلاح فرما کر طباعت واشاعت کی اجازت عطا فرماتے۔ ان

تالیفات میں علم و تحقیق اور جذب و جوش کا عجیب امتزاج ہے، آج بھی انھیں پڑھ کر قلب پر گہرا اثر ہوتا ہے، یہ تالیفات ضخامت کے اعتبار سے کچھ بہت زیادہ نہیں ہیں، بعض بعض رسالے تو چند اوراق پر مشتمل ہیں، لیکن افادیت واہمیت کے لحاظ سے ہر ایک نادرۂ روزگار ہے۔ ہم مختصر مختصر لفظوں میں ہر ایک کا تعارف پیش کر دیتے ہیں۔

ارباب خانقاہ نے حضرت کے بعد عام افادیت کے پیش نظر کئی رسالوں کو یکجا طور پر شائع کر دیا ہے۔ اب تک اس طرح کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن میں ۵۲/رسالے آسکے ہیں، یہ مجموعے ''مجموعۂ تالیفات مصلح الامت'' حصہ اول و دوم وسوم و چہارم و پنجم کے نام سے الگ الگ دستیاب ہیں۔

مجموعۂ تالیفات، حصہ اول میں حسب ذیل بیس رسالے ہیں:

(۱) اصلاحی مضمون:

اس کا موضوع عنوان ہی سے ظاہر ہے، اس میں مسلمانوں کے اسباب زوال اور ان کی اصلاح پر عارفانہ کلام فرمایا ہے۔

(۲) فوائد الصحبۃ:

اس رسالہ میں بزرگوں کی صحبت اور ان کی ہم نشینی کی ضرورت اور اس کے فوائد پر حضرت نے اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

(۳) تلاش مرشد:

اس زمانہ کے لوگ صحبت مشائخ کے طالب تو ضرور ہیں، مگر اہل حق اور اہل باطل کے اختلاط نے سخت اشتباہ پیدا کر رکھا ہے، آدمی حیران ہو جاتا ہے کہ کس سے ربط رکھے اور کس کی صحبت میں بیٹھے۔ حضرت نے اس حیرانی کا

اس میں نہایت آسان علاج بتایا ہے۔

(۴) **عاقبۃ الانکار:**

اس دور کی آزادی اپنے ساتھ بہت کچھ لعنتیں لائی ہے، انھیں لعنتوں میں سے ایک لعنت یہ بھی ہے کہ قلوب میں دین اور اہل دین کا اعتقاد باقی نہیں رہا، بالخصوص مشائخ اور بزرگانِ دین کی جانب سے بے اعتقادی کی ایک عام لہر چل پڑی ہے، حضرت نے اس رسالہ میں اس عام بیماری کی نشاندہی اور اس کا علاج بیان فرمایا ہے۔

(۵) **اعتقاد وانکار:**

یہ رسالہ بھی سابقہ موضوع پر ہے۔

(۶) **علم کی ضرورت:**

یہ ایک دینی وعلمی مقالہ، جو مولانا شاہ وصی اللہ صاحب خلیفہ حضرت تھانویؒ نے قومی لائبریری الہ آباد کے افتتاحی جلسہ میں ارشاد فرمایا تھا۔ خلیفہ میں شیخ کا رنگ ہونا قدرتی بات ہے، چنانچہ اس مقالہ سے مواعظ اشرفی کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ علم سے مولانا کی مراد قدرۃً علم دین ہی سے ہے، اور مقالہ دیندار حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لئے جانے کے قابل ہے۔

(مولانا عبدالماجد دریابادی)

(۷) **تحذیر العلماء:**

اس رسالہ میں حضرت نے ان امراض کی تشخیص اور علاج تجویز فرمایا ہے، جن میں مبتلا ہوکر علماء اپنا اصل منصب ومقام کھو بیٹھے ہیں، نیز نفاق پر ذرا تفصیل سے کلام فرمایا ہے۔

(۸)　توقیر العلماء:

علماء کا احترام اور ان کی ایذا رسانی سے اجتناب کے موضوع پر نہایت مفید اور بے نظیر رسالہ ہے۔

(۹)　الامر الفارق بین المخلص والمنافق:

مخلص اور منافق کے درمیان امتیازی علامتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں، اس رسالہ کی روشنی میں دوست و دشمن کی شناخت سہل ہوجاتی ہے، دونوں کی شرعی کسوٹی بیان فرمادی ہے۔

(۱۰)　تواصی بالصبر:

مخالف حالات میں بالخصوص جبکہ مخلوق کی جانب سے ایذا رسانی کا سلسلہ شروع ہوجائے، ایسے وقت کا دستور العمل۔

(۱۱)　ادائے حقوق:

مسلمانوں کے معاشرہ میں جہاں بہت سی غیر شرعی چیزیں داخل ہوکر ماحول کو بگاڑ رہی ہیں۔ انھیں میں ایک قرض لے کر ہضم کر جانا ہے، حضرت نے اس مرض کے لئے داروئے شفاء تجویز فرمایا ہے۔

(۱۲)　ارتفاع الضیق:

اس رسالہ حضرت اقدس نے دوستی اور دشمنی کا شرعی اصول بیان کیا ہے، اور عقلی و نقلی دلائل کی روشنی میں یہ ثابت فرمایا ہے کہ اسی معیار کے نہ اختیار کرنے سے آج مسلمان گوناگوں دینی و دنیوی پریشانیوں میں مبتلا ہیں، اور طرح طرح کے نقصانات کے شکار ہیں۔ اصلاحِ معاش و معاد کے لئے

اس دینی معیار کا برتنا ضروری ہے۔

(۱۳) مضمون نمیمہ:

چغلی کی شناعت وقباحت پر شاہکار ہے۔

(۱۴) نعم الامیر علیٰ باب الفقیر:

مالدار شخص خداوند عالم کا محبوب ومقبول کیونکر بنے، قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی تدبیر بیان کی گئی ہے۔

(۱۵) النعم علی خیر الامم:

امت محمدیہ پر خدا کے انعامات بیان کر کے طاعت کی ترغیب۔

(۱۶) طریقۂ اصلاح:

نام سے موضوع ظاہر ہے۔

(۱۷) طریقۂ کار:

سابقہ عنوان پر یہ بھی رسالہ ہے۔

(۱۸) تمسک بالسنۃ:

من تمسک بسنتی عند فساد أمتی فله أجر مائة شهيد (جس نے امت کے بگاڑ کے وقت میرے طریقہ کو مضبوط پکڑا، اس کیلئے سوشہیدوں کا ثواب ہے) کی بے نظیر شرح وتفسیر۔

(۱۹) مژدۂ جانفزا:

تمسک بالسنۃ ہی کے موضوع پر یہ رسالہ بھی ہے۔

(۲۰) عباد الرحمٰن کون لوگ ہیں؟:

اللہ کے واقعی بندے جن کی قرآن میں خدا نے خود مدح فرمائی ہے، ان کی

علامات بالخصوص ان کی یہ دعا: رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَاماً، اس پر مفصل کلام ہے۔

مجموعۂ تالیفات حصہ دوم میں حسب ذیل چودہ رسالے شامل ہیں۔

(۱) مفتاح الرحمۃ:

رسول اللہ ﷺ خاتم نبوت ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، اس لئے قیامت تک آنے والے انسانوں کی تمام ضروریات میں آپ نے قیمتی ہدایات کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے، انھیں قیمتی ذخیروں میں آپ کی دعائیں بھی ہیں، جن میں آپ نے رب العالمین سے تمام دینی ودنیوی ضرورتوں کا سوال فرمایا ہے، اور درحقیقت آپ نے امت کو اپنے پروردگار سے مانگنے کا سلیقہ سکھایا ہے، اس موضوع پر نہایت وجد آفریں، شوق انگیز اور ایمان افروز رسالہ ہے۔

(۲) راہِ صفا:

مفتاح الرحمۃ کا ضمیمہ اور اسی موضوع پر ہے۔

(۳) خوفِ آخرت:

خوفِ آخرت کے سلسلے میں حضرات انبیاء واولیاء کی سیرت پیش فرما کر دلوں میں فکر آخرت پیدا فرمائی ہے۔

(۴) ایقاظ الافکار بذکر الجنۃ والنار:

جنت اور جہنم کے تذکرے پر مشتمل آیات واحادیث کا ترجمہ وتشریح بیان فرما کر ایمان میں تازگی پیدا کرنے کی سعی مشکور۔

(۵) **اعترافِ ذنوب:**

گناہوں کا اقرار واعتراف بھی سنت نبوی ہے اور طاعت میں داخل ۔اس کے برخلاف طاعت پرزعم و پندار مہلک ہے اور عابد کے حق میں سم قاتل ۔ اس موضوع پرنہایت مؤثر اور ایمان افروز رسالہ ہے۔اس کتاب کو پڑھ کر پتھر جیسا دل بھی موم ہو جائے۔

(۶) **الاصول النادرۃ:**

اس رسالہ میں حضرت اقدس نے وہ اصول بیان فرمائے ہیں جن کی رعایت،تبلیغ کے اثر کو پائیدار بنانے کیلئے نہایت ضروری ہے۔

(۷) **ایجادات کی حقیقت:**

حضرت والا کے ارشادات وملفوظات کے ضبط میں دشواری دیکھ کر بعض حضرات کے مشورے اور حضرت اقدس کی رضامندی کے بعد آواز ضبط کرنے کا آلہ ٹیپ ریکارڈ کا انتظام کیا گیا، پہلے دن جب ٹیپ ریکارڈ مجلس میں لایا گیا تو حضرت والا نے معاً یہ آیت تلاوت کی: **وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّافِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَاالْكِتَابِ لَايُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا الخ** ۔اور نہایت مؤثر انداز میں اس کی تفسیر فرماتے ہوئے ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی،اور آخرت، بعث ونشر اور وہاں کے حساب وکتاب کو ایسا یاد دلایا کہ گویا قیامت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کردیا،اور کئی روز تک مسلسل یہ مضمون بیان فرماتے رہے، نیز جن شرعی باتوں کو آج اہل دنیا بعید سمجھتے ہیں، ان کو انھیں ایجاداتِ نو سے سمجھانے کی کوشش فرمائی۔اور اسی آلہ کو ضبط اعمال کی

نظیر میں پیش فرمایا کہ جس طرح یہ آلہ ہر بات کو محفوظ کرلیتا ہے اسی طرح منجانب اللہ ملائکہ مامور ہیں، جو تمام اعمال کو ضبط کرتے رہتے ہیں، جن کو بروز قیامت من وعن پیش کریں گے۔ نہایت ایمان افروز مواعظ کا مجموعہ ہے۔

(۸) حج رب البیت:

بزرگانِ دین کے ملفوظات اوران کی عبارات میں اس قسم کا مضمون پایا جاتا ہے، جس سے ظاہر بینوں کو کچھ توحش ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ بعض لوگ غیر معتقد بھی ہوجاتے ہوں، ایسے اقوال اگر فرقۂ باطنیہ سے صادر ہوں تو قابل انکار ورد ہوں گے اور اگر کسی متبع سنت سے منقول ہوں تو فوراً انکار نہیں کرنا چاہئے، اس سلسلے کے بعض ملفوظات بزرگوں سے حج کے متعلق بھی منقول ہیں، جن کا ظاہر وحشتناک ہے، حضرت نے ان کا صحیح مطلب واضح کیا، اور اس ضمن میں حج کی حقیقی روح سے بھی روشناس کرایا ہے۔

(۹) مضمون طہارت:

عنوان سے موضوع ظاہر ہے۔

(۱۰) مضمون اخوت:

حضرت والا کی مجلسی تقریر ہے، جو انجمن اصلاح المسلمین الہ آباد کے ایک سالانہ جلسہ میں پڑھ کر سنائی گئی، اس میں باہمی اخوت ودوستی کی اہمیت کو ایک نئے انداز سے سمجھایا گیا ہے۔

(۱۱) تعلیم وتربیت اولاد:

عنوان خود دلیل موضوع ہے۔

(۱۲) **سعادت حقیقیہ:**

رسول اللہ ﷺ کی ایک نہایت اہم اور کارآمد وصیت کی روشنی میں انسان کیلئے حقیقی سعادت کی راہ اس رسالہ میں واضح کی گئی ہے، حرزِ جان بنانے کے قابل ہے۔

(۱۳) **جنت:**

جنت مسلمانوں کا اصلی وطن ہے، اللہ ورسول نے قرآن وحدیث میں اس کی بہت ترغیب دی ہے، لیکن وہاں تک پہونچنے کا راستہ ذرا دشوار ہے، اسی لئے اس کی طلب میں سستی ہورہی ہے، اس رسالہ کا بغور مطالعہ دل میں طلبِ جنت کا نیا ذوق وشوق پیدا کرے گا۔

(۱۴) **اتباعِ سنت:**

رسالہ کی اہمیت عنوان سے ظاہر ہے۔

مجموعۂ تالیفات حصہ سوم میں حسب ذیل دس رسالے شامل ہیں۔

(۱) **مضمونِ ذکر:**

ذکر کی حقیقت، اہمیت اور اس کی نافعیت، نیز یہ کہ ذکر کیونکر کرنا چاہئے؟ اس موضوع پر ایک محققانہ اور مفید رسالہ ہے۔

(۲) **وصیۃ الذکر:**

سابقہ موضوع پر مزید محققانہ اور عارفانہ کلام۔

(۳) **ذکر اللہ تعالیٰ:**

ذکر ہی کے موضوع پر ایک اور نادر رسالہ۔

(۴) التذکیر بالقرآن:

رفیق محترم مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی گذشتہ مہینہ الہ آباد تشریف لے گئے تھے، جہاں ان کو ایک تقریر کرنی تھی، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب مدظلہ کچھ عرصہ سے الہ آباد ہی میں مقیم ہیں۔ موصوف حضرت ممدوح کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے، اس صحبت میں حضرت ممدوح نے وعظ وتقریر کے متعلق کچھ ارشاد فرمایا، جس کا مقصد یہ تھا کہ سب سے زیادہ مؤثر تذکیر بالقرآن ہے، لیکن اب اس کا رواج بہت کم ہوگیا، مولانا ندوی نے استدعا کی کہ اس مضمون کو قلمبند کردیا جائے، چند روز کے بعد حضرت مولانا کا ایک گرامی نامہ مولانا ندوی کے نام آیا، اس کی اصل حیثیت مضمون یا مقالے کی نہیں بلکہ مکتوب کی تھی۔ (مولانا محمد منظور نعمانی)

یہ مقالہ اہل علم کے لئے خاص طور سے لائق مطالعہ ہے۔

(۵) تلاوت قرآن:

حضرت اقدس کو قرآن اور تلاوت قرآن سے صرف لگاؤ نہیں بلکہ بے انتہا عشق تھا، خود بھی دن رات تلاوت فرماتے رہتے تھے اور اپنے متوسلین کو بھی خاص طور پر تلاوت اور تعلق بالقرآن کی تاکید فرماتے۔ اس رسالہ میں آپ کے جوش عشق اور قلبی تڑپ نے الفاظ کا پیکر اختیار کرلیا ہے، بہت سے حضرات کا تجربہ ہے کہ طبیعت میں تلاوت کی جانب سے کبھی بے رغبتی پیدا ہوجاتی ہے تو اس رسالہ کے مطالعہ کے بعد نیا ذوق وشوق حاصل ہوجاتا ہے۔

(۶) وصیۃ التلاوۃ:

بمبئی کا پہلا سفر حضرت والا نے اکتوبر ۱۹۶۳ء میں فرمایا تھا۔ دس گیارہ روز

تک قیام رہا، دورانِ قیام میں آپ کے مواعظ ہوتے رہے۔ یہ رسالہ پانچ وعظوں کا مجموعہ ہے، عجیب وغریب مضامین پر مشتمل ہے۔

(۷) ذکر اللہ عزوجل:

ذکر کے موضوع پر ایک اور اثر آفریں رسالہ۔

(۸) مضمون تہجد:

تہجد کی فضیلت وترغیب اور بسہولت ادا ہونے کی تدبیر پر مشتمل ایک مختصر مگر نہایت مؤثر رسالہ ہے۔

(۹) مسنون دعائیں:

اس رسالہ میں رسول اللہ ﷺ سے منقول چند دعائیں نقل کی گئی ہیں، مختصر ہونے کی وجہ سے ہر شخص اسے روزانہ کا ورد بنا سکتا ہے۔

(۱۰) وصیۃ السالکین:

یہ وہی رسالہ جسے ہم جزوِ سوانح بنا چکے ہیں۔

مجموعۂ تالیفات حصہ چہارم میں چار کتابیں شامل ہیں۔

(۱) وصیۃ الاخلاص:

یہ رسالہ حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کی درخواست پر لکھا گیا ہے، شروع میں علم اور علماء کی فضیلت واہمیت اور پھر اخلاص کی ضرورت اور فوائد پر حضرت والا نے اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اپنے موضوع پر بے مثال رسالہ ہے۔

(۲) تصوف ونسبت صوفیہ:

تصوف کے تعارف وتشریح کے باب میں نہایت عمدہ اور کارآمد مضامین پر

مشتمل یہ رسالہ ہے، اس کتاب میں تصوف اور صوفیہ کی نصرت کا حق ادا کردیا گیا ہے، اس سلسلے میں عام طور پر لوگوں کے ذہن و دماغ میں جو غلط فہمیاں راہ پاگئی ہیں، ان سب کا ازالہ کردیا گیا ہے، اور نہایت تحقیق اور شرح وبسط کے ساتھ یہ سمجھایا گیا ہے کہ نسبت صوفیہ عین قرآن وسنت کے مطابق ہے، بلکہ بعینہ یہ نسبت رسول اللہ ﷺ سے چلی آرہی ہے۔

(۳) وصیۃ السنۃ: (۴) بشریت کی راہ سے ترقی:

یہ دونوں رسالے سنت نبوی کی اہمیت اور اس کی اتباع کی فضیلت پر ہیں، حضرت والا نے نہایت والہانہ انداز میں اتباعِ سنت کے فوائد پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ آدمی، آدمیت کے تقاضوں کی ادائیگی ہی کی راہ سے خدا تک بآسانی پہونچ سکتا ہے، بشرطیکہ حضور کے نقش قدم پر چلتا رہے۔ اس رسالہ کے مطالعہ کے بعد ضعیف الہمت انسان بھی اپنے اندر اتباع شریعت کا حوصلہ پانے لگتا ہے۔

مجموعۂ تالیفات حصہ پنجم میں حسب ذیل چار کتابیں شامل ہیں۔

(۱) وصیۃ الاحسان:

یہ حضرت اقدس کے ملفوظات کا ایک مجموعہ ہے، جس میں صرف مرضِ نفاق سے متعلق مضامین کا بیان ہے، کتاب کے مقدمہ میں نفاق کی تعریف، اس کے اقسام اور اس کے جمیع مالہ وماعلیہ پر سیر حاصل کلام کیا گیا ہے، بہت مفید تالیف ہے۔

(۲) وصیۃ الاخلاق:

حضرت والا کی بے نظیر تصنیف ہے، اس میں سالکین کو سلوک کی ترتیب بتائی

گئی ہے، کہ پہلے اصلاح ظاہر ہے، اور پھر اصلاحِ باطن، نیز اخلاق کی تعریف، اقسام اور اس کا صحیح مقام بتایا گیا ہے، اور تلاوت قرآن کا مضمون تو اس میں وجد آفریں ہے۔

(۳) ضمیمہ تلاوت قرآن:

تلاوت کے موضوع پر ارشادات کا مجموعہ ہے۔

(۴) اخوت حصہ دوم:

اخوت کے سلسلہ میں مزید ارشادات کا مجموعہ۔

یہ کل باون رسالے ہیں، ان میں بجز چند ایک کے سب الگ الگ کتابی صورت میں حضرت کی حیاتِ مبارکہ میں شائع ہو چکے ہیں، لیکن بیشتر اب نایاب ہو چکے تھے، سہولت کے واسطے پانچ حصوں میں شائع کئے جا چکے ہیں۔ ان کے علاوہ مجالس و مواعظ کا ایک بڑا ذخیرہ ہے، جن کے مطالعہ سے ایمان میں حرارت، عمل کا شوق، آخرت کی فکر اور دنیا سے بے رغبتی پیدا ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت کی زبانِ فیض ترجمان سے نکلا ہوا ہر لفظ شریعت و طریقت کا ترجمان ہے، اور اس لائق ہے کہ اسے حرزِ جان بنالیا جائے۔

☆☆☆☆☆☆☆

چار ہفتہ ایک کہف میں

مولانا عبدالباری ندوی علیہ الرحمہ (خلیفہ حضرت حکیم الامتؒ)

ہم نے وعدہ کیا تھا کہ آخر کتاب میں حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی کا مکتوب نقل کریں گے جو مولانا نے فتح پور تشریف لانے کے بعد مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کو تحریر فرمایا تھا، چنانچہ وہ پیش خدمت ہے۔

مخدوم! **السلام علیکم**

ایک بزرگ کی خدمت میں تازہ حاضری کے کچھ مشاہدات وتاثرات عرض ہیں، ان شاء اللہ صادقین صدق کو کچھ نہ کچھ نافع ہوں گے۔

تھانہ بھون کا چمن جب سے اجڑا، اس آوارہ ونا کارہ کو اپنی شامت اعمال سے بھاگنے اور پناہ لینے کیلئے کوئی گوشہ نہ ملتا تھا، کبھی کبھی بے قراری میں دوسرے حلقوں کی طرف نگاہ دوڑائی، مگر تھانہ بھون نے نظر ایسی بگاڑ دی ہے کہ معاملہ ''چشم بدبیں نہ کند بکس نگاہے'' ہی کا رہا۔ ادھر آپ جانتے ہیں کہ بعض اسباب نے شدت اضطرار کی صورت پیدا کی، کہیں نہ کہیں فرار سے چارۂ کار نہ رہا۔ انتظار شاید اسی ''المضطر إذا دعاہ'' والے اضطرار کا تھا۔

تا نہ گرید طفل کے جوشد لبن

(جب تک بچہ نہ روئے چھاتی میں دودھ کا بال کیسے ہو)

آپ ہی آپ کہنا چاہیئے کہ بالکل الہاماً، نام ذہن میں مولانا وصی اللہ صاحب فتح پورتال نرجا، ضلع اعظم گڈھ کا آیا، کوئی ملاقات یا نیم ملاقات کیا، صورت تک کبھی دیکھنا یاد نہ آرہی تھی، لیکن خیال آنا تھا کہ زیارت کا تقاضا قلب میں تیز ہوتا ہی گیا۔ ابتداء نیم زیارت سے کی، خصوصیت سے بعض ناموافق دنیوی حالات عرض کئے، جو اس اضطرار کے ظاہری باعث اور فرار کے محرک ہورہے تھے۔ جواب کیا آیا کہ کسی نے آگ پر برف رکھ دی۔

"دنیا میں اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا مدار دنیا کے ہونے نہ ہونے پر نہیں، ممکن ہے کہ دنیا موافق ہو اور اللہ تعالیٰ ناراض ہوں، اور دنیا موافق نہ ہو لیکن اللہ تعالیٰ راضی ہوں، لیکن ہم لوگ ضعیف ہیں اس لئے دعاء فلاح دارین کی کرنی چاہیئے، میں بھی کرتا ہوں۔"

بات بالکل موٹی ہے، تاہم استحضار خواص اہل علم وصلاح کو بھی اس کا کم ہی رہتا ہے، لیکن حضرت حکیم الامت کی تعلیم وتربیت میں گوناگوں حکیمانہ عنوانات سے یہ سبق اتنا رٹایا جاتا تھا کہ اس غافل وغبی کو بھی ذہول ہرگز نہ ہوتا تھا، خود اپنے اور دوسروں کے لئے اس کی فہم وتفہیم سے کچھ نہ کچھ تسکین وتسلی کا سامان ہوتا ہی رہتا تھا، مگر مکتوبِ بالا سے جیسی خنکی قلب کو نصیب ہوئی، اس نے ایسے مواقع کے تھانوی مکتوبات کی تاثیر وتسلی کی یاد تازہ کردی۔

اوراد ووظائف وغیرہا کی اجازت کا بزرگوں میں جو ایک دستور چلا آرہا ہے، مجھ کو تو اس کی بنا بھی کچھ یہی حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ قول وتعلیم میں قائل ومعلم کے مرتبہ ومقام کی جو تاثیری برکت ہوتی ہے، وہی نوعیت اس اجازتی نسبت کی بھی ہے۔

والعلم عند اللہ

معلم ومربی کی شخصیت ہی کی دوسری زیادہ محسوس ومشاہد کرامت ملاحظہ ہو:

نالائق زادوں کی نالائقیوں سے آپ واقف ہی ہیں، اپنی والی اصلاح ودرستی کی کوئی فکر وتدبیر اٹھا نہیں رکھی۔ تھانوی وغیر تھانوی دونوں رنگ کے بعض مدرسوں اور مربیوں کی اس بدحال کے حال پر خاص عنایت وشفقت ہے، اس کا حق مہینوں اور برسوں نالائق زادوں کے حق میں بھی انھوں نے ادا فرمایا (جزاھم اللہ عنی وعنھم) مگر معلوم ایسا ہوتا رہا کہ ہر تریاق زہر کے اثر کو تیز کرتا چلا جا رہا ہے، برا بھلا ایمان رکھ کر اللہ تعالیٰ سے تو کیسے مایوس ہوتا، لیکن اسباب وتدابیر سے ہار قطعاً مان چکا تھا، جی میں آیا کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان نالائقوں کی اصلاح کا وسیلہ اپنے اس خاص وصی اللہ ہی کی وصیتِ تقویٰ (أوصیکم بتقوی اللہ) کو ٹھہرا رکھا ہو، سب کی انتہائی نالائقیوں کا کچا چٹھا لکھ بھیجا۔ ایسی انتہائی جن کی بدولت قریب کے قریب عزیز بھی روادار نہ تھے کہ ان کے قریب کھڑے ہوں، اندیشہ تھا اور بالکل واجبی تھا کہ مولانا بھی اپنے مدرسہ وخانقاہ کی فضا مسموم کرنا کیسے پسند فرمائیں گے، ساتھ ہی ساتھ صاف صاف لکھنا بھی ناگزیر تھا، کہ کوئی دھوکا یا غلط فہمی نہ رہے، جواب مختصر تھا لیکن حق تعالیٰ پر توکل واعتماد کا پورا غماز اور جلد از جلد بھیج دینے کی ہدایت!

بسم اللہ پہلے ایک سے کی اور صرف ایک چلہ کے لئے، واپسی پر دوسرے کی ہمت کی، جو پورا حافظ ہو چکنے اور محراب سنا چکنے کے بعد اتنا بگڑا تھا کہ کہیں ٹھہرتا ہی نہ تھا۔ ایک ابتدائی اچھے اور ایسے مدرسے میں بھیجا جہاں کے مہتمم اور اساتذہ راقم ہٰذا کے ساتھ خصوصی عنایت ومحبت کا معاملہ رکھتے ہیں، بالآخر وہاں سے بھاگا، کئی بار سمجھا بجھا کر بھیجا گیا، ہر بار بھاگا، کبھی راستہ ہی سے اور کبھی پہونچ کر، اور سال بھر سے تو اب آوارہ گرد ہی تھا، جب تک مولانا کے قلم سے فتح پور پہونچ جانے کی رسید نہ آئی برابر

احتمال رہا کہ راستہ ہی سے کسی اور طرف کا راستہ نہ لیا ہو۔ خیال تھا کہ کم از کم دو مہینے ٹک جاتا تو پہلے کے تجربہ سے اتنی امید پڑ چکی تھی کہ ان شاء اللہ غیر متاثر یہ بھی نہ رہے گا۔ ایک مہینہ ہی ہوا ہوگا کہ خود ہی خواہش کی، ایک سال اور رہنے دیا جائے، غرض راستہ دونوں کا الحمد للہ بدلا معلوم ہوتا ہے۔ رفتار تبدیلی کی سست البتہ بہت ہے، دل ساتھ دے نہ دے، زبان پر سالہا سال سے حقیقی مربی کی سکھائی ہوئی دعاء تو جاری رہی ہے:

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَاماً۔

بہر حال دونوں کے معاملہ میں اس خلافِ امید کیا بالکل کراماتی تجربہ نے خود اپنا شوقِ زیارت قدرۃً بڑھا دیا، اور یہ تصور و توقع باندھ کر حاضر ہو ہی گیا کہ ؎

چونکہ گل رفت و گلستاں شد خراب
بوئے گل را از کہ جوئیم جز گلاب

حاضری پورے ایک مہینہ رہی، تھانہ بھون کے اجڑے ہوئے گلستاں کی بوئے گل سے فتح پوری گلاب تصور و توقع سے بڑھ کر متاعِ جان کو معطر کرتا رہا۔ بارک اللہ فی برکاتہما۔

مہینہ بھی دن رات کی برکتوں والا، رمضان مبارک کا تھا، عام مسجدوں میں ہمارے عام اماموں اور مقتدیوں کی جہالت کی بدولت نماز و جماعت کی جو گت ہوتی ہے، اس کے زخم رسیدہ شاید آپ بھی کم نہیں، اور یہ کم ظرف تو مسجد کی حاضری کا بس فرض ہی اتارتا ہے۔ خصوصاً رمضان میں قیام وتراویح کی گت کیا ایسی درگت ہوتی ہے کہ بارہا مسجد کی تراویح کو دور ہی سے سلام کرنا پڑتا ہے، یا ہو پاتا ہے تو گھر میں انتظام ہو جاتا ہے، لیکن فتح پور میں اس برکتوں بھرے مہینہ کی جیسی جیسی ظاہری و باطنی برکتیں محسوس و مشاہد ہوئیں، زندگی میں یاد نہیں۔ سو ڈیڑھ سو بلکہ دو دو سو تک کی جماعت عوام کی نہیں، علماء و صلحاء، ذاکرین و شاغلین کی، اور امام (مولانا مدظلہٗ کے داماد)

قاری محمد مبین سلّمہٗ کا تو کہنا ہی کیا، ماشاء اللہ چہرہ باطنی وبطنی آثارِ سعادت کا آئینہ، بہت ہی نمایاں ''اثر السجود'' سے پُرانوار، رفتاروگفتار میں سراپا عجز وانکسار، نماز میں قرأت بالکل دل کی آواز، یہ بے بہرہ ساتھ ہی خاصا بہرہ، آواز کے سوا الفاظ کم ہی سن پاتا تھا، لیکن نفس تکبیر، اللہ اکبر ہی کی لذت وحلاوت ایسی کہ آج تک کانوں میں بسی ہے، ترویحہ کا حق بھی پورا ادا ہوتا ہے، جتنا قیام کم وبیش اتنی ہی استراحت، نہ مزدور حافظوں کی ''یعلمون تعلمون'' والی دوڑ بھاگ، کہ ایک کا بوجھ اتارا اور مزدوری وصول کرکے دوسری کے لئے بے تاب، نہ سننے والے ہی کسی نہ کسی طرح بس ایک ختم کی بے گار جلد از جلد پوری کرکے مٹھائی چراغاں کا تماشہ دیکھ دکھلا کر آمادۂ فرار!

کم ازکم ایک پارہ کا اوسط رہا، ۲۸ر کو ختم ہوا، نہ ختم کی مٹھائی، نہ چراغاں کا تماشہ، نہ مٹھائی اور تماشہ والے نئے نئے نمازیوں کی بھیڑ بھاڑ، نہ نماز کے دوران ہی سے نماز برباد کرنے والا مسجد کے اندر باہر بچوں اور عورتوں کا شور وشغب، اس سب کی جگہ عاجزی وبندگی والی عبادت وعبودیت کا یہ نظارہ کہ ختم کے بعد دعاء میں امام سلّمہٗ پر رقت وگریہ کا کچھ ایسا عالم طاری ہوا کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ساری صفیں زاروقطار رورہی تھیں، آہ وبکا سے مسجد کے در ودیوار گونج رہے تھے ع

حالتے رفت کہ محراب بہ فریاد آمد

۱۰/۱۵ر منٹ تک یہی حالت رہی ہوگی، اور بڑھتی ہی جارہی تھی، غالباً حد سے بڑھتی دیکھ کر آخر خود مولانا ہی نے حکیمانہ وحاکمانہ لہجہ میں فرمایا کہ ''بس مبین بس''

عجب نرالا رنگ، نہ دوکاندارانہ پیری مریدی، نہ رائج الوقت قسم کا کوئی ادارہ وانجمن، نہ مدرسہ نہ مرکز، نہ جلسہ وخطابت، نہ انشاپردازی نہ انشا گفتاری، نہ اعلانی واشتہاری تبلیغ ودعوت، نہ زبردستی لوگوں کی گھیر گھار، بلکہ دینی واخلاقی، ظاہری

وباطنی ہرطرح کی کوتاہیوں اورخامیوں پر أوصیکم بتقوی اللہ کی گرج وپکار، مواخذہ وگرفت، گھڑکیاں اور جھڑکیاں۔جگہ کوئی بڑا چھوٹا شہر یا قصبہ تک نہیں کہ آنے جانے والے ہی محفل کی رونق بڑھا رہے ہوں بجز دیہات، کوردہ، نہ ریل نہ سڑک، نہ سواری، ڈاکخانہ ندارد، اگر خود اپنا اخبار نہ جاتا تو اخبار تک کی صورت نہ دکھائی پڑتی، گویا کہ بیسویں صدی کا کہف، لیکن مخلوق ہے کہ دور ونزدیک چھوٹی بڑی بستیوں ہی سے نہیں دوسرے صوبوں تک سے جوق درجوق اس کہف کی طرف بھوکی پیاسی روزہ رکھے مئی کی چلچلاتی دھوپ اور لو میں زیادہ تر پیدل یا سائیکلوں پر کھچی دوڑی چلی آرہی ہے، روزانہ رمضان بھر یہی تانتا بندھا دیکھتا رہا، عوام بھی خواص بھی، امیر بھی غریب بھی، جوان بھی بوڑھے بھی، نئے بھی پرانے بھی، ڈاکٹر بھی طبیب بھی، دس دس پندرہ پندرہ تک اوسط تو خالی علماء کا ہی رہتا تھا، اس دورافتادہ ویرانہ میں خلقت کی یہ کشش سوا اس کے اور کیا کہا جائے کہ:

ہر کجا بوئے خلق می آید | خلق بیں کہ بے سروپا می آید

ظاہری رنگ اس بوئے خدا کا ذرا جذب وجوش اور جلال وکمال کا ہے مگر باتیں ماشاء اللہ خوب ہوش وکمال کی، سالک مجذوب کی بڑی دلکش جامعیت وشخصیت! نکلا تو تھا زیادہ تر کچھ تھانوی شخصیت، تعلیم وتربیت کی امید لگا کر، لیکن پائی ساتھ ساتھ حکیم الامت کے حکیمانہ وعارفانہ علوم کی شان بھی، اس کی زبردست توثیق اپنوں سے بڑھ کر پرایوں کے محبّ واعز واکرم مولانا علی میاں سلّمہٗ کی شہادت ہے، جو بڑی حد تک بالکل ایک دوسرے مذاق ومسلک کے بزرگ سے وابستہ وفیضیاب رہے ہیں۔

احقر کے دورانِ قیام ہی میں ممدوح کا ایک مکتوب مولانا مدظلہٗ کی خدمت میں گیا۔اصل درخواست تو ماہِ مبارک (رمضان) میں خود اپنے حق میں خاص دعاؤں

کی تھی، ضمناً حضرت مولانا کے علوم وافادات سے اپنی مناسبت واستفادہ کا بھی ذکر بطور خاص ہی تھا۔ علم وفضل کے گوناگوں کمالات کے باوصف موصوف سلّمہٗ کا رنگ ہی دوسرا ہے، اس لئے تھانوی رنگ کے کسی بزرگ سے اتنی مناسبت پر کچھ حیرت کے ساتھ مجھ کو مسرت زیادہ ہوئی، اس کا اظہار بے ساختہ فتح پور ہی سے ایک نیاز نامہ میں کیا تھا، جواب لکھنؤ کی واپسی پر توثیق مزید کا وہی ملا کہ واقعی مولانا مدظلہٗ کی خدمت میں دوبار حاضری ہوئی اور ان کے علوم وافادات سے مناسبت معلوم ہوئی، اور بہت مخلصانہ وعارفانہ باتیں معلوم ہوئیں، اللہ تعالیٰ ان کی ذات بابرکات کو تا دیر سلامت رکھے! ایک معاملہ میں حضرت فتح پوری اپنے مرشد اعلیٰ حضرت تھانویؒ سے آگے ہی نظر آئے، یعنی کتابوں پر بھی بڑی نظر ہے، اخلاق محسنی، سکندر نامہ تک پر، تفسیر وحدیث اور فقہ کے متداول کتابوں کا تو ذکر ہی کیا۔

باقاعدہ درس بھی ہوتا ہے، ایک دو نہیں روزانہ چھ چھ سبق، رمضان شریف کی وجہ سے یہ سلسلہ بند تھا، ورنہ شرکت کی سعادت ضرور حاصل کرتا۔ البتہ حضرت ممدوح کا جو عام رنگ ہے اس سے قیاس ہوتا ہے کہ آج کل کے دینی مدارس کی طرح خالی کتاب کی تعلیم وتفہیم، شروح وحواشی کی ردّ وقدح پر قناعت نہ فرمائی جاتی ہوگی، بلکہ دینی تعلیم کی عملی روح وباطنی پہلو قلب وقالب دونوں کی اصلاح اور خدا وآخرت سے تعلق پر بھی ساتھ ساتھ پورا زور دیا جاتا ہوگا کہ اسی کی کمی نے نام نہاد دینی تعلیم پر بھی دنیوی رنگ چڑھا دیا ہے۔ کتابوں کی الماریاں مجلس میں سامنے رکھی ہیں، ذرا کوئی اہم بات ہوئی فوراً کتاب نکالتے نکلواتے اور سند وشہادت پیش ہوجاتی ہے، کثرت سے کتابوں میں نشانیاں رکھی ہوتی ہیں، مطلوب مقام بات کی بات میں نکالتے ہیں، مجلس میں بہت محققانہ وعارفانہ ہی نہیں بڑے بڑے پتہ کی کارآمد باتیں ہاتھ آتی رہتی ہیں،

خصوصاً طالبین وسالکین کے لئے اور کم وبیش سب کی تائید وتوثیق اگلے پچھلے مسلّم اکابر کی کتابوں اور سندوں سے فرماتے جاتے ہیں۔ ع

صلاح کار کجا ومن خراب کجا

یہ سیہ کار وتباہ کار، ظاہر اور اس سے بڑھ کر باطن کا کورا ہی کورا ہے، البتہ کچھ اللہ والوں ہی کی صحبت میں صالحین کی صحبت ضرور نصیب ہوگئی ہے، **أحب الصالحين ولست منهم** کا پورا مصداق ہوں، اور **أحب الصالحين** ہی کے طفیل میں **ولست منهم** کا تھوڑا بہت غم بھی کھاتا رہتا ہوں، مگر اس سے نہ کوئی خاص تسلی نہ اس کی کوئی خاص قدر کہ اپنی ناکامی ونارسائی کی حسرت بھی حق تعالیٰ کی بڑی قابل قدر نعمت ہی ہے، ع

بلا بودے اگر ایں ہم نہ بودے

ایک مجلس میں کچھ اس حسرت ودرد کی راہ سے اہل طلب وسلوک کی تسلی فرمائیاں ہورہی تھیں کہ مکتوبات رشیدیہ (حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ) نکال کر ایک مکتوب کا یہ وجد آفریں ٹکڑا سنانے لگے کہ ہمارے شیخ الشیوخ قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو بعد مجاہدہ ہزار سالہ حسرت ودرد نایافت حاصل ہوجائے تو سب کچھ حاصل ہوگیا، ہائے افسوس کی درد نایافت .... نہیں ملتا کہ کام ہوجائے، اس مفلس وکنگال کو تو جیسے بے شان وگمان کوئی بڑا خزانہ ہاتھ آگیا، گھنٹوں حضرت عطار کا ایک مصرعہ دعا والتجا بن کر بے ساختہ زبان پر جاری رہا کہ اے بارِ الٰہا! کسی یافت کے لائق تو یہ سراپا نالائق کیا ہوگا، نایافت کے درد وغم ہی کے ایک ذرہ سے مرتے دم تک نواز دیتے۔

ذرۂ درد دے دلِ عطار را

خیر یہ تو اہل طلب کے مطلب کی ایک بڑی قیمتی بات اور قابل قدر نعمت یاد آگئی، ورنہ حضرت فتح پوری کی ذاتِ بابرکات میں بعض باتیں تو ایسی جمع پائیں جو اپنے مرشد اعلیٰ حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے نادر الوجود کمالات کا ہو بہو نقشہ آنکھوں کے سامنے کر دیتی ہیں۔

(۱) سب سے بڑھ کر تو **لا أسئلکم علیه من أجر إن أجری إلا علی الله** کا انبیائی ورثہ ہے یعنی خدمت دین وخلق کے سلسلہ میں تعلق حق پر مبنی ایسا قلبی توکل وغنائے تام کہ مخلوق کے کسی جاہی ومالی دباؤ کا قلب پر اثر کیا شائبۂ اثر بھی پورے ایک مہینہ کی خلوت وجلوت کی حاضریوں میں یہ چشم بدبیں ڈھونڈ کر بھی نہ پاسکی۔

(۲) اسی کا دوسرا لازم، احکام دین کی تعلیم وتبلیغ میں **فَاصْدَعْ بِمَا تُؤمَرُ** (اے محمد جو کچھ تم کو حکم دیا گیا ہے بے لاگ لپیٹ کھل کر کہہ دو) کے وہ مظاہر وآثار تھے جن سے مشکل ہی سے کوئی مجلس خالی جاتی ہوگی، کسی طرح لاگ لپیٹ اور مداہنت کیا معنیٰ، معلوم ہی نہیں ہوتا کہ بڑوں چھوٹوں، علماء، امراء، خواص وعوام، سیکڑوں آنے جانے والوں میں کسی کا قلب پر کوئی ہلکا سے ہلکا وزن بھی پڑتا ہے۔

(۳) تیسری خصوصیت تعلیم وتربیت میں علم سے زیادہ عمل اور عمل میں بھی بہت زیادہ اعمالِ قلب پر زور ہے۔ قلبی اعمال کا جوہر بھی اخلاص نکال رکھا ہے، ظاہر ہے کہ دوسرے تمام قلبی وقالبی اعمال کی صحت وسلامتی کی ضمانت یہی جوہر ہے، جس کی حقیقت ہر عمل وحرکت میں صرف خدا کی رضا وناراضی یا آخرت کی جزا اور سزا پر نظر ہے، سچ پوچھئے تو اسی نظر کے فقدان یا کمی وخامی کی وجہ سے ریا ونفاق وکبر وجاہ، حرص وہوس پرستی وخودغرضی وغیرہ کے سارے اخلاقی وباطنی رذائل وامراض پیدا ہوتے ہیں اور پرورش پاتے ہیں۔ حضرت ممدوح کی تعلیم وتربیت میں سب سے زیادہ زور

واصراران ہی رذائل خصوصاً ریا ونفاق کے مرض ومعالجہ پر رہتا ہے۔

اخلاص کے بڑے جانی دشمن یہی دو ہیں، جن سے نہ صرف نماز وروزہ، حج وزکوٰۃ کے سے خالص دینی اعمال بے جان و برباد ہوجاتے ہیں بلکہ دیکھا جائے تو دنیا کے بھی اکثر انفرادی واجتماعی، سیاسی وسماجی فتنوں فسادوں کی جڑ یہی ہیں، خاص کر آج کل کی سیاست وحکومت کا تو کہنا چاہئے کہ سارا تار وپود ہی ریا ونفاق یا مکر وفریب ہی سے تیار ہوتا ہے، پھر کیا تھا ''کڑوا کریلا نیم چڑھا'' **الناس علیٰ دین ملوکھم**، حکومت کی یہ برکات رعایا اور شہریوں کے ہر ہر طبقہ اور ہر ہر گھر میں اس طرح گھر کر گئی ہیں کہ معاشرہ (سوسائٹی) میں ان کو اب کوئی عیب مشکل سے شمار کیا جاتا ہے، مزید برآں ریا ونفاق کے مناشی یہ جراثیم اکثر ہوتے ہیں، ایسے دقیق وخفی اس طرح دبے پاؤں داخل ہوجاتے ہیں کہ بہتیرے صحابہ فاروق اعظمؓ جیسے اکابر صحابہ(۱) تک اپنے اندر اس کے اندیشہ سے ترساں ولرزاں رہتے تھے۔ حاذق سے حاذق روحانی اطباء وشیوخ اوران کے تربیت یافتہ تک دھوکا کھا جاتے ہیں، حکیم الامتؒ سے بڑھ کر کون حاذق وقت معالج ومربی ہوگا۔ حضرت ہی کے ایک پانی پتی مرید کا واقعہ یاد آیا۔ خانقاہ اشرفیہ کے مدرسہ کے لئے انھوں نے کچھ رقم پیش کی، اچھے پرانے تربیت یافتہ مرید تھے، حضرت نے بے تکلف قبول فرمالی، بعد کو خیال آیا کہ ایسا ہی مدرسہ تو خود پانی پت میں موجود ہے جس کا حق زیادہ تھا، وہاں چھوڑ کر تھانہ بھون کے مدرسہ کے لئے کیوں لائے، کہیں خدا کے ساتھ پیر کی رضا جوئی تو مطلوب نہیں کہ یہاں دینے سے ثواب بھی ہوگا اور پیر بھی خوش ہوں گے، بلا کر پوچھا اور جرح فرمائی، حضرت کے جرح میں کون ٹھہر سکتا تھا، دل کا چور پکڑا گیا اور عطائے شما بہ لقائے شما کا معاملہ فرمادیا، غریب مرید تو مرید ہی ہے، پیر بھی کتنے ایسے نکلیں گے جو مریدوں سے خود اپنی رضا

وخوشامد کے طلبگار نہ رہتے ہوں۔ مریدوں کے بنانے کیلئے زیادہ تر بگاڑنے والے تو نام نہاد پیر ہی ہوتے ہیں، یہ تو تھانہ بھون کے بنائے ہوئے پیر فتح پور کے ہاں دیکھا کہ کسی معاملے میں اس قسم کا شبہہ ہوتے ہی لتاڑ پڑنے لگتی ہے کہ تم لوگ خدا سے زیادہ مجھ کو راضی کرنے کی فکر میں رہتے ہو۔ کھانے پینے تک کے کسی ہدیہ میں شبہہ پیدا ہو جاتا ہے تو رد فرماتے ہیں۔

اس تھانوی مذاق ومسلک والے کے متعلق ''حکیم الامت'' کے مصنف سے بڑھ کر کون اندازہ کرسکتا ہے، کہ فتح پوری خانقاہ مدرسہ وغیرہ کے مصارف کے لئے رائج الوقت قسم کے چندہ کا دور دور بھی کوئی پتہ نہ ہوگا، اس پر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں کہ ۲۶ ر ۲۷ ر حجروں کمروں کی سلیب وسیمنٹ کی دومنزلہ عمارت معلوم ہوا کہ صرف ۲۸ ر دن میں کھڑی ہوگئی، اور اب سنا کہ مدرسہ کی مستقل عمارت بھی اسی طرح جلد ہی کھڑی نظر آنے والی ہے، یا اس کے بالکل برعکس چھوٹے بڑے عام دینی مدرسوں، اداروں کے اس حال سے کون واقف نہیں کہ دو چار کمروں یا دو چار ہزار کے کسی صرف کے اعلان واشتہار دوادوش میں کوئی کسر اٹھی نہیں رہتی، بمبئ اور کلکتہ تک دوڑ مچ جاتی ہے، خود مدرسہ کے مہتمم اور اساتذہ تک کاسۂ گدائی سنبھال کر نکل پڑتے ہیں۔

بات میں بات یاد آئی، عرض یہ کر رہا تھا کہ فتح پور کے مطب میں امراضِ قلب میں خصوصی توجہ ریا ونفاق کے مرض پر دیکھی، دوسروں کا حال کیا جانوں لیکن خود اپنے اعمال وافعال کو اس عینک سے دیکھا تو کیا کہوں کہ کیسی بھیانک شکل نظر آئی، مسلمان کی شان تو یہ ہے کہ دنیا کے دھندے بھی دین ہی کی کھیتی ہوں، لیکن اپنا حالِ بد تو اس عینک نے یہ دکھادیا کہ جو کام بظاہر خالص دین کے ہیں ان کے خلوص کی راہ بھی نفس و شیطان کس کس طرح چھپ چھپ کر مارتے رہتے ہیں، بس اللہ ہی ستار وغفار ہے۔

بزمیں چوں سجدہ کردم ززمیں ندا برآمد
کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی

زندگی میں نفاق وریا کی ایمانی وعملی مہلک بیماری پر اتنا تنبہ کبھی نہیں ہوا تھا جتنا مولانا فتح پوری (جزاہ اللہ) کی تنبیہات سے ہوا، آخر کوئی تو بات ہے جو بڑے بڑے صحابہ تک اپنے اوپر نفاق سے خائف تھے، بہ دیگراں چہ رسد وہ بھی ارذل الخلائق۔

(۴) ایک بظاہر انمل لیکن بہت کچھ تھانوی رنگ ہی سے ملتی جلتی بات، یعنی ایک طرف اخلاق واعمال کی خامیوں، کوتاہیوں پر معمولی وسرسری روک ٹوک ہی نہیں خاصی لے دے، ناراضگی وناگواری بلکہ لہجہ کی حد تک درشتی وسختی لیکن دوسری طرف بالمؤمنین رؤف الرحیم والی شان رافت ورحمت اور شفقت کا یہ عالم کہ بعض وقت بے قرار ہوجاتے دیکھا، نجی سے نجی پریشانیوں، بیماریوں میں دعا ودوا دونوں کی فکر وتدبیر سے ایسی دستگیری کہ قریب سے قریب عزیز اور ہمدرد سے ہمدرد دوست ہی سے امید ہوسکتی ہے، خود اپنی معمولی نزلہ زکام کی بیماری سے بعض سخت پریشانیوں تک میں تو اس کا تجربہ ہوا ہی۔ ایک اچھے رئیس زادے وعالم دین اپنے پورے گھر بیوی بچوں والدہ بھائی سب کے ساتھ اصلاحی تعلق سے مقیم تھے ماشاء اللہ بڑے سعید وصالح جوان، کسی کسی وقت میرے پاس بھی خصوصیت سے آبیٹھتے، بیچارے کچھ دماغی خلل کے مریض ہیں، کبھی کبھی دورہ سخت پڑتا ہے وطن ۵-۶ میل قریب ہی ایک قصبہ ہے، ایک دن دورہ جو پڑا تو روزہ رکھے لو دھوپ میں پیدل ہی سب گھر والوں کو چھوڑ چھاڑ بے تحاشہ بھاگ نکلے، ماں، بھائی، بیوی کی پریشانی تو ظاہر ہی ہے خود حضرت کو اتنا فکرمند اور متاثر دیکھا کہ جب تک ایک صاحب کو سائیکل پر بھیج کر ان کو واپس بلا نہیں لیا یکسو نہیں ہوئے اور پھر روزہ رکھنے سے حکماً روک دیا، دوا علاج کی فکر وتاکید فرمائی۔ دعا کا

خاص اہتمام تو جہاں تک اندازہ ہوا خاص معمولات میں داخل ہے، بعض وعلماء صلحاء نے خود احقر کو دوران قیام خط میں دعا کی درخواست کے لئے تحریر فرمایا تو درخواست کا جواب ایسے الفاظ اور انداز میں ملا جس سے معلوم ہوا کہ خاص وقت ہی میں نہیں ''خاص اوقات'' میں اور بار بار ہوگی اپنے پرائے دیکھے سنے متعدد تجربات سے شہادت ملی کہ ماشاء اللہ مستجاب الدعوات بھی بڑے ہیں، بعض واقعات تو نہایت حیرتناک اور بالکل ہی کرامت کے۔ مگر کیا کیا عرض کیا جائے، صدق کی محدود گنجائش سے بات یوں ہی بہت بڑھ گئی، اصل ذکر تو تھانوی رنگ سے ملتی جلتی چوتھی بات کا تھا، کہ وہاں بھی ایک طرف اخلاقی وعملی بلکہ بعض بظاہر چھوٹی بڑی معاشرتی کوتاہیوں پر بھی جیسا مواخذہ اور ڈانٹ ڈپٹ ہو جاتی تھی، اس سے میں آپ کیا دو ایک مجلسوں کی حاضری کی سعادت رکھنے والا بھی کون واقف نہ ہوگا! دوسری طرف آپ بیتی میں ایک مثال سن لیجئے! یادش بخیر ایک دماغ ہی کے پرانے مریض محترم دوست اور نئے عزیز کے سلسلہ میں اس نالائق کو کوئی مستقل نہیں محض عارضی ووقتی پریشانی کا سامنا ہوگیا تھا، دیکھئے کہ اس کے دور کرنے میں بھی حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کی رافت وشفقت کتنی دور تک گئی۔

یہ محترم دوست وعزیز خود حضرت اقدس علیہ الرحمہ کے مرید ہی نہیں مجاز ہیں، جب حضرت اپنے علاج کیلئے پہلی بار لکھنؤ تشریف لائے تو یہ اسی تعلق وسلسلہ سے غریب خانہ ہی کے ایک بغلی مکان میں مقیم تھے، یوں تو حضرت والا بلا کسی درخواست کے نہایت کرم وشفقت کی راہ سے غریب خانہ کو دن میں کئی مرتبہ خود ہی مشرف فرما چکے تھے، لیکن واپسی کے قریب خاکسار نے درخواست کی کہ ایک رات کے قیام کی سعادت بھی عطا ہو جائے۔ سوء اتفاق کہ جس دن اس درخواست کی

پذیرائی میں عصر کے وقت حضرت اپنے پورے اہل بیت کے ساتھ تشریف لائے، اسی دن کچھ پہلے ہی ہمارے دوست کا دماغی دورہ شروع ہو چکا تھا، جس نے بڑھتے رات اتنی شدت اختیار کرلی کہ سارا گھر سر پر اٹھالیا۔ اندر سے باہر تک دوسروں پر تو جو کچھ گذری گذری، یہ نابکار حضرت کے سامنے شرم وندامت سے سر اٹھانے کے قابل اپنے کونہیں پارہا تھا کہ بیماری سے اٹھتے ہی ایسی مہمانی ملی کہ رات بھر پلک نہ جھپکا سکے، ہائے اس لطف ولطافت کی یاد سے کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ صبح اول تو اس سراپا غرقِ انفعال کے احساسِ شرم وانفعال کو بلا خطاب خاص کیسے کیسے لطیف اور پُر حکمت عنوانات سے زائل کرنے کی فکر فرمائی، ساتھ ہی محسوس فرما کر کہ سخت دماغی دورہ ہے خدا جانے کتنا طول کھینچے اور اس سے گھر بھر کو پریشانیاں پیش آجائیں، غضب یہ فرمایا کہ ان کو فوراً ہی چلے جانے کا حکم دیا، اس سے بڑھ کر خود ان کے دروازے پر جا بیٹھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جب اپنی سواری کی موٹر آئی تو پہلے اس پر ان کو جہاں وہ جانا چاہتے تھے روانہ فرمالیا، پھر خود تشریف لے گئے، دیکھنے والے اس کو بڑی سخت گیری جان رہے تھے، میں خود دم بخود تھا مگر حضرت نے موٹر پر تشریف رکھتے رکھتے بس اتنا چپکے سے فرمایا کہ یہ گھر بھر کو بہت پریشان کرتے اور کسی کے ہٹائے ہٹتے بھی نہ، اب آپ بڑی پریشانیوں سے بچ گئے، اور اس سے انشاء اللہ خود ان کو سکون ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی کیا اور دیکھا کہ حضرت کو اسٹیشن پر رُخصت کرنے کے لئے اچھے خاصے حاضر ہیں تب سمجھ میں آیا کہ یہ سختی ہی میں نرمی تھی، ع

صد درستی در شکست خضر بود

اور بھی حضرت علیہ الرحمہ کی ایسی ہی دستگیریوں کے کئی تجربات خود اپنی خانگی ودنیوی زندگی کے الجھاؤں اور دشواریوں میں ہوئے، اللہ تعالیٰ نے سبھی کو

سلجھایا اور دور فرمایا۔ اس دنیادار کو نہ جانے کتنے مواقع پر اپنے دنیوی معاملات ہی میں تھانہ بھون کی یاد رلا دیتی ہے، اب دس بارہ برس کے بعد فتح پور میں ان آنسوؤں کو پونچھنے والا بھی ایک ملا، ذہن یہاں عجیب تضاد وتقابل سے دوچار ہو جاتا ہے، بعضے اکابر شیوخ اور اچھے علماء صلحاء کو دیکھا جنھوں نے کہنا چاہئے پوری زندگیاں اسلام اور مسلمانوں میں اجتماعی اور ملی خدمات کے لئے وقف فرما رکھی ہیں، انفرادی معاملات میں ان کا طرزِ عمل کچھ ایسا ہوتا ہے کہ گویا یہ افراد اس امت وملت کے افراد ہی نہیں جس کی اجتماعی صلاح وفلاح کے لئے تن من دھن سب تج رکھا ہے، نہ ان کے حق میں معروف ومنکر کے امر ونہی کا خصوصی اہتمام، نہ دینی واخلاقی نگرانی کا، نہ ان میں اصلاح ذات البین کا نہ ان کے نجی و دنیوی معاملات ومشکلات میں دستگیری کا، بلکہ بعضے تو اجتماعی مشاغل کے فرض کفایہ یا مستحبات کے انہماک میں اہل وعیال تک کے واجبات کو نظر انداز کر دیتے ہیں، غضب پر غضب یہ کہ اصلاحی خدمات کے مخلص ترین اور اہل علم فاضلوں کے قلم سے یہاں تک غایت تحسین وآفریں کے جوش میں نکل جاتے دیکھا کہ فلاں شخص یا مجمع کو دین وملت کی خدمت میں گھر بار، بال بچوں کا بھی ہوش نہیں۔ مجھ کو تو نام نہاد اجتماعی خدمات کا یہ افراد کش غلو بہت کچھ فرنگی یا مغربی غالبانہ اجتماعیت کا لایا ہوا ہیضہ معلوم ہوتا ہے، باقی افرادی یا انفرادی رذائلِ اخلاق اور قلبی وباطنی امراض کی اصلاح واِزالہ پر جیسی توجہ وتاکید تھانوی اور اس کے بعد فتح پوری مطب میں دیکھی، آج کل کی خالص دینی واصلاحی جماعتوں میں اور تحریکوں میں اس کی عشر عشیر بھی نظر نہ آئی، بلکہ کبھی کبھی اُلٹے اس سے انتہائی غفلت کے تجربات، بڑی بڑی اصلاحی درسگاہوں اور مرکزوں کے افراد ووابستگان میں ایسے ہوتے رہتے ہیں کہ فرنگی رنگ کی اجتماعی واصلاحی خدمات کا دین کے حق

میں یہ راستہ اُلٹا معلوم ہوتا ہے، دینی وعربی تعلیم کے کچھ طلبہ درسِ قرآن کا نام لگا کر اس کس مپرس کے پاس آجاتے ہیں، یہ نالائق ونا کارہ اس بہانہ سے ان کو خود اپنے انفرادی ایمان وعمل، ظاہر وباطن، معاملات واخلاق کی اصلاح ودرستی کی طرف بخطابِ عام دورانِ درس میں اور بخطابِ خاص نجی صحبت وخلوت میں متوجہ کرتا رہتا ہے، اس کے اثر سے بعضوں میں کچھ نہ کچھ چونک پیدا ہو جاتی ہے، اور اپنے اخلاقی وباطنی امراض خلوت یا نجی تحریر میں پوست کندہ ظاہر کردیتے ہیں، ان دن رات قرآن وحدیث پڑھنے والوں اور اصلاحی تحریکوں، تقریروں میں شریک ہونے والوں میں کبر وحسد، ریا ونفاق کی سی مہلک بیماریوں میں مبتلا ایسے شدید وآخری درجات تک کے مریض ملتے ہیں کہ جہلا وعوام میں بھی کم ہی ملیں گے، بڑی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ ان دینی مدرسوں اور اصلاحی اداروں میں بھی اب روز بروز انفرادی وعملی سے زیادہ اجتماعی ونظری پہلوؤں پر زور رہتا ہے، کہ لوگوں کا خود اپنی ظاہری وباطنی اصلاح کی طرف ذہن کما حقہٗ نہیں جاتا، قرآن کی تعلیم وتدریس میں بھی اگر تمام تر نہیں تو زیادہ ایسی ہی باتوں پر توجہ دلائی جاتی ہے جن کو قرآنی معارف وحقائق یا فلسفۂ قرآنی کہا جاتا ہے، وہی جس کی بڑی ہی پُر معنی تعبیر عارفِ الہ آباد نے دادِ قرآن سے کی ہے، دورِ حاضر کا کیا چور پکڑا ہے کہ ؎

دادِ قرآن کی نہ دو بھائی عمل اس پہ کرو

پیشِ درگاہِ خدا واہ کی حاجت کیا ہے

دادِ قرآن کی اس بے اعتدالی کا اثر یہ پڑتا ہے کہ جب تک یہ داد دیتا رہتا ہوں طالب علموں میں زیادہ انبساط پاتا ہوں اور جہاں عمل اس پہ کرو کی توجہ دلانا چاہتا ہوں چہرے مرجھانے لگتے ہیں، حالانکہ قرآن کی شکر کچھ نہ کچھ لپیٹتا ہی جاتا

ہوں، تاہم بحمد اللہ ظاہر و باطن کی عملی اصلاح کی طرف دونوں کے اس سراپا تباہ کار کے توجہ دلانے سے بھی کچھ نہ کچھ توجہ ہو ہی جاتی ہے۔

عرض یہ کرنا ہے کہ دینی تعلیم و اصلاح کا اصل مقصد اگر افراد و امت دونوں میں دینی زندگی پیدا کرنا ہے تو اس کی راہ فقط ایک ہی ہے کہ دینی و اسلامی تعلیمات کی نظر میں فلسفیانہ یا انشائی و خطابتی ''داد'' سے زیادہ اور بہت زیادہ زور و توجہ عملی اصلاح و انقلاب پر ہونا ضروری ہے بالفاظ دیگر مدرسوں اور خانقاہوں کی تفریق مٹانا اور دونوں کے رنگ کو ملانا ناگزیر ہے، اگر ہر دینی مدرسہ و ادارہ ساتھ ساتھ خانقاہ اور وہاں کا ہر بڑا کارپرداز اگر ساتھ ساتھ شیخ و سالک نہ ہو تو کم سے کم ہر مدرسہ و ادارہ میں ایک شیخ و مربی یا دین کے ظاہری و باطنی امراض کا نگراں و معالج کا ہونا لابد (ضروری) ہے، اور اس کی مجالست و صحبت کا لزوم کتابی اسباق اور تقریری مجالس سے کم نہیں زیادہ ہو، اور خاص کر بڑی دینی درسگاہ کی طرف سے تکمیل و فراغت کی سند ہرگز نہ دی جائے جب تک علم ''قال'' کے ساتھ معتد بہ درجہ تک عمل کے ''حال'' کا اطمینان نہ ہو، امت کے حکیم و مجدد وقت کے نزدیک تو ''مولوی'' نام ہی ''عالم باعمل'' کا ہے، اس کے اطمینان کے بغیر کسی کو مولویت کی سند تھما دینا دراصل امت کے حق میں خیانت اور دھوکا دینا ہے، ضرورت دراصل اس ''عالم باعمل'' بنانے والے جامع تعلیمی مدارس و ادارات کی ہے۔ فتح پور کا مدرسہ و خانقاہ اس جامعیت اور سنگم کا ایک غیر اشتہاری چھوٹا سا نمونہ ہے۔ قرآن و حدیث کا جو سب سے بڑا معلم و مدرس ہے وہی ایک بہت بڑا شیخ و مربی یا مزکی ہے، دوسرے اساتذہ وغیرہ بھی سب کے سب ماشاء اللہ سالک و طالب ہی ہیں، ایسی فضا میں ظاہری علوم دین بلکہ خالی علوم دنیا کے طلبہ کو بھی رکھ دیا جائے، تو وہ بھی کہاں تک غیر متاثر یا مسلمان ہو کر

اپنے ظاہر و باطن ایمان و عمل سے بالکل غافل رہ سکتے ہیں۔ سب سے بڑے معلم کتاب (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سب سے بڑا وصف تعلیم کتاب و حکمت کے ساتھ ساتھ ہی بلکہ اس پر مقدم مزکی ہونا یا ایمانی و عملی، قلبی قالبی تزکیہ فرمانا تھا: يُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، رَبَّنَا اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّينَ۔ آمین

☆☆☆☆☆☆☆

ایک تاریخی وعظ

الہ آباد کی مسجد کے متعلق واقعات گذشتہ اوراق میں آپ پڑھ آئے ہیں، دوبارہ اس کی آبادی کے موقع پر آپ نے جو وعظ فرمایا اس کا متن مکمل شامل کتاب کیا جارہا ہے۔

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونعوذ باللہ من شرور أنفسنا ومن سیئات أعمالنا ،من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ، ونشھد أن لاإلہ الااللہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد أن محمدا عبدہ ورسولہ ﷺ وعلیٰ آلہ وأصحابہ وبارک وسلم.

أما بعد! فأعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللہ الرحمن الرحیم، قال اللہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِیْ أَیَّدَکَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ وَأَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْأَنْفَقْتَ مَافِی الْاَرْضِ جَمِیْعاً مَا أَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ أَلَّفَ بَیْنَهُمْ إِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ۔

''تفسیر روح المعانی'' سامنے رکھ کر ارشاد فرمایا کہ یہ آیت جو میں نے تلاوت کی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے ایک خاص مضمون بیان فرمایا ہے، اپنے دین متین کی تائید میں، یہاں اپنی خاص قدرت اور جلال وعظمت کو ظاہر فرما رہے ہیں، اور جو شفقت ورحمت مسلمانوں پر فرمائی ہے اس آیت میں اپنے اس احسان کو بیان فرماتے ہیں، اور اہل ایمان پر اس کا امتنان فرماتے ہیں، اس کے بارے میں مفسرین

نے جو کچھ بیان فرمایا ہے انھیں کی زبان سے سنئے !

فرماتے ہیں کہ اللہ وہ ہے جس نے آپ کی (یعنی رسول اللہ ﷺ کی) تائید فرمائی اپنی خاص نصرت سے اور اپنی خاص امداد سے یعنی بلا واسطہ ملائکہ کے اور بلا واسطہ مومنین کے، اس لئے کہ وہ قادر ہیں کہ آپ کی امداد اس طریقہ سے بھی کریں۔ اللہ جس کو فرشتوں کے پیدا کرنے کی قدرت حاصل ہے تو وہ بلا واسطہ فرشتوں کے بھی اپنے دین متین کی تائید کرسکتا ہے اور فرشتوں کے ذریعہ بھی کرسکتا ہے۔ چنانچہ کبھی ان کے واسطہ سے بھی تائید کرائی، اور مومنین یعنی مہاجرین وانصار کے ذریعہ سے بھی دین کی تائید کرائی، غرض اس کی تائید کے دونوں ہی طریقے ہیں، بالواسطہ بھی کرتا ہے اور بلا کسی واسطہ کے بھی کرسکتا ہے، اس کے لئے دونوں برابر ہیں۔

تائید کے معنی قوت اور نصرت کے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ حق تعالیٰ اپنے رسول کی نصرت اور تائید میں کسی کا محتاج نہیں ہے، اس لئے کہ وہ قادر اور مختار ہے، مسبب الاسباب اور جبار ہے، اس کے قبضہ اور اختیار میں دلوں کا پھیر پھار ہے، لہٰذا جو امور کہ تائید کے وسائط اور وسائل ہیں، ان سب سے اس کی قدرت بالاتر ہے، یہ بھی خدائے تعالیٰ کی توحید اور اس کی وحدانیت کی ایک دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا متوحد اور قادر ہے کہ اپنے کاموں میں کسی کی نصرت کا محتاج نہیں ہے، جب اس نے آپ کو یعنی رسول اللہ ﷺ کو نبی بنایا تو ملائکہ وغیرہ تو سب وسائل کے درجہ میں ہیں، مسبب حقیقی تو وہی ہے، وہی آپ کی نصرت بھی کرے گا اور جس طرح سے یہ خدا کی توحید کی دلیل ہے، اسی طرح خدائے تعالیٰ کی توحید کی اور اس کی قدرت کی دوسری دلیل یہ ہے جس کو آگے بیان فرماتے ہیں کہ: وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ، یعنی یہی وہ ذات ہے جس نے مومنین کے قلوب میں اُلفت پیدا کردی، حالانکہ آپ کی تشریف

آوری سے پہلے تمام عرب کی جو حالت تھی وہ معلوم ہے کہ حمیت، عصبیت، کینہ اور عداوت، بدلہ اور انتقام میں سب کے سب فنا تھے اور یہ رذائل ان کی جبلت اور سرشت بن چکے تھے اور اس کا عموم اس درجہ تھا کہ تمام عرب میں دو قلب بھی ایسے نہ تھے جو باہم متفق ہوں اور ان میں دلی اتحاد موجود ہو۔ اسی کو فرمارہے ہیں کہ یہ بھی خدا کی قدرت کا ایک کرشمہ تھا کہ اس نے ایسوں کے قلب میں ایسی الفت ڈال دی، واقعی جب خدا چاہتا ہے تو سب کچھ کر دیتا ہے، اس کی نصرت ایسی ہی ہے، پس ایک نصرت تو اس کی یہ تھی کہ اس نے تائید رسول اور تائید دین متین فرمائی، اور دوسری یہ کہ سب لوگوں میں باہم قلبی اتفاق اور دلی اتحاد پیدا فرما دیا جو بحالت موجودہ بہت ہی مشکل بلکہ ناممکن تھا کہ اگر آپ روئے زمین کی سب چیزیں ان میں الفت پیدا کرنے کیلئے خرچ فرماتے تب بھی آپ ان میں قلبی اتفاق نہیں پیدا فرما سکتے تھے، اس لئے کہ ان کی عداوت کی شدت اسبابِ عداوت کی شدت پر متفرع ہے، جب سبب عداوت کم اور ضعیف ہوتا ہے تو عداوت بھی معمولی ہوتی ہے، اور جب اسبابِ عداوت زیادہ اور قوی ہوتے ہیں تو وہ عداوت بھی مستحکم ہو جاتی ہے، اب اس کو دور کرنا اور قلوب میں تالیف پیدا کرنا آسان نہیں ہوتا، چنانچہ ان کا یہی حال تھا کہ ان کے دو قبائل اوس وخزرج میں باہم کینہ وحسد، بغض وتنافس انتہا کو پہونچ چکا تھا ایسا کہ وہ کسی چیز سے ختم ہونے والا نہیں تھا، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے چاہا تو سب کو دور فرما دیا اور ان میں باہم ایسی الفت ڈال دی کہ جہاں دو قلب کبھی ملے ہوئے نہ تھے وہاں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے تمام لوگ مثل ایک نفس کے ہو گئے، اور ان میں آپس میں دلی اتفاق پیدا ہو گیا، اور بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک کرشمہ ہی تھا اور ان کا فضل تھا، ورنہ تو روئے زمین کی دولت خرچ کرنے کے بعد بھی اس کا حصول

ناممکن تھا، روپیہ پیسہ سے گو اتحادِ ظاہری پیدا کرسکتے ہیں مگر قلبی اتفاق اور دلی میل روپیہ کا کام نہیں ہے، اس لئے جسمانی اور قالبی اتفاق تو ممکن ہے، مگر باطنی اور قلبی اتحاد اس سے نہیں ہوسکتا۔

چنانچہ حضرات صحابہ میں جو اتفاق واتحاد تھا وہ قلبی اور دلی تھا، صرف جسمانی اور ظاہری نہیں تھا، اور آپ جانتے ہیں کہ اس کی کیا وجہ تھی۔ بات یہ ہے کہ جو بات ایک صحابی کے قلب میں تھی وہی دوسرے کے بھی دل میں تھی، وہی تیسرے کے قلب میں بھی تھی۔ اسی طرح سے سب صحابہ کا ایک نظریہ، ایک خیال، ایک فکر اور ایک دھن تھی، اسی لئے سب میں کامل اتفاق تھا، آج لوگ اس سے محروم ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص کی الگ الگ خصلت ہے، ایک مرکز پر لوگ متحد نہیں ہیں، خیالات ہر ایک کے جدا جدا ہیں، پھر اتفاق ہو تو کیسے ہو، ورنہ اللہ تعالیٰ کی کتاب موجود ہو، رسول اللہ ﷺ کے احکام موجود ہوں، اور مسلمانوں میں اختلاف اور فساد ہو، یہ بہت ہی تعجب کی بات ہے، وجہ یہ ہے کہ قرآن اور حدیث موجود ہے، لیکن ایمان، اخلاص اور محبت والفت جو پہلے تھی وہ مفقود ہے، اسی لئے ہم دنیا کو تباہ دیکھ رہے ہیں۔

اس وقت آپ سب حضرات نماز پڑھنے کے لئے یہاں تشریف لائے ہیں، یا وعظ سننے بیٹھے ہیں، تو ظاہر ہے کہ یہ اتفاق اس لئے ہے کہ مقصد سب کا ایک ہے، اسی طرح جب سب لوگوں کو اخلاق واخلاص اختیار کرنے کا، باہم محبت والفت پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوجائے تو دلی اتفاق بھی حاصل ہوسکتا ہے، مگر اب تو اخلاص باقی نہ رہا، اخلاق کا پتہ نہیں رہ گیا، تو اتفاق کہاں سے پیدا ہو۔

میرے پاس برابر خطوط آتے رہتے ہیں کہ، گھر گھر فساد ہے، لوگ مل کر کوئی کام کرلیں، یہ تو گویا ان سے ہو ہی نہیں سکتا۔ دین کا کوئی کام ہو رہا ہو اس میں تعاون

ہی کریں، خود نہ کر سکیں تو دوسروں ہی کو کرنے دیں، یہ کبھی نہیں کر سکتے، جانتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ یہی اخلاق کی خرابی! تو سن لیجئے صاف کہتا ہوں اور کھول کر کہہ رہا ہوں کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ بغیر اخلاق کے کام نہیں چلے گا، آخرت کا تو پوچھنا ہی کیا بدون شرعی اخلاق اختیار کئے ہوئے دنیا میں بھی کبھی فلاح نہیں ملے گی۔ چنانچہ زمانہ کے حالات نے لوگوں پر حجت قائم ہی کر دی ہے کہ بدون اخلاق کے یہ دنیا نمونۂ دوزخ بن گئی ہے، اسی طرح سے ذلیل وخوار رہیں گے، جب تک اپنے اخلاق کو درست نہ کریں گے، چنانچہ ببانگ دہل کہتا ہوں کہ آج اسی بداخلاقی نے حکومتوں کو فیل کر کے رکھ دیا ہے، اس کا بھی ناطقہ بند اور قافیہ تنگ کر رکھا ہے۔ ایک مصری عالم نے حرم شریف میں تقریر کی میں وہاں موجود تھا، انھوں نے کہا سنو!

"رسول اللہ ﷺ دونوں جہاں کی فلاح کا طریقہ بتانے کیلئے تشریف لائے تھے، آپ نے آخرت کی فلاح کا طریقہ بھی بتایا اور دنیا کی فلاح وبہبود کے طریقے بھی ہمیں سکھلائے، تم نے آخرت سے متعلق امور میں آپ کی تصدیق ضرور کی، چنانچہ نماز روزہ وغیرہ وہ تمام اعمال جن سے اُس جہان کی فلاح وابستہ ہے، تم نے ان پر عمل کیا تو اس کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ تم کو وہاں کی فلاح نصیب ہو جائے گی، لیکن رسول اللہ ﷺ چونکہ دارین کی فلاح کا طریقہ بتانے اور سکھانے تشریف لائے تھے، اسلئے آپ نے دنیوی فلاح کی تدبیریں بھی بتلائیں، ہر ہر صیغۂ زندگی پر آپ نے روشنی ڈالی، اخلاق سکھائے، شوہر بیوی کے تعلقات اور ان کے باہمی حقوق بتائے، بھائی کو بھائی کا حق بتایا، پاس پڑوس والوں کے حقوق تعلیم فرمائے، اسی طرح امیر وغریب، مالک ومملوک کے حقوق بیان فرمائے، غرض کہ دنیا میں جتنے بھی تعلقات ہو سکتے تھے سب کے

حقوق بیان فرمائے، مگر افسوس کہ تم نے اس امر میں آپ کی تصدیق نہیں کی یعنی آپ کے تعلیم فرمودہ دستور العمل اور اصول پر عمل نہیں کیا، چنانچہ دنیا نے اس کا انجامِ بد دیکھ لیا اور تم بھی یہ روزِ بد دیکھ رہے ہو کہ آج میاں بیوی میں نا اتفاقی ہے، بیٹا باپ سے جدا ہے، لڑکی اور ماں میں اختلاف ہے، بھائی بھائی میں خلاف وشقاق ہے۔ کوئی کسی کا دلی دوست نظر نہیں آتا بلکہ ہر شخص دوسرے کی جانب سے یوں منہ پھلائے ہوئے ہے (اس کو انھوں نے منہ بنا کر بتایا) غرض کوئی لطف زندگی باقی نہیں رہ گیا، یہ سب نحوست اسی کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ان حکام میں جو اِس دنیا کی زندگی سے متعلق تھے تم نے آپ کی تصدیق نہیں کی، یہ بھی کہا کہ یہ جو کچھ دنیا میں دیکھ رہے ہو بہت کم ہے، اس سے کہیں زیادہ وہاں دیکھنے کے لئے تیار رہو۔

اس مضمون کو ایسے اچھے مؤثر عنوان سے بیان کیا، اور لوگوں کے حالات کو اور ان کی بداخلاقیوں کو ایسا سمجھایا کہ طبیعت خوش ہوگئی، میں نے اپنے دل میں کہا کہ الحمد للہ ایک شخص نے کھل کر کہہ دیا اور صاف صاف بیان کر دیا اور جس بات کو میں بہت دنوں سے سمجھ رہا تھا، آج اس اللہ کے بندے نے مجمع میں اس کو کہہ ہی دیا۔

باقی صحابہ میں اختلاف کے بعد جو اتفاق ہوگیا تھا تو یہ برکت تھی رسول اللہ ﷺ کی، کہ ان کے قلوب میں محبت والفت پیدا ہوگئی، آپ سے کہتا ہوں کہ پھر اس کے بعد کیسا کچھ ایمان ان کے قلوب میں داخل ہوا کہ سبحان اللہ سب لوگ آپس میں شیر وشکر ہوگئے۔ الفت ومحبت اگر صرف ایک ہی طرف سے ہو تو یہ ہوسکتا ہے، لیکن جب تک دوسری جانب سے بھی نہ ہو، باہم میل کیسے ہوسکتا ہے؟ پس اللہ تعالیٰ نے ان سب کے دلوں میں الفت ڈال دی، جس کی وجہ سے قلب وقالب یکساں ہوگئے، یعنی

جسم سے بھی سب ایک ہوگئے اور دل سے بھی، آگے فرماتے ہیں:

إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۔ بے شک اللہ تعالیٰ کو غلبہ وقوت اور قدرت کاملہ حاصل ہے، اس لئے ان کے چاہے ہوئے کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی، اور حکیم بھی ہیں، یعنی جو کام کرتے حکمت سے کرتے ہیں۔

(اس کے بعد تفسیر کشاف سامنے رکھی اور فرمایا کہ) اب ایک دوسری چیز سنئے!

بن یہودیٰ ایک شخص عظیم الکفر تھا، مسلمانوں پر طعن کیا کرتا تھا اور ان سے بہت شدید حسد رکھتا تھا، ایک دفعہ یہی شخص انصار کی دو جماعتوں (اوس وخزرج) کے کچھ لوگوں کے ہمراہ بیٹھا ہوا گفتگو کر رہا تھا، ان کے آپس کے اتفاق واتحاد کو دیکھ کر اسے حسد پیدا ہوا، اس لئے کہ ان دو قبیلوں (اوس وخزرج) کے درمیان جاہلیت کے زمانہ میں بڑی عداوت اور نزاع رہ چکا تھا، تو اس نے دل میں کہا کہ مجھے تو ان کے اتفاق واجتماع کو دیکھ کر اب چین اور صبر نہیں ہوگا جب تک کہ ان کا اختلاف نہ دیکھ لوں گا، یہ کہہ کر ایک یہودی سے کہا کہ جاؤ ان کے مجمع میں بیٹھو اور بات بات میں (یوم بعاث) جو کہ اوس وخزرج کی سابق ایک جنگ تھی، اس کا ذکر کرو اور اس موقع کے کچھ اشعار پڑھو، اس لڑائی میں اوس کی فتح ہوئی تھی۔ غرض وہ شخص گیا اور سابقہ رنجش یاد دلا کر دونوں کو مشتعل کر دیا، یہاں تک کہ باہم مفاخرت شروع کر دی، اور اس میں غصہ کی باتیں ہونے لگیں، اور بات اتنی بڑھ گئی کہ وہ لوگ کہنے لگے کہ ''السلاح، السلاح'' (یعنی لانا تو ہتھیار) رسول اللہ ﷺ مدینہ ہی میں تشریف رکھتے تھے، آپ کو اس کی اطلاع ملی، فوراً آپ تشریف لائے اور آپ کی خدمت میں جو مہاجرین اور انصار موجود تھے سب ہمراہ آئے، آپ نے فرمایا کہ کیا تم لوگ جاہلیت کو بلا رہے ہو، حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں، بعد اس کے اللہ تعالیٰ نے

دین اسلام کے ساتھ تمہیں نوازا، اور تمہارے اندر سے جاہلیت کی باتوں کو بالکل دور کر دیا، اور تم میں آپس میں الفت ڈال دی۔ آپ کے اس ارشاد کو سنکر قوم نے محسوس کیا کہ یہ ایک شیطانی حرکت تھی اور دشمن کا کید تھا، چنانچہ سب نے ہتھیار پھینک دیئے۔ صحابہ فرماتے تھے کہ کوئی دن ایسا نہیں گذرا جس کا اول اس دن سے اقبح (یعنی برا) ہو، اور آخر اس سے احسن ہو۔ دیکھا آپ نے رسول اللہ ﷺ موجود اور شیطان چاہتا تھا کہ اپنا کید چلا لے جائے، حالانکہ کیا مجال تھی کہ آپ کی موجودگی میں اس کی کوئی بھی تدبیر کارگر ہو سکے، اسی کو فرمایا ہے کہ:

وَ کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ وَاَنۡتُمۡ تُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتُ اللّٰہِ وَ فِیۡکُمۡ رَسُوۡلُہٗ وَ مَنۡ یَّعۡتَصِمۡ بِاللّٰہِ فَقَدۡ ہُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ کُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِہٖۤ اِخۡوَانًا وَ کُنۡتُمۡ عَلٰی شَفَا حُفۡرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنۡقَذَکُمۡ مِّنۡہَا کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمۡ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمۡ تَہۡتَدُوۡنَ۔

آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ کیا کہہ رہا ہوں، آپ کے محلّہ والوں سے بھی وہی سنت ادا کرائی گئی، جو صحابہ نے ادا کی تھی، صبح کا بھولا ہوا اگر شام کو آجائے تو اس کو بھولا نہ کہنا چاہیئے، یہ خدا ہی کا تصرف ہے، انسان کے بس کی بات نہیں ہے، کیونکہ انسان کا تصرف قلب پر نہیں چلا کرتا۔ قلب خدا کی تجلی گاہ ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے ہی تصرف کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے۔

دیکھئے اللہ تعالیٰ نے اور اعضاء مثلاً ہاتھ پیر اور کان وغیرہ کو دو دو بنائے ہیں، مگر قلب کو جو ایک بنایا ہے تو اسی لئے کہ یہ ذات وحدہٗ لاشریک کی تجلی گاہ ہے، چنانچہ

دلوں کا پھیر پھار اسی کے قبضہ میں ہے۔ مشائخ ایک آدمی کی نسبت یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نہیں آوے گا مگر اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ آجائے گا، بالآخر ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ اللہ چاہتے ہیں، اس سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ کسی کے متعلق حتماً کوئی رائے نہیں قائم کرلینی چاہئے، معلوم نہیں کس وقت کس پر فضل ہوجائے، اور اس کا دل پھر جائے۔ ایک مسلمان جب دوسرے مسلمان سے کبر کرتا ہے اور برے خیالات اس کے متعلق رکھتا ہے اور بعد میں وہ جھک جاتا ہے تو بہت شرمندگی ہوتی ہے کہ میں اس کو کیسا سمجھتا تھا اور یہ کیسا نکلا۔ (اس کے بعد الابداع سامنے رکھ کر فرمایا) ایک چیز اور سنئے!

صحابہ سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے وضو سے بچے ہوئے پانی کو لے کر اپنے بدن اور چہروں پر ملتے تھے، اسی طرح آپ کے کلی وغیرہ کے پانی کو اپنی ہتھیلیوں پر لیتے تھے اور اس کو بھی چہرے اور بدن پر ملتے تھے، اور آپ کے سینگی کے خون کو پی جاتے تھے۔ چنانچہ آپ کی ایک خادمہ نے ایک بار آپ کا پیشاب پی لیا تھا، اسی طرح صحابہ سے ثابت ہے کہ وہ آپ کے موئے مبارک اور کپڑوں کو رکھتے تھے اور اس سے تبرک حاصل کرتے تھے۔

عروہ بن مسعود کو قریش نے صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اپنا قاصد بنا کر بھیجا تھا، وہ صحابہ کی محبت اور عقیدت کا منظر اپنی آنکھ کے گوشہ سے دیکھنے لگا اور کہا کہ خدا کی قسم خدا کے رسول نے نہیں ناک جھاڑی مگر یہ کہ وہ کسی نہ کسی کے کف دست میں گرتی تھی اور وہ اس کو فوراً اپنے چہرے اور بدن پر تبرک کے خیال مل لیتا تھا، اور جب آپ کا کوئی بال گرتا تو فوراً اس کو اٹھا لیتے تھے اور جب آپ انھیں کسی امر کا حکم فرماتے تھے تو سب کے سب تعمیل حکم کے لئے سبقت کرتے تھے اور آپ جب وضو فرماتے تو آپ کا فضالۂ وضو لینے کیلئے ایسا دوڑتے تھے کہ معلوم

ہوتا تھا کہ اب لڑ پڑیں گے، اور جب آپ کے سامنے کلام کرتے تو اپنی آوازوں کو پست کر لیتے تھے اور آپ کی عظمت ان کے قلوب میں اس درجہ تھی کہ نظر بھر کر آپ کے چہرۂ انور کو دیکھتے نہ تھے، عروہ یہ منظر دیکھ کر قریش کی جانب جب واپس ہوئے تو اپنے تاثر کو ان سے اس طرح بیان کیا کہ وہ سب بھی مرعوب ہی ہو گئے۔ کہا کہ اے قوم! خدا کی قسم میں نے بادشاہوں کے دربار بھی دیکھے ہیں، قیصر و کسریٰ اور نجاشی سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا ہے، لیکن بخدا میں نے کسی بادشاہ کے لوگوں کو اس کی ایسی تعظیم کرتے ہوئے نہیں دیکھا جیسی کہ اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کی تعظیم کرتے ہیں، خدا کی قسم اگر وہ تھوکتے اور ناک بھی صاف کرتے ہیں تو وہ کسی (اگالدان میں نہیں بلکہ) کسی شخص کے ہاتھ پر گرتی ہے، جس کو وہ اپنے بدن اور چہرے پر مل لیتا ہے، اور جب کسی بات کا حکم دیتے ہیں تو سب کے سب امتثالِ حکم میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں، اور ان کے وضو کا غسالہ حاصل کرنے کیلئے تو ایسا جھپٹتے ہیں کہ گویا باہم قتل و قتال ہی کی نوبت آجائے گی، اور جب ان کے سامنے آپس میں باہمی کچھ باتیں کرتے ہیں تو انتہائی آہستگی اور شائستگی اختیار کر لیتے ہیں اور آپ کو نظر اٹھا کر دیکھتے نہیں۔

دیکھا آپ نے یہ ادب اور تعظیم تھی صحابہ کی۔ کسی ایک صحابی سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ بتایئے، فرمایا بھائی! کیا بتائیں، ہم نے آپ کو نظر بھر کر دیکھا ہی کب ہے؟ صحابہ کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن آپ کا نور جیسا کچھ تھا اس کو وہی برداشت کرتے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ زلیخا کی سہیلیوں نے یوسف علیہ السلام کے حسن کو دیکھ کر اپنی انگلی ہی کاٹ ڈالی تھی، اگر وہ کہیں میرے محبوب کی پیشانی دیکھ لیں تو شاید ان کا دل ہی پاش پاش ہو جاتا، ہم سے پوچھو کہ ہم

دیکھتے تھے اور اس کو برداشت کرتے تھے۔ آپ سے کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم ایسی صحابہ نے کی کہ ہم لوگوں سے ممکن نہیں، صحابہ نے جس طرح اور کام کئے اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو مان کر بھی دکھلا دیا، ایسا مانا کہ کوئی دوسرا کیا مان سکتا ہے، یہ حضرات جو آپ کی تعظیم کرتے تھے تو بادشاہ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ نبی ہونے کی وجہ سے کرتے تھے، بڑے بڑے اولیاء کرام ہوئے، مگر صحابہ کے برابر درجہ نہیں پاسکے۔ رسول للہ ﷺ کے ماننے اور تعظیم کرنے کا جو حق تھا وہ صحابہ نے ادا کر دیا، کسی دوسرے کے ماننے کے لئے کوئی درجہ باقی نہیں چھوڑا۔

اب اسی سے سمجھ لیجئے کہ جب ان حضرات کا معاملہ آپ کے تبرکات کے ساتھ یہ تھا اور اس کو ان حضرات نے اتنا مانا، تو رسول اللہ ﷺ کے احکام اور آپ کی تعلیمات جس کے پھیلانے کے لئے آپ دنیا میں تشریف ہی لائے تھے، ان کے ساتھ ان حضرات کا کیا معاملہ رہا ہوگا۔ حضور ﷺ کی ایک ایک حدیث کا اور آپ کی ایک ایک سنت کا ان حضرات کے نزدیک کیا مرتبہ رہا ہوگا؟ اب ہم لوگ دعوی محبت کرتے ہیں، دعوی کرنا ممکن ہے اور آسان بھی ہے، لیکن بات یہ ہے کہ جھوٹا دعویٰ چھپتا نہیں ہے۔ ؎

وجائزۃ دعوی المحبۃ فی الھویٰ
ولکن لایخفیٰ کلام المنافق

محبت کا دعویٰ ہوائے نفسانی میں بھی ہوسکتا ہے، مگر منافق کا کلام چھپ نہیں سکتا۔

مطلب یہ ہے کہ جب محبت کے مقتضا پر عمل کرنے کا وقت آوے گا تو فیل ہو جائے گا۔

جو لوگ کہ اللہ کے جاں نثار ہیں اور اس کے راستہ کے جاں باز ہیں وہ لوگ

کچھ کہیں تو بات بھی ہے، مگر تم تو محض دعوی کر کے چاہتے ہو کہ نکل جاؤ، تو یہ عوام الناس کے سامنے تو ہوسکتا ہے لیکن جو لوگ حقیقت کے جاننے اور پہچاننے والے ہیں، ان کے سامنے نہیں چل سکتا۔ سن لیجئے صاف کہہ رہا ہوں کہ اس زمانہ میں دعویٰ بہت ہے، لیکن جب ہم لوگوں کے اقوال وافعال اور احوال کا جائزہ لیتے ہیں اور کتاب وسنت پر اس کو منطبق کرتے ہیں، تو لوگوں کو بہت دور پاتے ہیں، ایسی حالت میں ہم سے اخلاق کا مطالبہ کیا جاتا ہے، تو کیا ہم شریعت کو معاف کر دیں کہ احکامِ شرعیہ پر عمل کرنا ضروری نہیں، یہ ہمارے لئے کب جائز ہے کہ آپ کی رعایت میں دین ہی کو معاف کر دیں۔ جو لوگ حضور ﷺ کو ماننا چاہتے ہیں وہ آپ کی تعلیمات اور لائے ہوئے احکامات کو مانتے ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں، آپ معراج میں تشریف لے گئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو انتہائی قرب سے نوازا، اور کیسی کچھ رفعت عطا فرمائی اور کیسی کیسی دولت عطا فرمائی، اس کو کیا کوئی بیان کرسکتا ہے، مگر حضور ﷺ کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے مومنین کو بھی اس سے کچھ حصہ نصیب فرمایا، وہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کو معراج میں نماز جیسے تحفہ سے نوازا، جس کے متعلق حدیث شریف میں ہے کہ: **الصلوٰۃ معراج المومنین**، سنئے یہ! پانچ وقت کی نماز جو آپ پڑھتے ہیں معراج ہی میں فرض ہوئی اس لئے یہ معراج المومنین کہلاتی ہے، اب آپ اس کا کیا حق ادا کر رہے ہیں؟

حدیث شریف میں ہے کہ دین کی برکات جو اس امت سے ختم ہوں گی تو ان میں سے سب سے پہلے جو چیز اٹھالی جائے گی وہ نماز کا خشوع ہوگا، سب سے پہلے یہی رُخصت ہوگا، یہاں تک کہ زمین پر کوئی ایک شخص بھی خاشع نہ رہ جائے گا۔

اب آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ آج آپ کتنے لوگوں کی نمازوں میں

خشوع دیکھتے ہیں .... خشوع تو نماز کے اندر ہوتا ہے، جب نماز ہی نہ ہوگی تو خشوع کہاں ہوگا؟ خشوع کے بارے میں حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بدون خشوع کے نماز قبول نہیں فرماتے، پس خشوع نماز کی صحت کی شرط نہ سہی مگر اس کے قبول ہونے کی شرط ضرور ہے، اب اوّل تو نماز ہی کتنے لوگ پڑھتے ہیں اور جو تھوڑے بہت نماز پڑھتے بھی ہیں تو وہ بھی صرف صورت نماز کی رہ گئی ہے، حقیقت رُخصت ہو چکی ہے۔

میں بیان کر رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کی زمانۂ جہالت کی عداوت کو اپنے فضل وکرم سے جب مبدل بہ مودت فرما دیا تو ان کو یہ نعمت یاد دلائی اور حکم دیا کہ اللہ کے اس انعام کو وقتاً فوقتاً یاد کیا کریں، اس کا یاد کرنا فرض ہے، چنانچہ فرمایا کہ: **وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا**، یعنی اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو جو اس نے تم پر کیا یاد کرو، وہ یہ کہ تم آپس میں سخت دشمن تھے، تمہارے اندر فساد عام ہو گیا تھا، نہ کسی کی جان محفوظ تھی، نہ مال اور آبرو۔ عداوت ایسی شدید تھی کہ اگر کوئی قتل ہو جاتا تو سوسو برس کے بعد اس کا بدلہ لیا جاتا تھا، ایسی دشمنی اور ایسا کینہ تھا، اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے مبدل بہ اخوت فرما دیا، اور تم آپس میں بھائی بھائی ہو گئے، تمام لوگ مانند ایک نفس کے ہو گئے، اور مودت والفت کو تمہارے دلوں میں پیدا کر دیا، حالانکہ اس سے قبل دل محبت سے خالی ہو چکے تھے، تمہاری محبت یہ رہ گئی تھی کہ بچیوں کو عمدہ لباس اور زیور سے آراستہ کر کے جنگل میں لے جاتے تھے اور لڑکی راستہ میں کہتی کہ ابا مجھے کہاں لے چل رہے ہو تو اس کو خوشنما باغ دکھلا کر موقع پا کر گڈھے میں ڈھکیل دیتے تھے اور اوپر سے مٹی ڈال کر گڈھے کا منہ بند کر کے چلے آتے تھے۔ باپ کو اپنی اولاد سے فطری محبت ہوتی ہے،

مگر قلوب چونکہ الفت ومحبت سے یکسر خالی ہو گئے تھے، اس لئے کسی سے بھی الفت باقی نہ رہی تھی ، ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور محبت ومودت جب قلب میں آجاتی ہے تو قالب تو قلب کے تابع ہوتا ہے، جب دل میں جھکاؤ پیدا ہوجاتا ہے تو جسم بھی جھک جاتا ہے، یہ تو دنیوی نفع ہوا جو حضور ﷺ کی برکت سے انھیں ملا، اور دوسرا نفع آخرت کا جو آپ کی برکت سے صحابہ کو پہونچا، تو وہ یہ ہے جس کو آگے فرمایا: وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ،یعنی تم اپنی بداخلاقیوں کے ہاتھوں دوزخ کے بالکل کنارے پر تھے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا، اور اس نے تم کو دوزخ سے بچالیا، یعنی رسول اللہ ﷺ کو تم میں مبعوث فرمایا اور آپ نے حسن اخلاق کی تعلیم فرمائی جس پر عمل کرکے تم دوزخ سے بچ گئے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کو تم سے بیان کیا تاکہ تم ہدایت پاؤ، اس سے قبل فرمایا: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعاً وَّلَا تَفَرَّقُوْا ،یعنی اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑلو اور آپس میں اختلاف پیدا نہ کرو۔

آپ لوگوں نے کہا تھا کہ کچھ بیان کردو، تو ہم جن حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں، ان پر گفتگو ضروری سمجھتے ہیں، ہم تو اب یہی دیکھتے ہیں کہ گھر گھر فساد پھیلا ہوا ہے، سب کے سب آپس میں گتھم گتھا ہو رہے ہیں، کیا ہمارے سامنے ہی لڑو گے؟ ہم موجود اور ہماری مسجد کے دروازے پر باہم ٹکراؤ ہوجائے، میرے لئے اس سے بڑھ کر کوئی ذلت نہیں ہوسکتی کہ مسجد ہم نے بنوائی ہمارے لوگوں نے اس میں اپنا سرمایہ اور وقت صرف کیا، اور اس لئے بنوائی کہ اس میں عبادت کی جائے، یہ سب تو الگ رہا اس کے بجائے اسی کے دروازے پر فتنہ ہو، اور مسلمانوں کی جماعتیں ٹکرا جائیں، بالکل اس کے موضوع کے خلاف بات ہے، خبر بھی ہے مسجد خدا

کے سامنے جھکنے کی جگہ ہے، متکبر کے تکبر ٹوٹنے کی جگہ ہے، یہاں سر نہ جھکاؤ گے، تکبر یہاں بھی نہ توڑو گے بلکہ باہم ٹکراؤ گے تو میرے لئے اس سے زیادہ ذلت اور خرابی اور کیا ہوگی؟ مسلمان چاہے کسی خیال کا ہو، مسجد میں ایک خدا کی پرستش کے لئے آتا ہے، یہ نہیں ہوسکتا کہ مسجد ہی کے دروازے پر لڑ جائیں، میں یہاں موجود نہ تھا ورنہ اتنا بھی نہ ہوتا جو ہوا۔ انتہائی شرم اور غیرت معلوم ہوتی ہے کہ ہمارا معاملہ اور دین ومسجد کا معاملہ اور دوسرے آکر اس کا فیصلہ کریں، اور حکومت کو مدافعت کرنی پڑے۔

اگر کہو تو شہر چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں، لیکن مسلمانوں میں فساد ہو یہ مجھے گوارا نہیں، مجھے سب سے زیادہ ناپسند آپس کی خانہ جنگی اور ایک دوسرے کی آبرو ریزی ہے، بے شمار آیتیں قرآن شریف کی موجود ہیں جن میں آتا ہے کہ ''اصلاح کے بعد فساد مت کرو'' وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا، فرعون، عاد، ثمود کے فسادات کو بہت سی جگہ ذکر کیا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے اپنے وقت میں زمین میں فساد مچایا، فرعون کے بارے میں سورۂ فجر میں ہے کہ: وَفِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ الَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ فَاَكْثَرُوْا فِیْهَا الْفَسَادَ فَصَبَّ عَلَیْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ، آپ سے کہتا ہوں کہ کہ قرآن شریف کے الفاظ پڑھئے گا اور معنی نہ سمجھئے گا؟ اور عمل نہ کیجئے گا؟

پھر یاد دلاتا ہوں کہ حضور ﷺ کی موجودگی میں صحابہ سے جو باتیں صادر ہوئیں اور جو واقعات پیش آئے وہ ہمارے پیش نظر رہنا ضروری ہے، صحابہ سے گناہ ہوا، وہ باہم جھگڑے کے لئے آمادہ بھی ہوئے، یہی ہمارے لئے سبق ہوگیا، اور اس کے متعلق آیت نازل ہوگئی، اس کو آپ اب قیامت تک پڑھتے رہئے، مضمون یہی رہے گا، اس سے صحابہ کی سیرت معلوم ہوئی کہ بر بنائے بشریت اور عدم عصمت کے اگر

اتفاقاً ان سے کبھی اس قسم کے معاملات بھی ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ کے سمجھانے کے بعد فوراً راہ راست پر آ گئے، اور اپنے کئے پر دل سے نادم ہوئے، باہم مل کر خوب روئے اور متفق ہو گئے۔

میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا فضل آپ پر پھر بھی متوجہ ہے، اور رسول اللہ ﷺ کی برکت آپ کے شامل حال ہے، اس کی قدر کیجئے اور اس کا شکریہ ادا کیجئے اور یہ سمجھ لیجئے کہ مومن کو اپنے ایمان کو تازہ کرنا چاہئے۔ ہویٰ یعنی خواہشاتِ نفسانیہ جب تازہ ہے تو ایمان تازہ نہیں، اس لئے ہویٰ ایمان کے دروازہ کا قفل ہے، بزرگانِ دین نے یہ سب فرمایا ہے، مسجد اور لڑائی بھڑائی؟ بہت بری بات ہے، مگر الخیر فیما وقع۔ اصلاح کی صورتیں بھی پیدا ہوئیں، چنانچہ کبھی کبھی ظاہری اختلاف بھی سبب بن جاتا ہے زبردست اتحاد کا۔ اب دعاء کرو کہ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائیں اور مسلمانوں کے اندر آپس میں اتفاق واتحاد قائم ہو اور لوگ باہم آپس کے حقوق کو پہچانیں۔ اس وقت یہی سب باتیں کرنے کی ہیں، بس اب دعا کر لیجئے۔

☆☆☆☆☆☆☆

مجلس الہ آباد

حضرت والا جب الہ آباد تشریف لائے تو ابتداءً قیام ''حسن منزل'' میں فرمایا ، پھر جب یہاں مستقل قیام کا ارادہ ہوا تو ذاتی مکان کی تلاش ہوئی ، کیونکہ ضرورت ایک ایسے وسیع مکان کی تھی جس میں طلباء، طالبین اور خود حضرت کے جملہ متعلقین آرام کے ساتھ رہ سکیں ، حسن اتفاق سے ان دنوں بخشی بازار والا یہی مکان فروخت ہو رہا تھا، مسلمانوں کا محلّہ تھا، مسجد کا قرب تھا، مکان بھی اپنی وسعت کے ساتھ ساتھ ایک شریف دیندار مسلمان کا تھا، اور انھوں نے حضرت اقدس کے خریدنے سے اپنی خوشی کا اظہار بھی کیا، حضرت نے مذکورہ بالا امور کی بنا پر اپنے احباب کے مشورہ کے بعد اس کو خرید لیا۔

یوں مکان کچھ زیادہ خوبصورت تو نہ تھا، مگر ایک رئیس کا تعمیر کرایا ہوا تھا، اس لئے وسیع تھا اور بلند و پُرشکوہ تھا، اور گو حسن اور ظاہری سجاوٹ میں تو آج کل کی تعمیر سے اس کو کوئی نسبت بھی نہ تھی ، اور بلند و بالا ہونے میں بھی اگرچہ قلعہ سا معلوم ہوتا تھا، لیکن پرانے قصبات میں زمینداروں اور رئیسوں کے مکانات پہلے زمانہ میں بالعموم ایسے ہی ہوتے تھے، یہ کوئی انوکھا مکان نہ تھا، تاہم جس قدر احباب کو اس سے مسرت تھی، بعض حضرات کو اس کا قلق بھی تھا کہ مولانا نے یہ مکان کیسے خرید لیا۔ بہر حال ع

گل است سعدی و در چشم ہمگناں خار است

ادھر مالک مکان صاحب نے خود اپنے رہنے کا حصہ الگ کر کے باقی پانچ

سات حصوں میں تقسیم کر کے ہر ایک کو کرایہ اٹھا رکھا تھا، ان میں سے ایک خاصا وسیع حصہ میونسپلٹی کے ایک حکیم صاحب نے بھی سرکاری یونانی دواخانہ کیلئے لے رکھا تھا، حضرت کو پورے مکان کی ضرورت تھی، اس لئے کرایہ داروں سے کہا کہ اب اس کو خالی کر دیں۔

چنانچہ سب سے پہلے دواخانہ کا حصہ خالی ہوا، اور طلباء کا قیام اس حصہ میں تجویز ہوا، بطور شکریہ کے نیز حصول برکت کے خیال سے حضرت اقدس کی مجلس شریف جو اب تک دوسرے حصہ مکان میں ہوا کرتی تھی، چند دن دواخانہ کے ہال میں ہوئی، جس کی پہلی مجلس آپ کے پیش نظر ہے، (از ناقل)

فرمایا کہ سنئے! اس وقت ایک مضمون بیان کرنا چاہتا ہوں، اور اس لئے بیان کرتا ہوں کہ ضرورت ہے اس کے بیان کرنے کی، اور میں نے پہلے سے اس کو نہیں سوچ رکھا تھا، بلکہ ابھی ابھی جب یہاں بیٹھا ہوں تو یکبارگی جی میں آیا کہ یہی بیان کروں، اس لئے بیان کرتا ہوں۔ اب تک اس گھر سے جسمانی امراض کا علاج ہوتا رہا ہے، اب روحانی علاج کے سلسلہ کی باتیں سنئے!

چاہتا ہوں کہ اس مضمون کو سب لوگ سن لیں، اس قسم کے مضامین روز روز نہیں بیان ہوتے۔

بہر حال سنئے! مجھے آپ کے اس شہر میں آئے ہوئے قریب قریب ایک سال کا زمانہ ہو رہا ہے، اس اتنے عرصہ کے بعد آپ کے یہاں سے مجھے ایک فیض ملا، وطن سے میں ایک اور جگہ گیا، تقریباً دو سال وہاں رہا مگر یہ فیض مجھ کو وہاں نہیں ملا، پھر یہاں آ کر ایک جگہ قیام کیا تھا اس وقت تک یہاں بھی نہیں ملا، لیکن اس کے بعد جب خود اپنے لئے یہ مکان لے لیا تو بس لوگوں نے کہنا شروع کیا ''یہ امیر آدمی ہیں'' اسی لقب کو میں نے کہا تھا کہ مجھے آپ کے یہاں سے ایک فیض ملا۔ اس کے متعلق سنتا

ہوں کہ کوئی تو کہہ رہا ہے کہ بڑے روپئے والے ہیں، کوئی کہہ رہا ہے کہ پیر صاحب بہت بڑے آدمی ہیں، غرض ہر ایک کو یہ فکر ہے کہ روپیہ کہاں سے آیا، کس نے دیا، اور اگر خود ان کے پاس تھا تو یہ کیسے ہیں کہ مال رکھتے ہیں؟

میں نے جب یہ سنا تو لوگوں سے کہا کہ بھائی میں ان کہنے والوں کو نیک نیت ہی سمجھتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں کو میرے بگڑ جانے کا بہت غم ہے، یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ مال جمع کرنا دنیا داری ہے، اور کسی شیخ یا مولوی کے لئے دنیا دار ہونا بڑی مذموم بات ہے، اس لئے ان لوگوں کو میری فکر ہے، اس لئے کہتا ہوں کہ آپ کے نزدیک میں بگڑ گیا ہوں تو مجھے درست کر دیجئے، لیکن میں آپ سے یہ بھی پوچھنا چاہتا ہوں کہ مال اور دنیا اگر بری چیزیں ہیں اور قابل نفرت اور قابل اعتراض چیزیں ہیں تو آیا صرف ہمارے ہی لئے ہیں یا آپ کے لئے بھی ہیں، مگر میں تو نہیں دیکھتا کہ آپ اپنے لئے بھی اس سے احتیاط اور اجتناب کا معاملہ رکھتے ہو بلکہ آپ لوگوں کو تو دیکھتا ہوں کہ شب وروز اس میں منہمک ہیں اور سب لوگوں نے اس کے استحسان پر اتفاق کرلیا ہے کہ کسی کو کسی پر اعتراض نہیں، البتہ اگر کسی مولوی یا پیر کو کچھ اچھے حال میں دیکھ لیں تو سب کے سب اس کو نشانۂ ملامت بنالیتے ہیں، یہ کیا بات ہے؟ اس تفریقی معاملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بذاتِ خود دنیا سے نفرت نہیں ہے اور نہ آپ اس کو برا جانتے ہیں، ہاں کسی مولوی یا پیر کے پاس دنیا کا ہونا آپ کو بے شک ناگوار ہے، اسی لئے آپ اس کو ہدفِ ملامت بناتے ہیں، اور طرح طرح سے اس پر اعتراض کرتے ہیں، پس جب بات یہ ہے تو اب آپ سے کہتا ہوں کہ اور ضرورت سمجھ کر کہتا ہوں کہ سن لیجئے، یہ طریقہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ تمام لوگ یکساں نہیں ہیں، اس لئے آپ کو کسی کو پہچان کر اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا چاہئے، اور سنبھل کر زبان کھولنا

چاہئے، ''سب چیزیں سولہ سیر'' یہ اندھیر نگری کا قاعدہ تو ہوسکتا ہے، ورنہ عقل کی بات نہیں ہے۔

قصہ مشہور ہے کہ ایک جگہ گرو اور ان کے چیلے صاحب پہونچے، جہاں ''سب چیزیں سولہ سیر'' کی تھیں، گھی بھی سولہ سیر، گیہوں بھی سولہ سیر اور چنا بھی سولہ سیر۔ چیلے نے کہا کہ بس یہیں رہیں گے یہاں چیزیں سستی ہیں، گرو نے کہا کہ معلوم ہوتا کہ یہاں کے لوگوں میں بھلے برے کی تمیز نہیں ہے، لہٰذا ایسی جگہ نہیں رہنا چاہئے مگر چیلے کے اصرار پر رہ پڑے۔

ایک دفعہ کسی کو پھانسی کی سزا ہوئی، مجرم پکڑ کر لایا گیا، مگر تھا وہ بہت دبلا پتلا، پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں نہ آتا تھا، بڑا ہو رہا تھا اور گردن اس کی پتلی تھی، اتفاقاً یہ گرو چیلے بھی اسی وقت ادھر سے گذرے اور تمام مجمع میں چیلا ہی ایسا موٹا تازہ نظر آیا کہ جس کے گلے میں پھندہ بالکل ٹھیک آتا تھا، چنانچہ اسی کو پھانسی کا حکم ہوگیا۔

یہ سن کر چیلا بہت گھبرایا اور گرو سے کہا کہ آپ ٹھیک کہتے تھے مگر میں نے آپ کا کہنا نہیں مانا بڑی غلطی کی، اس کو معاف فرمادیجئے اور اب میری جان بچائیے، گرو آخر گرو ہی تھا، اس کے ذہن میں ایک تدبیر آگئی، اس نے چیلے سے کہا کہ جب تم کو پھانسی کے لئے بلایا جائے تو میں کہوں گا کہ اس کے بجائے مجھ کو پھانسی دی جائے، اور تم کہنا کہ نہیں مجھ کو ہی دی جائے اور اسی پر اصرار کرنا، بس اس کے بعد ہم سمجھ لیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، جب چیلے کو پھانسی کے لئے بلایا گیا تو گرو نے کہا کہ مجھے لے چلو، چیلے نے کہ نہیں مجھے لے چلو، اس پر شور بڑھا، راجہ نے کہا کیا بات ہے، لوگوں نے بتلایا کہ دو شخص آپس میں لڑ رہے ہیں، ایک کہتا ہے کہ مجھے پھانسی دو، دوسرا کہتا ہے کہ نہیں مجھے پھانسی دو۔ راجہ کو اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ لوگ تو جان بچاتے

ہیں اور ان کو کیا ہوا کہ جان دینے کے لئے ہر ایک دوسرے پر سبقت کرنا چاہتا ہے، اس نے گرو سے پوچھا کہ کیوں کیا بات ہے؟ آخر آپ کیوں اس قدر اصرار کر رہے ہیں کہ آپ کو پھانسی دی جائے، اس نے کہا آپ نے دریافت فرمایا ہے اس لئے بتلانا ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ ایک ایسی ساعت ہے کہ جو بھی اس وقت مرے گا سیدھا بیکنٹھ (جنت) میں جائے گا، اس لئے آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر مجھے پھانسی دلوا دیجئے۔

راجہ نے یہ سن کر کہا کہ اگر ایسا ہے تو پھر مجھ ہی کو پھانسی دو، چنانچہ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی اور اس کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا، گرو نے چیلے سے کہا چلو یہاں سے جلدی بھاگ چلو، کسی نہ کسی طرح جان بچی ہے، یہاں کا کچھ ٹھیک نہیں ہے کہ کس وقت کیا ہو جائے، کسی کو اچھے برے کی تمیز نہیں ہے، اس لئے یہاں ''سب چیزیں سولہ سیر'' کی ہیں۔

تو جس طرح وہاں سب کا سولہ سیر ہونا کچھ اچھا نہیں تھا اسی طرح سے میں کہتا ہوں کہ آپ کو بھی ہر شخص کے متعلق رائے زنی کرنا اور اس پر حکم لگا دینا، یہ بھی کچھ مناسب نہیں ہے، اس دارِ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے بھی ہیں جو کہ کھاتے بھی ہیں، ان کے بچے بھی ہیں اور بعضے ان میں غنی بھی ہوتے ہیں، تو یہ غنا کوئی بری چیز نہیں ہے، حضرت عثمانؓ غنی تھے، اور آخر تک غنی رہے، یہاں تک ...... کہ غنی ان کا لقب ہی تھا، حضرت صدیق اکبر بھی ابتداء میں غنی تھے، مگر سب مال اللہ تعالیٰ کے راستے میں صرف کر کے فقیر ہو گئے تھے، حضرت عثمانؓ نے ایک کنواں زر کثیر میں خرید ا اور اس کو مسلمانوں کے لئے وقف فرما دیا تھا، رسول اللہ ﷺ پر کافروں نے مال نہ ہونے کا طعن کیا تھا، مگر وہ اس کو کیا جانیں کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا آپ ہی کیلئے پیدا فرمائی تھی۔ ع

محمد نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا

پھر دنیا کی کیا مجال تھی کہ وہ آپ کے پاس نہ آتی، مگر بات یہ تھی کہ آپ نے خود ہی اس کو پسند نہیں فرمایا، پس آپ کا فقر اختیاری تھا، ورنہ یوں آپ فقیر نہ تھے۔

اسی لئے علماء نے فرمایا ہے کہ یہ بھیک مانگنے والے جو آپ کو کالی کملی والے کالی کملی والے وغیرہ جیسے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، اس میں حضور ﷺ کی توہین ہوتی ہے، لہٰذا یہ لوگ مستحق تعزیر اور لائق سرزنش ہیں۔

نفع قوت المغتذی حاشیہ ترمذی میں قاضی تاج الدین سبکی سے نقل کرتے ہیں کہ وہ اپنے شیخ جوان کے والد بھی تھے ان کا قول بیان فرماتے ہیں کہ: **لم یکن محمد ﷺ فقیراً من مال قط بل کان أغنی الناس باللہ قد کفی دنیاہ فحسبہ وعیالہ وکان یقول أللّٰھم أحینی مسکیناأی ارزقنی اسکانۃ العبودیۃ لا مسکنۃ الفقر وکان یشد تنکیرہ علیٰ من یعتقد خلافہ۔**

رسول اللہ ﷺ مال کے اعتبار سے فقیر نہ تھے، وہ بلکہ اللہ تعالیٰ پر نظر ہونے میں سب لوگوں سے بڑھ کر غنی تھے جو کہ آپ کی دنیا کا کفیل تھا خود آپ کی ذات کے لئے اور آپ کے اہل وعیال کے لئے بھی، باقی آپ خود فرماتے تھے کہ اے اللہ مجھ کو مسکین زندہ رکھ، تو اس کا مطلب یہ کہ مجھے مسکین جیسی عبودیت اور بندگی نصیب فرما، یہ نہیں کہ مسکین جیسا فقر عطا فرما۔ چنانچہ میرے شیخ اس شخص پر جو اس کے خلاف اعتقاد رکھتا تھا شدت کے ساتھ نکیر فرماتے تھے (نوٹ، ص: ۸۴، سطر: ۷)

دیکھا آپ نے علماء محققین کی یہی تحقیق ہے کہ آپ کو فقیر کہنا جائز نہیں، آپ سب اغنیاء سے بڑھ کر غنی تھے، باقی رہے آپ کے صحابہ سو ان میں بھی بہت سے مالدار ہوئے، اور آخر تک رہے، اور ایسے صحابہ جو مالدار ہوئے ہیں انھیں کے مراتب

بھی بلند ہوئے۔ حضرت صدیق کی بہت بڑی تجارت تھی، حضرت عمر بھی فقراء صحابہ میں سے نہ تھے، اور حضرت عثمان تو غنی تھے ہی اور یہی حضرات رسول اللہ ﷺ کے بعد آپ کے جانشین ہوئے۔

حضرت سفیان ثوریؒ جو اس امت کے صوفیاء میں سے گذرے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ اگر ہمارے پاس مال نہ ہوتو یہ امیر لوگ تو ہم کو مندیل یعنی رومال بنالیں۔ بہرحال اس دور میں تو وہ مومن کی ڈھال ہے، حدیث شریف میں ہے کہ **نعم المال الصالح للرجل الصالح**، یعنی نیک آدمی کے لئے عمدہ مال کیسی اچھی چیز ہے، یہ حدیث کیوں نہیں سنتے۔ دوسری حدیث سنئے!

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: **نعم المعونة المال الصالح**، ایک صحابی کو رسول اللہ ﷺ مال دے رہے تھے، وہ نہیں لیتے تھے اور کہتے تھے کہ یارسول اللہ میں اس کے لئے مسلمان نہیں ہوا ہوں، اس پر آپ نے فرمایا، کیوں نہیں لیتے، لے لو بھائی! **نعم المعونة المال**، اور یہ اس لئے کہ خدا نے دیا ہے، اس لئے وہ بھی ایک اچھی چیز ہے، اور سنئے بزرگانِ دین کیا فرماتے ہیں، مولانا روم فرماتے ہیں۔ ؎

چیست دنیا از خدا غافل بدن　　　نے قماش ونقرہ وفرزند وزن

دنیا کس چیز کا نام ہے؟ خدا سے غافل ہونے کا، مال ومتاع، چاندی سونا اور بیوی بچوں کا نام دنیا نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ آدمی کے پاس یہ سب چیزیں ہوں اگر ان کی وجہ سے وہ خدا سے غافل نہیں ہوتا تو اس کا نام دنیا نہیں ہے، البتہ اگر یہی چیزیں آدمی کو خدا کی یاد سے غافل بنادیں تو وہ دنیادار شخص ہے۔ اب آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ کیا ہے؟ کیا اس کو آپ نے نہیں سنا؟ کیا مولانا روم بھی دنیادار تھے، یہ دیندار نہیں تھے؟ کیا حضرت امام ابوحنیفہؒ دیندار نہیں تھے؟ پھر کیوں مالدار تھے؟

میں تو آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ اگر آج کسی کے پاس مال نہیں ہوتا تو مخلوق اس کو پوچھتی تک نہیں، باقی اللہ تعالیٰ جس سے کام لینا چاہتے ہیں اس کو کسی کا محتاج نہیں چھوڑتے (اتنے میں قاری عبداللطیف صاحب مجلس میں تشریف لائے، تو ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ جلدی آیئے قاری صاحب بہت سا مضمون ختم ہو گیا، آپ دیر میں آئے) میں اس پر کہہ رہا ہوں کہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ مالدار آدمی ہیں تو میں کہتا ہوں کہ یہ منصب مجھے آپ ہی نے دیا ہے، تو اب آپ ہی لوگ مجھے اس سے نکال بھی دیجئے۔ ایک شخص بگڑ رہا ہے اور آپ لوگ دیکھ رہے ہیں کہ بگڑ رہا ہے تو آپ کی محبت و دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو درست کیجئے، بگڑنے نہ دیجئے، توجہ کر کے اس کو بچایئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ منبر پر فرمایا کہ اگر میرے ذہن میں ذرا سی بھی کجی دیکھو گے تو تم لوگ کیا کرو گے؟ یہ سن کر ایک شخص اٹھا اور تلوار کھینچ کر کہا کہ اس سے تم کو سیدھا کر دیں گے، آپ نے فرمایا الحمدللہ کہ امت محمدیہ میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے کہ اگر عمر سرمو منحرف ہو تو وہ اس کو درست کر دیں گے، اور جب تک ایسے درست کرنے والے موجود ہوں گے انشاء اللہ عمر غلط راستہ پر نہیں چل سکتا۔ اسی طرح سے میں آپ سے کہتا ہوں کہ جب آپ بھی مجھے بگڑتا ہوا دیکھتے ہیں تو توجہ کر کے ٹھیک کر دیجئے، کیونکہ شیخ اگر بگڑتا ہے تو مرید اس کو درست بھی کر دیتے ہیں، اس پر شیخ صنعاء کا واقعہ سنئے!

یہ حضرت فریدالدین عطار کے پیر ہیں۔ نصرانیوں کے گاؤں سے گذرے، دیکھا کہ وہ لوگ صلیب کی پوجا کر رہے ہیں، فرمایا کہ یہ لوگ کیسے ہیں کہ خدا کو چھوڑ کر صلیب کی پوجا کرتے، الہام ہوا کہ کہو تو تم کو تمہارے ایمان کی حقیقت دکھلا دیں، بس اسی وقت ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی چیز سینے سے پُھر سے نکل گئی، چنانچہ آگے بڑھے تو

ایک نصرانی لڑکی سور چراہی تھی، اس سے عشق ہوگیا، وہیں ٹھہر گئے اور اس کے باپ کو پیغام دیا، اس نے کہا کہ ہاں منظور ہے مگر چند شرائط کے ساتھ۔ ایک تو یہ کہ نصرانی ہوجاؤ، دوسرے یہ کہ سور چراؤ۔ غرض مطلوب کی خاطر سب کچھ کرلیا۔ حضرت فرید الدین عطار حج کے لئے گئے ہوئے تھے، لوگوں نے وہاں جاکر شیخ کی حالت کی اطلاع کی، آپ نے اول تو ان لوگوں کو ڈانٹا اور فرمایا کہ تم لوگوں نے شیخ کو اس حالت میں کیوں چھوڑ دیا، ایسی حالت میں بھی شیخ کو کہیں چھوڑا جاتا ہے، پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسجد نبوی میں جاکر خوب رو روکر دعاء کی کہ یا اللہ یہ ہمارے شیخ ہیں، ہم نے دین انھیں سے حاصل کیا ہے، ان کی اس حالت کو تبدیل فرمادیجئے، جب خوب دعا کر چکے تو پھر شیخ سے ملنے کیلئے روانہ ہوئے۔

یہ واقعہ میں نے اس پر سنایا کہ دیکھئے پیر کی حالت جب بگڑی تو مریدوں نے کس طرح سے ان کے لئے دعا کی اور توجہ کی، بالآخران کی دعاء قبول ہوئی اور یہاں شیخ کو ہوش آگیا، جب ہوش میں آئے اور اپنے گلے میں زُنّار دیکھا تو اس کو توڑ ڈالا، اور سامنے ایک عورت کو دیکھا کہ عورت نصرانی کیسے بیٹھی ہے، اس سے کہا جاؤ اپنا راستہ لو، اس نے کہا ہم مسلمان ہوئے جاتے ہیں، آج سے جو آپ کا مذہب ہے وہی ہمارا مذہب ہے، مجھ کو نکالئے نہیں، کہا کہ خیر رہو اور اس سے کہا کہ یہ سور وغیرہ اپنے باپ کے یہاں پہونچادو۔

اتنے میں دیکھا کہ سامنے سے فرید الدین عطار آرہے ہیں جب ان کی نظر شیخ پر پڑی تو دیکھا یعنی باطنی آنکھ سے دیکھا ظاہری سے نہیں کہ شیخ پہلے سے بھی زیادہ بلند مراتب پر فائز ہیں۔

تو دیکھا آپ نے ایسا بھی ہوتا ہے کہ پیر جب بگڑنے لگتا ہے تو کبھی مرید بھی

اس کو ٹھیک کر دیتے ہیں، لہٰذا اگر آپ بھی کہتے ہیں کہ کسی مولوی یا شیخ کے لئے دنیا دار ہونا برا ہے اور وہ بے چارہ دنیا میں پھنس رہا ہے تو اس کے لئے دعاء کیجئے، توجہ باطنی فرمایئے اور اس کو اس سے نکالئے۔ باقی اگر اس کی ہمت نہیں ہے تو فضول باتوں سے کیا فائدہ؟ ارے دنیا میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہین، امیر بھی اور غریب بھی، بہت سے دوسرے لوگ امیر ہوتے ہیں تو اگر مولوی بھی امیر ہوجائے تو اس کو بھی ہوجانے دیجئے، باقی یہ سمجھ لیجئے کہ مال کا دینے والا خدا ہے، پھر ہم کاہے کو آپ کے محتاج رہیں، وہی امیر بھی بناتا ہے اور وہی غریب بھی بناتا ہے، آپ نہ کسی کو امیر بناتے ہیں اور کسی کو غریب بنا سکتے ہیں، نص قرآن میں نبی کریم ﷺ کو امر ہورہا ہے کہ:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر۔

یعنی آپ کہئے کہ اے اللہ مالک ملک کے، تو ہی جس کو چاہتا ہے ملک عطا فرماتا ہے، اور جس سے چاہتا ہے ملک کو چھین لیتا ہے، جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ذلت دیتا ہے۔ تیرے قبضہ میں ہے ہر قسم کی بھلائی، اور تو ہی ہر شے پر قادر ہے۔

پھر جب امیری اور غریبی خدا کے قبضہ میں ہے تو جانتے ہیں کہ لوگوں کو کیوں ناگواری ہوتی ہے، بات یہ ہے کہ جب خاندان میں کا کوئی شخص سب سے بڑھ جاتا اور ترقی کر جاتا ہے اور نیا نیا مالدار ہوتا ہے تو دوسرے لوگوں پر یہ امر شاق ہوتا ہے، وہ نہیں پسند کرتے ہیں کہ ہم لوگ ایسے ہی رہ جائیں اور یہ ترقی کر جائے، اس لئے اس سے حسد بھی کرنے لگتے ہیں اور برادری سے خارج کر دیتے ہیں، لیکن جب وہ پرانا ہوجاتا ہے تو پھر اس کو برادری میں شامل کر لیا جاتا ہے، اسی طرح سے یہ لوگ سمجھتے ہیں

کہ امیری صرف ہمارے لئے مخصوص ہے، کسی اور کو یہ حق ہی نہیں کہ وہ امیر ہو جائے، اس لئے جب کسی کو ذرا خوشحال دیکھتے ہیں تو ان کو ناگوار ہوتا ہے، اور پھر اس پر اعتراض کرتے ہیں اور جو چاہتے ہیں اس کے متعلق قیاس آرائی اور رائے زنی کرنے لگتے ہیں۔

اس کے متعلق میں نے کہا کہ سب کو ایک ہی لکڑی سے نہیں ہانکنا چاہئے، بعض اللہ کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر ان پر اعتراض کرو گے تو لوٹ کر اپنے ہی پر پڑے گا، جیسے آسمان کا تھوکا اپنے ہی پر آتا ہے، اس لئے آدمی کو پہچاننا چاہئے اور سب کے ساتھ یکساں معاملہ نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ بعض دفعہ اعتراض صحیح نہیں ہوتا۔

حضرت تھانویؒ ایک مرتبہ دانت بنوانے لاہور تشریف لے گئے تھے، ڈاکٹروں نے ملنے ملانے اور بات چیت کرنے سے منع کر دیا تھا، اس لئے حضرت وہاں لوگوں سے ملتے جلتے کم تھے، واپسی میں امرتسر میں اترے، وہاں یہ عذر نہ تھا اس لئے سب لوگوں سے ملاقات کی اجازت تھی، تو وہاں سے واپسی پر فرماتے تھے، اور حضرت کے لطیفے تو ایسے ہی ہوتے تھے، کہ پنجاب سے مسئلۂ مختلف فیہا ہو کر آیا ہوں، یعنی لاہور کے لوگ تو کہتے ہوں گے کہ یہ نہایت بداخلاق شخص ہیں، نہ کسی سے ملاقات کی اور نہ کسی سے بات چیت کرنے کا موقع دیا، اور امرتسر کے لوگ کہتے ہوں گے کہ بہت خوش اخلاق ہیں، سب سے ملے اور سب سے باتیں کیں۔

تو دیکھئے اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ اہل لاہور کا فیصلہ حضرت کے بارے میں کس قدر غلط اور غلط فہمی پر مبنی تھا، جس طرح امرتسر میں خوش اخلاق تھے اسی طرح لاہور میں بھی تھے، مگر ان لوگوں نے تحقیق کرنے سے پہلے ہی حکم لگا دیا ورنہ اگر تحقیق کرتے تو شاید حضرت کا عذر معلوم کر لیتے اور پھر اعتراض نہ کرتے، اسی لئے میں نے کہا ہے

کہ سب کے ساتھ یکساں معاملہ نہیں کرنا چاہئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی اعتراض کرو اور وہ اس کا محل نہ ہو، میں یہ سب ضرورۃً کہہ رہا ہوں اور از خود نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ کوئی بُلوا رہا ہے تو بول رہا ہوں۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

نے کہ ہر دم نغمہ آرائی کند　　　　فی الحقیقت از دم نائی کند

یعنی بانسری جو ہر وقت نغمہ آرائی کرتی رہتی ہے، خود بخود تھوڑا ہی بولتی ہے، بلکہ کوئی بجانے والا اس میں پھونک مارتا ہے تو اس کے اندر سے آواز نکلتی ہے۔

اور سنئے!

صاحب روح المعانی آیت: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ۔

(یعنی آپ فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ کی اس زینت کو جسے اس نے اپنے بندوں کے لئے بنایا ہے، اور حلال طیب چیزوں کو کون حرام کرنے والا ہے) کے تحت لکھتے ہیں حضرت زین العابدینؒ سے مروی ہے کہ انھوں نے خود ریشم کی ایک چادر پچاس دینار میں خریدی، اور جب وہ پرانی ہوگئی تو اس کو صدقہ فرمادیا اور اس میں آپ کچھ حرج نہیں سمجھتے تھے اور فرماتے تھے: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللهِ الَّتِي الآية۔

نیز مروی ہے کہ حضرت حسینؓ جس وقت شہید ہوئے تو ان کے جسم پر خز کا جبہ تھا، اسی طرح حضرت ابن عباسؓ کو جب حضرت علیؓ نے خوارج کی جناب بھیجا تو انھوں نے سب سے نفیس لباس زیب تن فرمایا اور بہترین خوشبو لگائی، اور سب سے عمدہ گھوڑے پر سوار ہوئے اور پھر نکلے، جب وہاں پہونچے تو انھوں نے کہا کہ اے ابن عباس! آپ تو خیر الناس ہیں، پھر آپ یہ جبابرہ کے لباس، ان کی جیسی سواری پر کیسے تشریف لائے، اس پر آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللهِ

الَّتِی الآیۃ۔

اسی طرح روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک بار باہر نکلے تو آپ کے اوپر ایک ہزار درہم کی قیمت کی چادر تھی۔

امام ابوحنیفہؒ چار سو دینار کی قیمت کی چادر اوڑھتے تھے، اور اپنے اصحاب کو بھی اسی کے لئے فرماتے تھے، چنانچہ امام محمد بھی نفیس لباس پہنتے تھے، اور یہ فرماتے تھے کہ میری بیویاں ہیں، باندیاں ہیں، میں تزین اس لئے اختیار کرتا ہوں کہ ان کی نظر غیر کی جانب نہ اٹھے۔

فقہاء نے بھی تجمل کو مستحب فرمایا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ پر انعام فرماتے ہیں تو اپنی نعمت کا اس پر اثر دیکھنا چاہتے ہیں، اس پر کہا گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو پیوند دار کپڑے پہنتے تھے، اس کا جواب دیا گیا کہ اس میں یہ مصلحت تھی کہ آپ امیر المومنین تھے، آپ جو کام کرتے تو عمال بھی آپ کی اقتداء کرتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کم آمدنی ہونے کی صورت میں مسلمانوں سے رشوت لیتے، اس کا سد باب حضرت عمرؓ کے پیش نظر تھا۔ (روح المعانی، ص:۹۷، ج:۸)

اب آپ اجازت دیجئے اور وقت دیجئے تو اس پر تفصیلی بحث کروں گا، اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت اس سلسلہ میں بیان کروں گا کہ آپ کے پاس کس قدر بکریاں تھیں اور کتنے اونٹ تھے اور کتنے گھوڑے، کتنے خچر تھے، کتنے پیالے تھے، کتنے ہتھیار، نیز یہ کہ بادشاہوں نے شاہی حلے آپ کی خدمت میں ہدیہ کئے ہیں، اور آپ نے اس کو استعمال بھی فرمایا ہے۔

وطن میں ایک صاحب میرے پاس آئے، اعتراض کرنے کی عادت تھی، میں نے کہا خاموش رہئے گا، لیکن چلتے چلاتے کہا کہ آپ قالین کی جانماز پر نماز کیوں

پڑھتے ہیں، میں نے کہا کہ آپ سے تو طے تھا کہ آپ کچھ نہ بولیں گے، پھر شرط کے خلاف آپ نے کیوں کیا، کہنے لگے ایک وسوسہ دل میں لے کر جاتا، اس سے تو اچھا یہی ہے کہ اس کو ظاہر کر دیا۔

میں نے کہا کہ یہ بتلایئے، ایک تو وہ شخص ہے جس نے لاکر اس کو بچھایا ہے اور چاہتا ہے کہ میں اس پر بیٹھوں، اور ایک آپ ہیں کہ دیا بھی نہیں اور میرا بیٹھنا بھی ناگوار ہے، ان دونوں میں مخلص کون ہے؟ کہنے لگے بس سمجھ میں آ گیا، میں نے کہا کہ سمجھ و مجھ میں آپ لوگوں کے خوب آتا ہے، آپ مولوی ہیں، کیا آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ رسول اللہ ﷺ قیمتی شے بھی پہنتے تھے، امام ابوحنیفہ اور امام محمد اچھا لباس پہنتے تھے، چنانچہ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ میں تجمل اس لئے اختیار کرتا ہوں تا کہ میری عورتوں اور باندیوں کی نظر دوسری جانب نہ اٹھے، آپ یہ سب کیوں بھول گئے، یہ سب بھی کچھ یاد ہے یا صرف اعتراض ہی یاد ہے، اسلام میں تو اعتراض ہے ہی نہیں، اعتراض تو منافقین کیا کرتے تھے۔

ایک بزرگ کو حکم ہوا کہ سوال کرو۔ یہ سن کر وہ دربدر بھیک مانگنے لگے، پھر کچھ دنوں کے بعد حکم ہوا کہ اب ایک جگہ بیٹھ جاؤ اور اچھا لباس پہنو، انھوں نے عمدہ لباس پہنا اور بیٹھ گئے۔ اس پر کسی نے کہا کہ حضرت یہ کیا؟ پہلے آپ نے وہ کام کیا، اور اب یہ کر رہے ہیں، فرمایا کہ اپنے جی سے نہ وہ کیا، نہ اپنی خوشی سے یہ کیا، ادھر ہی سے حکم ہوا تھا لہٰذا جو حکم ہوا اس کی تعمیل کی۔

حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی نعمت کا اثر اپنے بندوں پر دیکھنا چاہتے ہیں، تو نعمت پا کر پھر اس کو استعمال نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے جو کہ منع ہے، نیز اہل نعمت کو اس لئے بھی استعمال نعمت ضروری ہے تا کہ فقراء اور غرباء ان کو پہچانیں اور ان

سے اپنی حاجات ظاہر کرسکیں۔

تھانہ بھون میں ایک مرتبہ ایک صاحب حضرت تھانوی کے پاس آئے اور ایک کنارے مجلس میں بیٹھے، حضرت نے کچھ بھی التفات نہ فرمایا، حالانکہ جن لوگوں کا اکرام مقصود ہوتا ان کو اپنے قریب بٹھاتے تھے۔ دوسرے وقت یہی صاحب نہایت عمدہ لباس پہن کر مجلس میں گئے، حضرت نے فرمایا آیئے یہاں تشریف رکھئے، اس پر ہم لوگوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ دیکھو تو پہلے حضرت نے ان کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا، اور بعد میں کیسا فرمایا، حیرت اس پر تھی کہ دیکھو تو حضرت نے اپنی بصیرت سے ان کو کیسے پہچان لیا کہ ان کے پاس عمدہ کپڑے موجود ہیں، مگر یہ ان کو استعمال نہیں کرتے، اور لطف یہ کہ ہمراہ ہی لے گئے تھے، ورنہ تو دوسرے وقت کیسے بدلتے، پس چونکہ ان کا عمل حدیث شریف کے بالکل خلاف تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی نعمت کا اثر بندہ پر دیکھنا چاہتے ہیں، اس لئے حضرت مولانا نے بھی ان سے اعراض فرمایا، اور جب انھوں نے اس پر عمل کرلیا تو حضرت نے دوسرا معاملہ فرمایا۔

اب یہ کیا کہ آپ لوگ سیرت پر تقریر کریں اور سنیں اور یہ سب باتیں نہ سنیں، اور وہ پیر کیسا کہ مرید کی نظر ہی دیکھے کہ اگر ٹاٹ پہننے سے وہ لوگ خوش ہوں تو ان کی خاطر ٹاٹ ہی پہنا کرے۔ پیر کا کام تو اللہ اور رسول کی نظر دیکھنا ہے نہ کہ مخلوق کی، اللہ والوں تو یہ حال ہوتا ہے کہ ؎

گو ہوا دشمن زمانہ ہو مگر اے دل ہمیں	دیکھنا یہ ہے مزاجِ یار تو برہم نہیں

ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت مولانا کے حال کے متعلق یہی شعر پڑھا، کیونکہ شورش کا زمانہ تھا، بہت سے لوگ مخالف ہوگئے تھے، مگر حضرت اپنی رائے پر مستقیم تھے، اس کے حسب حال کہا ہے کہ اجی ان کو کسی کی مخالفت کی کیا پرواہ ہے، ان

کا تو یہ حال ہے کہ ؎

گو ہوا دشمن زمانہ ہو مگر اے دل ہمیں | دیکھنا یہ ہے مزاجِ یار تو برہم نہیں

خواجہ صاحب نے آکر اس کو حضرت مولانا سے نقل کر دیا، کہ فلاں صاحب آپ کے متعلق یہ کہتے ہیں اور یہ شعر پڑھتے تھے کہ ان کا تو یہ حال ہے کہ ؎

گو ہوا دشمن زمانہ ہو مگر اے دل ہمیں | دیکھنا یہ ہے مزاجِ یار تو برہم نہیں

حضرت یہ سن کر بہت خوش ہوئے، کیونکہ حضرت کا یہی حال تھا۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ اپنی نعمتوں کا اثر بندوں پر دیکھے اور بالکل ایسا ہی ہے جس طرح سے والدین جب اپنی اولاد کو اچھے لباس میں دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا بَنِي آدَمَ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ، یعنی اے آدم کی اولاد! ہر نماز کے وقت اپنی زینت اختیار کرو۔

یہی وجہ ہے کہ جمعہ میں اور عید و بقرعید کے موقع پر اچھا لباس پہننے کو رسول اللہ ﷺ نے مسنون فرمایا ہے۔

باقی حضراتِ صوفیاء چونکہ علاجِ نفس کے لئے لذائذ کو ترک فرمادیتے ہیں، اس لئے علاجاً وہ ایسا کریں تو کر سکتے ہیں، ورنہ نص قرآنی: **قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ**، اس خیال کی تردید کرتی ہے۔ کفارِ عرب حج کے موقع پر ایک حرکت شنیع یہ کرتے تھے کہ تمام مرد عورت ننگے ہو کر طواف کرتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ شیطانی حرکت تھی کہ وہ ایسا کرتے تھے، شیطان نے سب سے پہلی عداوت جو انسان کے ساتھ کی وہ یہی تھی کہ ان کا کپڑا جنت کا اتروا دیا۔

چنانچہ جب آدم علیہ السلام کو بہکا کر گیہوں کھلا دیا تو ان کا انجام یہی ہوا کہ ان

کا لباسِ جنت اتر گیا اور شرم گاہیں کھل گئیں، اور درخت کے پتوں سے اپنا ستر چھپانے لگے۔

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۔ (ترجمہ) جب ان دونوں یعنی آدم اور حوا نے اس درخت (کے پھل) کو کھالیا تو ان کی دونوں کی شرم گاہیں ظاہر ہوگئیں جو ان کو بری معلوم ہو رہی تھیں، لہٰذا لگے دونوں جنت کے پتے توڑ توڑ کر اس کو ڈھانپنے۔

بہر حال میں یہ کہہ رہا ہوں کہ کسی کے پاس لباس کا ہونا، مکان کا ہونا، روپیہ کا ہونا ہر صورت میں مذموم نہیں ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے یہاں تجارت تھی لیکن کسی کی مجال نہیں جو ان حضرات کو دنیا دار کہہ سکے، اور یہ اس لئے کہ دنیا داری اس کا نام ہے کہ مال اور اس کی محبت دل کے اندر ہو، باقی اگر کسی کے دل میں مال کی محبت نہ ہو تو اس کو دنیا دار نہیں کہیں گے۔

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ

چوں ہر ساعت از تو بجائے رود دل　　　　به تنہائی اندر صفائی نہ بینی

یعنی جب ہر گھڑی ایک طرف تمہارا دل جاتا رہے گا، تو تم خلوت وتنہائی میں بھی اپنے قلب میں ذرا صفائی نہ دیکھ سکو گے۔

گرت مال وجاہ است وزرع وتجارت　　　　چو دل با خدا یست خلوت نشینی

یعنی ہاں اگر تمہارے پاس مال اور جاہ بھی ہے، اسی طرح زراعت اور تجارت بھی ہے تو اگر تمہارا قلب اس سے فارغ ہے اور خدا تعالیٰ کی جانب راغب ہے تو تم اس حالت میں بھی خلوت نشین ہی ہو۔

چنانچہ بزرگانِ دین کا یہی حال ہوتا ہے کہ ان کے پاس مال ہوتا ہے، مگر دل

میں اس کی محبت نہیں ہوتی ، چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ اگر غیر اللہ کا خطرہ کے درجہ میں میرے دل میں سہواً بھی گذر ہو تو میں اپنے اوپر رِدّت کا حکم کروں گا، یعنی یہ سمجھوں گا کہ میں مرتد ہو گیا۔ (العیاذ باللہ)

دیکھا آپ نے ان حضرات کا قلب وقف ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے لئے، غیر اللہ کا خطور تک اس میں نہیں ہوتا، اسی کو حضرت حاجی صاحب فرماتے ہیں ؎

آسکے غیر مرے خانۂ دل میں کیسے کہ خیالِ رُخِ دلدار ہے درباں اپنا

خود جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ آپ فرماتے ہیں اگر کسی کو خلیل بناتا تو ابو بکر کو خلیل بناتا، لیکن میرا خلیل اللہ ہے۔

دیکھئے خلت کا تعلق آپ کا صرف خدا کے ساتھ تھا، اس مرتبہ میں حضرت ابو بکرؓ کی بھی گنجائش نہ تھی، بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ اللہ والے دنیا کو دل میں جگہ نہیں دیتے، دنیا ان کے پاس بھی آتی ہے، مگر وہ اس کو ایک خادم اور نوکر کی طرح، ع

سمجھتے ہیں خود اس کے تابع نہیں ہو جاتے

میں نے ایک دفعہ گورکھپور میں اس مضمون کو ایک خاص انداز سے بیان کیا تھا، بازار کے لوگوں نے اس کو بہت پسند کیا تھا، اور سامنے خوب واہ واہ کی تھی، نہ جانے، جانے کے بعد اس پر عمل بھی کسی نے کیا یا نہیں، میں نے یہ کہا تھا کہ ہم لوگ یعنی علماء اور مشائخ دنیا کمانے کو منع نہیں کرتے، خوب دنیا کماؤ، مگر مال کو جیب میں اور صندوق میں رکھو دل میں نہ رکھو۔ دل خدائے تعالیٰ کے تعلق اور محبت کی جگہ ہے، دنیا اور مال کی جگہ نہیں ؎

دل دیا ہے اس نے تخم عشق بونے کے لئے
آنکھ دی ہے اس نے ساری عمر رونے کیلئے

ہاں اگر دنیا کو اس کے مرتبہ سے بڑھا کر یہ درجہ اس کو دیدو کہ دل اس کی جگہ ہو جائے، تو یہ منع ہے اور انتہائی ظلم بھی ہے، ورنہ تو رسول اللہ ﷺ نے بھی دنیا کو دین کے لئے معین و مددگار فرمایا ہے، ارشاد ہے کہ:

أللّٰھم أعنی علیٰ دینی بالدنیا و علیٰ آخرتی بالتقویٰ ۔یعنی یا اللہ! میرے دین میں دنیا کے ذریعہ اور میری آخرت میں تقویٰ کے ذریعہ مدد فرمایئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا دین کی معین ہے، اور تقویٰ آخرت کیلئے معین ہے۔

ان سب باتوں پر آپ کی نظر کیوں نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں جہاں اور سب چیزیں بدل گئی ہیں، پیری مریدی کا حال بھی عجیب ہو گیا ہے، اب بہت سے مریدین پیر کے پاس اس لئے نہیں آتے ہیں کہ اپنی اصلاح کریں، بلکہ اس لئے آمد و رفت رکھتے ہیں کہ خود ان کی اصلاح کریں، اس لئے جو بات ان کی اپنی دانست میں خلاف دیکھتے ہیں تو اس پر اعتراض اور انکار کرنے لگتے ہیں، حالانکہ یہ بہت برا ہے، دوسروں کی اصلاح سے زیادہ ضروری آدمی کے لئے اپنی اصلاح ہے، اس طرف لوگوں کی توجہ ہی نہیں ہے ؎

ہر کسے ناصح برائے دیگراں　　　ناصح خود یافتم کم در جہاں

دوسروں کی باطنی تباہی کا تو آپ کو بڑا رنج ہوتا ہے، اور اپنی حالت کا غم نہیں ہے۔

حضور والا جانتے ہیں کہ یہ کیا بات ہے؟ بات وہی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ دو بیماریاں ایسی ہیں کہ وہ انسان کے قلب پر چیونٹی کی چال چلتی ہیں۔ ایک حسد اور دوسرے بغض، اس لئے انسان کو اس کا پتہ نہیں چلتا، اور یہ اس میں موجود ہوتی ہے، اس لئے کسی کو اچھے حال میں دیکھ کر قلب میں کچھ سوزش اور کچھ حرکت پیدا ہوتی ہے اور آدمی اس کے خلاف باتیں زبان سے نکالتا ہے، چنانچہ جس

چیز کی وجہ سے یہ ان پر اعتراض کرتا ہے، اگر خود اس کو مل جائے تو کبھی اسکو برا نہ سمجھے۔

اللہ والوں کو جو دنیا ملتی ہے تو وہ حضرات اس کی تحصیل میں دنیا داروں کی طرح منہمک نہیں ہوتے، پھر یہ کہ وہ اس کو اللہ تعالیٰ کا عطیہ سمجھ کر اللہ ہی کے راستہ میں مہمانوں میں، علم دین میں، طالبین میں اس کو صرف فرماتے ہیں اس کو جمع کر کے نہیں رکھتے، یہ لوگ کسی سے نہ مانگتے ہیں، نہ سوال کرتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اوپر توکل کرتے ہیں، اب اللہ تعالیٰ ہی کسی بندے کو ان کی جانب متوجہ فرما دیتے ہیں، اور جائز طریقہ سے وہ ان کی خدمت کرنا چاہتا ہے، تو انکار بھی نہیں فرماتے۔ اس پر حضرت مولانا کا ایک واقعہ سنئے!

حضرت ہدایا کے باب میں کتنے سخت تھے، ذرا سا اصول کے خلاف ہوا تو جھٹ سے واپس فرمایا، اس میں نہ کسی امیر کی رعایت تھی، نہ غریب کی، ایک مرتبہ خواجہ صاحب نے مجلس ہی میں سب کے سامنے اپنا بیگ نکالا، سڑاسڑ سڑاسڑ ایک دو تین چار، نہ معلوم کتنے نوٹ گن کر حضرت کے سامنے رکھ دیئے، حضرت نے صرف اتنا فرمایا کہ خواجہ صاحب اتنا دیدیا۔ اس پر خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے بہت دے رکھا ہے، حضرت نے قبول فرمالئے، اور پھر کچھ نہیں کہا، ہم لوگ یہ منظر دیکھ رہے تھے، خیال ہوا کہ خواجہ صاحب نے یہ کام تنہائی میں کیوں نہیں کیا، مجمع میں دینے کی کیا ضرورت تھی، پھر یہ سمجھ میں آیا کہ ہم لوگوں کو عملی طور پر یہ سبق دیا ہے، محبؔ جس طرح سے اپنے محبوب پر دل و جان سے نثار ہوتا ہے، اسی طرح سے مال سے بھی فدا ہوتا ہے، خواجہ صاحب کا قلب و جان سے فدا ہونا تو سب پر ظاہر تھا، اس وقت اپنے مال سے نثار ہونا دکھلا دیا، یہ نہیں کہ

اگر جاں طلبی مضائقہ نیست ورزر طلبی سخن درین است

اسی طرح حضرت تھانویؒ ایک دفعہ فتح پور ہنسوہ میں تھے، حضرت پیرانی صاحبہ کے علاج کے سلسلہ میں قیام تھا۔ کانپور سے حاجی دلدار خاں صاحب آئے اور حضرت کی خدمت میں ایک کثیر رقم پیش کی، حضرت نے فرمایا کہ یہ تو بہت ہے، حاجی صاحب نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا حضرت یہ وہی دلدار ہے جو کانپور کے بازار میں پھیری کرتا تھا۔ آج اللہ تعالیٰ نے جو اس قابل کیا ہے تو محض آپ کی دعاء کی برکت ہے، اس لئے سب آپ ہی کا ہے، اس کو قبول فرمالیجئے، حضرت نے پھر کچھ نہیں فرمایا۔

اسی طرح سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب ایک دفعہ حجامت بنوا رہے تھے، ایک رئیس جو حضرت کے معتقد تھے خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت نے ان کو دور سے آتے دیکھ تو لیا مگر گردن جھکائے حجامت بنواتے رہے، وہ پاس آکر کھڑے ہوگئے، کچھ دیر کے بعد حضرت نے سر اٹھایا، جب ان پر نظر پڑی تو فرمایا، اخاہ شیخ صاحب ہیں، آیئے تشریف لایئے۔ شیخ جی بہت سی رقم لائے تھے، حضرت کے قدموں میں ڈال دی، حضرت نے پیر ہٹائے وہ سب روپئے وہیں بکھر گئے، اور اسی وقت سب حاضرین کو وہیں بلوا کر تقسیم فرمادیا اور فرمایا کہ ہم بھی دنیا کماتے ہیں، اور دنیا دار بھی دنیا کماتے ہیں، مگر ہم اس طرح کماتے ہیں کہ وہ ہمارے قدموں سے لگتی ہے اور ہم اس کی طرف التفات بھی نہیں کرتے، چہ جائیکہ اس کے لئے ذلت گوارا کرنا۔

بزرگانِ دین جب نفس جیسے سرکش کو مار کر اس کو اپنا مطیع بنالیتے ہیں، جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ ؎

بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا
نہنگ واژدہا وشیر نر مارا تو کیا مارا

تو مال کو کیوں نہ اپنا مطیع بنالیں گے، کہ اس کا درجہ تو نفس سے کم ہے، ان کے

پاس مال کیوں آتا تھا، یہ حضرات بھی دیندار تھے، آج کسی کی مجال ہے جوان پر حب دنیا کا الزام بھی لگا سکے۔ حضرت جنیدؒ کے پاس ایک شخص آیا اوراس نے زیادہ سی رقم ہدیہ پیش کی، حضرت نے فرمایا کہ کیا یہ سب سالکین کے لئے ہے جو میرے پاس مقیم ہیں، اس نے کہا نہیں، حضرت یہ تنہا آپ کے لئے ہے، جس کو خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت آپ سے زیادہ بغداد پر احسان کرنے والا کوئی دوسرا شخص نہیں۔ رقم زیادہ تو جب ہو کہ ہم کہیں کہ آپ اس سے ساگ ترکاری کھایئے، یہ نہیں کہتا ہوں بلکہ آپ بادام کا حلوا کھائے، فلاں چیز استعمال کیجئے وغیرہ، اسی طرح بہت سی قیمتی چیزیں شمار کرادیں، حضرت جنیدؒ نے قبول فرمالیا، اور فرمایا کہ اس طرح سے ہدیہ مجھے آج تک کسی نے نہیں دیا جس طرح سے تم نے دیا، یعنی حضرت نے اس کے جواب سے سمجھ لیا کہ مخلص شخص ہے، بس ان حضرات کے یہاں یہی اخلاص ہی تو سب کچھ ہے، اس کے ہوتے ہوئے قلیل بھی کثیر ہے تو پھر کثیر کا کیا کہنا، اور یہی نہ ہو تو کثیر بھی قلیل ہے، بلکہ کچھ بھی نہیں ہے، جب کوئی شخص اس طرح سے اخلاص سے دے تو پھر اس کے لینے میں کیا حرج ہے۔ علماء کا اتفاق ہے کہ حلالِ مطلق تو حقیقت میں وہی ہے جو بدون کسی واسطہ کے براہ راست ملے، اللہ سے ملے۔

مشائخ نے وجوہِ حلال پانچ بیان فرمائے ہیں، حضرت ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ حلال پانچ ہیں۔ سچائی کے ساتھ تجارت کی جائے، اس سے جو آمدنی ہو وہ حلال ہے۔ دینداری کے ساتھ کوئی پیشہ یا حرفت اختیار کرے، اس کی بھی آمدنی حلال ہے، مثلاً نجاری، حدادی وغیرہ۔ دریا یا جنگل کا شکار بھی حلال ہے۔ اسی طرح وہ مال جو میراث میں کسی کو ملا ہو وہ اس کے لئے حلال طیب ہے۔ اسی طرح سے کسی ایسی جگہ اور ایسے شخص سے ہدیہ لینا جس کو یہ (حدودِ شرعی کے اندر ہونے کی وجہ سے) پسند

کراتا ہو۔ یہ سب ذرائع آمدنی کے حلال طیب اور جائز ہیں۔ پس اسی آخری قسم میں وہ ہدایا بھی داخل ہیں جو مرید پیر کو دیتا ہے، پھر یہ ناجائز کیوں ہے، یہ تو مرید کے اخلاص کی دلیل ہے، جس کا ثبوت دینا اس کیلئے ضروری ہے۔اس کے متعلق بزرگوں نے فرمایاہے: مقادیر الاموال موازین الجنة، اور جو سچ پوچھئے تو یہی مرید شیخ کی دنیا کا بھی ساتھی اور دین کا بھی، کیونکہ کوئی شخص جب اس دنیا میں رہتا ہے تو اس کے لوازم سے وہ خالی کیونکر ہوسکتا ہے۔اب ان سب باتوں کو نہ سمجھنا یا سمجھ کر محض حسد کی وجہ سے کسی کونشانۂ ملامت بنالینا، بلکہ اس امر کا منتظر رہنا کہ کون سا موقع ملے کہ اپنی بھڑاس نکالی جائے، یہ بہت برا ہے، کیونکہ ہر جگہ یہی کرتے رہوگے اور اس کی عادت ہوگئی تو اگر کہیں کسی کو ایسے کہہ دیا جو ایسا نہ ہو جیسا کہ تمہارا خیال ہے تو نقصان اٹھاؤ گے، اس لئے جب اس دنیا میں تم بھی ہو اور بہت سے اللہ کے بندے بھی ہیں تو ذرا غور کرلیا کرو کہ تمہارے منہ سے کیا نکل رہاہے اور دل میں کیا گذر رہا ہے۔اس پر ایک قصہ سنئے!

شیر ایک دفعہ بیمار ہوا، چونکہ جنگل کا بادشاہ کہلاتا ہے، اس لئے سب جانور اس کی عیادت کے لئے گئے، لومڑی نہیں گئی۔ بھیڑیئے نے چغلی کھائی کہ حضور سب جانور آئے اور لومڑی نہیں آئی، اتنے میں لومڑی بھی آگئی اور دور سے شیر کے تیور دیکھ کر سمجھ گئی کہ کچھ گڑبڑ ہے، دریافت کیا کہ کیا بات ہے، کسی نے کہا کہ بھیڑیئے نے تمہاری شکایت کردی ہے۔

چنانچہ جب سامنے گئی تو شیر نے کہا کہ کہاں تھی؟ اس نے کہا کہ حضور کے لئے دوا کی تلاش میں گئی تھی، اس میں دیر ہوگئی، پوچھا کہاں ہے دوا؟ کہا بھیڑیئے کی پنڈلی میں۔

شیر نے یہ سن کر بھیڑیئے کی پنڈلی پر ایک ہاتھ رسید کیا جس کی وجہ سے وہ زخمی ہوگیا اور خون سے سارا پیر رنگین ہوگیا، جب شیر کے پاس سے سب ہٹ کر باہر آئے تو لومڑی نے بھیڑیئے سے کہا کہ اے سرخ موزے والے جب بادشاہ کے پاس بیٹھا کرو تو اس کا ہوش رکھا کرو کہ تمہارے سر سے کیا نکل رہا ہے؟ مطلب یہ تھا کہ تم نے جو میری چغلی کھائی اس کا انجام دیکھ لیا نا، لہٰذا ایسا کام نہیں کرنا چاہئے۔

میں یہی کہہ رہا تھا کہ کسی کے بارے میں کوئی بات زبان سے سوچ کر نکالنا چاہئے، ورنہ بعض مرتبہ اس کا نتیجہ اپنے حق میں برا ہوتا ہے، اور کام کی چیز یہ ہے کہ آدمی اپنے کو دیکھے، دوسرے پر نظر ہی نہ کرے، کیونکہ اگر دوسرے کے بارے میں آپ محقق بھی ہوگئے تو یہ آپ کے لئے کچھ زیادہ نافع نہیں ہے، ہاں اگر آدمی اپنی ذات کا، اپنے نفس کا محقق ہو تو البتہ مفید ہے۔ اہل حقیقت کی تو یہی تحقیق ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

حضرت والا کا ایک درس

گذر چکا ہے کہ حضرت نے بیعت وارشاد کے ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا تھا، خوش قسمتی سے ایک درس جو منطق کی مشہور کتاب ''سُلَّم'' سے متعلق تھا، کسی صاحب علم کے قلم سے لکھا ہوا حضرت کے کاغذات میں دستیاب ہوگیا، ہم نے کچھ حذف وتصرف کے ساتھ اسے جزوِ کتاب بنانا مناسب سمجھا، درس خاصا اَدَق ہے، لیکن اس خیال سے کہ یہ اتنا حصہ خالص اہل علم کے ذوق کی چیز ہے، اس لئے تسہیل چنداں ضروری نہ سمجھی۔ اس سے حضرت کے اندازِ درس کا ایک نمونہ اہل علم حضرات کے پیش نظر ہوجائے گا۔ (مؤلف)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

منطق کے درس میں صاحب سلم کے قول **لا یحد** کی تشریح فرماتے ہوئے ملاحسن سے بھی کچھ سنایا، چنانچہ صاحب ملاحسن نے اس دعویٰ کے اثبات کے لئے پہلے اپنے دلائل بیان کئے ہیں، اور آخر میں قاضی مبارک کی بیان کی ہوئی دلیل کا ذکر کرکے اس کا رد کیا ہے، جیسا کہ ان کا عام دستور ہے کہ قاضی مبارک سے کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں، اس لئے ان کی اچھی خاصی دلیل کو بھی رد کئے بغیر نہیں رہتے۔ قاضی نے اللہ تعالیٰ کے لئے اجزاء حدیہ کا ابطال کیا تھا، جس کا حاصل صاحب ملاحسن کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

لو كان له أجزاء فأما أن يكون تلك الاجزاء ممكناً فيلزم من

رفعها بحسب الذات رفع الواجب كذٰلك فلايكون الواجب واجباً أو ممتنعات وهو ظاهر البطلان ضرورة أن إمتناع الاجزاء يستلزم إمتناع الكل أو واجبات فيلزم تعدد الواجب۔

اگر (معاذ اللہ) واجب تعالیٰ کے اجزاء ثابت ہوں گے تو یا تو وہ اجزاء ممکنات کے قبیل سے ہوں گے جن کا وجود وعدم یکساں ہوتا ہے، تو ان کے رفع بالذات سے واجب تعالیٰ کا بھی رفع بالذات لازم آئے گا، پس واجب، واجب نہ رہے گا، کیونکہ واجب کا عدم محال ہوتا ہے، یا وہ اجزاء ممتنعات کی قبیل سے ہوں گے، اس کا بطلان بالکل ظاہر ہے، اس لئے کہ اجزاء کا امتناع کل کے امتناع کو مستلزم ہوا کرتا ہے اور یا وہ اجزاء واجب ہوں گے، پس واجب کا تعدد لازم آئے گا جو توحید کے منافی ہے، لہٰذا باطل ہے۔

اس پر ملا حسن لکھتے ہیں:

وهٰذا البيان وإن يقنع به الناظر ولكن لايفحم المناظر فإن تعدد الواجب تعالىٰ باطل فى نفس الامر بدليل شرعى وبيان عقلى خارج عن العقول المتوسطة كعقول العرفاء فإنهم يعلمون ذٰلك بالعقول ايضاً فى خلواتهم ومراقباتهم وصفاء اذهانهم ولكن لم يقم عليه برهان قوى بعد فى عالم العقول المتوسطة التى كلامنا فيها۔

یہ بیان اگرچہ ظاہر بیں کو اس سے قناعت ہوسکتی ہے، لیکن مناظر کے لئے یہ مسکت نہیں ہے، اس لئے کہ واجب تعالیٰ کا متعدد ہونا (معاذ اللہ) نفس الامر میں جو باطل ہے تو محض دلائل شرعیہ سے، اور جن دلائل عقلیہ سے بھی باطل ہے تو وہ ایسے ہیں کہ عقول متوسطہ کی فہم سے بالاتر ہیں، مثلاً عارفین ہیں کہ یہی لوگ اس کو (تعدد وجباء

کے بطلان کو) اپنی عقول سے بھی جانتے ہیں، اپنی خلوات ومراقبات میں اور صفاء اذہان سے، مگراس دعویٰ پر عقول متوسطہ میں جس میں ہمارا کلام ہے اب تک کوئی قوی (قطعی) برہان قائم نہیں ہوسکا ہے۔

تقریر جب اس مقام پر پہونچی تو حضرت والا نے ذرا سا توقف فرمایا اور یہ فرمایا کہ صاحب ملاحسن کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی، اور یہ کچھ اس وقت نہیں بلکہ زمانۂ طالب علمی میں بھی جب یہ عبارت سامنے آئی تو طبیعت میں ایک کھٹک پیدا ہوئی، اس وقت بھی یہی سمجھ میں آتا تھا کہ یہ بات صحیح نہیں، یہ کیسے فرمارہے ہیں کہ نفی تعدد واجب تعالیٰ یعنی توحید واجب تعالیٰ پر اب تک کوئی عقلی وقطعی دلیل ہی قائم نہیں ہوئی ہے، حالانکہ علماء محققین نے اہل معقول کے اصول پر توحیدِ الٰہ کو ثابت کیا ہے، سنئے! حضرت مولانا تھانویؒ اپنے رسالہ ''الادراک فی اقسام الاشراک'' میں فرماتے ہیں کہ:

دلیل اول عقلی براصول میزانیین جواپنی جزئیت کے سبب کلیات سے زیادہ کافی ہے، وہ یہ ہے کہ مسئلہ توحید الٰہ واجب عقلی ہے، خواہ بدیہی ہو یا نظری۔ یہ دوسری بحث ہے اور کسی حکم کا وجوب عقلی مستلزم ہوا کرتا ہے، اس کی نقیض کے امتناع عقلی کو، پس نقیض توحید کا حکم ممتنع ہوگا، اور اس نقیض کی دو قسمیں ہیں، ایک نفی الٰہ کہ کفر ہے۔ دوسرے تشریک الٰہ آخر معہ، کہ شرک ہے، اور مقسم کا امتناع مستلزم ہوتا ہے اس کے سب اقسام کے امتناع کو، پس شرک کے لئے لازم ہوا کہ وہ کسی امر ممتنع کا اعتقاد ہوگا، اور اس امتناع واستحالہ کی طرف نصوص بھی مشیر ہیں۔

کقولہ تعالیٰ: قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي

الْعَرْشِ سَبِيْلاً. وقوله تعالی: ''لَوْ كَانَ فِيْهِمَا الِهَةٌ إِلَّا اللهُ لَفَسَدَتَا. وقوله تعالیٰ: مَااتَّخَذَاللهُ مِنْ وَّلَدٍ إِذاً لَّذَهَبَ كُلُّ إِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلىٰ بَعْضُهُمْ عَلىٰ بَعْضٍ. وقوله تعالی: لَوْأَرَادَ اللهُ أَنْ يَّتَّخِذَ وَلَداً لَّاصْطَفىٰ مِمَّايَخْلُقُ مَايَشَاءُ. (امدادالفتاویٰ، ج:۵،ص:۵۲۵)

جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ ''تم کہہ دو اگر اس کے ساتھ اور معبود ہوتے جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں تو وہ عرش والے تک پہونچنے کا راستہ ڈھونڈ نکالتے۔ اور جیسے خدا کا ارشاد: اگر زمین وآسمان میں خدا کے علاوہ اور معبود ہوتے تو دونوں کا نظام فاسد ہوجاتا۔ اور جیسے حق تعالیٰ کا ارشاد کہ ''اللہ نے کوئی بیٹا نہیں بنایا اور اسکے ساتھ کوئی اور معبود نہیں ہے، ورنہ تو ہر معبود اپنی مخلوق کو الگ کرلیتا۔ اور ارشاد خداوندی کہ ''اگر اللہ تعالیٰ بیٹا ہی بنانا چاہتے تو اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتے چن لیتے۔

دیکھا آپ نے ملاحسن تو فرماتے ہیں کہ عام عقول متوسطہ میں توحید باری تعالیٰ اور نفی تعدد وجبہ پر دلائل ہی قائم نہیں۔ اور علماء یہ فرماتے ہیں کہ توحید الٰہ واجب عقلی ہے، یعنی جس طرح سے نقل سے یہ ثابت ہے کہ صانع عالم واحد قدیم ہے، اسی طرح سے عقل سلیم بھی اس کی قائل ہے کہ خالق ومدبر عالم ذات واحد واجب الوجود ہے، اور اشراک شرعاً اور عقلاً قبیح وباطل امر ہے۔

اب میں آپ کے سامنے توحید باری تعالیٰ پر نقلی اور عقلی دونوں دلائل پیش کرتا ہوں، سنئے!

قال الله تعالی: ''لَوْ كَانَ فِيْهِمَا الِهَةٌ إِلَّا اللهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحٰنَ اللهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ لَايُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ

أَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اٰلِهَةً قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ’’زمین و آسمان میں اگر اللہ کے سوا اور کوئی معبود ہوتا تو دونوں درہم برہم ہوجاتے، سو اللہ تعالیٰ جو کہ مالک ہے عرش کا ان امور سے پاک ہے، جو کچھ یہ لوگ بیان کرتے ہیں، وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے کوئی بازپُرس نہیں کرسکتا، اور اوروں سے بازپُرس کی جاسکتی ہے۔ کیا خدا کو چھوڑ کر انھوں نے اور معبود بنا رکھے ہیں، کہئے کہ تم اپنی دلیل پیش کرو۔ یہ میرے ساتھ والوں کی کتاب اور مجھ سے پہلے لوگوں کی کتابیں موجود ہیں، بلکہ ان میں زیادہ وہی ہیں جو امرِ حق کا یقین نہیں کرتے، سو وہ اعراض کر رہے ہیں۔

دیکھئے ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے شرک کا ابطال کر کے توحید کا اثبات فرمایا ہے، اور عقلی طور پر فرمایا ہے، اس لئے یہ دلیل عقلی بھی ہے اور چونکہ قرآن شریف میں مذکور ہے اس لئے نقلی بھی ہے، پھر اس میں ان مشرکین کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ: أَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اٰلِهَةً ؟ کیا یہ لوگ خدا کے ماسوا اوروں کو بھی معبود بناتے ہیں؟ پھر آگے ان سے اس پر برہان کا مطالبہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ، یعنی آپ فرما دیجئے کہ تم اس پر اپنی دلیل پیش کرو۔

صاحب تفسیر مظہری نے اس مقام کو خوب واضح فرمایا ہے، اس لئے یہاں ان کا کلام نقل کرتا ہوں۔ لکھتے ہیں:

’’أَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اٰلِهَةً ؟ کیا ان لوگوں نے اللہ کے علاوہ اوروں کو معبود بنا رکھا ہے؟) اللہ تعالیٰ نے یہ زجر و توبیخ اور انکار دوبارہ ذکر کیا، مقصد ان کے کفر کی قباحت اور ان کی جہالت کا اظہار ہے، اور انھیں لاجواب کرنا ہے۔ یا مقصود ان کے

اس کفر پر دلیل عقلی ونقلی قائم ہونے کا انکار ہے۔مطلب یہ ہے کہ کیا انھوں نے اور بھی کچھ ایسے معبود پائے جو مردوں کو زندہ کرتے ہیں کہ انھیں معبود بنالیا، کیونکہ ان میں خدائی خصوصیات دیکھ لئے ہیں، یا انھوں نے آسمانی کتابوں میں شرک کا کوئی حکم پالیا ہے کہ اس کے اتباع میں دوسرے معبود بنالئے ہیں۔اس تشریح کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ آگے چل کر پہلی بات کے رد میں اللہ تعالیٰ نے ایسا جملہ ارشاد فرمایا ہے، جس سے شرک کا فساد عقلاً سمجھ میں آتا ہے،اور دوسری بات کے رد میں ایسا جملہ ارشاد ہوا ہے جس سے اس کا فساد نقلاً معلوم ہوتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے کہ: قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ، یعنی شرک کے اوپر کوئی دلیل عقلی یا نقلی لاؤ، بے دلیل بات کہنا تو کسی طرح درست نہیں ہے، لیکن دلیل کہاں، یہاں تو شرک کے ابطال پر بے شمار عقلی دلائل قائم ہیں (منجملہ ان کے ایک یہ آیت بھی ہے لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ، یعنی: اگر زمین وآسمان میں خدا کے علاوہ کوئی اور معبود ہوتا تو دونوں درہم برہم ہوجاتے حالانکہ ایسا نہیں ہے، معلوم ہوا کہ کئی معبود نہیں ہیں، کیونکہ بالفرض اگر کئی خدا ہوتے تو اگر مقصد میں سب ایک رائے ہوں تو کئی قدرتیں جمع ہوجائیں گی، اور اگر مقصد میں مختلف الخیال ہوں تو اس کا وقوع ہی ممکن نہ ہو) نیز شرک کے ابطال پر نقلی دلائل بھی موجود ہیں، آگے ارشاد ہے: هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ ، یعنی یہ قرآن، یہ تورات اور انجیل جو اس وقت تمہارے سامنے موجود ہیں یہ تمہارے لئے یعنی امت کے لئے قیامت تک کے لئے سامانِ نصیحت ہیں۔وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ، اور مجھ سے پہلے گذشتہ اقوام کے لئے سامانِ عبرت تھیں۔حضرت عطاء نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ ذکر من معی قرآن کریم ہے، اور ذکر من قبلی توریت اور انجیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمانی کتابوں یعنی قرآن، توریت اور انجیل کی مراجعت کرو اور دیکھو ان میں کہیں اس کا ذکر ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنا کوئی شریک کار

یا بیٹا بنایا ہے، یا کسی اور کی عبادت کا حکم دیا ہے، اور توحید کا مسئلہ کوئی ایسا تو نہیں ہے کہ اس کے ثبوت پر رسول کی بعثت اور کتابوں کی تنزیل کا مسئلہ موقوف ہو، اس لئے کتابوں سے استدلال نقلی میں کوئی استحالہ بھی نہیں ہے، اگر کسی کو شبہہ ہو کہ مشرکین مکہ تو کسی آسمانی کتاب کو تو مانتے ہی نہ تھے، بالخصوص قرآن کے تو سرے سے منکر تھے، پھر ان کے خلاف آسمانی کتابوں سے حجت کیونکر قائم ہوگی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ آسمانی کتابوں بالخصوص قرآن کریم کی صحت اور اس کا ثبوت اس کے اعجاز کی وجہ سے اتنا واضح اور ظاہر ہے کہ اسے گویا مسلمات میں شمار کیا گیا، اور مشرکین کا انکار تو محض بغض وعناد کی وجہ سے تھا، اس لئے ان کے انکار وتکذیب کو قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اہل انصاف تو اسے برحق ہی سمجھیں گے۔

دیکھئے قاضی صاحب نے ھَاتُوا بُرْھَانَکُمْ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ شرک پر برہان لاؤ یعنی دلیل عقلی یا نقلی پیش کر، اس لئے کہ کوئی بھی دعویٰ بغیر دلیل کے معتبر نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ نے مشرکین سے ان کے شرک پر برہان کا مطالبہ قرآن شریف میں متعدد مقامات پر فرمایا ہے، چنانچہ ایک مقام پر اور فرماتے ہیں:

أَمَّنْ يَّبْدَؤُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ أَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ۔

کیا وہ جو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر دوبارہ پیدا کرے گا، اور جو تم کو آسمان وزمین سے روزی عطا فرماتا ہے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی معبود ہے، تم کہو کہ اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو۔

دیکھئے یہاں بھی وہی برہان کا لفظ استعمال فرمایا، اسی طرح ایک جگہ اور ارشاد ہے:

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَاءِ یَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ، وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْا أَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ

وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ۔

جس دن انھیں پکارے گا اور کہے گا کہ میرے وہ شرکاء کہاں ہیں جنھیں تم سمجھتے تھے، اور ہم ہر ایک امت سے ایک گواہ اٹھائیں گے اور کہیں گے کہ اپنی دلیل لاؤ، پھر انھیں معلوم ہو جائے گا کہ حق تو اللہ کیلئے ہے، اور جو کچھ یہ افتراء کرتے تھے، سب غائب ہو جائے گا۔

هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ کی تفسیر میں قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ **أی حجتکم علیٰ صحة ما کنتم تدینون به**، یعنی جس اشراک کو تم نے دین بنا رکھا ہے، اس کی صحت پر حجت قاطعہ لاؤ، اسی طرح ایک اور مقام پر برہان کا لفظ آیا ہے، فرماتے ہیں:

فَذَانِکَ بُرۡهَانَانِ أی حجتان قال فی القاموس: البرهان بالضمة الحجة وبرهن علیه، أقام البرهان۔

پس یہ دو برہان ہیں یعنی قطعی دلیل ہیں، صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ برہان بالضم کے معنی حجت اور دلیل کے ہیں، کہا جاتا ہے **برهن علیه**، دعویٰ پر دلیل قائم کی۔

ان سب تصریحات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ ان سے برہان کا مطالبہ کیا ہے، اور برہان لغت میں کہتے ہیں اس حجت کو جس کے مقدمات یقینی ہوں، چنانچہ غیاث اللغات میں ہے کہ:

بدانکہ برہان باصطلاح منطقیین عبارت است از قیاسے کہ مرکب باشد از مقدمات یقینی۔ ص:۷۶	جانو کہ برہان منطقیوں کی اصطلاح میں اس قیاس کو کہتے ہیں جس کے مقدمات یقینی ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اشراک کے ثبوت پر حجۃ قاطعہ

طلب فرمایا ہے، کیونکہ ہر جگہ لفظ برہان ہی استعمال فرمایا ہے اور برہان کہتے ہیں حجۃ قاطعہ کو نہ کہ دلیل ظنی کو۔ یہاں سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ اہل معقول جس دلیل کو برہان کہتے ہیں، تو اس کا یہ نام بھی قرآن شریف ہی سے سرقہ کیا گیا ہے، چنانچہ اس حجت کا نام برہان رکھنے میں بھی یہ لوگ چور ہی ہیں، اگر اللہ تعالیٰ نے اس کو برہان نہ فرمایا ہوتا تو یہ لوگ از خود یہ نام نہ رکھ سکتے تھے۔

بہرحال اس تمامتر گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان سے اشراک کے اثبات کے لئے برہان کا مطالبہ فرمایا، تو جہاں کہیں قرآن شریف میں خود اللہ تعالیٰ توحید کا اثبات یا شرک کا ابطال فرمائیں گے اس کے لئے براہین قاطعہ نہ بیان فرمائیں گے، صرف ظنیات پر اکتفا کریں گے، یہ کیسے ممکن ہے، مخلوق تو عاجز ہے اور حق تعالیٰ قادر ہیں، اور توحید کا مسئلہ ایمان واسلام کا بنیادی مسئلہ ہے، بلکہ دیگر مسائل کا موقوف علیہ ہے، پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایسا اہم مسئلہ ہو اور اس کے دلائل قطعی نہ ہوں۔

☆☆☆☆☆☆☆

پھر آیت کریمہ **لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ** کی مزید تشریح فرماتے ہوئے حضرت والا نے شرح عقائد نسفی سے اس قول کی شرح سنائی کہ **والمحدث للعالم هو الله تعالىٰ الواحد القديم**، اور عالم کو وجود میں لانے والا اللہ ہے، جو اکیلا ہے، قدیم ہے، اور اسی سلسلے میں علامہ تفتازانی کی یہ عبارت سنائی (ہم صرف ترجمے پر اکتفا کرتے ہیں)

”معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد **لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ**“ اقناعی دلیل ہے، اور کئی معبود کے وجود اور فسادِ عالم کے درمیان لزومِ عقلی نہیں

بلکہ لزوم عادی ہے، اور یہی دلائل خطابیہ کے مناسب بھی ہے، کیونکہ عادۃً تعدد حاکم کے وقت ٹکراؤ اور تصادم ہو ہی جاتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ولعلیٰ بعضھم علیٰ بعض بعض کا بعض پر غلبہ ہو جاتا ہے۔ اور ہم نے اس لزوم کو لزوم عادی اس لئے کہا کہ اگر یہ لزوم عقلاً مانا جائے تو دو حال سے خالی نہیں، یا تو فساد سے مراد فساد بالفعل ہے، تب تو ظاہر ہے کہ محض تعدد الٰہ کی وجہ سے فساد عالم لازم نہیں ہوگا، کیونکہ ممکن ہے کہ دو متعدد خدا اسی پر متفق ہوں، اور اگر فساد سے امکانِ فساد ہو تو امکانِ فساد تو ایک خدا ہونے کی صورت میں بھی ہے، کیونکہ نصوص اس بات پر قطعی شاہد ہیں کہ قیامت کے دن عالم کا نظام پورا درہم برہم ہو جائے گا، معلوم ہوا کہ نظام عالم کی برہمی ممکن ہے۔

اس کو سنا کر فرمایا کہ دیکھئے بعض دفعہ محققین اسلام بھی فلاسفہ کے علوم سے اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں کہ اسی بات کو کہنے لگتے ہیں جس کا ظاہر نصوص کے بالکل خلاف ہوتا ہے، چنانچہ ابھی آپ نے دیکھا کہ ملا حسن نے کیا فرمایا؟ ان کے نزدیک ابھی تک عالم عقول متوسطہ میں تعدد الٰہ معاذ اللہ باطل ہی نہیں ہوا ہے، حالانکہ میں اس کے متعلق ابھی حکماء اسلام کے پیش کردہ دلائل عقلیہ آپ کے سامنے بیان کروں گا کہ دیکھئے کیسی مستحکم دلیل ہے اور اس پر جو ایرادات کئے گئے ہیں، علماء نے کس طرح اس کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے ہیں۔

اسی طرح یہ صاحب شرح عقائد علامہ تفتازانی کتنے بڑے محقق ہیں، لیکن توحید جو کہ امہات المسائل میں سے ایک اہم اور بنیادی مسئلہ ہے، اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس کی اصلی دلیل جو قرآن شریف میں بیان کی گئی ہے وہ قطعی نہیں ہے محض اقناعی ہے، ان کا یہ کہنا بھی دل کو لگا نہیں، اور محض ان کے بیان سے قناعت نہیں

ہوئی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ شرک وغیرہ پر تو مشرکین سے برہان کا مطالبہ فرماتے ہیں اور خود توحید اور ابطال شرک پر محض اقناعیات اور خطابیات ہی پر اکتفا فرمائیں گے، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کے پیش نظر قناعت نہیں ہوئی، تو دوسری کتب تفسیر کی مراجعت کی گئی، چنانچہ روح المعانی میں اس پر مفصل کلام ملا۔

آیت **لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللّٰهُ** پر کلام کرتے ہوئے علامہ تفتازانی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: **ان الحجة اقناعية و الملازمة عادية الخ** اور پھر اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:

”علامہ تفتازانی نے آیت کے برہان ہونے کی نفی کی ہے، خواہ فساد عالم کا معنی یہ ہو کہ بننے کے بعد بگڑ جائے، یا یہ ہو کہ سرے سے وجود ہی میں نہ آسکے۔ اس عبارت میں شرح مقاصد کی بات کی تردید ہے، شرح مقاصد میں اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ اگر فساد سے عالم کا عدم تکون مراد ہو تو اس صورت میں یہ برہان تمانع ہے، کیونکہ انھوں نے برہان تمانع کی تقریر کے بعد یہ کہا ہے کہ ”کہ اس برہان کا نام برہان تمانع ہے“ اور اسی جانب اللہ کے ارشاد **لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللّٰهُ** میں اشارہ ہے، پس اگر فساد سے عدم تکون مراد ہے، تو اس کی تقریر یوں ہوگی کہ اگر خدا متعدد ہوں تو زمین وآسمان بن ہی نہ سکتے، اس لئے کہ ان کا بننا اس صورت میں .... فرض کرو دو خدا ہوں .... تو یا تو دونوں کی مجموعی قدرت سے ہوگا یا دونوں کی علیٰحدہ علیٰحدہ قدرت سے، یا دونوں میں سے کسی ایک ہی کی قدرت سے۔ اور یہ تینوں باطل ہیں۔ پہلی صورت اس لئے باطل ہے کہ خدا کی شان یہ ہے کہ اسے کمالِ قدرت حاصل ہو، اور اس صورت میں دونوں کی مجموعی قدرت کامل ہورہی ہے، گویا ہر ایک کی الگ قدرت ناقص ہے، اور دوسری صورت اس لئے باطل ہے کہ دو کامل قدرتوں

کا مکمل توارد لازم آتا ہے، جو ممکن نہیں، اور تیسری اس لئے باطل ہے کہ دو مساوی قدرتوں میں ترجیح لازم آئے گی، اور یہ بھی درست نہیں، اور اگر فساد سے مراد بن جانے کے بعد نظام کا تہ وبالا ہو جانا ہے، تو دلیل تمانع کی تقریر اس طرح ہوگی کہ اگر مثلاً دو خدا ہوئے تو ان کے درمیان تنازع اور کشمکش کا ہونا لازمی ہے، اور ہر ایک اپنے کام کو دوسرے سے الگ اور ممتاز کرے گا۔ عادتاً ایسا کرنا لازم ہے، اس طرح کے نتیجے میں اجزاء عالم کے درمیان یہ ربط واتصال باقی نہ رہ جائے، جس کی بنیاد پر پورا عالم بمنزلہ شخص واحد کے ہے، اور یہ نظام بالکل گڑبڑ ہو کر رہ جائے جس میں انواع کی بقاء اور آثار کا ترتب ہوتا رہتا ہے۔

آگے صاحب روح المعانی نے علامہ خیالی کی بحث بھی نقل فرمائی ہے، جو انھوں نے اس مقام پر کی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''اس جگہ تحقیق یہ ہے کہ اگر آیت کریمہ کو مطلق صانع کے تعدد کی نفی پر محمول کریں تو دلیل اقناعی ہے، لیکن بہ ظاہر آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مطلق صانع کے تعدد کی نفی نہیں مقصود ہے بلکہ مقصد ایسے ایسے صانع کے تعدد کی نفی ہے جو آسمان وزمین میں مؤثر ہوں، اس لئے کہ لوکان سے مراد صرف اتنا نہیں ہے کہ وہ زمین وآسمان میں موجود ہو بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ تصرف بھی کرتا ہو اور مؤثر بھی ہو، اس صورت میں حق یہ ہے کہ تعدد الٰہ اور فساد عالم میں لزوم قطعی ہے، اس لئے کہ توارد (۱) تو یقیناً باطل ہے، پھر ان دونوں کا تصرف یا تو بطور اجتماع کے ہوگا یا بطور تقسیم کے، ان دونوں صورتوں میں یا تو پورے عالم کا یا اس

---

(۱) توارد کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک اپنی اپنی جگہ مستقل ارادہ کر کے عالم میں تصرف کرتا ہے، مگر اتفاق ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ دونوں کا تصرف بالکل ایک ہوتا ہے، مثلاً بارش برسانے کا ارداہ ہمیشہ ساتھ ہوتا ہے ، اسی پر اور افعال کو قیاس کر لیجئے۔ اس توارد کو کون احمق ممکن کہہ سکتا ہے، دو انسان باوجود اپنے ناقص ارادے کے بایدوشاید متفق ہوتے ہیں، پھر خدا کی قدرت تو ہر چیز میں کامل ہوتی ہے۔

کے کچھ حصے کا انعدام لازم ہوگا، کیونکہ فرض کیجئے بطور اجتماع کے تصرف وتاثیر ہوتو اگر ایک نے عدم تصرف کا ارادہ کرلیا تو پورا عالم ہی گیا، کیونکہ وہ علت کا جز ہے، اور اگر جز نہیں تو کل بھی نہیں، پھر عالم کا وجود کہاں؟ یا اگر الگ الگ تصرف کریں تو ہر ایک علت تامہ ہے تو کچھ عالم تو موجود ہوگا اور کچھ موجود نہ ہوگا، اس طرح عالم کا فساد کلی طور پر یا جزئی طور پر لازم آئے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لزوم عقلی اور قطعی ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ مطلق صانع کے تعدد کی نفی پر محمول کرتے ہوئے بھی اس لزوم کو قطعی اور عقلی قرار دیا جائے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ اگر خدا متعدد ہوں تو عالم ممکن ہی نہ ہوگا، اس کا وجود میں آنا تو درکنار، ورنہ تعدد الٰہ کی صورت میں عالم ممکن ہوگا تو تمانع بھی ممکن ہوگا، اور تمانع محال کو مستلزم ہوگا، اس لئے کہ تمانع کا امکان جبھی ہوگا جب تعدد الٰہ بھی ہو اور اشیاء کا وجود بھی ممکن ہو، پس اگر تعدد کو تسلیم کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ کوئی چیز ممکن ہی نہ ہو، ورنہ وہی تمانع لازم آئے گا، اور تمانع محال کو مستلزم ہے، اور جو محال کو مستلزم ہو وہ خود محال، لہٰذا تمانع محال اور جب تمانع محال ہوا تو اس کا ملزوم یعنی تعدد الٰہ بھی محال۔

دیکھئے علامہ خیالی کی اس تشریح سے معلوم ہوا کہ ان کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ آیت حجت قطعی ہے، ثانی توجیہ کے اعتبار سے تو مطلقاً اور اول کے اعتبار سے فی الجملہ، چنانچہ فاضل کلنبوی نے توجیہ اول پر ایرادات وارد کئے ہیں، لیکن ثانی کے بارے میں وہ بھی کہتے ہیں کہ:

فالحق أن التوجيه الثانى لقطعية الملازمة صحيح دون الاول۔

حق یہ ہے کہ لزوم کے قطعی ہونے کی دوسری توجیہ درست ہے، پہلی نہیں۔

اس کے بعد صاحب روح المعانی نے محقق دوّانی کا کلام نقل فرمایا ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دلیل کو قطعی کہنے والا ان کے نزدیک خاطی نہیں ہے، چنانچہ علامہ دوانی اس کے متعلق فرماتے ہیں:

''تمانع کے دو معنی ہیں۔ایک معنی یہ ہے کہ دو صاحب قدرت میں سے ایک کسی شی کے وجود اور دوسرا اس کے عدم کا ارادہ کرے۔ برہان تمانع جو مشہور ہے جس میں کہا گیا ہے کہ دو صاحب قدرت کے درمیان ایک مقدور محال ہے، اس میں تمانع سے یہی مراد ہے، چنانچہ حکماء کا یہ قول کہ اگر الٰہ متعدد ہوں گے تو ممکنات میں کسی ایک کو لازماً مستلزم ہے، یا تو وقوع بین قادرین کو، یا ترجیح بلا مرجح کو''۔ یہ قول بھی تمانع کے اسی مذکورہ بالا معنی پر مبنی ہے۔

دلیل کا حاصل یہ ہے کہ اگر دو قادر مطلق کا وجود تسلیم کرلیا جائے تو ان دونوں کے درمیان تمانع کا امکان بھی ماننا ہوگا، اور لازم یعنی تمانع محال ہے، کیونکہ تمانع اگر تسلیم کیا گیا اور ہر دو صاحب قدرت نے الگ الگ مستقلاً کسی ایک چیز کو وجود بخشنا چاہا تو یا تو کسی شی کا وجود ہی نہ ہوسکے، یا دونوں میں سے ہر ایک کی مجموعی قدرت سے ہوگا، یا کسی ایک کی قدرت سے ہوگا اور ہر صورت باطل ہے ۔دونوں کی مجموعی قدرت سے اگر اس کا وجود مانا جائے جبکہ ہر ایک کا ارادہ بالاستقلال تھا تو دونوں کا عجز لازم آئے گا، کیونکہ ارادہ کسی کا پورا نہ ہوسکا، پھر یہ دونوں قادر مطلق نہیں رہے، حالانکہ انھیں قادر مطلق فرض کیا گیا تھا۔

اسی جگہ یہ بات ظاہر ہوگئی کہ تعددِ الٰہ کو اگر تسلیم کرلیا جائے اور کسی مخلوق کا وجود اس صورت میں فرض کیا جائے تو دو محالات میں سے ایک کا امکان بہر حال ماننا پڑے گا، یا تو توارُد کا امکان یا ترجیح بلا مرجح کا امکان، اور یہ دونوں محال ہیں۔

اس لحاظ سے اگر ''فساد'' کا مطلب ''عدم کون'' لیا جائے تو بعض لوگوں نے آیت میں تعددِ الٰہ اور فساد عالم کے تلازم کو قطعی کہا ہے، پس یہ ایک لحاظ سے تو دلیل اقناعی ہے اور دوسرے لحاظ سے دلیل قطعی، پہلی صورت کا تعلق عوام سے ہے اور دوسری کا خواص سے۔ (روح المعانی، ص:۲۵، پ:۱۷)

اسی طرح علامہ مصلح الدین لاری نے بھی آیت کریمہ سے حجت کی جو تقریر کی ہے، اس کا حاصل بھی یہی نکلتا ہے کہ یہ قطعی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

''الٰہ...... جو مستحق عبادت ہو...... ضروری ہے کہ واجب الوجود ہو، اور واجب الوجود کا وجود اربابِ تحقیق کے نزدیک اس کی عین ذات ہوتا ہے، اس لئے اگر اس کا وجود اس کی ذات سے جداگانہ کوئی چیز ہو تو وہ ممکن ہوگا، کیونکہ اس صورت میں موجود ہونے کے لئے اپنے غیر کا محتاج ہوگا، اور غیر وہ وجود ہے، پس اگر الٰہ متعدد ہوں تو لازم ہوگا کہ وجود نہ ہو، لہٰذا اشیاء بھی موجود نہ ہوں گی، کیونکہ اشیاء کی موجودیت وجود کے ساتھ ارتباط کا نتیجہ ہے، جب وجود نہیں تو موجود بھی نہیں، پس ظاہری معنی کے اعتبار سے آسمان وزمین کا فساد ظاہر، نہ کہ عدم کون کے معنی کے لحاظ سے، کیونکہ وہ محض تکلف ہے۔

لیکن غور کرو تو اس استدلال کی رو سے عدم کون مراد لینا زیادہ واضح ہے۔ (روح المعانی)

اس استدلال کے متعلق صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ یہ حکماء اور فلاسفہ کا طرزِ استدلال ہے، کیونکہ ان کے اکثر وبیشتر براہین توحید اسی بات پر موقوف ہیں کہ وجودِ باری عین ذات اور وجوب وجود اس کے لئے ذاتی ہے۔ (پھر مولانا نے روح المعانی سے بہت طویل عبارت بڑھ کر سنائی، وہ بحث چونکہ بہت دقیق وطویل اور

فلسفیانہ ہے، نیز بہت سے اعتراضات وجوابات سے معمور ہے، اس لئے اسے حذف کرنا مناسب معلوم ہوا، صاحب روح المعانی کی تحریر سنانے کے بعد مسامرہ سے اس بحث کی تفصیل سنائی، اس کے بعد بطور خلاصہ کے ارشاد فرمایا:)

صاحب مسامرہ کے آخر کلام سے معلوم ہوا کہ علامہ تفتازانی کے اس قول کی وجہ سے کہ قولہ تعالیٰ: لَوْ كَانَ فِيهِمَا اٰلِهَةٌ إِلَّا اللّٰهُ، **حجة اقناعية والملازمة عادية علىٰ ماهو اللائق بالخطابيات لوجود التمانع والتغالب عند تعدد الحاكم الخ**، جس کا حاصل یہ ہے کہ اثباتِ توحید کے باب میں یہ آیت ظنی ہے، صاحب تبصرہ نے ان کی تکفیر تک کردی ہے، اس لئے کہ توحید دلائل قطعیہ سے ثابت ہے، اس کی دلیل کو ظنی سمجھنا یعنی ظنی الثبوت سمجھنا ظاہر ہے کہ کفر ہے۔

اور صاحب تبصرہ کے علاوہ دوسرے علماء نے بھی مثلاً امام رازیؒ اور صاحب روح المعانی وغیرہ نے علامہ تفتازانی کی رائے کو پسند نہیں فرمایا ہے، لیکن تکفیر بھی نہیں کی، بلکہ امام رازی نے تو یہ کہا کہ آیت حجت اقناعی سہی، تاہم مخاطبین کی خصوصیت کے اعتبار سے مفید للقطع ہے، ظنی محض نہیں ہے جس کی وجہ صاحب مسامرہ نے مفصل ذکر کی ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ:

''دلائل کی مثال اثباتِ توحید میں اَدْوِیہ کی سی ہے، ان سے قلب کا علاج مقصود ہوتا ہے، اور دوا ظاہر ہے کہ ہر مریض کی قوت طبیعت اور اس کے ضعف کے لحاظ سے مختلف ہوا کرتی ہے، اگر کوئی طبیب اپنے سب مریضوں کو ایک ہی دوا اور ایک ہی قوت کی دیتا چلا جائے تو وہ حاذق نہیں ہے بلکہ احمق وجاہل شمار ہوتا ہے، اسی طرح روح اور قلب کے بیماروں کو بھی سب کو ایک قسم کی دوا مفید نہ ہوگی، مثلاً:

(۱) مومن، مصدق ہے، تو اس کو دلائل کی احتیاج ہی نہیں ہے، اس کی سمعی یا

تقلیدی تصدیق ہی اس کے لئے کافی ہے۔

(۲) اور جافی غلیظ القلب، ضعیف العقل، جامد علی التقلید، مصر علی الباطل شخص کے لئے کوئی دلیل نافع ہی نہیں ہے، خواہ وہ کیسی ہی قطعی کیوں نہ ہو، وہ شخص اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس کا بھی انکار کردے گا۔

(۳) اور وہ لوگ جو شک میں پڑے ہوئے ہیں اور کسی قدر فہم وذکاء سے بھی ان کو حصہ ملا ہوا ہے، لیکن عقل کا وہ درجہ انھیں حاصل نہیں ہے کہ براہین عقلیہ جو مفید للقطع والیقین ہیں، ان تک ان کی رسائی ہوسکے تو ایسوں کے معالجۂ باطن میں تلطف ہی مناسب ہے، یعنی ان کے سامنے ایسے دلائل بیان کرنا ہی مقتضائے حکمت ہے، جو مقنع اور مقبول ہوں، یعنی ان کے مسلمات سے ان کو قائل اور محجوج کرنا چاہئے، اور ان کو انھیں سے الزام دینا چاہئے، نہ یقینیات کا استعمال، کیونکہ ان کے تو فہم ہی سے ان کی عقول قاصر ہوں گی۔

آگے صاحب مسامرہ نے اس بات کو مدلل فرمایا کہ نورِ عقل جو امور عادیہ سے مجرد ہو اس کے ساتھ اہتداء تو اللہ تعالیٰ کے کچھ مخصوص بندے ہی حاصل کرتے ہیں، ورنہ تو عام مخلوق تو بوجہ اس کے کہ ان پر قصور اور جہل کا غلبہ ہوتا ہے، دلائل عقلیہ کا ادراک ہی نہیں کرسکتے، جیسے چمگادڑ نورِ شمس کا ادراک نہیں کرسکتی، بلکہ اس طبقہ کے لئے یہ دلائل بجائے مفید ہونے کے مضر ثابت ہوتے ہیں جس طرح سے کہ گلاب کی خوشبو سے گبریلے کو ایذا ہوتی ہے۔

(۴) ہاں ایک طبقہ اور بھی ہے عقلاء کا جن کو کلام خطابی سے قناعت نہیں ہوتی تو ان کے لئے بلاشبہ دلائل وبراہین کی حاجت ہے۔

انسانوں کی تقسیم کے پیش نظر رکھنے کے بعد کہ ایک طبقہ ان میں جافی غلیظ

القلب، ضعیف الیقین ہوتا ہے، ایک طبقہ اہل شک کا ہوتا ہے جن کے نزدیک دونوں جانب (موافق ومخالف) برابر ہوتی ہیں، اور ایک فطن وعاقل کا ہے، یہ سمجھئے کہ قرآن شریف میں دلائل توحید کچھ اسی آیت میں منحصر نہیں ہے، بلکہ ہر ہر طبقہ کے مزاج اور فہم کے مطابق خالق حکیم نے اپنے وجود اور اپنی توحید پر کلام فرمایا ہے، پس اہل شک کے مناسب حال ہی یہ تھا کہ ان سے گفتگو ان کے فہم کے مطابق کی جاتی، یعنی ان کے لئے حجت قطعی کی حاجت نہ تھی، کلام اقناعی جو کہ ان کے مسلمات سے ہو، ان کے اسکات اور الزام کے لئے کافی تھا، اور یہی ان کے حق میں بمنزلہ دلیل قطعی کے تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے جب مشرکین کے مقابلہ میں دلیل قائم فرمائی تو ایسی جو کہ اگرچہ خطابی ہو یعنی امور عادیہ پر مبنی ہو لیکن ان کے نزدیک مقبول ہو، اور کم از کم وہ اس کو قطعی ہی سمجھتے ہوں۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیت بھی اسی قبیل سے ہے کہ ہے اقناعی لیکن مفید **للقطع بخصوصیة المخاطبین بها۔**

اس تقریر کے بعد یہ علامہ تفتازانی کی تکفیر کی حاجت اور نہ بالکلیہ ان کے قول کے تائید کی ضرورت۔

باقی یہ جو کہا گیا کہ بعض دفعہ خصم کو اس کے مسلمات سے ہی مجوب کرنا اس کے حق میں الزم واسکت ہوتا ہے تو اس کے متعلق یہ سمجھئے کہ یہ مشرکین عرب ایسے ہی تھے، اس لئے کہ شرک جس کے ابطال کے لئے یہ آیت وارد ہوئی ہے، اس کا قبیح ہونا ان کو بھی مسلم تھا، چنانچہ حضرت الاستاذ مولانا انور شاہ صاحب سے سنا، فرماتے تھے کہ شرک کو اہل عرب بھی برا جانتے تھے، چنانچہ علی الاعلان حج کے موقع پر اپنے تلبیہ میں کہا کرتے تھے **لبیک لاشریک لک إلا شریکاً ھو لک تملکه وماملک۔**

دیکھئے لا شریک لک کہتے تھے، مگر چونکہ تقلید آباء ان میں راسخ تھا، اس لئے اس کے آگے عقل ودین سب قربان تھا، اس پر باقی رہنا چاہتے تھے، اس کے جواز کے لئے اپنی طرف سے ملالیا تھا کہ إلا شریکاً ھو لک تملکہ وما ملک، یعنی آپ کا کوئی شریک نہیں ہے بجز اس شریک کے کہ آپ جس کے مالک ہیں اور وہ مالک نہیں ہے، یہی ان کی گمراہی اور شیطان کا اغوا تھا کہ بلا دلیل بلکہ خلافِ دلیل اور خلافِ عقل باتوں کے قائل تھے، آپ خود سمجھئے کہ جس کا خدا مالک ہوگا تو وہ مملوک ہوگا، پھر کسی مملوک کے مالک کے ساتھ شریک ہونے کیا مطلب؟ أضلہ اللہ علیٰ علم کا یہی مصداق ہے، کہ آدمی جانتا ہو، سمجھتا ہو اور وقت پر اس کا علم اور اس کی عقل کام نہ آوے، صحیح راہ نہ دکھاوے بلکہ بے راہ روی ہی کو راہ جانے۔ غرض یہ معلوم ہوا کہ وہ بھی شرک کو معیوب جانتے تھے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں یہ لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے ان کے اندر دین سماوی کی بہت سی بقیہ چیزیں موجود تھیں، بعض بعض میں اضافہ وتصرف کر کے بدل دیا تھا، میں یہاں حضرت شاہ صاحب کی کتاب سے پوری عبارت نقل کرتا ہوں جو میرے سابق بیان کے لئے بمنزلہ تائید کے ہے۔

(یہاں حضرت والا نے حجۃ اللہ البالغہ سے ص: ۱۲۶ سے ۱۲۸ تک عبارت نقل فرمائی ہے، ہم نے اختصار کی غرض سے یہ حصہ حذف کر دیا، اہل علم حضرات اصل کتاب سے رجوع کر سکتے ہیں، ہمارا مقصد محض درس کا ایک نمونہ پیش کرنا تھا، جس سے حضرت کی انفرادیت اور عبقریت کا کچھ اندازہ نہ جاننے والے کر سکیں۔)

☆☆☆☆☆☆☆

حضرتؒ کی مکاتبت حضرت تھانویؒ سے

حضرت مولانا کے چند مکاتیب جو حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے نام لکھے گئے تھے، ہماری خوش قسمتی سے حضرت مولانا قاری محمد مبین صاحب کے پاس محفوظ ہیں، ان میں سے چند ایک کو یہاں دیا جا رہا ہے، یہ مکاتیب خود آپ اپنے تعارف ہیں۔

مرشدی ومولائی سیّدی وسندی وسیلۃ یومی وغدی مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جب سے خدمت اقدس میں حاضر ہوا، بے حد نفع پاتا ہوں، مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا نفع ہوا؟ اپنی حالت کے متعلق کوئی بات سمجھ ہی میں نہیں آتی کہ خدمت اقدس میں پیش کروں۔ دوسرے خدمت اقدس میں کوئی بات پیش کرنا صریح کذب اور نفاق معلوم ہوتا ہے، حتیٰ کہ ان چند سطور کے لکھنے میں مجھے کسی طرح اطمینان نہیں ہے کہ سچ لکھ رہا ہوں، بڑی مشکل سے یہ چند سطور لکھ رہا ہوں۔ ظہر کے بعد جو خدمت اقدس میں حاضر ہوتا ہوں تو اس قدر شرم آتی ہے جس کی انتہا نہیں، جی چاہتا ہے کہ زمین شق ہو جائے اور میں اس میں سما جاؤں، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور کی مجلس میں ایک نجس بیٹھا ہوا ہے، نہ معلوم یہ کیا حالت ہے، حضور میرے حال پر توجہ فرمائیں ورنہ بڑی مشکل ہے۔

والسلام

وصی اللہ اعظم گڈھی

جواب: یہی چیزیں تو مشعل راہ ہیں اور خدا تعالیٰ کی رحمتیں ہیں، یہ فنا کے آثارِ

مقصودہ ہیں، کچھ فکر نہ کی جاوے، جب تربیت کی مصلحت ہوگی، اس کا رنگ بدل دیں گے کہ وہ بھی نافع ہوگا، خلاصہ یہ ہے کہ

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست

☆☆☆☆☆☆☆

سیّدی وسندی وسیلتہ یومی وغدی لازالت شموس فیوضکم علینا بازغۃً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

جواب: السلام علیکم

خط: احقر لکھنؤ ہوتا ہوا بخیریت مکان پہونچ گیا۔

جواب: الحمدللہ

خط: اللہ حضرت اقدس کو تا دیر ہمارے سروں پر سلامت با کرامت رکھیں، آمین اپنی خیریت مزاج سے سرفراز فرمائیں۔

جواب: بفضلہٖ تعالیٰ خیریت سے ہوں۔

خط: حضرت والا کی جوتیوں کے طفیل میں قلب پر منجانب اللہ حضرت والا کی ذاتِ بابرکات کے متعلق یہ بات آتی ہے کہ حضور اقدس راہِ سلوک کے عظیم الشان سالک ہیں، اور ذوقاً قلب اس عظمت سے بھر جاتا ہے، اور ایک عجیب کیف ہوتا ہے، جو بیان سے باہر ہے۔

جواب: محبت کی رنگین عینک ہے، اس لئے کبھی دوسری بے رنگ چیز رنگین نظر آنے لگتی ہے۔

خط: اس وقت زبان پر بے اختیار یہ بات آتی ہے کہ سبحان اللہ، یہ شان اور اس کا یہ اثر ہے کہ نہ اپنی نسبت، عقیدت ومحبت کا گمان ہوتا ہے اور نہ خلوص کا، اور یوں معلوم

ہوتا ہے کہ ساری عمر منافقت میں گذری۔ سچ عرض کرتا ہوں حضرت کے ساتھ جو برتاؤ بوجہ عدم معرفت کے ہوا ہے اس سے اس قدر شرمندگی ہے کہ عرض نہیں کرسکتا، اور نہ کوئی تلافی سمجھ میں آتی ہے اور نہ ممکن ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا پہچاننا ناممکن ہے، اس کے اولیاء کا بھی ناممکن ہے۔ اب اخیر میں بکمال ادب معروض ہے کہ دل سے دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ جناب والا کی سچی عقیدت ومحبت ومناسبت عطا فرمائیں کہ اسی پر سب دارومدار ہے۔

والسلام

وصی اللہ، از فتح پور تال نرجا

جواب: یہ سب آثار ہیں فنا کے، دولت فنا کے حصول پر مبارکباد دیتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں۔

☆☆☆☆☆☆☆

مرشدی ومولائی سیّدی وآقائی أدام اللہ ظلال فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

جواب: السلام علیکم

خط: بکمال ادب وبصد الحاح وزاری خدمت اقدس میں اپنا ایک دلی مقصود عرض کرتا ہوں، گو وہ میری بساط سے بہت زیادہ ہے، مگر حضور کے کرم سے کچھ زیادہ نہیں، وہ یہ کہ حضرت اقدس کا خاص مذاق فنا وتوجہ ہے، مجھے بھی اگر اس میں سے ایک شمہ عطا ہوجاتا تو زہے سعادت وزہے نصیب۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ دل ہر وقت ایسا متفکر وپریشان رہتا ہے جیسے کسی مفقود شے کی تلاش میں ہو اور ملتی نہ ہو، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شے ہے جس کو میں دیکھ رہا ہوں اور وہاں تک پہونچنا چاہتا ہوں، مگر پہونچ نہیں سکتا، اس لئے محزون رہتا ہوں۔ دل چاہتا ہے کہ حضور کے ساتھ تعلق کا یہ

درجہ عطا ہو جائے۔

جواب: کیا عطا ہونے میں کچھ شبہہ بھی ہے، مگر ہر شے کے کچھ خواص ہوتے ہیں، اس دولت کا یہی خاصہ ہے کہ

دلارام در بر دلارام جوئے　　لب از تشنگی خشک و برطرف جوئے
نگویم کہ برآب قادر نیند　　کہ برساحل نیل مستسقی اند

جب حکمت کا تقاضا ہوگا انشاء اللہ اطلاع بھی ہو جائے گی۔

خط: عجب است باوجودت کہ وجود من بماند
تو بگفتن اندر آئی و مرا سخن بماند

دل میں جو کچھ ہے، اظہار کی طاقت نہیں ہے، امید کہ حضور والا میری غلطیوں کو معاف فرما کر میری تسلی فرمائیں گے۔

والسلام
وصی اللہ عفی عنہ

☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظم

بہ موقع طبع ثانی ''حیات مصلح الامت''

(نتیجۂ فکر: مولانا فضل حق صاحب عارفؔ خیرآبادی)

حیاتِ نو ''حیات مصلح الامت'' نے پائی ہے
کسی معجز نما ''اعجاز'' کی معجز نمائی ہے

دلوں نے کیف، روحوں نے لطافت جس سے پائی ہے
اسی سوزِ دروں کی خوش نوائی، خوش نوائی ہے

دکانِ معرفت، گنجِ گرانمایہ تصوف کا
طریقت کی صراحی میں شرابِ عشق لائی ہے

منور طورِ دل کتنے ہوئے اس برقِ ایمن سے
ضلالت کے اندھیرے میں یہ کتنا کام آئی ہے

طریقت ہوگئی محفوظ فانوسِ شریعت میں
سرِ محفل وہی شمع فروزاں پھر جلائی ہے

نقوشِ سنت نبوی سے ہیں اوراق رخشندہ
کرے بیخود دلوں کو اس میں وہ خوشبو بسائی ہے

شعورِ بندگی، خودآگہی ،ذوق خود آرائی
بہ ارواح ثلاثہ اہل دل کو دل سے بھائی ہے
جلا کے خرمنِ شہوت جو کردیتی ہے خاکستر
وہی برقِ تپاں خوداس کے دامن میں چھپائی ہے
حفاظت اپنی چاہو تو چھپالو خانۂ دل میں
محافظ بن کے خود یہ دولت بیدار آئی ہے

قناعت،صبر،ضبط نفس، عارفؔ جن سے ہو حاصل
انھیں اسباق کی سطروں میں اس کی رونمائی ہے

☆☆☆☆☆☆☆